قصص الاولیاء

(اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور واقعات)

(3)

ضیا تسنیم بلگرامی

قصص الاولیاء

(اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور واقعات)

(3)

ضیا تسنیم بلگرامی

Compiled by

Abdul Basit

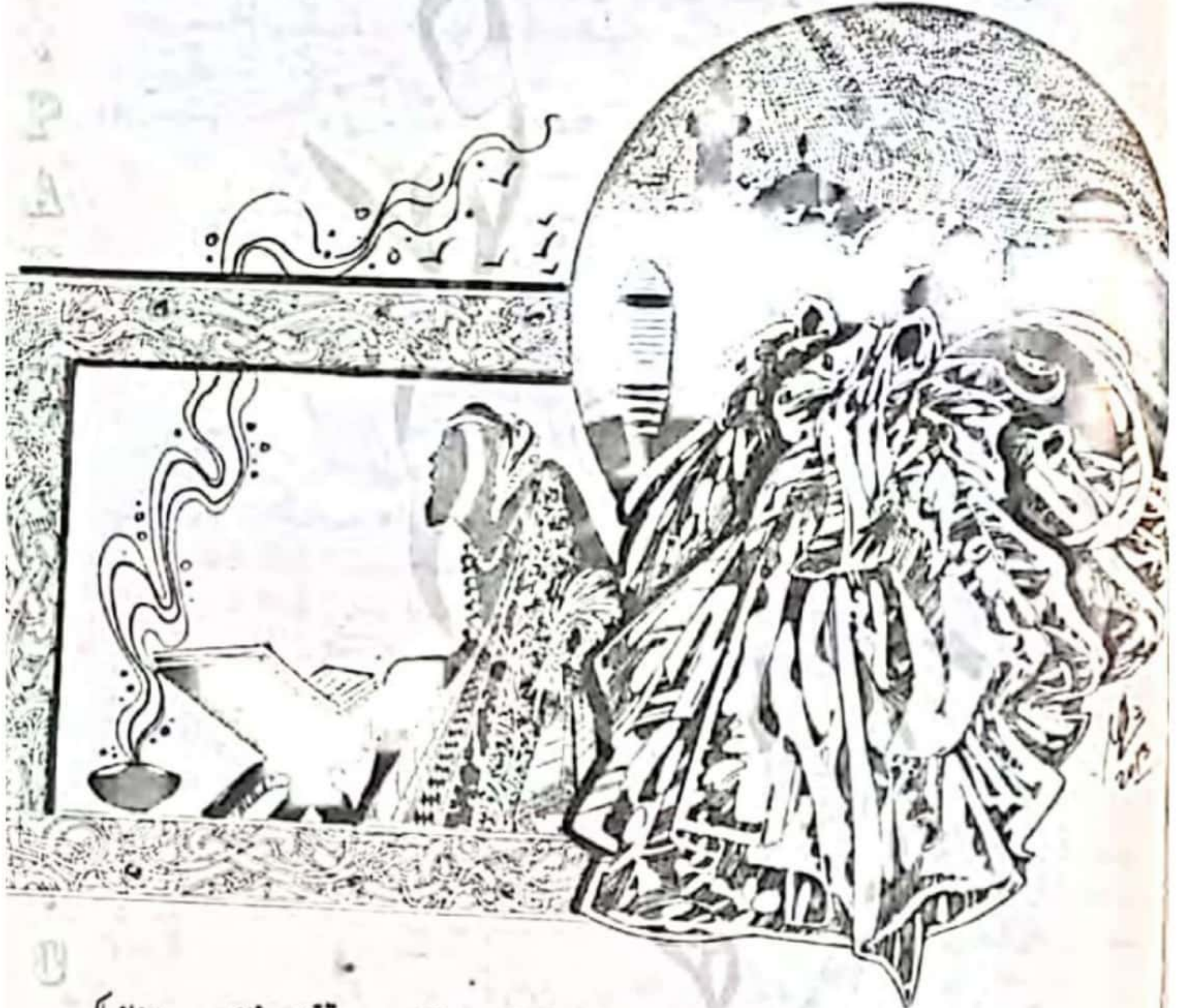
ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے

شیخ المشائخ
معصوم ولی
صحرا نورد درویش
ابن خلدون
عارف کامل
اجودھن کا درویش
عالم باطن
اسحاق اخرس
شمع فروزاں
انا الحق
متکلم صوفی
بہاء الدین ولد
شیخ محمد
بے تاج بادشاہ
محیط عالم
حاکم فقیر

ضیا تسنیم بلگرامی

شیخ المشائخ

دنیا کی تاریکی دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگ ایسے بھی پیدا کیے جو لہو و لعب سے دور ہو کر روشنی پھیلانے کا سبب بنتے رہے... اور اللہ کے ولی ٹھہرے۔ اس راہ کی کٹھنائیوں کو عبور کرنا خاص الخاص لوگوں کا وتیرہ رہا۔ آپ کا شمار بھی انہی روشن ضمیر انسانوں میں ہوتا ہے جن کا فیض مخلوق خدا کو پہنچتا رہا۔



لوگ یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے کہ شاہی خاندان کا ایک فرد عبداللہؒ تکلفات اور تعیشات شاہی سے بے نیاز بلکہ نفور، نفس کشی اور چلوں میں مشغول رہتا ہے۔ ٹاٹ کا لباس زیب تن کیے ہوئے بیس سال گزر چکے تھے۔ خاندان کے لوگ آپ کے پاس آتے اور کہتے۔ ''عبداللہ! یہ تمہیں کیا سوجھی ہے؟ اللہ نے تمہیں سب کچھ دے رکھا ہے لیکن تم نے ٹاٹ کا لباس پہن رکھا ہے۔ کیا یہ کفرانِ نعمت نہیں ہے؟''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''کفران نعمت یہ ہے کہ انسان اپنے اعضائے جسمانی کو اپنے معبود کی عبادت اور شکر گزاری سے

محروم رکھے اور میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایسی عقل عطا فرمائی جس سے میں اپنے دنیوی اور آخروی نفع ونقصان کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔"

انہوں نے اپنے کاموں کے لیے ایک آدمی رکھ لیا تھا جو گھر کے کام کے علاوہ آپ کے کھانے کی خاص فکر رکھتا تھا۔ آپ کا حکم تھا کہ جب دن بھر کے روزے کے بعد افطار کا وقت آئے تو خادم گن کر سات منقے دے دیا کرے۔ ایک عرصے تک اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ آپ کی صحت گرتی رہی لیکن آہ نیم شبی میں لذت محسوس ہوتی رہی۔ اس لذت نے ان کے دل سے ضعف و نقاہت کا خیال تک نکال دیا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ وہ خدا کی بارگاہ میں گرے ہوئے آہ وزاری میں مشغول تھے لیکن آج روز جیسی لذت اور کیفیت سے وہ محروم تھے۔ وہ جب بھی اپنی زبان سے "اللہ" کہتے تو دل میں وہ چمک اور وہ لذت نہیں پیدا ہوتی جو ہمیشہ کا خاصہ تھا۔ ان کا دل سوز دروں سے محروم ہو چکا تھا۔ عبداللہؒ بہت پریشان تھے۔ ان کی تو گویا متاعِ حیات ہی چھن چکی تھی۔ اب ان کا دل اللہ کی یاد میں نہیں، اس میں مشغول تھا کہ اس ستم کا پتا چلایا جائے جس نے ان کی لذت وکیفیت چھین کر انہیں خالی کر دیا ہے۔ انہوں نے رات کے پچھلے پہر اپنے خادم کو طلب کیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا آپ کے سامنے آ کھڑا ہوا، ادب سے عرض کیا۔ "خلافِ معمول طلبی پر یہ عاجز پریشان اور خوفزدہ ہے۔ اس ناچیز سے کوئی غلطی تو نہیں سرزد ہو گئی؟"

آپ نے دریافت کیا۔ "میں تجھ سے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں اور اس یقین کے ساتھ کہ تو جھوٹ نہیں بولے گا۔"

خادم نے عرض کیا۔ "یہ میری مجال کہ میں جھوٹ بولوں اور وہ بھی آپ سے، مجھ میں نہ اتنی ہمت ہے نہ حوصلہ۔"

آپ نے کہا۔ "آج رات معلوم نہیں کیوں، مجھ پر نیند غلبہ کر رہی ہے اور اعصاب آسودگی سی محسوس کر رہے ہیں۔ میں بڑی کوشش کرتا ہوں کہ ان لذتوں اور کیفیتوں کا مزہ چکھوں، جو ہر رات مجھے حاصل رہی ہیں لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود میں ان سے محروم ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو نے افطار میں مجھے جو منقے دیے تھے، ان میں کوئی خاص فرق تو نہیں تھا، کوئی تبدیلی کوئی تغیر؟"

خادم سناٹے میں رہ گیا، بڑی بے بسی سے آپؒ کی صورت دیکھنے لگا، بولا۔ "میں ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ حضور کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ اور ضعف ونقاہت سے حضور کی آنکھیں حلقوں میں چلی گئی ہیں اور اوپر کا نصف جسم جھکتا جا رہا ہے۔ میں اس کا اور کوئی علاج تو نہیں کر سکتا تھا، فوری اور قابل عمل جو تدبیر میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ میں حضور کے منقوں کی تعداد میں نہایت ہوشیاری سے اضافہ کرتا چلا جاؤں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ منقوں کی تعداد میں ایک معتدبہ اضافہ حضور کی کمزوری اور نقاہت پر غالب آ جائے گا۔"

آپ نے غصے میں پوچھا۔ "تو نے آج افطار میں مجھے کتنے منقے دیے تھے؟"

خادم نے جواب دیا۔ "آٹھ منقے آج میں نے ایک کا اضافہ کیا تھا۔"

آپؒ کو رونا آ گیا، گلوگرفتہ آواز میں بولے۔ "ظالم! تو نے یہ کیا غضب کر دیا؟ تو جانتا ہے اس ایک منقے نے میرے جسم میں کیا فتور کر رکھا ہے۔ میرے اعصاب آرام طلبی میں مبتلا ہیں اور دل ودماغ سو جانے پر مائل ہیں۔ آہ! مجھ سے میری آہ نیم شبی کی لذت اور کیفیت چھن گئی۔ تو نے یہ کیا کر دیا ظالم انسان!"

خادم سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ آپؒ بھی بڑی دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتے رہے، آخر فرمایا۔ "اب جا، آرام کر میں تجھ سے صبح بات کروں گا۔ لیکن صبح مجھ سے یہ امید ہرگز نہ رکھنا کہ میں تجھے معاف کر دوں گا۔ تو مجھے جسمانی اذیت پہنچاتا تو میں تجھے معاف بھی کر دیتا لیکن تو نے میری زندگی بھر کی کمائی چھین لی، میرا سوز چھین لیا، میری آہ کی لذت لوٹ لی پھر میں تجھے کس طرح معاف کر دوں گا۔"

خادم نے لجاجت سے عرض کیا۔ "میں نے جو کچھ کیا تھا آپ کی بھلائی کے پیش نظر کیا تھا۔"

آپؒ نے جواب دیا۔ "وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے نادان دوست کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا ہے۔ تو نے جو کام میری فلاح کے خیال سے کیا تھا اس سے مجھے زبردست نقصان پہنچ گیا۔ کل ایسی نوع کا تو کوئی اور کام میری بہبود کی خاطر کرے گا اور اس سے میں بالکل ہی تباہ وبرباد ہو گیا تو کیا ہوگا؟ میں نادان دوست کو نہیں برداشت کر سکتا۔"

خادم خوفزدہ ولرزیدہ سامنے سے ہٹ گیا اور آپ پوری قوت ارادی سے خدا سے لو لگاتے رہے لیکن اس وقت ان کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کسی کسی لمحے سوز دروں کی شمعیں جھلملاتی تھیں اور پھر بجھ جاتیں وہ رونے لگے۔ انہوں نے بارگاہ ایزدی

میں عرض کیا۔ ''اے الہ العالمین! ایک مٹکے کی اتنی بڑی سزا نہ دے کہ میں اپنی لذت آہ نیم شبی ہی سے محروم ہو جاؤں۔ اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں اس غلطی کو نظر انداز فرما دے۔ اب آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔''

صبح آپؒ نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے خادم کو رخصت کر دیا اور اس کی جگہ دوسرا آدمی رکھ لیا۔ اس واقعے کے بعد لوگ آپ کو خفیف کہنے لگے۔

توکل اور استغناء کا یہ عالم تھا کہ آپ کسی سے اپنا کوئی کام نہ کہتے تھے نہ لیتے۔ ہاں دوسروں کا کام البتہ کر دیا کرتے تھے۔ آپؒ نے حج کا ارادہ کیا تو قافلے والوں سے اتنی بے تکلفی اختیار کی کہ صرف پیاس کا خیال رکھا اور کسی چیز کی پروانہ کی۔ سامان سفر میں ایک ڈول اور ایک رسی ساتھ لی اور حج کی نیت سے نکل کھڑے ہوئے۔ قافلے والوں کی اتباع، پیروی یا پابندی آپ کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ کچھ دور تک تو آپ قافلے کے ساتھ رہے اس کے بعد آپ اس سے الگ ہو گئے۔ بھوک لگتی تو چند مٹکے کھا لیتے اور پیاس لگتی تو کسی چشمے سے اپنا ڈول بھر کر پیاس بجھا لیتے۔

دوران سفر ایک ایسا مرحلہ بھی پیش آیا کہ کافی دور تک آپ کو کوئی چشمہ نہ ملا۔ پیاس آپ کو تنگ کرنے لگی۔ آپ چشمے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہے تھے۔ آخر آپ نے کافی فاصلے پر ایک ہرن کو زمین کی طرف سر جھکائے کھڑے دیکھا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ ہرن پانی پی رہا ہے۔ آپ بے چینی سے اس طرف چل پڑے۔ جب قریب پہنچے تو ہرن ان کی آہٹ محسوس کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے آگے بڑھ کر جو دیکھا تو نشیب میں ایک چشمہ رواں تھا۔ پانی کی سطح اتنی بلند تھی کہ ڈول رسی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اگر سطح نیچی ہوتی تو ہرن اپنی پیاس نہ بجھا سکتا۔ آپ نے دونوں ہاتھوں کو چلو بنا کے پانی پینا چاہا لیکن انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جیسے جیسے وہ ہاتھ پانی کی طرف لے جاتے تھے، پانی کی سطح نیچے ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ پانی کی طرف منہ کے بل کافی جھک گئے اور بڑی کوشش کی کہ پانی پی لیں لیکن پانی تک ان کے ہاتھ نہیں پہنچ سکے۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور چشمے کے کنارے بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا۔ ''میرے مولا! یہ ایک اسرار ہے کہ اسی چشمے سے ہرن نے بھی پانی پیا تھا اور اس وقت اس کی سطح اونچی تھی لیکن جب میں نے پانی پینا چاہا تو اس کی سطح حیرت انگیز طور پر نیچی ہوتی چلی گئی۔ کیا تو مجھ سے ناراض ہے؟''

یہ خاموش ہو کر رونے لگے۔ ان کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بولے۔ ''اے اللہ! میں اپنی گریہ وزاری کا جواب چاہتا ہوں۔ مجھے صرف یہ بتا دے کہ کیا میرا مرتبہ ہرن سے بھی کم ہے؟''

انہیں اپنے قریب ہی سے جواب ملا، کوئی کہہ رہا تھا۔ ''عبداللہؒ! ہرن کے پاس ڈول رسی نہیں تھی اس لیے اس کے لیے پانی کی سطح اونچی کر دی گئی تھی۔ لیکن تو نے ڈول رسی کا سہارا لیا، تو اب رو کیوں رہا ہے؟ گریہ وزاری کیوں کر رہا ہے؟ رسی میں ڈول پھنسا اور بھر لے پانی، ہم سے شکوہ کیوں کر رہا ہے؟''

آپؒ نے بڑی ندامت محسوس کی اور ڈول رسی پھینک کر آگے روانہ ہو گئے، بولے۔ ''میں پیاسا رہ لوں گا لیکن اب ڈول رسی کا سہارا نہیں لوں گا۔''

ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ پھر آواز سنائی دی۔ ''عبداللہؒ! کہاں جاتے ہو؟ کیا ناراض ہو گئے؟''

عبداللہؒ بولے۔ ''اے اللہ! کیا کسی بندے میں اتنی ہمت ہے کہ اپنے آقا سے ناراض ہو جائے۔''

آواز آئی۔ ''پھر تو پانی پیے بغیر ہی کیوں چل پڑا جبکہ میں جانتا ہوں کہ تو بہت زیادہ پیاسا ہے۔''

عبداللہؒ نے کہا۔ ''مجھے میری غیرت اور ندامت نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ یہ پانی ہرگز نہ پیوں۔''

جواب ملا۔ ''نہیں چشمے پر واپس جا اور پانی پی لے۔ اس طرح تیرے صبر کا امتحان لیا جا رہا تھا۔ چشمے پر واپس جا اور اس کے پانی سے اپنی پیاس بجھا۔''

آپ چشمے پر دوبارہ واپس پہنچے اور یہ دیکھ کر ان کا دل بھر آیا کہ پانی کی سطح اتنی ہی اونچی ہو چکی ہے جتنی ہرن کے پانی پینے کے وقت تھی۔ آپ نے ہاتھ کو چلو بنا کے پانی پینا شروع کر دیا۔ پانی پیتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ جب خوب شکم سیر ہو کر پانی پی چکے تو اس پانی سے وضو بھی کیا۔

آپؒ حج سے فارغ ہو کر جب بغداد واپس آئے تو آپ نے اس عہد کے سب بڑے صوفی جنید بغدادیؒ سے ملاقات کی اور ان کے سامنے پانی والا واقعہ دُہرا دیا۔ جنیدؒ نے جواب دیا۔ ''عبداللہؒ! اگر تم ذرا سا صبر اور کر لیتے تو چشمہ تمہارے قدموں میں بہنے لگتا۔''

آپ خاموش ہو گئے کچھ دیر بعد فرمایا۔ "جنیدؒ! اگر تمہارے جیسا مشیر اور دوست اس وقت مجھے میسر آجاتا تو آج میں اس سعادت سے بھی ہمکنار ہو چکا ہوتا۔"

☆☆☆

کچھ دن بغداد میں رہنے کے بعد آپ کو کسی نے بتایا۔ "عبداللہ! تم کیا مراقبہ کرو گے! میں نے مصر میں ایک نوجوان کو کچھ ایسا مراقبے میں دیکھا کہ حیران رہ گیا۔ اسے اپنے آس پاس کی کوئی خبر ہی نہیں۔"

آپ نے تڑپ کر پوچھا۔ "کیا تو مجھے اس شخص کا پتا بتا سکتا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں؟"

اس کے بعد اس شخص نے آپ کو اس نوجوان کا پتا بتا دیا۔ آپ اسی وقت مصر روانہ ہو گئے۔ کافی دنوں بعد سفر کی صعوبتیں اور پریشانیاں جھیل کر جب آپ مصر میں اس نوجوان کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر واقعی حیران رہ گئے کہ اس کے آس پاس لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے مگر اس نوجوان کے خضوع و خشوع، انہماک اور مراقبے میں کوئی فرق نہیں آ رہا۔

عبداللہؒ اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور بہ آواز بلند سلام عرض کیا لیکن اس نوجوان نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ عبداللہ نے اسے پھر سلام کیا اور نوجوان نے اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا۔ آپ نے تیسری بار بھی سلام کیا مگر اس بار بھی جواب سے محروم رہے۔

آپ نے چوتھی بار سلام کیا اور ساتھ ہی کہا۔ "اے نوجوان! ایسا بھی انہماک اور مراقبہ کس کام کا کہ میں سنت رسول ﷺ ادا کر رہا ہوں اور تو میرے سلام کا جواب تک نہیں دے رہا۔"

نوجوان نے اپنا سر اٹھایا اور آہستہ سے جواب دیا۔ "اے خفیف! میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس بڑا وقت ہے اور تم اپنے اہم کاموں کو انجام دے کر فرصت حاصل کر چکے ہو حالانکہ تمہیں اس حقیقت کا علم ہونا چاہیے تھا کہ دنیا بہت قلیل اور عمر بہت مختصر ہے۔ اگر تم چاہو تو اس قلت میں سے کثرت حاصل کر لو لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ تم نے میرے جیسے بے کار آدمی سے ملنے کی خاطر مصر تک کا سفر کیا اور بار بار سلام کر کے اپنا ہی نہیں بلکہ میرا بھی وقت ضائع کرنا چاہتے ہو۔"

اتنا کہہ کر اس نے عبداللہ کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور پھر مراقبے میں چلا گیا۔

جب یہ اس نوجوان کے پاس پہنچے تھے تو ان کا بھوک سے بہت برا حال تھا لیکن نوجوان کے جواب نے ان کی بھوک اڑا دی تھی۔ یہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔ "اے نوجوان! میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں تیرے ساتھ ہی پڑھوں گا۔"

دونوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور اس کے بعد عصر کی نماز بھی ایک ساتھ ادا کی۔ آپ نے اس نوجوان کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے میری خواہش پوری کی اور دو نمازیں میرے ساتھ ادا کیں۔ اب ایک آخری خواہش بھی پوری کر دے۔"

نوجوان نے پوچھا۔ "کون سی خواہش؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں تو مجھے کوئی نصیحت کرے۔"

نوجوان نے کہا۔ "خفیف! جو شخص خود ہی گرفتار بلا ہو، اس کی زبان اس لائق کہاں کہ کسی کو نصیحت کرے۔ میں تو خود ہی ایک عرصے سے یہ امید لگائے ہوئے ہوں کہ کوئی مجھے نصیحت کرے۔"

عبداللہ نے کہا۔ "اے شخص! میں کوئی نصیحت سنے بغیر واپس نہ جاؤں گا۔"

نوجوان نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "خفیف! اس وقت تمہارے اصرار پر میں ایک ہی نصیحت کروں گا، وہ یہ کہ تم ہمیشہ ایسوں کی صحبت اختیار کرو، جن سے خدا کی یاد تازہ رہے اور یہ لوگ ایسے ہوں جو خدا کی یاد کی زبانی تلقین نہ کرتے ہوں بلکہ صحیح معنوں میں عمل کر کے تمہیں اس کا عامل بنا دیں۔"

آپ اس نصیحت پر زار و قطار روئے اور کہا۔ "آہ، میں ایسے دوست کہاں پاؤں گا جو اپنے عمل سے مجھے خدا کی یاد پر ڈال دیں جبکہ میں خود ابھی اس راہ کا ایک ادنیٰ سا مسافر ہوں۔"

آپ نے واپسی میں ایک جنگل سے گزرتے ہوئے، ایک لاش پڑی دیکھی۔ اس لاش کے آس پاس آہستہ آہستہ لوگ آ آ کر جمع ہو رہے تھے۔ آپ ان لوگوں کے قریب پہنچے اور پوچھا۔ "یہ کس شخص کی لاش ہے؟"

کسی نے جواب دیا۔ "یہ ہمارا راہب تھا اور اس نے اپنی پوری زندگی خدا کی یاد میں گزار دی۔"
آپ نے دریافت کیا۔ "اب اس لاش کا تم لوگ کیا کرو گے؟"
جواب ملا۔ "اس راہب نے مرنے سے پہلے ایک وصیت کی تھی۔ ہم لوگ اسی پر عمل کرنے جا رہے ہیں۔"
آپ نے تعجب سے پوچھا۔ "اس نے کیا وصیت کی تھی؟"
جواب دیا گیا۔ "اس نے کہا تھا کہ جب میں مرجاؤں تو مجھے دفن کرنے کے بجائے جلا دیا جائے اور میری راکھ کو محفوظ کرلیا جائے اور یہ راکھ ان لوگوں کی آنکھوں میں سرمے کے طور پر لگائی جائے جن کی آنکھیں خراب ہوں یا ان کی بینائی رخصت ہو چکی ہو۔"
آپ نے کہا۔ "لیکن اس عمل کا فائدہ؟"
کسی نے جواب دیا۔ "اس عمل کا فائدہ یہ ہوگا کہ خراب آنکھ ٹھیک ہو جائے گی اور کور چشم بینا ہو جائیں گے۔"
آپ کو ان باتوں پر یقین نہیں آیا۔ آپ وہیں کھڑے ہو کر لاش کے جلنے کا منظر دیکھنے لگے۔ لوگوں نے واقعی راہب کی راکھ کو اپنی اپنی شیشیوں میں محفوظ کرلیا۔ آپ ان کی خوش عقیدگی پر افسوس کرتے رہے۔ آپ نے پوچھا۔ "کیا تم لوگوں کو واقعی یقین ہے کہ اس راکھ سے خراب آنکھیں درست اور نابینا بینا ہو جائیں گے؟"
ایک کٹر سیحی نے طنزاً کہا۔ "تم مسلمان ہو اس لیے تمہیں ہماری باتوں پر یقین نہیں آرہا لیکن میں تمہیں اس کا مشاہدہ ہی کیوں نہ کرادوں۔"
وہ سیحی آپ کو اپنے گھر لے گیا اور میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد اس نے بستی کے ان آدمیوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا جن کی آنکھیں خراب تھیں یا ان کی بینائی رخصت ہو چکی تھی۔ بہ مشکل اس نے چار آدمی تلاش کر لیے۔
ان میں تین کی تو آنکھیں خراب تھیں اور ایک اندھا تھا۔
اس سیحی نے ان چاروں کو عبداللہؒ کے سامنے کھڑا کر دیا، کہا۔ "حضرت! ان چاروں کی آنکھیں ملاحظہ فرمالیں۔ ان میں سے تین کی تو آنکھیں خراب ہیں اور ایک نابینا ہے۔ اب میں اس راکھ کا اثر آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔"
آپ دم بخود حیرت زدہ یہ تماشا دیکھنے لگے۔
اس سیحی نے یکے بعد دیگرے خراب آنکھوں میں راکھ کی سلائیاں پھیریں اور انہیں ایک تاریک کمرے میں جا کر چھوڑ دیا، بولا۔ "جب تک میں بلاؤں نہ، تم تینوں اندر ہی رہو گے۔"
یہ تینوں کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ آخر میں اس نے نابینا کی آنکھوں میں راکھ کی سلائیاں پھیر کر انہیں پٹی سے باندھ دیا اور کہا۔ "تم یوں ہی بیٹھے رہو، یہ پٹی میں خود ہی کھولوں گا۔"
عبداللہؒ حیرت سے یہ سب دیکھتے رہے۔ وہ شخص آپ کو لے کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں ان کی اقامت کا انتظام کر دیا تھا۔ آپ نے شام تک کا وقت بڑی بے چینی اور اضطراب میں گزارا۔ مغرب کے بعد آہستہ آہستہ اندھیرا پھیلنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دن کی سپیدی کو رات کی چادر نے لپیٹ کر انسانی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اس رات آسمان پر بارھویں کا چاند چمک رہا تھا اور چاند کی روشنی میں ستارے اپنی چمک دمک کمزور کر چکے تھے۔ سیحی، عبداللہؒ سے باتیں کرتے کرتے اپنی جگہ سے اٹھا اور کہا۔ "شاید اب وقت آگیا ہے کہ میں ان چاروں کو آپ کے پاس لے آؤں اور راہب کی راکھ کے کرشمے دکھادوں۔"
آپ نے پوچھا۔ "کیا تیرا یہ خیال ہے کہ وہ فضول راکھ اپنا کام کر چکی ہوگی؟"
سیحی نے کہا۔ "جناب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، اگر آپ اس مقدس راکھ کو فضول نہ کہیں۔"
آپ نے آہستہ سے کہا۔ "اگر میری اس بات نے تیرے دل کو دکھ پہنچایا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔"
سیحی ان تینوں کو کمرے سے باہر لے آیا۔ ان تینوں نے ابھی تک اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ سیحی نے ایک شخص کو عبداللہؒ کے قریب کھڑا کر دیا اور اسے حکم دیا۔ "اے شخص! آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول اور ہمیں بتا کہ اس راکھ نے کوئی اثر کیا یا آنکھیں اب بھی خراب ہیں؟"
اس شخص نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنا شروع کر دیں اور جب اس کی دونوں آنکھیں پوری طرح کھل گئیں تو وہ خوشی میں چیخ اٹھا۔ "آہ، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میری آنکھیں بالکل درست ہو چکی ہیں۔"
آپ کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ اس شخص سے کہا۔ "اے شخص! تو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ درست ہے یا اپنے مذہب

اور عقائد کی طرفداری میں ایسی بات کر رہا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تو کون ہے اور ایسی بات کیوں کر رہا ہے لیکن میں اب مسیح علیہ السلام کی قسم کھا کر تجھے یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، تو اس کی صداقت پر شک و شبہ نہ کر۔''

اس کے بعد دوسرے اور تیسرے شخص کی آنکھیں بھی کھلوائی گئیں اور ان دونوں نے بھی ویسی ہی باتیں کیں جیسی پہلا شخص کر چکا تھا۔ ان تینوں کی آنکھیں ٹھیک ہو چکی تھیں۔

آپ نے اس مسیحی سے کہا۔ ''بھائی میں حیران ہوں اور مجھے ان تینوں کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی مردے کی راکھ دوا کا کام دے۔''

مسیحی نے جواب دیا۔ ''اے مسلمان درویش! مردے کی راکھ کہہ کر ہمارے مقدس بزرگ کی بے حرمتی نہ کیجئے۔ اگر وہ مقدس نہ ہوتا تو کبھی بھی اس کی راکھ میں یہ اثر نہ ہوتا۔''

آپ نے کہا۔ ''اب اس نابینا کی پٹی تو کھول کر دکھاؤ۔ اس اعتبار سے وہ گویا بینا ہو چکا ہوگا۔''

''بے شک۔'' مسیحی نے جواب دیا۔ ''مجھے اس پر ذرا سا بھی شبہ نہیں۔''

اس کے بعد وہ مسیحی اس نابینا کو لے آیا اور آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں پر سے پٹی ہٹانے لگا۔

ایک آنکھ پر سے ذرا سی پٹی ہٹا کر اس نے کہا۔ ''اے شخص! اپنی آنکھ کے گوشے سے دنیا دیکھنے کی کوشش کر، کیا تجھے کچھ نظر آیا؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں اپنی آنکھ کے کھلے ہوئے گوشے سے بادلوں کا جھنڈ دیکھ رہا ہوں یا پھر ایسا ہے کہ میں کہر آلود فضا میں کھڑا ہوں۔''

مسیحی نے پٹی ذرا سی اور کھسکا دی، پوچھا۔ ''اور اب؟''

''بادل بہ دستور موجود ہے، کہر آلود فضا۔''

اس کے بعد مسیحی نے پوری پٹی ہٹا دی۔ نابینا کی بینائی واپس آ چکی تھی۔ عبداللہؒ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا مسیحی حق پر ہیں؟ کیا ایک راہب اپنی موت کے بعد بھی مخلوق کے لیے اتنا مفید اور فائدہ رساں ہو سکتا ہے؟ یہ سوالات انہیں پریشان کرتے رہے۔ رات کو جب یہ سو گئے تو خواب میں رسول مقبول ﷺ کو دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا۔

''اے خفیف! تم الجھنوں کا شکار کیوں ہو گئے ہو؟ اس راہب کی راکھ نے تمہیں اتنا پریشان کیوں کر دیا ہے؟ ان باتوں سے تمہیں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیے، صدق ریاضت سے باطل دین والوں میں بھی یہ اثر پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر دین حق والے بھی صدق و ریاضت سے کام لیں تو ان میں اس راہب سے زیادہ کمالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ صدق و دیانت، ریاضت اور خلوص، یہ کہیں بھی ہوں، ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔''

آپ کے دل کو قرار آ گیا اور کچھ دن اس مسیحی کے مہمان رہ کر روانہ ہو گئے۔

آپ نے ایک بار پھر رسول مقبول ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ ﷺ نے عبداللہؒ سے فرمایا۔ ''اے خفیف! اگر راہ طریقت کا واقف بھی اس راستہ پر گامزن نہ ہوگا تو محشر میں یہی شخص عذاب کا سب سے زیادہ مستحق قرار پائے گا۔''

آپ پر اس قول کا اتنا شدید اثر ہوا کہ آپ نے اتباع سنت ﷺ میں انگوٹھوں کے بل پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ آپ نے زار و قطار روتے ہوئے عرض کیا۔ ''یارسول اللہ ﷺ! میں نے تو بڑی کوشش کی کہ آپ ﷺ کی اتباع میں انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر نماز پڑھوں لیکن میں اس میں ناکام رہا۔ اب آپ ﷺ ہی فرمایئے کہ میں راہ طریقت پر کس طرح چلوں کہ محشر میں مجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔''

آپ نے اسی رات خواب میں دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں کہ ''اے خفیف! انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ بات میری ذات تک مخصوص تھی۔ تجھے اس معاملے میں میری اتباع نہیں کرنا چاہیے۔''

ایک بار آپ نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے۔ ہر طرف نفسانفسی کا بازار گرم ہے۔ لوگ حیران و سرگرداں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ پل صراط پر لوگوں کا ہجوم ہے اور اس پر سے گزرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس عالم میں آپ نے دیکھا ایک چھوٹا سا بچہ کسی طرف سے نمودار ہوا اور ایک شخص کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ''ابا جان! آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ ادھر آیئے میرے ساتھ تاکہ میں آپ کو پل صراط کے اس پار پہنچا دوں۔''

اس شخص نے اپنا ہاتھ اس لڑکے کے ہاتھ میں دے دیا۔ لڑکے نے اسے نہایت آسانی سے پل صراط کے اس پار پہنچا دیا۔ سامنے ہی جنت تھی۔ لڑکے نے کہا۔ ''ابا جان! آیئے میرے ساتھ، میں آپ کو جنت میں داخل کرا دوں۔''

چنانچہ اس لڑکے نے اپنے باپ کو جنت میں پہنچا دیا اور خود کہیں غائب ہو گیا۔

آپ نے بیدار ہوتے ہی کسی عورت سے نکاح کر لیا۔ دس گیارہ ماہ بعد گھر میں ایک حسین بچہ پیدا ہوا جو چند گھنٹے زندہ رہ کر چل بسا۔ بیوی چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ آپ بھی بہت اداس تھے، آہستہ، آہستہ چل کر بیوی کے پاس پہنچے اور کہا۔ ''بی بی! تم اتنا مت رو، خدا کی مشیت میں کوئی کس طرح دم مار سکتا ہے۔ رضائے الٰہی پر تمہیں اپنا سر جھکا دینا چاہیے کیونکہ اللہ اس بات سے بہت خوش ہوتا ہے۔''

بیوی نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ میرے پاس اس قسم کی باتیں کر کے دل دکھانے آئے ہیں۔ میں کس طرح صبر کر لوں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تم کس طرح یہ کہہ سکتی ہو کہ میں نے یا میرے کسی رویے میں تمہارے لیے تکلیف اور اذیت کا محرک پایا جاتا تھا۔ میں نے تو تم سے کسی اور ہی مقصد سے شادی کی تھی۔ آج وہ مقصد پورا ہو چکا ہے اس لیے مجھے اجازت دیجیے۔ میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔ میں تمہیں طلاق بھی دے سکتا ہوں کیونکہ لڑکے کی پیدائش اور اس کی فوری موت نے میرے مسائل حل کر دیے۔ اب میں اس فکر سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔''

بیوی نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''میں نے طلاق لینے کے لیے یہ شادی نہیں کی تھی۔ یہ طلاق کیوں لوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر تم اب بھی میرے ہی ساتھ رہنا چاہتی ہو تو میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔''

بیوی کا دل گداز اور کمزور تھا۔ شوہر کو اداس اور طول دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔

☆☆☆

آپ کے مریدوں میں دو ایسے بھی تھے جن کا نام احمد تھا۔ آپ نے ان دونوں میں تمیز کی خاطر ایک کا نام احمد کہہ اور دوسرے کا نام احمد مہ رکھ دیا لیکن آپ کو احمد کہہ سے بڑی انسیت تھی۔ حالانکہ عبادت اور ریاضت میں احمد مہ کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ دوسرے مرید جب یہ دیکھتے کہ ایک دیندار کے مقابلے میں دوسرے کمتر درجے کے دیندار کو زیادہ سراہا جا رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔

ایک دن ایک مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں ایک بات معلوم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اگر اس کا صحیح جواب مل جائے گا تو میں نہایت خشوع وخضوع سے یاد الٰہی میں مشغول رہ سکوں گا۔''

آپ نے کہا۔ ''وہ کیا، پوچھو۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''آپ کے دونوں مرید احمد کہہ اور احمد مہ میں جو زیادہ عبادت گزار اور متقی ہے آپ اس کے مقابلے میں اسے زیادہ چاہتے ہیں جو نسبتاً کم عبادت گزار ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں تیرے سوال کا جواب کسی خاص وقت پر دوں گا۔ اس کے لیے تجھے انتظار کرنا ہوگا؟''

مرید چپ ہو گیا۔ اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔

آپ ایک بڑے اجتماع سے مخاطب تھے۔ آپ کے دلکش انداز وعظ گوئی نے مجمع پر سحر سا کر رکھا تھا۔ وعظ کے خاتمے پر آپ نے احمد مہ سے کہا۔

''احمد مہ! میرا ایک کام تو کر دے۔''

احمد مہ نے ادب سے عرض کیا۔ ''ارشاد، ایک کیا دس کا ارشاد فرمایئے میں دل وجان سے اس کی تعمیل کروں گا۔''

آپ نے کہا۔ ''میرے اونٹ کو، جو باہر بندھا ہوا ہے، ذرا اوپر چھت پر باندھ دے۔''

احمد مہ آپ کی صورت دیکھنے لگا، آپ نے پوچھا۔ ''میری صورت کیا دیکھ رہا ہے، میں نے جو کام تیرے سپرد کیا ہے اسے انجام دے۔''

احمد مہ نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ نے اس پر غور بھی فرمایا ہے کہ کیا حکم دے رہے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے تجھے جو حکم دیا ہے اچھی طرح سوچ سمجھ کر دیا ہے، اونٹ کو چھت پر لے جا کر باندھ دے۔''

احمد مہ نے کہا۔ ''حضرت! ذرا غور تو فرمایئے، اونٹ کوئی بکری یا بھیڑ کا بچہ تو ہے نہیں جسے میں گود میں لے کر چھت پر

پہنچادوں۔"

آپ نے احمد کبہ کو آواز دی۔ "احمد کبہ! ذرا میرے قریب تو آنا۔"

احمد کبہ بھاگا بھاگا آپ کے روبرو آن کھڑا ہوا۔ "ارشاد!"

آپ نے فرمایا۔ "ذرا میرے اونٹ کو چھت پر لے جا کر باندھ تو دے۔"

احمد کبہ نے گردن جھکا کر بصد ادب عرض کیا۔ "بہتر ہے، ابھی لے لیجیے۔"

احمد کبہ فوراً اٹھا اور اونٹ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اونٹ کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا ایک ہاتھ اگر اونٹ کی پچھلی ٹانگ پر تھا تو دوسرا اونٹ کے نصف حصے تک پہنچ کر رک جاتا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ اونٹ کو گود میں اٹھالے لیکن ناکام رہا۔

آپ اپنے چند مریدوں کو ساتھ لے کر احمد کبہ کے پاس پہنچ گئے۔ ان میں وہ مرید بھی شامل تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے یہ سوال کیا تھا کہ آپ عبادت گزار احمد مہ کے مقابلے میں نسبتاً کم عبادت گزار احمد کبہ کو کیوں زیادہ چاہتے ہیں۔ آپ نے اپنے مریدوں کے ساتھ یہ تماشا دیکھا کہ احمد کبہ پسینے میں تر بہ تر اونٹ کو اٹھالینے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا ہے لیکن اونٹ کو جنبش تک نہیں دے پارہا۔ آپ نے احمد کبہ سے کہا۔ "اب بس کر اگر اونٹ تیرے اٹھائے نہیں اٹھتا تو مت اٹھا، میرا منشا پورا ہو چکا۔"

مرید حیرت سے آپ کی شکل دیکھنے لگے۔ احمد کبہ نے عرض کیا۔ "حضرت! میں کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کا حکم بجالاؤں۔"

آپ نے کہا۔ "میرا حکم تو تو بجالایا اب مزید ہلکان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اونٹ تیرے اٹھائے نہیں اٹھے گا۔"

جس مرید نے کچھ عرصے پہلے اعتراض کیا تھا، اس نے کہا۔ "آپ کو خود بھی اس کا پہلے ہی علم ہوگا کہ اونٹ اس کے اٹھائے نہیں اٹھے گا پھر اسے خوامخواہ ہلکان فرمایا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تجھے اور تیرے جیسے دوسروں کو یہ بتانے کے لیے کہ میں عبادت گزار احمد مہ کے مقابلے میں کم عبادت گزار احمد کبہ کو کیوں زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔"

مرید نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "اس طرح اس ناچیز کی سمجھ میں یہ بات اب بھی نہیں آئی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے ایک ہی حکم دونوں کو دیا۔ ان میں جو زیادہ عبادت گزار تھا، وہ اپنی عبادت پر نازاں رہا اور میرے حکم کی بجا آوری کے بجائے یہ عذر پیش کر دیا کہ اونٹ کو چھت پر لے جانا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے برعکس احمد کبہ، جو تم سب کی نظروں میں احمد مہ کے مقابلے میں کم عبادت گزار ہے، میرا زیادہ فرماں بردار ہے۔ چنانچہ جب میں نے اسے یہ حکم دیا کہ اونٹ کو چھت پر باندھ دے تو اس غریب نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ تعمیل حکم کی کوشش میں مشغول ہو گیا۔ مجھے ایسا ہی انسان زیادہ پسند ہے جو حکم کی بجا آوری میں احمد کبہ جیسا ہو۔"

معترض مرید اور اس جیسے دوسرے مریدوں کو اپنے اپنے شک و شبہات کا جواب مل چکا تھا۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

☆☆☆

ایک شخص آپ کے پاس آیا اور درخواست کی کہ میرے ساتھ کھانا تناول فرمانے کی سعادت عطا فرمائیں۔

آپ نے پہلے تو تامل سے کام لیا لیکن جب اس کا اصرار بہت زیادہ بڑھ گیا تو آپ نے اس کی دعوت قبول کر لی اور ارشاد فرمایا۔ "مجھے کھانے کے وقت اپنے ساتھ لے جانا۔"

وہ شخص چلا گیا اور کھانے کا اہتمام کرنے لگا۔ جب کھانا پک چکا تو وہ آپ کو بلانے آگیا۔

آپ کھانا کھانے بیٹھے تو پہلے ہی لقمے پر کچھ کراہت سی محسوس ہوئی۔ آپ کو گوشت میں کچھ خرابی محسوس ہوئی۔ صاحب خانہ نے پوچھا۔ "حضرت! کوئی خاص بات؟"

آپ نے اس کی پردہ پوشی کی۔ "نہیں تو، کوئی خاص بات نہیں۔"

اس شخص نے نہایت عقیدت اور محبت سے عرض کیا۔ "حضرت! میں ایک سعادت اور حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

اس نے عرض کیا۔ "میں لقمے اپنے ہاتھ سے آپ کو کھلانا چاہتا ہوں۔"

آپ نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے، بولے۔ "تو اپنی یہ خواہش بھی پوری کر لے۔"

اس شخص نے اپنے ہاتھ سے آپ کو کھلانا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے وہ لقموں کو چباتے تھے انہیں گوشت کی خرابی اور سڑاند کا

احساس شدید ہوتا جارہا تھا۔ جب وہ آپ کے چہرے سے نظریں ہٹالیتا تو آپ کے چہرے پر کراہیت کی شکنیں نمودار ہوجاتیں اور جب وہ دیکھنے لگتا تو آپ ضبط واحتیاط سے کام لیتے کہ کہیں اس کی دل شکنی نہ ہوجائے لیکن آخرکار صاحب خانہ کو اس کا احساس ہوگیا کہ گوشت صحیح نہیں ہے اور اس میں سڑاند محسوس ہورہی ہے۔ اس نے شرمندگی سے منہ چھپالیا۔ آپ نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اسے اچھی طرح نادم ہونے کا موقع دیا۔

اسی سال آپ ایک بار پھر حج پر روانہ ہوگئے۔ آپ جس قافلے کے ساتھ سفر کررہے تھے، وہ قادسیہ پہنچ کر راستہ بھول گیا یہ اپنے قافلے کے ساتھ بھٹکنے لگے۔ پاس کھانے کو جو کچھ تھا، ختم ہونے لگا۔ آس پاس کوئی بستی بھی نہ تھی۔ یہ کئی دن تک بھٹکنے کے بعد اپنا کھانے پینے کا سامان تک ختم کربیٹھے اور نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ ان لوگوں نے کھانے کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کی لیکن بڑی مایوسی رہی اور بھوک حد سے تجاوز کرتی رہی۔

آخر وہ لوگ اضطراری حالت کو پہنچ گئے جہاں حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔

بھوک نے ان سب کو جاں بہ لب کررکھا تھا۔ قافلے کے لوگ ادھر ادھر پھیل گئے۔ وہ آبادی کی تلاش میں پریشان اور سرگرداں تھے۔

اس وقت آپ کو وہ شخص یاد آرہا تھا جس نے آپ کی دعوت کی تھی کہ گوشت کی سڑاند کا علم ہوجانے کے بعد شرمندہ اور نادم ہوکر ایک طرف جا بیٹھا تھا اور آپ نے اس کی ندامت دور کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی تھی۔ آپ کو اچانک احساس ہوا کہ یہ جو کچھ بھی ہورہا ہے، اس عذاب میں ہورہا ہے۔ آپ کو اس شخص کی ندامت اور دل شکنی کا خیال ضرور کرنا چاہیے تھا۔ شاید یہ اسی بات کی سزا ہے۔

☆☆☆

آپ نے آخری عمر میں بادشاہ کے دربار میں جانا شروع کردیا تھا۔ لوگ اس تغیر پر حیران تھے لیکن آپ بڑی پابندی سے دربار جانے لگے تھے۔ آپ کے مرید اس پر معترض تو تھے لیکن زبان سے کچھ بھی نہ کہتے تھے۔ کسی نے احمد کبہ کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ آپ سے پوچھے کہ آپ نے بادشاہ کی درباروداری کیوں شروع کردی ہے؟

لیکن احمد کبہ نے صاف انکار کردیا کہ میں یہ سوال نہیں کروں گا۔ آپ دربار جارہے تھے اور آپ کے مرید گوگو بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان میں ہر شخص اس تبدیلی کو بڑی ناگواری سے محسوس کررہا تھا۔ جب آپ دربار چلے گئے تو آپ کی عدم موجودگی.... میں دو درویش نہایت دور دراز سے سفر کرکے آپ سے ملاقات کو حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''عبداللہ خفیفؒ کہاں ہیں؟''

کسی مرید نے جواب دیا۔ ''وہ بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔''

درویشوں نے حیرت سے کہا۔ ''عبداللہ خفیفؒ اور بادشاہ؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ شاہی دربار میں باقاعدگی سے حاضری دے رہے ہیں۔''

ایک درویش نے اپنے ساتھی درویش سے کہا۔ ''یہ کیسے بزرگ ہیں جو شاہی دربار میں جایا کرتے ہیں۔ حالانکہ درویشوں کو شاہوں اور ان کے درباروں سے کیا تعلق؟''

دوسرے درویش نے جواب دیا۔ ''خدا عالم الغیب ہے، وہی چھپی باتوں اور دلوں کے رازوں سے واقف ہوتا ہے۔''

دونوں درویش آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ عبداللہ خفیفؒ کا کہاں انتظار کیا جائے؟ ان کی خانقاہ میں یا کہیں اور پھر دونوں نے یہ طے کیا کہ شیراز کے بازاروں میں گھوم پھر لیا جائے۔ یہ طے کرکے دونوں بازار کی طرف نکل گئے۔ وہ کافی دیر تک گھومتے پھرتے رہے۔ اچانک ان کی نظر ایک درزی پر پڑی۔ ایک درویش کے خرقے کی جیب پھٹی ہوئی تھی اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے وقت غنیمت ہے، کیوں نہ میں اپنے خرقے کی جیب سلوالوں۔''

دوسرے درویش نے تائید کی، بولا۔ ''بے شک، وقت غنیمت ہے۔''

دونوں درزی کی دکان پر بیٹھ گئے اور ایک درویش نے اپنا خرقہ اتار کر درزی کے حوالے کیا اور کہا۔ ''او بھائی درزی! ذرا میری یہ پھٹی ہوئی جیب تو سی دے۔''

درزی نے خرقہ لیا اور جیب سینے لگا۔ اسی دوران اسے قینچی کی ضرورت پیش آگئی۔ اس نے اپنے سامان میں قینچی

تلاش کی لیکن وہ نہیں ملی۔ اس نے ان درویشوں کی طرف دیکھا۔ کوسوں کی مسافت طے کیے ہوئے یہ درویش پراگندہ و پریشان عجیب بے اعتبارے سے محسوس ہوئے۔ درزی نے ان سے پوچھا۔ "تم دونوں نے میری قینچی تو نہیں دیکھی؟"

دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ "بابا! ہم دونوں اس شہر میں نووارد ہیں اور بھلا ہمیں تیری قینچی کا کیا علم؟ یہ سوال تو ان سے کر جو تیری دکان پر اٹھتے بیٹھتے ہیں۔"

درزی کا شک اور بڑھا۔ "سیدھی طرح بتا دو کہ میری قینچی کہاں ہے ورنہ میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کروں گا۔"

ایک درویش نے کہا۔ "تو دوسرا نہیں تیسرا طریقہ اختیار کر، جب ہمارے پاس تیری قینچی موجود نہیں تو تیرا دوسرا یا تیسرا طریقہ اسے کہاں سے فراہم کر دے گا۔"

درزی نے کہا۔ "تم دونوں ہی میری دکان پر آئے تھے یا تمہارے ساتھ کوئی تیسرا بھی تھا؟"

ایک درویش نے جواب دیا۔ "ہم دو ساتھی ہیں، بہت دور سے ہی آئے ہیں اور تیری دکان میں ہم دونوں ہی آئے ہیں، تیسرے ساتھی سے تیری کیا مراد ہے؟"

درزی نے کہا۔ "تم دونوں کا کوئی تیسرا ساتھی ضرور ہوگا اور تم دونوں نے میری قینچی اس کے حوالے کر کے اسے چلتا کر دیا ہوگا۔"

دونوں درویشوں کو غصہ آ گیا، ایک نے ذرا جوشیلے لہجے میں کہا۔ "تیرا دماغ تو صحیح ہے، تو ہم دونوں کو چور ٹھہراتا ہے۔ تجھے شرم آنی چاہیے۔ ہم درویشوں کو چوری چکاری سے کیا تعلق؟"

درزی نے کہا۔ "میں تمہاری کوئی بات نہ سنوں گا۔ بس سیدھی طرح میری قینچی فراہم کر دو، ورنہ میں پولیس بلا لوں گا۔"

ایک درویش نے عاجزی سے کہا۔ "بھائی! یہ تجھے ہو کیا گیا ہے جو ہم کو چور بناتا ہے، کچھ تو خدا کا خوف کر۔"

درزی نے جواب دیا۔ "میں خدا کا خوف کیوں کروں؟ تم چوری کر کے بھی خدا سے ڈر نہیں رہے اور مجھے خدا سے ڈراتے ہو، کمال کے ہو تم دونوں۔"

دوسرے درویش نے کہا۔ "بھائی! یہ تکرار بعد میں کر لینا، پہلے میرے خرقے کی جیب تو سی دو۔"

درزی نے خرقہ اٹھا کر دکان کے اندر پھینک دیا، کہا۔ "اب یہ اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک تم دونوں میری قینچی نہیں دو گے۔"

ایک درویش نے اپنا سر پکڑ لیا، پیشانی دباتا ہوا بالا۔ "بھائی! تو نے تو کمال ہی کر دیا۔ ہم دونوں پر چوری کا الزام لگاتا ہے اور خدا کے غضب سے ذرا بھی نہیں ڈرتا۔"

درزی نے جھنجلا کر کہا۔ "دیکھو مجھے بار بار خدا کے غضب سے مت ڈراؤ۔ میں بہت برداشت سے کام لے رہا ہوں ورنہ اب تک پولیس آ چکی ہوتی۔"

درویش نے کہا۔ "دیکھ تنگ نہ کر، ہم چور نہیں ہیں۔"

درزی نے کہا۔ "تم چور اگر نہیں تو پھر میری قینچی کہاں چلی گئی؟"

درویش نے گرم ہو کر کہا۔ "ہم کیا جانیں تیری قینچی کہاں چلی گئی؟"

درزی نے کہا۔ "واہ جناب! ایک تو میری قینچی غائب کر دی، دوسرے مجھی کو آنکھیں بھی دکھاتے ہیں۔"

ایک درویش نے نرمی سے کہا۔ "بابا! کیسی باتیں کرتے ہو۔ ہم تمہیں کس طرح یقین دلائیں کہ ہم نے تمہاری قینچی نہیں لی۔"

درزی نے جواب دیا۔ "تمہیں یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ میں یقین کرنے کو تیار ہی نہیں۔ مجھے یا تو میری قینچی واپس کر دو ورنہ میں سپاہیوں کو بلاتا ہوں۔"

درویش نے کہا۔ "تم ہمیں برابر سپاہیوں کی دھمکی دیے جا رہے ہو۔ اگر تم واقعی ہماری بے گناہی پر یقین نہیں رکھتے تو کوئی بات نہیں پھر وہی کرو جس پر تمہارا دل راغب ہے۔"

درزی نے اسی وقت سپاہیوں کو بلا لیا اور ان دونوں درویشوں کو قینچی چرانے کے جرم میں گرفتار کرا دیا۔ سپاہیوں نے انہیں حکمران کے دربار میں پیش کر دیا۔ وہاں عبداللہ خفیفؒ پہلے ہی سے موجود تھے۔ آپ نے دونوں درویشوں کو دیکھا اور مسکرا دیے اور ان سے سوال کیا۔ "درویشو! میں تمہیں بتاؤں کہ میں بادشاہ کے دربار میں کیوں آتا ہوں؟"

دونوں درویش بہت پریشان تھے، بولے۔ "اس وقت تو ہم دونوں مصیبت میں گرفتار ہیں، اس سے نجات ملے تو کچھ

عرض کریں۔"

عبداللہ خفیفؒ نے بادشاہ سے کہا۔"تیرا میری بابت کیا خیال ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔"میں آپ کو انتہائی بزرگ سمجھتا ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔"میں سچا ہوں یا جھوٹا؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔"آپ سچے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔"اگر تو مجھے سچا سمجھتا ہے تو میری بات کا یقین کر، یہ دونوں درویش دور دراز سے میری ملاقات کو آئے ہیں۔ یہاں بے وجہ چوری کے الزام میں گرفتار کر کے، تیرے دربار میں لا کھڑے کیے گئے۔ ان بے گناہوں کو چھوڑ دے۔"

بادشاہ نے ان دونوں کو اسی وقت رہا کر دیا۔ آپ ان دونوں کو لے کر دربار سے باہر نکلے اور سیدھے درزی کے پاس پہنچے۔

درزی سے پوچھا۔"کیا تو ان دونوں کو چور سمجھتا ہے؟"

درزی بہت ڈرا سہما تھا، اس نے جواب دیا۔"نہیں تو، میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔"تیری قینچی ملی یا نہیں؟"

درزی نے جواب دیا۔"مل گئی، وہ کپڑوں میں بندھ گئی تھی۔"

آپ نے کہا۔"تب پھر تو نے اپنے کپڑوں میں پہلے ہی اسے اچھی طرح کیوں نہیں تلاش کر لیا تھا؟"

آپ نے دونوں درویشوں سے کہا۔"میں شاہی دربار کیوں جاتا ہوں؟ یہ تو تم دونوں کو معلوم ہی ہو چکا ہوگا۔ آج اگر میں دربار میں موجود نہ ہوتا تو تم دونوں کا معلوم نہیں کیا حشر ہوتا۔" پھر درزی سے کہا۔"کیا ان کے خرقے کی جیب سل گئی؟ اگر سل گئی ہے تو وہ دے دے۔"

درزی نے خرقہ آپ کے حوالے کر دیا، کہا۔"اسے تو میں نے سب سے پہلے سی دیا تھا۔"

آپ نے اس کی سلائی دریافت کی، لیکن درزی نے سلائی نہیں لی۔ آپ دونوں درویشوں کو اپنی خانقاہ لے گئے۔ وہاں ان دونوں نے اپنی بدگمانی کی معافی مانگی۔

☆☆☆

ایک مسافر نے آپ کی خانقاہ میں قیام کیا۔ وہ بہت تھکا ہارا تھا۔ معلوم نہیں اس نے ناقص کھانے یا شیراز کے پانی کی ناموافقت سے اپنے پیٹ میں گڑبڑ محسوس کی۔ پھر اجابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ اس کی تیمارداری میں لگ گئے۔ اس کی حالت نازک ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ رات کے پچھلے پہر تک اسے پچاس بار رفع حاجت کے لیے جانا پڑا۔ رات کے آخری حصے میں آپ کی آنکھ لگ گئی، مہمان کو ایک بار پھر رفع حاجت کی ضرورت پیش آ گئی۔ اس نے آپ کو آواز دی لیکن نیند اتنی گہری تھی کہ آپ کی آنکھ نہیں کھلی۔ اس نے پھر آواز دی لیکن آپ سوتے رہے۔ مہمان پر کمزوری اتنی غالب تھی کہ اس کا دماغی توازن خراب ہو چکا تھا۔ اس نے آپ کو پوری قوت سے پکارا اور جب یہ محسوس کیا کہ آپ بیدار نہیں ہوئے تو اس نے گستاخانہ لہجے میں کہا۔"او شیخ! تجھ پر خدا کی لعنت، کہاں چلا گیا؟"

مریدوں نے آپ سے کہا۔"حضرت! آپ نے اس کے گستاخانہ کلمات سنے؟"

آپ نے جواب دیا۔"ہاں، میں نے اس کے کلمات رحمت سن لیے۔"

اس کے بعد آپ مہمان کو بیت الخلاء لے گئے۔ جب واپس آئے تو مریدوں نے کہا۔"گستاخانہ کلمات کو کلمات رحمت کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟"

آپ نے جواب دیا۔"خدا نے مجھے خراب بات سننے کے لیے کان نہیں دیے۔"

میں نے تو اسے یہ کہتے سنا کہ 'او شیخ! تجھ پر خدا کی رحمت، کہاں چلا گیا؟"

مریدوں نے عرض کیا۔"آپ اس گستاخ کی بے جا طرف داری فرما رہے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ اپنے منصب کا حق ادا کر رہا ہوں۔"

مریدوں نے خاموشی اختیار کی۔

☆☆☆

درس وتدریس میں معروف تھے۔ میری بدحواسی دیکھ کر میرے پاس آگئے۔

''کیا ہوا، کہاں سے آرہے ہو، کیوں دوڑ رہے تھے۔''

''پلیز، مجھے پناہ دیں۔ میں اس وقت پھنس گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''مذہب کیا ہے تمہارا۔ کس مسلک کے ہو؟'' کسی نے پوچھا۔

''بھائیو! میں مسلک وسلک تو نہیں جانتا۔ انسان ہوں تم جیسا۔''

''یہ کافر معلوم ہوتا ہے۔'' ایک نے آواز لگائی۔

''میرے بھائیو، میں نے کہا نا کہ میں صرف انسان ہوں۔''

''انسان ہو تو مسلک بتاؤ، کیا ہو تم؟''

''ارے بھائیو! یہ تم لوگ مجھے کس چکر میں الجھا رہے ہو؟'' میں گڑبڑا کر بولا۔ ''میں صرف ایک انسان ہوں اور پناہ چاہتا ہوں۔''

''یہ کافر ہے کافر۔ مارو اس کو۔'' ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

ان لوگوں نے بھی مارنا شروع کردیا۔ ایسا لگا جیسے میں صرف مار ہی کھانے کے لیے بھوت سے انسان بنا تھا۔

میں اس مسجد سے بھی باہر آگیا۔ باہر ایک اور تماشا ہو رہا تھا۔ ایک زبردست قسم کا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ بہت سے ڈنڈا بردار دکانوں کو توڑ رہے تھے اور گاڑیوں کو آگ لگا رہے تھے، ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنے دکھوں کو بھول کر ان لوگوں کو دیکھنے میں معروف ہوگیا۔ بہت ہی پرجوش لوگ تھے۔ غصے میں بھرے ہوئے۔ میرے قریب دو نوجوان کسی غریب کا ٹھیلا جلانے میں معروف تھے۔

میں نے ان سے پوچھ لیا۔ ''بھائیو! کیا مسئلہ ہے۔ کیا ہوا ہے یہاں؟''

''تم کو نہیں معلوم؟'' اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

''نہیں بھائی۔ مجھے نہیں معلوم۔''

''کس دنیا میں رہتے ہو۔ ڈنمارک میں ایک گستاخ نے ہمارے نبی ﷺ کا مذاق اڑانے کی جسارت کی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ایک بات بتاؤ، کیا یہ غریب ٹھیلے والا ڈنمارک کا باشندہ ہے؟''

''نہیں۔''

''جس نے جسارت کی ہے، کیا اس سے ٹھیلے والے کی کوئی رشتے داری ہے؟''

''کیا پاگل ہوگئے ہو! رشتے داری کیسی! اس جاہل ٹھیلے والے نے تو ڈنمارک کا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔''

''تو پھر اس غریب کا ٹھیلا کیوں جلا رہے ہو۔ اس بے چارے کا کیا قصور؟'' میں نے کہا۔

''بھائیو! یہ بندہ یہودیوں کا ایجنٹ معلوم ہوتا ہے۔'' کسی طرف سے آواز آئی۔

''ہاں، یہ یہودی ہے۔ ایجنٹ ہے۔ مارو اس کو۔''

ایک بار پھر وہی مار دھاڑ، اور میں وہاں سے بھی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس بار میں اتفاق سے ایک ایسے میدان کی طرف جا نکلا جہاں سناٹا تھا۔ اس میدان میں کئی درخت بھی تھے۔

میں ایک درخت کے پاس پہنچ گیا۔ اب مجھے تھوڑی فرصت مل گئی تھی۔ میں یہاں بیٹھ کر دوبارہ انسان سے بھوت بن سکتا تھا اور میں بھوت بن گیا۔

28 جنوری 2012ء

میں ایک بار پھر اس بھوتنی کے پاس بیٹھا ہوا تھا جس کے بیٹے سے میری بیٹی کا رشتہ ہونے والا تھا اور جس نے دس ویران شہروں کی شرط لگائی تھی۔

''ہاں بھائی صاحب، کیا سوچا ہے آپ نے جہیز کے بارے میں!'' اس نے پوچھا۔

''بھوتنی بہن، بس چند برس رک جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے دس ویران شہروں کی بات کی تھی نا۔ میں تمہیں چند برسوں کے بعد چالیس ویران شہر بیٹی کے جہیز میں دے سکتا ہوں۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔'' اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ''ایسا کون سا ملک ہوگا جس کے آباد شہر چند برسوں کے بعد ویران ہونے والے ہوں گے۔''

''ہے ایسا ایک ملک...... جسے ایک خاص نظریے کے تحت حاصل کیا گیا اور جس کی آزادی کی خاطر لاکھوں جانیں گئیں مگر...... اب اسی آزادی کو کروڑوں جانیں دے کر رفتہ رفتہ اختتام کی جانب دھکیلا جا رہا ہے۔ بس...... میری ہونے والی سمدھن کچھ برسوں کا انتظار اور...... یقین جانیے یہ چند برس بھی یوں چٹکی بجاتے گزر جائیں گے۔'' میں نے ہوا میں چٹکی بجاتے ہوئے ہاتھ لہرایا تو مجھے اپنے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ صاف محسوس ہو رہا تھا۔ ''مگر اس کا نام میں نہیں بتا سکتا یقین نہ ہو تو خود جا کر دیکھ لینا۔''

صحرا نورد درویش

ضیا تسنیم بلگرامی



جن کے پیروں میں گردش ہو وہ ایام گردش سے گھبرایا نہیں کرتے... کیونکہ مشہور ہے سفر وسیلہ ظفر... ویسے بھی انسان سفر سے علم سیکھتا ہے... اللہ کے اس ولی کی نمایاں خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ تھی کہ آپ کا زیادہ تر وقت سفر میں گزرا اور جو کچھ سیکھا اس سے عوام الناس کو بھی فیض پہنچاتے رہے اور سفر کا دائرہ مکمل کرتے رہے... ایسے لوگوں کی کیا شان ہوتی ہے جن پر اللہ کی خاص نظر کرم ہو۔

بستی بستی صحرا صحرا محوِ سفر ایک درویش کی روداد

ایران کے شہر رے میں زنبیلیں بنانے والے ابراہیمؒ نامی صوفی کو لوگوں نے اس وقت تعجب سے دیکھنا شروع کیا جب سے توکل اور استغنا کا چرچا بغداد اور اس سے بھی آگے پہنچ گیا۔ آپؒ نے زنبیل بنانا اور اسے بازار میں فروخت کر دینا، ...ماس پیشے کے طور پر اختیار کر رکھا تھا۔ اس لیے لوگ انہیں ابراہیمؒ خواص کہنے لگے تھے۔ ایک عرصے تک رے میں ...ے کے بعد آپؒ نے حج کا ارادہ کیا۔ اس وقت تک آپؒ کے آس پاس ارادت مندوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ ...ا آپؒ سے طرح طرح کے سوالات کرتے اور ان کے ایمان افروز جواب سے اپنی روح میں تازگی اور گرمی محسوس کیا ...نے تھے۔ آپؒ سفرِ حج کی تیاری مکمل کر چکے تھے۔ رے کے ارادت مندوں نے آپؒ کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا ...ب سے طرح طرح کے سوالات اور خواہشیں کر رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا۔ "حضرت! مکہ معظمہ میں، خدا کے گھر کے روبرو ...ن کے لیے دعا ضرور فرمائیے گا کیونکہ افلاس نے ایک عرصے سے میرا بہت برا حال کر رکھا ہے۔"

آپؒ جواب دیتے۔ ''اے شخص! کیا تیرا رب یہاں تیرے حال اور خواہش سے آگاہ نہیں ہے کہ میں مکہ معظمہ میں اس کے گھر کے سامنے تیرے لیے دعا کروں؟''

دوسرا کہتا۔ ''حضرت! میں صبر اور توکل سے واقف تو ہوں اور اس کے نتائج اور ثمرات کا بھی مجھے علم ہے لیکن جہاں تک طاقت صبر اور استطاعتِ توکل کا تعلق ہے، میں ان دونوں سے محروم ہوں۔ خدا سے دعا کیجیے گا کہ مجھے یہ دونوں خوبیاں بھی حاصل ہوجائیں۔''

آپؒ مسکرا کر جواب دیتے۔ ''تیری مجبوریاں اور پے در پے مایوسیاں خود بہ خود تجھ میں یہ اوصاف پیدا کردیں گی۔ اس کے لیے دعا مانگنے کا یہ مطلب ہے کہ تجھ پر ناکامیوں اور نامرادیوں کی بارش کردی جائے تاکہ تو ان کا خوگر ہوجائے۔''

انہی میں سے کسی ایک نے سوال کیا۔ ''حضرت! ایمان کی کیا حقیقت ہے؟''

آپؒ نے ذرا سکوت اختیار کیا پھر جواب دیا۔ ''تمہارے سوال کا اس وقت میرے پاس کوئی جواب نہیں کیونکہ اس وقت میں جو جواب دوں گا وہ قول کے ذریعے ہوگا جبکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری بات کا جواب عمل سے دیا جائے۔''

سوال کرنے والے نے پوچھا۔ ''یہ کس طرح ممکن ہوگا؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''تمہیں اپنے جواب کے لیے میرے ساتھ مکہ معظمہ کے سفر میں چلنا ہوگا۔ اللہ نے چاہا تو دوران سفر تمہیں اپنے سوال کا جواب خود بہ خود مل جائے گا۔''

وہ شخص آپؒ کے جواب سے متفق ہوگیا اور حج کے سفر میں آپؒ کا ساتھی بن گیا۔ دوران سفر اس شخص نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ راستے میں دور دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا، اس لیے کسی دکان کا خیال تک نہ کیا جاسکتا تھا لیکن ابراہیمؒ خواص ہر روز اپنے شریک سفر کو تازہ تازہ دو روٹیاں اور دو آبخورے پانی پیش کردیتے۔ جس میں سے ایک روٹی اور ایک آبخورہ پانی شریک سفر کھالیتا اور دوسری روٹی اور پانی سے آپؒ سیر ہوتے۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ ان روٹیوں اور پانی کے راز سے آگاہی حاصل کرے لیکن ناکام رہا۔ کافی مسافت طے کرچکنے کے بعد ان دونوں کی ایک تن رسیدہ بزرگ سے ملاقات ہوگئی۔ یہ بزرگ بھی گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے ابراہیمؒ خواص کو دیکھتے ہی گھوڑے کی پشت سے چھلانگ لگادی اور نیچے آگئے۔ نہایت ادب و احترام سے ابراہیمؒ خواص کے پاس پہنچے اور سرگوشی میں باتیں کرنے لگے۔ جواب میں ابراہیمؒ خواص بار بار نفی میں اپنی گردن ہلا رہے تھے۔ بزرگ نے عاجزی سے کہا۔ ''اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجبوری ہے، بہرحال جیسی تمہاری مرضی۔''

ان بڑے میاں نے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنے گھوڑے کی طرف جاتے ہوئے بولے۔ ''اچھا، میں تو جارہا ہوں پھر ملاقات ہوگی۔''

ابراہیمؒ خواص نے فی امان اللہ کہہ کر اپنا سفر جاری رکھا۔

شریک سفر نے حیرت سے پوچھا۔ ''حضرت! یہ کون تھا اور کیا کہہ رہا تھا؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''یہ شخص تیرے سوال کا جواب تھا۔''

اس نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟ میں آپؒ کا مطلب نہیں سمجھا۔''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے اور اس بات کے خواہش مند تھے کہ میری صحبت میں رہیں لیکن میں نے انکار کردیا۔''

اس شخص نے نہایت تعجب سے کہا۔ ''لیکن آپؒ نے ایسا کیوں کیا؟ کوئی خاص بات ورنہ لوگ تو حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت تک کو ترستے رہتے ہیں۔''

''تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو لیکن اگر میں انہیں اپنی صحبت میں رکھنے کی ہامی بھر لیتا تو اس سے میرا توکل مجروح ہوجاتا۔ میں نے خضر علیہ السلام سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں خدا کے سوا کسی پر بھی اعتماد نہیں کرتا۔ اگر تم میری صحبت میں رہنے لگو گے تو اس بات کا امکان پیدا ہوجاتا ہے کہ میں خضرؑ پر بھی تکیہ کرنے لگوں اور میں نے ایک عرصے سے خدا کے سوا تمام سہارے اپنے دل سے نکال دیے ہیں۔ تم نے مجھ سے ایمان کی تعریف پوچھی تھی، یہ اس کا عملی جواب ہے۔'' شریک سفر سناٹے میں آگیا۔

☆☆☆

آپؒ نے صحرانوردی اختیار کی تو کسی ایک جگہ جم کر رہنے کا اپنے دل سے خیال ہی نکال دیا لیکن ایک شہر میں آپؒ تھوڑا عرصے تک مقیم رہے اور یہاں آپؒ کی بزرگی اور عظمت کا وہ شہرہ ہوا کہ آپؒ کے گرد لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ آپؒ کو دنیا کی

کہ اس شہرت سے ان کے دل و دماغ پر اچھا اثر نہیں مرتب ہو رہا اور اس سے غرور پیدا ہو جانے کا ڈر پیدا ہو گیا ہے۔ آپؒ نے اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کا ایک عجیب و غریب علاج دریافت کیا۔ ایک دن صبح آپؒ ایک ایسے حمام میں پہنچ گئے جہاں امیرزادیاں غسل کے لیے آیا کرتی تھیں۔ اس دن ایک شہزادی غسل کے لیے آئی ہوئی تھی۔ آپؒ سیدھے حمامی کے پاس پہنچے۔ اس نے آپؒ کو دیکھتے ہی خوش اخلاقی سے سلام کیا اور ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ آپؒ نے پوچھا۔ "کیا حمام میں کوئی امیرزادی موجود ہے؟"

حمامی نے جواب دیا۔ "حضرت! آج تو میری خوش قسمتی سے شہزادی صاحبہ تشریف لائی ہوئی ہیں۔" پھر شہزادی کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ان کا لباس میرے پاس امانتاً رکھا ہے میں اس کی حفاظت کر رہا ہوں۔" آپؒ چپ چاپ حمامی کے پاس بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد شہزادی نے حمامی کو کسی ضرورت سے بلوایا۔ آپؒ نے اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھایا اور شہزادی کا لباس لے کر اپنی راہ لی پھر خلیے میں آپؒ نے اپنے کپڑے اتارے اور شہزادی کے کپڑے پہن لیے۔ ان پر اپنا لباس پہن لیا۔

حمامی جب دوبارہ اپنی جگہ پر واپس پہنچا تو شہزادی کا لباس غائب دیکھ کر بدحواس ہو گیا پھر اس نے ابراہیمؒ خواص کو تلاش کیا ان کا بھی کہیں پتا نہ تھا۔ رہ رہ کر انہی پر چوری کا گمان جاتا تھا لیکن ان کی بزرگی کے شہرے سے وہ ڈر جاتا تھا۔ اس نے حمام کے باہر موجود خدمت گاروں سے پوچھا۔ "یہاں کوئی آیا تھا؟"

انہوں نے ایک ہی جواب دیا۔ "ابراہیمؒ خواص کے سوا کوئی بھی نہیں آیا۔"

حمامی نے گھبرا کر سوال کیا۔ "جب ابراہیمؒ خواص واپس جا رہے تھے تو تم میں سے کس کس نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا؟"

دو خدمت گاروں نے جواب دیا۔ "ہم دونوں نے۔"

"وہ خالی ہاتھ تھے یا ان کے ہاتھوں میں کپڑے وغیرہ بھی تھے؟"

"ان کے ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی سی تھی لیکن جب وہ آئے تھے تو ان کے ہاتھ میں یہ پوٹلی نہیں تھی۔"

حمامی کے لیے اب شک و شبے کی کوئی بات بھی نہ رہی تھی۔ وہ افتاں و خیزاں اٹھا اور خدمت گاروں کو حکم دیا۔ "دیکھو تم سب ہوشیار اور چوکس یہیں موجود رہو، کچھ دیر بعد شہزادی غسل سے فارغ ہو جائے گی۔ تم شہزادی سے کہنا کہ انہیں کچھ دیر حمام ہی میں رکنا پڑے گا کیونکہ ان کا لباس چوری ہو چکا ہے اور اسے ابراہیمؒ خواص کے علاوہ کسی نے بھی نہیں چرایا۔ میں ان کی تلاش میں جا رہا ہوں۔" خدمت گاروں کو حمامی کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیرت اور شک و شبے سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

حمامی بدحواس اور پریشان ابراہیمؒ خواص کے ٹھکانے پر جا رہا تھا لیکن وہ راستے میں ہی مل گئے۔ حمامی نے ان کا گریبان پکڑ لیا اور نہایت گستاخانہ لہجے میں پوچھا۔ "کیوں رے چور! اس بزرگی کی آڑ میں چوری کا مذموم پیشہ اختیار کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں محسوس ہوئی؟"

آپؒ نے کہا۔ "میرا گریبان تو چھوڑ، آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے کچھ مجھے بھی تو پتا چلے؟"

اس جھگڑے کو دیکھنے کے لیے راہ گیر بھی اکٹھے ہونے لگے۔ ان میں اکثر وہ لوگ تھے جن پر ابراہیمؒ خواص کی بزرگی کا نقش بیٹھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نے حمامی سے کہا۔ "دشمنِ دین و ایماں! کیا تو اندھا ہو گیا ہے اور یہ بھی نہیں جانتا کہ اس وقت تیرا ہاتھ کس مقدس گریبان پر ہے؟"

حمامی نے گریبان کو ایک سخت جھٹکا دیا اور آپؒ کے حامی کو جواب دیا۔ "میرا ہاتھ میرے چور کے گریبان پر ہے۔ اس نے میرے حمام سے شہزادی کا لباس چوری کیا ہے۔ کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ میں شہزادی کا موردِ الزام ٹھہروں اور اس کا لباس چرانے کے جرم میں بندی خانے کی قید بھگتوں؟"

ایک ارادت مند نے کہا۔ "لیکن تجھے یہ بات کس طرح معلوم ہوئی کہ شہزادی کا لباس انہی بزرگ نے چرایا ہے؟"

حمامی نے جواب دیا۔ "لوگو! میں نے خدا کو اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا اس کے باوجود کوئی شخص بھی خدا کے وجود کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب میں شہزادی کے لباس کی نگرانی کر رہا تھا تو اس وقت سے لے کر لباس غائب ہو جانے تک وہاں اس کے علاوہ کوئی اور پہنچا ہی نہیں تھا اور یہ لباس بھی اسی وقت غائب ہوا ہے جب میں شہزادی کی طلبی پر اس کے پاس سے اٹھ کر شہزادی کے پاس چلا گیا تھا۔ اب تم خود ہی بتاؤ کہ شہزادی کا لباس اس کے علاوہ کون چرا سکتا ہے؟"

گریبان کو بار بار کھینچنے کی وجہ سے اندر سے شہزادی کا لباس صاف نظر آنے لگا۔ حمامی نے اسے دیکھتے ہی آپ کا گریبان چاک کر دیا، بولا۔ ''تو نے اندر کیا پہن رکھا ہے؟''

گریبان کے چاک ہوتے ہی شہزادی کا لباس صاف صاف نظر آنے لگا۔ حمامی نے تماشائیوں سے کہا۔ ''دیکھا، میں جو کہتا تھا کہ شہزادی کا لباس اسی نے چرایا ہے۔ آپ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے کہ شہزادی کا لباس اس نے خود اپنے اندر پہن رکھا ہے۔''

لوگوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا لیکن وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے وہ حقیقت تھی۔ حمامی نے اور زیادہ داویلا کیا۔ ''لوگو! جب ان جیسے بزرگ ایسی مذموم حرکتیں کریں گے تو پھر اعتبار کس پر کیا جائے گا۔''

لوگوں نے آپؒ پر لعن طعن شروع کر دی۔ ایک شخص بولا۔ ''ابراہیمؒ! پھر تم نے یہ تصوف کا لباس کیوں پہن رکھا ہے؟''

دوسرے نے کہا۔ ''رنگا سیار ہے رنگا سیار۔ اس کو یہیں برہنہ کر کے شہزادی کا لباس اتروا لو۔''

لوگوں نے آپؒ کو گھیرے میں لے کر پٹائی شروع کر دی اور شہزادی کا لباس اسی وقت اتار لیا۔ حمامی کی جان میں جان آئی۔ اس نے تماشائیوں سے کہا۔ ''اب آپ لوگ اس کے ساتھ جو سلوک مناسب سمجھیں کریں۔ میں تو اسے نہایت نیک اور متقی سمجھتا تھا لیکن یہ تو چور نکلا۔''

لوگوں نے بیک آواز جواب دیا۔ ''یہ چور ہے، اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو چوروں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔''

تماشائیوں نے ایک دم شور مچا دیا۔ ''چور ہے چور، حمام کا چور۔''

حمامی نے کپڑے پاتے ہی اپنی راہ لی۔ لوگوں نے آپؒ کو مار پیٹ کر چھوڑ دیا۔ آپؒ زخمی حالت میں ایک گوشے میں تشریف لے گئے اور اپنے نفس سے کہا۔ ''بول، اب تو کیا کہتا ہے۔ تو تو اس شہر میں مستقلاً ہی تنگ گیا تھا۔ اب اس ذلت و رسوائی کے بعد بھی کیا تو اس شہر میں رہنے کی ہمت کر سکتا ہے؟''

اس کے بعد آپؒ کو لوگوں نے حمام کا چور کہنا شروع کر دیا۔ آپؒ نے اس شہر کو چھوڑ دیا اور ایک قریبی قصبے میں چلے گئے لیکن آپؒ کی شہرت وہاں آپؒ سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ آپؒ نے جس جگہ قیام کرنا چاہا وہاں چند بزرگ بیٹھے آپؒ ہی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک بزرگ کہہ رہے تھے۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ ابراہیمؒ خواص نے چوری کیوں کی؟ انہیں یہ بات ہرگز زیب نہ دیتی تھی۔''

دوسرے بزرگ نے جواب دیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ ابراہیمؒ نے ایسا کیوں کیا؟ وہ اس شہر میں ایک عرصے سے بزرگ اور محترم شخص کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ اس عزت اور احترام نے ان کے دل میں غرور اور تکبر پیدا کر دیا تھا۔ اس غرور کو توڑنے کے لیے چوری کی ذلت اور رسوائی کا سہارا لینا ازحد ضروری تھا۔''

پہلے بزرگ نے زیرلب تبسم سے کہا۔ ''حضرت! جب چوری شرعاً ناجائز ہے تو ابراہیمؒ کو اس ناجائز فعل سے بچنا چاہیے تھا۔ اللہ انہیں دینی معاملات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔''

دوسرے بزرگ نے جواب دیا۔ ''حضرت! ابراہیمؒ خواص کو خدا نے جو عقل دی ہے آپ تو اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ آپ جس فعل کو غیر شرعی اور ناجائز قرار دے رہے ہیں، جہاں تک میں سمجھتا ہوں ابراہیمؒ خواص اسے جائز اور شرعی ثابت کر سکتے ہیں۔''

''وہ کس طرح؟''

اسی وقت ابراہیمؒ خواص بھی اجازت لے کر ان کے پاس جا بیٹھے۔ پہلے بزرگ نے منہ بنایا اور دوسرے نے آپؒ کا ہاتھوں ہاتھ لیا اور کہا۔ ''حضرت! زہے نصیب، جو آپؒ ہم میں تشریف لائے۔''

آپؒ نے کہا۔ ''ابھی تم دونوں کس مسئلے پر بحث کر رہے تھے؟''

پہلے بزرگ نے طنزاً کہا۔ ''یہ حضرت آپؒ کی چوری کے فعل کو شرعی اور جائز قرار دے رہے ہیں لیکن میری سمجھ میں یہ بات ہرگز نہیں آتی کہ ایک حرام امر شرعی اور جائز کس طرح قرار پاسکتا ہے۔''

آپؒ نے ہنس کر کہا۔ ''حضرت! خدا آپ کا بھلا کرے، جس طرح زندگی کو بچانے کے لیے حرام شے کو بھی حلال قرار دے دیا گیا ہے اسی طرح ایمان کو بچانے اور تکبر اور سرکشی کو توڑنے کے لیے چوری جیسے غیر شرعی اور ناجائز کام کو بھی شرعی اور جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ میں نے چوری، چوری کی نیت سے نہیں کی تھی بلکہ اپنے سرکش نفس کی اصلاح کی خاطر کی تھی اور یہ

۔ میں اس میں کامیاب ہو چکا ہوں۔''

دونوں بزرگ آپؒ کے استدلال سے خاموش ہو گئے۔

☆☆☆

آپؒ ہمیشہ اپنے ساتھ سوئی، دھاگا، قینچی اور ڈوری رکھا کرتے تھے۔ لوگ کہتے کہ ایک طرف تو آپؒ لوگوں کو توکل کا ...ن دیا کرتے ہیں اور دوسری طرف سوئی، دھاگے، قینچی اور ڈوری ہر وقت اپنے پاس رکھتے ہیں، کیا ان کی موجودگی میں بھی آپ توکل کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

آپؒ نے جواب دیا۔ ''یہ حقیر سی چیزیں توکل کے منافی نہیں ہیں، تو تصوف کو پہلے اچھی طرح سمجھ لے اس کے بعد اعتراض کر۔''

آپؒ صحرا میں مارے مارے پھر رہے تھے کہ اس صحرا میں ایک جگہ آپؒ کو ایک عورت نظر آ گئی۔ اس پر وجدانی کیفیت طاری ...ی۔ وہ پریشان حال، سر برہنہ پھر رہی تھی۔ آپؒ اس کے پاس پہنچے اور کہا۔ ''اے عورت! کیا تو اپنی جنس سے واقف ہے؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''میں نے خود کو پہچان لیا ہے۔''

آپؒ نے کہا۔ ''اگر تو نے خود کو پہچان لیا ہے تب پھر یہ کیا کہ تو ننگے سر پھر رہی ہے، تو اپنا سر کیوں نہیں ڈھانپتی؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''ابراہیمؒ! تم اپنی آنکھیں کیوں نہیں بند کر لیتے؟''

آپؒ نے کہا۔ ''میں عاشق ہوں اور آنکھیں بند کر لینا عشاق کا شیوہ نہیں۔''

عورت نے جواب دیا۔ ''میں مست ہوں اور مستوں کو سر ڈھانپنے کا ہوش کب رہتا ہے۔''

آپؒ نے پوچھا۔ ''تو نے کس میکدے سے پی ہے، جس کا نشہ اتنا گہرا چڑھا ہے؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''ابراہیمؒ! میں حیران ہوں کہ یہ سوال تم کر رہے ہو حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ یہاں دوسرا کوئی ...ندہ ہی نہیں کیونکہ ہم دونوں ہی یہ جانتے ہیں کہ دونوں عالم میں خدا کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

آپؒ نے پوچھا۔ ''کیا تو میرے ساتھ رہنا پسند کرے گی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں مرد کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی بلکہ میں فرد کی خواہاں ہوں۔''

اس عورت کو آپؒ نے وہیں چھوڑا اور کسی اور طرف نکل گئے۔ دوران سفر آپؒ نے ایک جنگل میں پانی کی طلب میں ...ر اُدھر پھرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد ایک درخت کے نیچے انہیں پانی نظر آیا۔ یہ اس کے نیچے پہنچ گئے لیکن ان کے پہنچتے ہی ...ک شیر غراتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ انہوں نے سوچا اگر ان کی موت اس شیر کے ذریعے ہی لکھی گئی ہے تو انہیں کوئی نہیں بچا ...تا اور اگر زندگی باقی ہے تو شیر کی مجال نہیں کہ انہیں نقصان پہنچائے۔ یہ راضی بہ رضائے الٰہی درخت کے نیچے کھڑے ...ہے۔ شیر آپؒ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ لنگڑا رہا تھا۔ اس نے ایک نظر آپؒ پر ڈالی اور زمین پر بیٹھ گیا اور زخمی پیر آپؒ کی طرف ...ڑھا دیا۔ آپؒ نے دیکھا اس کا پیر زخم کی وجہ سے پھولا ہوا ہے۔ آپؒ اس سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوئے۔ زمین پر سے ایک ...ڑی اٹھائی اور اس سے شیر کے زخم کو آہستہ آہستہ کھرچنا شروع کر دیا۔ زخم سے خون اور پیپ خارج ہونے لگی۔ شیر نہایت تحمل ...و برداشت سے چپ چاپ بیٹھا زخم صاف کراتا رہا۔ زخم صاف کر چکنے کے بعد آپؒ نے اپنی گدڑی پھاڑی اور اس میں ...ٹی نکال کر اس کے زخم پر باندھ دی۔ شیر نے محبت بھری نظروں سے آپؒ کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آپؒ نے ...ے کہا۔ ''افسوس کہ میں یہاں جنگل میں اس سے زیادہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر شہر میں ہوتا تو زخم پر دوا بھی لگا دیتا۔''

شیر نے دم ہلائی اور ایک طرف چلا گیا۔ آپؒ نے پانی سے پیاس بجھائی اور درخت کی جڑ سے ٹیک لگا کر آرام لینے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد شیر واپس آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو بچے بھی آ رہے تھے۔ ان تینوں کو دیکھ کر آپؒ کھڑے ہو گئے۔ شیر ...ے دہاڑا اور دم ہلانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں بچے بھی دم ہلا رہے تھے پھر یہ تینوں آپؒ کا طواف کرنے لگے۔

آپؒ نے کہا۔ ''تم تینوں میرا شکریہ ادا کر رہے ہو حالانکہ تمہیں اپنے رب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ میں نے وہی کیا جس ...ا خدا نے مجھے حکم دیا تھا۔''

شیر نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر دہاڑنا شروع کیا گویا کہہ رہا ہو اس جنگل میں کس کی مجال ہے جو آپؒ کو گزند پہنچانے کی جرأت ...ے۔ اس واقعے کو ایک مدت گزر گئی اور آپؒ کی صحرا نوردی اور دشت گردی کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک بار ایک مرید بھی آپؒ ...م سفر رہا تھا۔ حسب سابق آپؒ ایک جنگل سے گزر رہے تھے۔ آپؒ نے مرید کے ساتھ ایک درخت کے نیچے قیام کیا۔ ...ت تھا آپؒ نے نماز کی نیت باندھی، ساتھ ہی مرید بھی نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی نماز جاری ہی تھی کہ کسی طرف سے

شیر کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ اس آواز نے مرید کو اتنا خوف زدہ کیا کہ وہ نیت توڑ کر درخت پر چڑھ گیا لیکن آپؒ پر شیر کی غراہٹ کا کوئی اثر نہ ہوا اور بہ دستور نماز پڑھتے رہے۔ اسی دوران شیر ایک طرف سے نمودار ہو کر اس درخت کے نیچے آ گیا۔ مرید اوپر خوف زدہ بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ شیر نے اس کے پیر و مرشد کو اب کھایا اور اب کھایا۔ شیر آپؒ کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور آپؒ کو نماز پڑھتے دیکھتا رہا پھر اٹھا اور آپؒ کے تین چکر لگاتا رہا۔ دائیں بائیں اور پیچھے، سامنے جانے سے گریز کرتا رہا۔ مرید حیرت اور خوف سے یہ سب دیکھتا رہا۔ آخر شیر نے ایک طرف کی راہ لی اور مرید اس یقین کے باوجود کہ شیر جا چکا ہے ڈر کی وجہ سے درخت سے نہیں اترا۔ آپؒ نے نماز پوری کی اور مرید کا خیال کیے بغیر اپنی راہ لی۔ مرید نے آپؒ کو جاتے دیکھا تو فوراً درخت سے نیچے آ گیا اور تیز تیز قدم بڑھاتا آپؒ کے پاس جا پہنچا۔ آپؒ نے پوچھا۔ ''تو کہاں رہ گیا تھا؟''

مرید نے کپکپاتی آواز میں جواب دیا۔ ''حضرت! کیا آپؒ نے شیر کے غرانے کی آواز نہیں سنی تھی اور کیا آپؒ نے اسے اپنے آس پاس چکر لگاتے نہیں دیکھا؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''میں نماز میں مشغول تھا۔ کیا تو نے اس کی آواز سنی تھی اور اسے چکر لگاتے دیکھا تھا؟''

مرید نے کہا۔ ''ہاں حضرت! لیکن میں حیران ہوں کہ اس نے آپؒ کو گزند کیوں نہیں پہنچایا؟''

اسی وقت آپؒ کے پیر میں کسی زہریلے مچھر نے کاٹ لیا۔ آپؒ نے اس کی اتنی زیادہ تکلیف محسوس کی کہ درد سے تلملانے لگے۔ مرید نے دریافت کیا۔ ''کیا ہوا حضرت؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''غالباً مچھر نے کاٹ لیا ہے، کسی زہریلے مچھر نے۔''

مرید نے حیرت سے کہا۔ ''حضرت! حیرت ہے کہ آپؒ شیر جیسے درندے سے خوف زدہ ہوئے نہیں لیکن ذرا سے مچھر نے کاٹ لیا تو آپؒ اتنے بے چین ہو گئے۔''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''جس وقت شیر آیا تھا میں اللہ کے حضور میں کھڑا تھا اور ایک خاص کیفیت نے مجھے سرشار اور بے خود کر رکھا تھا لیکن اس وقت جبکہ مچھر نے کاٹا ہے میں اپنے آپ میں تھا اس لیے اس کی تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔''

اسی طرح ایک اور مرید آپؒ کا ہمسفر تھا اور ان دونوں کا ایک ایسی جگہ سے گزر ہوا جہاں سانپوں کی کثرت تھی۔ وہاں کے لوگوں نے بھی ان دونوں کو خبردار کیا کہ اس نواح میں ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ سانپوں کے کاٹنے کی اکثر وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ آپؒ نے مرید کو ساتھ لیا اور پہاڑ کی کھوہ میں چلے گئے۔ اس پہاڑی کھوہ میں سانپوں کی بہت زیادہ کثرت تھی۔ مرید نے سانپوں کو بلوں میں سے نکلتے اور ادھر ادھر رینگتے دیکھا۔ اس نے آپؒ کو خوف سے آواز دی۔ ''حضرت! یہ آپؒ کہاں لے آئے ہیں مجھے۔ یہاں تو سانپ اس طرح رینگتے پھر رہے ہیں جس طرح کیچوے رینگتے ہوں۔ یہاں سے بچ کر نکلنا تو بہت ہی مشکل بات ہے۔''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''گھبرا مت، اللہ کو یاد کر تجھے سانپ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔''

آپؒ کی ہدایت پر مرید نے عبادت شروع کر دی۔ آپؒ خود بھی ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ سانپ ان دونوں سے دور دور گھومتے رینگتے رہے اور اپنے اپنے بلوں میں آتے جاتے رہے۔

صبح ہوتے ہوتے مرید کی آنکھ لگ گئی لیکن آپؒ ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے۔ صبح جب مرید کی آنکھ کھلی تو مرید گھبرا کر آپؒ کی طرف رجوع ہوا۔ اس نے دیکھا، آپؒ آنکھیں بند کیے اللہ اللہ کا ورد فرما رہے ہیں اور آپؒ کے قریب ہی ایک موٹا اور لمبا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ مرید نے گھبرا کر عرض کیا۔ ''حضرت! آپؒ کو کچھ خبر بھی ہے کہ آپؒ کے قریب کتنا موٹا اور لمبا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ اگر آپؒ فرمائیں تو میں اسے ہلاک کر دوں؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تجھے نہیں معلوم کہ یہ رات جو گزر چکی ہے نہایت افضل اور برکتوں والی رات تھی اور میں تجھ پر حیران ہوں کہ تو اس افضل رات میں بھی خدا کی یاد سے غافل ہو کر سو رہا۔''

مرید نے دیکھا، آپؒ کے کپڑے پر ایک بچھو رینگ رہا ہے۔ اس نے گھبرا کے عرض کیا۔ ''حضرت! آپؒ کے لباس پر بچھو رینگ رہا ہے۔''

اس کے بعد مرید بچھو کو مارنے کے لیے اٹھا لیکن آپؒ نے منع کر دیا، فرمایا۔ ''نہیں، اسے مار نامت کیونکہ میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے کسی چیز کا ضرورت مند نہیں بنایا بلکہ دوسروں کو میرا محتاج کر دیا ہے۔''

بچھو کچھ دیر تک تو رینگتا رہا، اس کے بعد اتر کے ایک سوراخ میں چلا گیا۔

☆☆☆

آپ تنہا سفر کر رہے تھے۔ کئی دن کئی رات سفر کر چکنے کے بعد آپ کو آبادی کی جستجو ہوئی۔ طبیعت میں پریشانی تھی اور انسانوں میں پہنچنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے پھر اچانک ایک طرف سے مرغ کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ آپ نے اس خیال سے کہ ادھر آبادی ضروری ہوگی۔ مرغ کی آواز کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ابھی آپ نے زیادہ راستہ طے نہیں کیا تھا کہ ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور آپ کی گردن پر ایک زوردار مکا رسید کر کے فرار ہوگیا۔ آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور عرض کیا۔

''اے اللہ! کیا اپنے متوکلین کی تو یوں ہی عزت کرواتا ہے؟''

اسی وقت کسی نے جواب دیا۔ ''ابراہیم! جب تک تو نے اپنے رب پر توکل کیا، مخلوق نے تیری عزت کی لیکن جب تو نے مرغ کی آواز کے سہارے انسانوں کی ہمسائیگی پر توکل کا ارادہ کیا تو تجھے لوگوں کی نظروں سے گرا دیا گیا۔ حالانکہ تو اس سے بھی بڑی سزا کا مستحق تھا۔''

آپ مکے کی ضرب سے نڈھال آگے بڑھے اور عرض کیا۔ ''الٰہ العالمین! اب میں دوبارہ ایسی غلطی نہیں کروں گا، اس بار تو مجھے معاف کر دے۔''

مکے کی تکلیف گردن کو ٹیڑھا کیے ہوئے تھی لیکن آپ نے اس تکلیف کی پروا کیے بغیر ادھر کا رخ کیا جدھر آبادی کے آثار نہیں پائے جاتے تھے۔ ابھی آپ نے تقریباً ایک فرلانگ کا راستہ طے کیا تھا کہ پھر ایک آواز سنائی دی۔ ''اے ابراہیم خواص! کیا تم اس شخص کو پہچان سکتے ہو جس نے ابھی تھوڑی دیر قبل تمہاری گردن پر ایک مکا رسید کیا تھا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''خدایا! میں تیری مشیت اور مدد کے بغیر ایک ذرے تک کو پہچاننے یا سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔''

آواز آئی۔ ''اپنے سامنے دیکھ، یہ کس کی لاش ہے؟''

آپ نے اپنے سامنے دیکھا، ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ اسے کسی درندے نے ہلاک کر دیا تھا۔

اسی آواز نے مطلع کیا۔ ''یہ اسی شخص کی لاش ہے جس نے تیری گردن پر مکا رسید کیا تھا۔''

ابھی آپ کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ ایک شخص نے آپ کا نام لے کر آپ کو سلام کیا۔ آپ نے پوچھا۔ ''تو کون ہے، میں تجھے پہچانا نہیں حالانکہ تو نے میرے نام سے مخاطب کیا ہے۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''اے خواص! میں ایک آتش پرست ہوں اور آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''مجھ سے کیا چاہتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''آپ کا ساتھ، آپ کی قربت، آپ کی معیت۔''

آپ نے کہا۔ ''لیکن میں زیادہ تر حالت سفر میں رہتا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''میری خواہش ہے کہ میں بھی آپ کا شریک سفر ہو جاؤں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''لیکن جہاں میں جانا چاہتا ہوں وہاں تیرا گزر ممکن نہیں۔''

آتش پرست نے کہا۔ ''خواص! میں ہر شے سے بے نیاز ہو کر آپ کے ساتھ چلوں گا تاکہ آپ کی محبت سے میں بھی فیض حاصل کرسکوں۔''

آپ نے کہا۔ ''میرے ساتھ رہنے میں تجھے فاقوں کی اذیت جھیلنا پڑے گی۔''

اس نے جواب دیا۔ ''میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔''

آپ نے کہا۔ ''تب پھر چل میرے ساتھ، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

آتش پرست آپ کے ساتھ ہوگیا۔ یہ دونوں ایک ساتھ ایک ہفتے تک حالت سفر میں رہے۔ آتش پرست کا فاقوں سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے آٹھویں دن نڈھال ہو کر عرض کیا۔ ''حضرت! اب بھوک ناقابل برداشت ہو چکی ہے اور کمزوری میرے پیر پکڑ رہی ہے۔ آپ خدا سے کھانا طلب فرمائیے ورنہ میرا اب آپ کے ساتھ چلنا ناممکن ہے۔''

آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر عرض کیا۔ ''خدایا! تو نے مجھے بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ یہ آتش پرست کھانا مانگ کر میرا امتحان لے رہا ہے۔ اب تو ہی مجھے ندامت سے بچا سکتا ہے۔ تجھے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ، میری لاج رکھ لے۔''

آپ نے ابھی دعا ختم ہی کی تھی کہ ایک شخص دور سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ دونوں اسے دیکھتے رہے یہاں تک کہ جب وہ

کسی قدر قریب آ گیا تو پتا چلا کہ اس کے سر پر خوان رکھا ہوا ہے۔ اس نے آپؒ کے قریب آ کر دریافت کیا۔ ''آپ دونوں میں ابراہیمؒ خواص کس کا نام ہے؟''

آتش پرست نے آپؒ کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپؒ کا نام ہے۔''

خوان بردار نے عرض کیا۔ ''یہاں سے ذرا فاصلے پر ایک بستی ہے۔ اس کے حاکم نے یہ کھانا آپؒ کو بھیجا ہے کیونکہ کچھ دیر پہلے خدا نے اسے حکم دیا تھا کہ ابراہیمؒ خواص اپنے آتش پرست ساتھی کے ہمراہ بھوکے پیاسے پھر رہے ہیں۔''

آپؒ کا دل بھر آیا، گداز آواز میں عرض کیا۔ ''میرے خدا نے میری دعا سے پہلے ہی میری ضرورت محسوس کر لی تھی۔ میں کس زبان سے اس کے لطف و کرم کا شکریہ ادا کروں؟''

اس کے بعد خوان پر سے کپڑا جو اٹھایا تو لذیذ کھانوں کی خوشبو نے آتش پرست کو بے چین کر دیا۔ خوان میں گرم گرم روٹیاں، تلی ہوئی مچھلی، تازہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی رکھا ہوا تھا۔ دونوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا اور خدا کا شکر ادا کر کے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ان دونوں کو ایک ہفتے تک پھر بھوکا رہنا پڑا اور آتش پرست ایک بار پھر پریشان ہو گیا۔ اب اسے کچھ کہنے میں تامل ہو رہا تھا۔ آٹھویں دن پھر اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ آخر اس نے پھر زبان کھولی، بولا۔ ''حضرت! ایک بار پھر اپنے خدا سے کھانے کی درخواست کیجیے، میں تو بھوک سے عاجز آ گیا ہوں۔''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''میں تیرے کہنے سے ایک بار اپنے خدا سے کھانا طلب کر چکا ہوں، اب تو بھی تو کچھ کر، میں تیرا کمال تو دیکھوں۔''

آتش پرست نے نہایت بے بسی سے آپؒ کی شکل دیکھی اور اپنے ہاتھ کا عصا زمین پر رکھ دیا، بولا۔ ''آپؒ کہتے ہیں تو میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ اپنا کمال دکھاؤں۔''

اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ کچھ دعا مانگی پھر با آواز بلند کہا۔ ''اب میں اپنی دعا کی تاثیر کا انتظار کروں گا۔''

ابراہیمؒ خواص حیرت سے اپنے آتش پرست ساتھی کی حرکات و سکنات دیکھ رہے تھے۔ آخر ان دونوں نے ایک بار پھر ایک شخص کو دور سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ جب یہ شخص ان دونوں کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر انہیں بہت تعجب ہوا کہ یہ بھی وہی شخص تھا، جو ایک بار پہلے بھی خوان لے کر حاضر ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا۔ ''آپ دونوں میں آتش پرست کون ہے؟''

آتش پرست نے جواب دیا۔ ''میں ہوں، شاید تم میرے ہی پاس آئے ہو؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں تمہارے ہی پاس آیا ہوں۔ تمہیں یہ خوان بھیجا گیا ہے۔''

آتش پرست نے خوشی خوشی خوان لے لیا اور اس پر سے کپڑا جو ہٹایا تو یہ دیکھ کر وہ دونوں حیرت زدہ رہ گئے کہ اس میں بھی وہی سب کچھ موجود تھا جو پہلے خوان میں ملا تھا۔ ابراہیمؒ خواص کو حیرت بھی تھی اور افسوس بھی کہ اب ان میں اور آتش پرست میں کوئی فرق نہ رہ گیا تھا۔

آتش پرست نے خوش ہو کر آپؒ سے کہا۔ ''آیئے ہم دونوں خوب شکم سیر ہو کر کھائیں۔''

آپؒ نے ندامت سے جواب دیا۔ ''تم تنہا کھا لو، مجھے بھوک نہیں ہے۔''

آتش پرست نے حیرت سے کہا۔ ''کئی دنوں سے ہم دونوں نے کچھ کھایا نہیں پھر آپؒ کو بھوک کیوں نہیں ہے؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''تم اصرار نہ کرو میں نہیں کھاؤں گا۔''

آتش پرست نے آپؒ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ''نہیں جناب انکار سے کام نہیں چلے گا۔ آپؒ کو میرے ساتھ کھانا ضرور پڑے گا۔ جب آپؒ کھانا کھا چکیں گے تو میں آپؒ کو دو خوش خبریاں سناؤں گا۔''

آپؒ نے کہا۔ ''اگر تم کھانا کھلانے پر مصر ہی ہو تو اپنی دونوں خوش خبریاں مجھے پہلے سنا دو، میں کھانا بعد میں کھاؤں گا۔''

آتش پرست نے جواب دیا۔ ''پہلی خوش خبری تو یہ ہے کہ آج سے میں مسلمان ہو رہا ہوں، مجھے کلمہ پڑھا کے مسلمان کر لیجیے اور ارکان دین کی تعلیم دیجیے۔''

آپؒ نے خوش ہو کر سوال کیا۔ ''اور دوسری خوش خبری؟''

اس نے جواب دیا۔ ''دوسری خوش خبری یہ ہے کہ اس وقت ہم دونوں جو کچھ کھائیں گے، یہ مجھے آپ ہی کے طفیل ملا ہے۔''

آپؒ نے کہا۔ ''ذرا صاف صاف بیان کرو۔''

اس نے جواب دیا۔ ''جب آپؒ نے مجھ سے یہ کہا کہ آج میں اپنا کمال دکھاؤں تو میں اپنی جگہ بہت شرمسار اور نادم تھا

کیونکہ میں اپنی حقیقت سے خوب اچھی طرح واقف تھا، آخر میں نے خدا سے یہ دعا مانگی کہ اے اللہ! ابراہیم خواص کے سامنے میں مجھے ندامت سے بچا لے۔ اس دعا کے فوراً بعد ہمیں یہ خوان مرحمت فرما دیا گیا۔ اب آپ ہی بتایئے کہ کیا میں اب بھی آتش پرست رہ سکتا ہوں؟"

آتش پرست اسی وقت مسلمان ہو گیا اور ان دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ مکہ معظمہ پہنچ کر اس نے ابراہیمؒ خواص کا ساتھ چھوڑ دیا اور خانہ کعبہ کا مجاور بن گیا۔

☆☆☆

ایک بار پھر آپؒ حج کی غرض سے حجاج کے قافلے میں شامل ہو گئے لیکن راستے میں قافلے سے علیحدگی اختیار کر لی کیونکہ انہیں کسی کا سہارا لے کر چلنا ناگوار گزرتا تھا۔ انہوں نے حجاج کا عام راستہ چھوڑ دیا اور ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ یہ اس راستے پر تین دن اور تین رات چلتے رہے اور انہیں کھانے کا خیال تک نہ آیا۔ یہاں تک کہ یہ ایک سرسبز وشاداب جنگل میں داخل ہو گئے۔ اس جنگل میں میوے دار درختوں کی کثرت تھی اور پھولدار درختوں اور پودوں سے پورا علاقہ اٹا پڑا تھا۔ ایک جگہ ایک خوب صورت تالاب بھی موجود تھا۔ آپؒ اس کے حسن اور دلکشی سے اسے جنت سمجھ بیٹھے۔ یہ حیران اور متجسس ابھی کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ایک طرف سے چند لوگوں کی ایک جماعت آتی دکھائی دی۔ ان کا چہرہ تو آدمیوں ہی جیسا تھا لیکن بقیہ حصہ انسانوں سے ذرا مختلف تھا۔ لمبے لمبے ہاتھ، شانے غائب لیکن ہاتھوں کے نیچے بغل سے ان کا دھڑ بتدریج چوڑا ہوتا چلا گیا تھا۔ دونوں ٹانگیں غیر معمولی لمبی تھیں۔ پوشاکیں پہنے، خوب صورت پٹکوں سے کمریں کسی ہوئیں۔ انہوں نے آتے ہی آپؒ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور انسان کی طرح عرض کیا۔ "ابراہیمؒ! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ۔"

ان میں سے ایک نے آپؒ کو مخاطب کیا۔ "ابراہیمؒ! ہمیں ایک مسئلہ درپیش ہے، ہمارا خیال ہے آپ ہمیں اس سے مطلع فرما کر ہماری ذہنی الجھنیں دور فرما دیں گے۔"

آپؒ نے کہا۔ "لیکن جب تم لوگ اپنا تعارف نہیں کرواتے، میں تم سے کس طرح باتیں کروں۔"

ایک نے اپنے ساتھیوں کی شکل دیکھی اور پھر جواب دیا۔ "حضرت! ہم لوگ جن ہیں۔ آپؒ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آپ جس مرتبے کے انسان ہیں، ہم میں ایک بھی آپؒ جیسا نہیں ہے۔"

آپؒ نے نرمی سے کہا۔ "پوچھو، تم لوگ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

ایک جن نے جواب دیا۔ "ہم نے خدائے بزرگ وبرتر کا کلام رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے۔ العقبہ میں ہمیں آپؐ کا شرف حضوری بھی حاصل رہا ہے۔ آپؐ کے کلام مبارک نے ہم سے ہماری دنیا کے سارے کام چھڑا لیے اور اس کے صلے میں خدا نے ہمیں یہ جنت نظیر جنگل عطا فرمایا ہے۔"

آپؒ نے بات کاٹ دی، پوچھا۔ "یہاں سے وہ جگہ کتنی دور ہے جہاں سے میں نے حجاج کا قافلہ چھوڑا تھا؟"

آپؒ کے سوال پر ایک جن مسکرایا اور جواب دیا۔ "اے ابراہیمؒ خواص! اللہ تعالیٰ کے جو بے شمار عجائب واسرار ہیں، ان میں سے ایک یہ جنگل بھی ہے اور یہاں جس جگہ تو موجود ہے تجھ سے پہلے ایک انسان اور آچکا ہے تو دوسرا انسان ہے۔"

آپؒ نے پوچھا۔ "مجھ سے پہلے یہاں کون آیا تھا؟"

جن نے جواب دیا۔ "وہ بھی تیرے جیسا ایک بزرگ تھا۔ اس نے یہیں وفات پائی اور اس کی قبر اس تالاب کے کنارے موجود ہے جسے تو خود بھی دیکھ سکتا ہے۔"

اس کے بعد جن نے قبر کی طرف اشارہ کیا جو تالاب کے کنارے بنی ہوئی تھی۔ اس قبر کے تین طرف ایک باغیچہ بنا ہوا تھا جس میں طرح طرح کے پھول کھلے تھے۔ ان پھولوں کو آپؒ نے اس سے پہلے کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔

جن نے کہا۔ "ابراہیمؒ خواص! اس وقت تیرے اور تیرے ساتھیوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ حائل ہے۔"

آپؒ نے قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا، پہلے بزرگ کا ذکر کرو۔"

ایک جن نے کہا۔ "ایک دن ہم سب اس تالاب کے کنارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہم میں محبت کا ذکر چھڑا ہوا تھا۔ ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ اچانک ایک شخص ہم میں آ گیا اور اس نے آتے ہی ہمیں سلام کیا۔ ہم نے سلام کا جواب دے کر دریافت کیا کہ جناب کہاں سے آ رہے ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں نیشاپور سے چلا آ رہا ہوں۔"

ہم نے پوچھا۔ ''وہاں سے کب چلے تھے؟''
اس نے جواب دیا۔ ''سات دن پہلے۔''
ہم نے پوچھا۔ ''گھر چھوڑنے کی وجہ؟''
اس نے جواب دیا۔ ''خدا کا یہ کلام۔ اللہ کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرماں بردار بن جاؤ قبل اس کے کہ تم پر عذاب آئے پھر تمہاری مدد نہ ہوگی۔''
پھر جن نے ذرا رک کر کہا۔ ''ہم نے اس مرد قلندر سے پوچھا۔ ''انابت کا عذاب کے کیا معنی ہیں؟''
اس نے جواب دیا۔ ''انابت کا مطلب ہے کہ اپنے آپ سے رجوع ہو کر اسی کا ہو رہے اور تسلیم کے معنی ہیں کہ اپنی جان اس کے سپرد کر دے اور یہ سمجھے کہ میری نسبت خدا اس کا زیادہ مستحق ہے بلکہ مستحق ہی نہیں مالک بھی۔ اس کے بعد جب اس نے عذاب کے معنی بتانا چاہے تو اس کی زبان سے لفظ عذاب نکلا ہی تھا کہ اس نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم لوگوں نے اسے یہاں تالاب کے کنارے دفن کر دیا۔'' اس کے بعد اس جن نے افسوس سے کہا۔ ''خدا اس سے راضی ہو، بڑا صاحب دل اور اہل جذب انسان تھا۔''
آپؒ اس شخص کی قبر پر گئے۔ قبر کے سرہانے نرگس کے پھولوں کا ایک بہت بڑا گلدستہ رکھا ہوا تھا جس پر عبارت لکھی تھی۔ ''یہ خدا کے دوست کی قبر ہے، اسے اس کی غیرت نے ہلاک کر دیا۔''
گلدستے کے پاس ہی ایک کاغذ رکھا تھا جس پر لکھا تھا۔ ''عذاب تو بہت بڑی شے ہے خشیتِ الٰہی رکھنے والوں کے لیے لفظ عذاب ہی اتنا مہیب اور مہلک ہے کہ اہل جذب اس کا متحمل نہیں ہو سکتا جس کی مثال یہ شخص ہے جو اس قبر میں سو رہا ہے۔''
جب آپؒ نے یہ عبارت جنوں کو پڑھ کر سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے اور بیک آواز کہا۔ ''ہماری الجھن دور ہو گئی۔ ہمیں اپنے متنازعہ مسئلے کا جواب مل گیا۔''
اس کے بعد آپؒ نے بڑی تکان محسوس کی اور نیند سے آپؒ کی آنکھیں بند ہونے لگیں یہاں تک کہ آپؒ سو گئے۔ آپ کتنی دیر سوئے کچھ پتا نہ چلا لیکن جب آنکھ کھلی تو آپؒ ایک نئی جگہ پر پڑے ہوئے تھے۔ آپؒ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ وہ ایک فرش پر بیٹھے تھے اور ان کے سامنے مسجد کی محراب تھی اور یہ جگہ ان کی دیکھی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ آخر آپؒ کھڑے ہو گئے، ہوش و حواس ٹھیک طور پر کام نہیں کر رہے تھے۔ آپؒ کے قدموں میں انہی پھولوں کی پنکھڑیاں بکھری پڑی تھیں جو آپؒ جنوں کی بستی میں دیکھ آئے تھے۔ آپؒ باہر نکلے تو یہ جگہ سمجھ میں آ گئی۔ یہ حضرت عائشہؓ کی مسجد تھی۔ آپؒ مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ آپؒ مسجد میں واپس گئے اور پھولوں کی بکھری پنکھڑیاں آپؒ نے سمیٹ لیں اور ان کی خوشبو سے سال بھر تک محظوظ ہوتے رہے۔

☆☆☆

ایک شخص آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ''میں آپؒ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی ہم نشینی کا شرف عطا فرمایئے۔''
آپؒ نے جواب دیا۔ ''کیا تو جانتا ہے کہ میں زیادہ تر حالت سفر میں رہتا ہوں، کیا تو سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کو تیار ہے؟''
اس نے کہا۔ ''حضرت! میں خود ایک درویش ہوں اور دنیا کو ترک کر چکا ہوں۔ میرے لیے سفر کی صعوبتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ میں آپؒ کی ہم نشینی میں بڑی سے بڑی صعوبت جھیلنے کو تیار ہوں۔''
آپؒ نے کہا۔ ''میری ہم نشینی کے لیے ایک شرط بھی ہے اگر تو میری شرط مان لے گا تو تجھے اپنے ساتھ رکھوں گا۔''
اس نے کہا۔ ''مجھے وہ شرط بھی بتا دیجیے حالانکہ میں شرط سنے بغیر ہی ماننے کو تیار ہوں۔''
آپؒ نے جواب دیا: ''میں اس شرط پر تجھے اپنے ساتھ رکھوں گا کہ ہم دونوں میں سے ایک حاکم بن جائے اور دوسرا محکوم تا کہ دوران سفر سارے امور بہتر طریقے سے انجام پا سکیں۔''
امیدوار نے کہا۔ ''آپؒ حاکم بن جائیں اور میں محکوم۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔''
آپؒ نے کہا۔ ''بہتر ہے، اب تو میرے ساتھ رہ سکتا ہے۔''
ان دونوں نے ایک ساتھ سفر شروع کر دیا۔ پہلی ہی منزل پر آپؒ نے درویش سے کہا۔ ''تو یہیں ٹھہر میں پانی لے کر آتا ہوں۔'' وہ ٹھہر گیا، آپؒ پانی لائے، آگ جلائی اور سارا کام خود ہی انجام دیتے رہے۔ آپؒ کے ہم نشین درویش نے شرما کر عرض کیا۔ ''حضرت! کوئی کام میرے سپرد بھی کیجیے۔''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''یہ بات تو ہم دونوں میں پہلے ہی طے پا چکی ہے کہ میں حاکم رہوں گا اور تو محکوم اور بحیثیتِ حاکم میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ اپنی زبان بند رکھے گا اور مجھے میرے کاموں سے نہیں روکے گا۔''

درویش خاموش ہوگیا۔ آپؒ ہر جگہ ہر کام خود ہی انجام دیتے رہے۔ ایک جگہ بارش شروع ہوگئی۔ آپؒ نے اپنی چادر ...انے کی طرح تانی اور اس کے نیچے درویش کو بٹھالیا اور خود بارش میں بھیگتے رہے۔ یہ کیفیت پوری رات رہی۔ درویش پہلو بدلتا رہا اور بہ مشکل اپنی زبان بند رکھ سکا۔ صبح اس نے آپؒ سے کہا۔ ''حضرت! اب تک آپ نے جو کچھ کیا وہ حاکم کا نہیں محکوم کا فرض تھا۔ میں شرم وندامت سے ہلاک ہوجاؤں گا۔ خدا کے لیے آپؒ محکومی سے پرہیز کریں اور حاکم کی شان اختیار کریں۔''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''تو غلط سمجھ رہا ہے، میں اگر تجھے یہ حکم دوں کہ تو میری خدمت کر تو یہ بڑی زیادتی ہوگی اور حکم ...سرتابی بھی۔ جب میں تیرا حاکم ہوں تو ایک حاکم کا یہ فرض ہے کہ اپنے محکوم کی خدمت کرے تو میرا نوکر نہیں محکوم ہے اور ...م اپنے محکوم کا خدمت گزار ہوتا ہے۔''

یہ درویش خاموش ہوگیا اور مکہ معظمہ تک آپؒ کے ساتھ رہا پھر الگ ہوگیا۔

واپسی میں آپؒ شامی علاقے سے گزر رہے تھے کہ آپؒ کا گزر ایک ایسے باغ کے پاس سے ہوا جہاں تُرش انار کے درختوں کی کثرت تھی اور پھلوں سے درخت پٹے ہوئے تھے۔ آپؒ کا جی چاہا کہ کاش ایک آدھ انار مل جاتا لیکن پھر توکل نے انہیں اپنی خواہش کی تکمیل سے باز رکھا۔ آپؒ ان درختوں کے پاس سے ہٹ گئے۔ آگے جا کر آپؒ کو ایک ایسا شخص دکھائی دیا جو دونوں ہاتھوں اور پیروں سے بیکار تھا۔ ہاتھ تھے لیکن بیکار تھے، پیر تھے لیکن مفلوج تھے۔ وہ کولہے کے بل گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔ آپؒ اس کے قریب گئے تو پتا چلا اس کے جسم میں کیڑے بھی پڑے ہوئے تھے۔ آپؒ کو اس پر بہت رحم آیا، بولے۔ ''اے شخص! اگر تو اجازت دے تو میں تیری صحت یابی کے لیے دعا کروں؟''

اس نے ترشی سے جواب دیا۔ ''نہیں، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

آپؒ نے پوچھا۔ ''تو مجھے دعا سے کیوں منع کر رہا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''عافیت مجھے پسند ہے اور یہ اذیت میرے مولا کو پسند ہے۔ اس لیے اب میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کی پسند کو اپنی پسند پر ترجیح دوں۔''

اس کے جسم پر مکھیوں نے یلغار کر رکھی تھی۔ آپؒ نے کہا۔ ''اچھا، اگر تو پسند نہیں کرتا کہ میں تیرے حق میں دعا کروں تو یہ اجازت دے کہ میں تیرے جسم کی مکھیاں اڑا دوں۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''اے خواص! پہلے اپنے دل سے ترش انار کی خواہش تو نکال دے اس کے بعد میری طرف توجہ دینا۔''

آپؒ نے حیرت سے پوچھا۔ ''تو نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ میرے دل میں انار کی خواہش ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''خداشناس پر خدا ہر شے واضح کر دیتا ہے۔''

آپؒ نے پوچھا۔ ''کیا یہ کیڑے تجھے تکلیف نہیں پہنچا رہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''یہ سب اللہ کے حکم سے اذیت پہنچانے پر مامور ہیں، اس لیے میں اذیت نہیں محسوس کرتا۔''

اسی دوران آپؒ کو کسی نے اطلاع دی کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک کلیسا ہے جس میں لوگوں کے بقول ایک راہب ستر سال سے روپوش ہے۔ آپؒ اس کلیسا میں تشریف لے گئے اور بہ آواز بلند راہب کو مخاطب کیا۔ ''اے شخص! جو لوگوں کے بقول ستر سال سے اس کلیسا میں روپوش ہے، ابراہیم خواص تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔''

آپؒ جواب کے انتظار میں ایک کھڑکی کے نیچے کھڑے ہوگئے۔ کچھ دیر بعد کھڑکی کھلی اور وحشت زدہ پریشان حال چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے پوچھا۔ ''اے خواص! تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''تو نے اس بلا کی رہبانیت کیوں اختیار کر رکھی ہے؟''

راہب نے کہا۔ ''میں راہب نہیں ہوں بلکہ وہ شخص ہوں جس کے نفس نے کتے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ میں اس کتے کی نگرانی میں لگا ہوا ہوں کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ اگر میں باہر نکلا تو میرے نفس کا کتا خدا کی مخلوق کو ستانے سے باز نہیں آئے گا۔ میں مخلوق کو اس کے شر سے بچائے ہوئے ہوں۔''

آپؒ نے اس راہب کے حق میں دعا کی۔ ''خدایا! اس راہب کو صحیح راہ پر ڈال دے کیونکہ یہ نہیں جانتا کہ نفس کے کتے کی جس طرح یہ کر رہا ہے اگر ہر شخص اسی طرح کرنے لگے تو دنیا کا کاروبار ہی رک جائے۔''

راہب نے کہا۔ ''خواص! تم میرے لیے ناحق دعا کررہے ہو۔ تم اس طرح کب تک خاک چھانتے رہو گے۔ آخر تم کیے بسر کررہے ہو پہلے تم خود کو تلاش کرلو۔ جب تم اپنے آپ کو پا جاؤ تو پھر اپنے نفس کی نگرانی شروع کردینا کیونکہ خواہشاتِ نفسانی ہمیں بدل بدل کر دن میں تین سو ساٹھ قسم کا لباس الوہیت پہن کر آتی ہیں اور بندے کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیل کر چلی جاتی ہیں۔''

آپؒ خاموش ہوگئے اور خود سے کہا۔ ''جب خدا نے خود ہی اس کے دل اور فکر پر قفل ڈال دیے ہیں تو میں کیا کرسکتا ہوں۔''

آپؒ کے ہمعصر ابوالحسن الخرانی کو صوفیوں سے بڑی چڑ تھی۔ ایک دن آپؒ کی مجلس میں یہ بھی موجود تھے۔ آپؒ اپنے ارادتمندوں سے فرما رہے تھے۔ ''انسان کے لیے تین مصیبتیں ہیں پہلی مصیبت زر و مال سے محبت، دوسری عورت سے محبت اور تیسری سرداری سے اور حکم چلانے کی محبت ہے۔ اگر کوئی شخص ان تینوں پر غالب آنا چاہے تو روپے کی محبت کو پرہیزگاری سے مغلوب کرلے۔ عورت کی محبت کو ترکِ شہوات سے اور سرداری کی محبت کو گمنامی کی زندگی اختیار کرکے، ختم کردے۔ لوگو! جو مرید کا اللہ مطلوب ہوتا ہے اور صدق یقین اس کے بھائی ہیں۔ خلوت اس کا گھر، تنہائی اس کی مونس، دن اس کا غم، رات اس کی خوشی، اس کا دل اس کا رہنما، قرآن اس کا مددگار، گریہ اس کا لباس، بھوک اس کی غذا، عبادت اس کی رونق، معرفت اس کی سپہ سالار، حیات اس کا سفر، زمانہ اس کی منزلیں، پرہیزگاری اس کا راستہ، صبر اس کا اوڑھنا، سکون اس کا بچھونا، صدق اس کی سواری اور موت کا خوف اس کا ڈر ہوتا ہے۔''

ابوالحسن پر اس وعظ کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ آپؒ کے پیچھے ہولیے۔ آپؒ نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ آخر ابوالحسن اپنے گھر گئے اور ساری کتابیں لوگوں میں تقسیم کردیں اور آپؒ کی صحبت اختیار کرلی۔ آپؒ نے ایک عرصے بعد ان پر توجہ دی اور اپنی ہم نشینی کا شرف بخشا۔

ایک دن آپؒ زور زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ''مجھے اس خدا کے دیدار کا اشتیاق ہے جو مجھے ہر لحہ دیکھتا رہتا ہے۔''

آپؒ سے لوگوں نے پوچھا۔ ''آپؒ کھاتے کہاں سے ہیں کیونکہ کھانا کہیں سے آتا تو نظر آتا نہیں۔''

آپؒ نے جوش میں جواب دیا۔ ''مجھے کھانا اسی جگہ سے ملتا ہے جہاں سے شکمِ مادر میں بچے کو ملتا ہے اور جہاں سے جنگلی جانور کھاتے ہیں۔''

آپؒ اپنے وطن رے کی مسجد میں تشریف فرما تھے کہ پیٹ کی مروڑ سی محسوس ہوئی۔ بعد میں پتا چلا کہ آپؒ کو مرض پیچش لاحق ہوگیا ہے۔ یہ مرض اتنا بڑھا کہ آپؒ دن میں ساٹھ ساٹھ بار رفع حاجت کے لیے تشریف لے جاتے اور ہر بار واپس آکے غسل کرتے اور دو دو رکعت نماز ادا کرتے۔

ایک دن لوگوں نے پوچھا۔ ''حضرت! آپؒ کو کس چیز کی خواہش محسوس ہوتی ہے؟''

آپؒ نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''بھنی ہوئی کلیجی کی خواہش محسوس ہورہی ہے۔''

اس کے بعد آپؒ غسل خانے میں تشریف لے گئے اور وہیں آپؒ کا انتقال ہوگیا۔

وفات کی خبر سن کر لوگ آپؒ کی میت پر جمع ہونے لگے۔ آپؒ کی میت میں ایک دوسرے بزرگ بھی شریک ہونے کے لیے تشریف لائے اور انہوں نے آتے ہی آپؒ کا تکیہ اٹھایا۔ وہاں سے روٹی کا ایک ٹکڑا برآمد ہوا۔ ان بزرگ نے کہا۔ ''لوگو! بہ خدا! اگر یہ ٹکڑا ان کے تکیے کے نیچے سے نہ نکلتا تو میں ان کے جنازے میں ہرگز شریک نہ ہوتا۔''

کسی نے پوچھا۔ ''حضرت! وہ کیوں؟''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''اس صورت میں، میں سمجھتا کہ خواص کا انتقال محض توکل پر ہی ہوا ہے اور توکل کا اگلا مقام رد توکل آپؒ کو حاصل نہیں ہوسکا جبکہ ہر صوفی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام مراتب حاصل کرے نہ یہ کہ صرف ایک ہی صفت پر جم جائے اور دوسری صفات سے محروم رہ جائے۔''

آپؒ کے علم کی بابت یہ قول بہت مشہور ہے کہ ''علم تو بس اسی کا ہے جو علم کی پیروی کرے اور اس کو کام میں لائے کیونکہ غیر کے سرمائے سے تجارت کرنے والا مفلس ہوتا ہے۔''

ماخذات
الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ روضۃ الریاحین، ابی محمد عبداللہ
۔ سفینۃ الاولیاء، شہزادہ دارشکوہ۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فریدالدین عطار

خواجہ ابو محمد چشتی کی عمر پینسٹھ سال کی ہو چکی تھی اور ان کی بہن عصمت خاتون چالیس سال پورے کر چکی تھیں لیکن شادی دونوں ہی نہیں کر سکے تھے۔ خواجہ ابو محمد ذکر الٰہی میں ایسے ڈوبے کہ انہیں کسی اور چیز کا خیال ہی نہ رہا اور عصمت خاتون نے اپنے درویش بھائی کی خدمت کو خود پر فرض کر لیا۔ وہ سوچتیں اگر میں شادی کر لوں گی تو بھائی کی خدمت کون کرے گا۔

خواجہ محمد اپنی نیک اور پرہیز گار بہن کو دیکھتے تو بڑا دکھ ہوتا۔ انہوں نے کئی بار بہن پر زور دیا کہ شادی کر لو مگر بہن نے ہر بار انکار کر دیا۔

آخر بھائی نے زیادہ زور دیا اور شادی پر اصرار کیا، بولے۔ ''عصمت! آخر تو شادی کیوں نہیں کرتی؟''

عصمت خاتون نے جواب دیا۔ ''بھائی! اگر میں شادی کر لوں گی تو آپ کی خدمت کون کرے گا؟''

بھائی نے کہا۔ ''تو میری خدمت نہ کر۔ اب میں تجھ سے خدمت نہیں لوں گا۔''

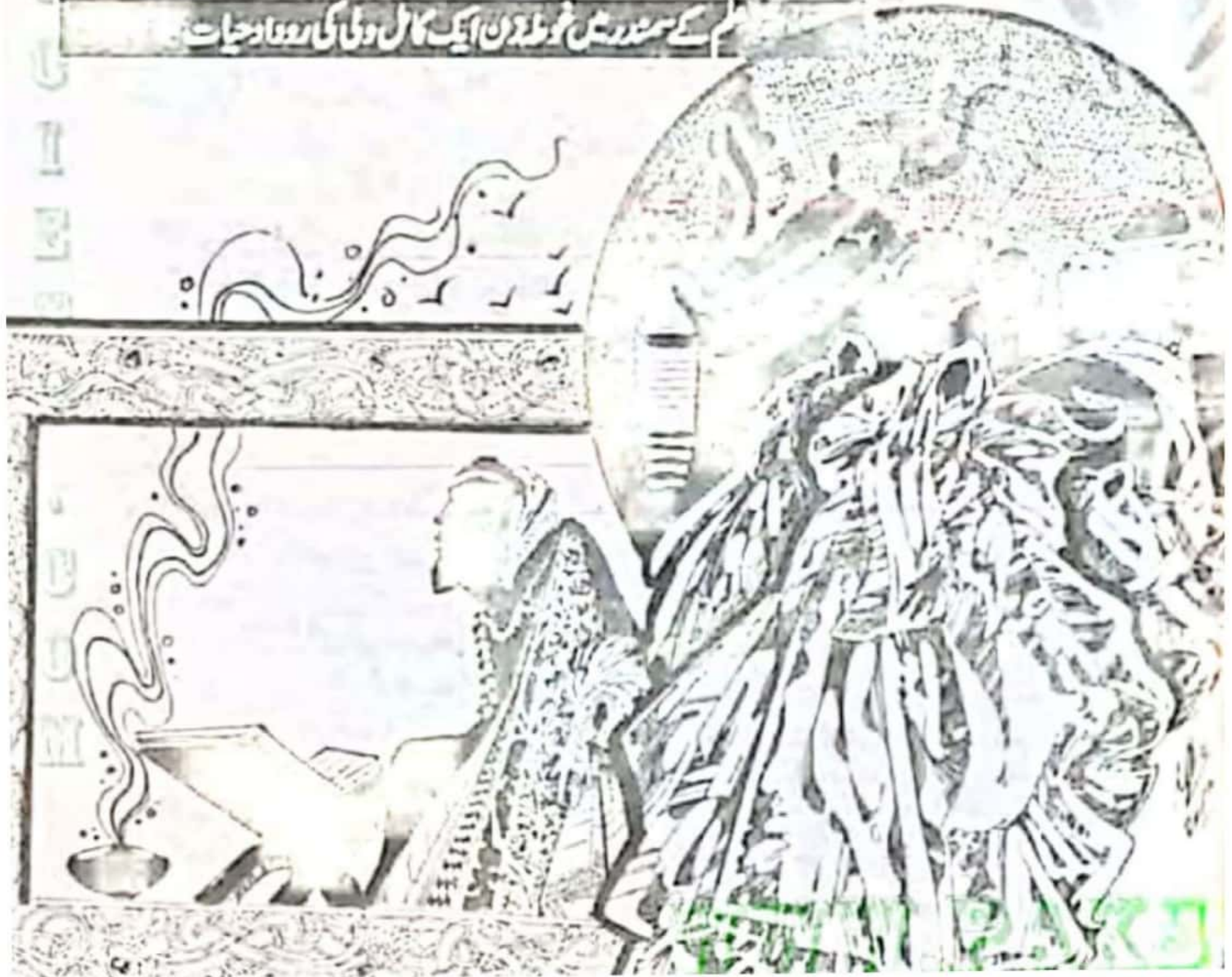
بہن نے نظریں جھکائے رکھیں، جواب دیا۔ ''بھائی! ہمارے خاندان کی نسل آپ سے چلے گی۔ میں اگر شادی کر بھی لوں گی تو اس سے کسی اور شخص کی نسل چلے گی، شادی تو آپ کو کرنا چاہیے تھی۔''

عارف کامل

ضیا تسنیم بلگرامی

تیرگی خواہ آس پاس ہو یا دلوں کے اندر... رستہ چلنے والے ٹھوکر ضرور کھاتے ہیں... ایسے میں اگر کوئی روشن ضمیر سہارا بن جائے تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ عارفانہ کلام کے شیدائی ابو یوسف بھی ایک ایسے ہی ولی کامل تھے جن کی ایک بھرپور نگاہ دلوں میں حشر بپا کر دینے کے لیے کافی تھی۔ آپ اپنے ماموں ابو محمد چشتی کے سجادہ نشین ٹھہرے اور بے شمار انسانوں کو فیض عام پہنچایا۔

...م کے سمندر میں غوطہ زن ایک کامل ولی کی روداد حیات



بھائی نے کہا۔ "میں بھی کرلوں گا شادی۔ بس ذرا حکم ربی کا منتظر ہوں۔"
بہن نے جواب دیا۔ "اس حکم ربی کی میں بھی منتظر ہوں۔"
ابو محمد چشتی سوال و جواب سے تنگ آ کر چپ ہو رہے اور یہ مسئلہ کئی دن کے لیے ٹل گیا۔
آخر ایک رات، ابو محمد چشتی نے اپنے باپ شیخ ابو احمد چشتی کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو سرزنش کی اور کہا۔ "ابو محمد! تو عصمت خاتون کی شادی کر دے۔"
خواجہ ابو محمد نے جواب دیا۔ "پدر بزرگوار! میں نے عصمت پر کئی بار یہ دباؤ ڈالا کہ وہ شادی کر لے لیکن وہ شادی پر آمادہ ہی نہیں ہوتی۔ اب میں اس کو کس طرح راضی کروں؟"
باپ نے کہا۔ "یہ کام تیرا ہے کہ تو اپنی بہن کو شادی پر آمادہ کرے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اب عصمت کی شادی ہو جانا چاہیے۔ میں اسے بھی ہدایت کر رہا ہوں۔"
خواجہ ابو محمد نے جواب دیا۔ "بابا جان! آپ ہی اس مشکل کو حل فرمائیں۔ میں تو بے بس ہو چکا ہوں۔"
باپ نے کہا۔ "اچھا تو اٹھ کر عصمت سے اس موضوع پر بات کر وہ راضی ہو جائے گی۔"
خواجہ ابو محمد نے پوچھا۔ "حضرت! اب اس چالیس سالہ خاتون سے شادی کون کرے گا؟"
باپ نے جواب دیا۔ "جا، مغرب کا سفر اختیار کر، دوران سفر سید محمد سمعان نامی سید زادہ تجھ کو ملے گا۔ بس یہی شخص تیری بہن کا شوہر ہوگا۔"
ابو محمد نے بیداری کے بعد فوراً اپنی بہن سے ملاقات کی اور کہا۔ "عصمت! میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اب تم شادی کرلو کیونکہ اس میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔"
بہن نے حیا و شرم سے جواب دیا۔ "ہاں، اب میں شادی کے لیے تیار ہوں کیونکہ میں مرحوم بابا جان کے حکم کے خلاف نہیں جا سکتی۔ انہوں نے آج خواب میں مجھے حکم دیا ہے کہ میں شادی کرلوں۔"
ابو محمد خوشی سے از خود رفتہ سے ہو گئے اور دوسرے دن علی الصباح مغرب کی طرف کوچ کیا۔ کئی دن کی تلاش اور جستجو کے بعد انہیں محمد سمعان نامی سید زادے مل گئے۔ وہ بھی ابو محمد کا انتظار کر رہے تھے۔ دونوں کا تعارف ہوا اور محمد سمعان، ابو محمد کے ساتھ ان کے گھر چلے آئے۔ یہاں عصمت خاتون سے ان کی شادی کر دی گئی۔ شادی کے بعد بہن نے کہا۔ "بھائی! اب میں آپ کو بھی مجبور کروں گی کہ سنت نبوی ﷺ پر عمل کرتے ہوئے شادی کرلیں۔"
ابو محمد نے مسکرا کر کہا۔ "بہن! ذرا بتانا تو سہی اس وقت میری کیا عمر ہوگی؟"
بہن نے جواب دیا۔ "یہی کوئی پینسٹھ سال۔"
ابو محمد نے فرمایا۔ "اب اس عمر میں، میں شادی کرلوں۔ لوگ کیا کہیں گے؟"
بہن نے جواب دیا۔ "لوگ کچھ بھی کہیں گے، آپ تو سنت نبوی ﷺ پوری کریں گے۔"
ابو محمد نے فرمایا۔ "عصمت خاتون! اگر مجھے دنیا کی شرم نہ ہوتی تو میں قطعی شادی کر لیتا۔"
بہن نے کہا۔ "بھائی! آپ کو دنیا کی شرم کا تو بڑا خیال ہے لیکن رسول کی شرم کا ذرا بھی خیال نہیں۔ میں تو آپ سے یہ پوچھتی ہوں کہ کل قیامت کے دن، جب رسول مقبول ﷺ آپ سے یہ پوچھیں گے کہ تو نے میری شادی والی سنت پر عمل کیوں نہیں کیا تو آپ کیا جواب دیں گے؟"
ابو محمد نے ذرا جز بز ہو کر پوچھا۔ "لیکن اس شادی سے مجھے کوئی فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے؟"
بہن نے فوراً جواب دیا۔ "ہاں کیوں نہیں، شادی کا یہ فائدہ کیا کم ہے کہ اس سے آپ کی نسل چلے گی۔ آپ اپنا سجادہ نشین یا نائب چھوڑ سکیں گے۔"
ابو محمد نے معنی خیز ہنسی میں جواب دیا۔ "بہن! تو سخت غلط فہمی میں ہے۔ شادی کے بعد نہ تو مجھ سے نسل چلے گی اور نہ ہی میرا سجادہ نشین یا نائب پیدا ہوگا۔ میرا خلیفہ تو تیرے بطن سے پیدا ہوگا عصمت خاتون۔"
بہن نے شرما کر دریافت کیا۔ "میرے بطن سے؟ یعنی میرا بیٹا آپ کا نائب اور سجادہ نشین ہوگا؟"
ابو محمد نے جواب دیا۔ "ہاں میں نے جو کچھ کہہ دیا...... کہہ دیا۔ تو ایک ایسے یگانہ روزگار بچے کی ماں بنے گی کہ چہار دانگ عالم میں اس کا ڈنکا بجے گا۔"
بہن کا خوشی سے حال ہی کچھ اور ہو گیا۔ انہوں نے ایک بار پھر دریافت کیا۔ "بھائی! کیا یہ سچ ہے؟"
"عصمت خاتون! میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

پھر ابو محمد نے بہن کے اصرار اور سنت نبوی ﷺ کے احترام میں شادی کر لی۔ لوگ ہنسے بھی لیکن انہیں تو رسول ﷺ کی سنت پر عمل کر کے دکھانا تھا۔

☆☆☆

سال بھر کے بعد عصمت خاتون کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ لڑکے کی پیدائش کی خبر ابو محمد کو ملی تو بھاگ کر اپنی بہن کے پاس پہنچے اور انہیں مبارک باد دی۔ بہن نے کمزور آواز میں مبارک باد کا شکریہ ادا کیا اور بھائی سے کہا۔ "بھائی! یہ آپ ہی کا بیٹا ہے میں نے تو عرصہ پہلے یہ منت مانی تھی اور یوں بھی آپ یہ بشارت دے چکے ہیں کہ میرا بیٹا آپ کا جانشین ہوگا۔ یہ کتنا خوش قسمت ہے کہ میرے ولی بھائی کی جانشینی کا شرف حاصل کرے گا۔"

ابو محمد نے نومولود کے کان میں اذان دی اور فرمایا۔ "میں نے تیرا نام ابو یوسف رکھا۔" پھر بہن سے فرمایا۔ "بہن اب یہ نومولود ابو یوسف ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ میرا جانشین ہوگا۔ اس کی پرورش اور تربیت بھی اسی نہج سے ہوگی۔" بہن کا خوشی سے حال ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔

ابو یوسف اپنے ماموں ابو محمد کی نگرانی میں پرورش پا رہے تھے۔ ابو محمد کے مواعظ ان کے کان میں پڑ رہے تھے اور یہ کان کی راہ سے دل و دماغ میں اترتے چلے جا رہے تھے۔ ابو محمد کی پوری کوشش یہی تھی کہ انہیں جو کچھ بھی معلوم ہے اس کو اپنے بھانجے میں منتقل کر دیں۔ ابو یوسف بھی حیرت انگیز طور پر اکتساب کر رہے تھے۔ انہیں غربا اور فقرا سے محبت تھی اور امرا سے تو دور دور ہی رہتے تھے۔ ولی ماموں اپنے ولی بھانجے کی ایک ایک بات پر نظر رکھتے تھے۔

ابو محمد شاندار وعظ کہہ رہے ہوتے اور ابو یوسف اس میں یوں گم ہو جاتے کہ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہ رہتا۔ کچھ عرصے بعد شیخ ابو یوسف نے اپنی ماں کے پاس سکونت اختیار کی۔ باپ کی بھی یہی خواہش تھی کہ بیٹا ان کے پاس ہی رہے۔ یہ اپنے والدین کے پاس رہنے لگے مگر بہن کو یہی فکر دامن گیر رہتی کہ ان کے بیٹے ابو یوسف کو اپنے ماموں ابو محمد کی مریدی کا شرف حاصل کرنا ہے۔ آخر ماں نے اپنے بیٹے کو ٹوک دیا، کہا۔ "ابو یوسف! میرا خیال ہے اب تجھ کو اپنے ماموں کے پاس چلے جانا چاہیے۔"

ابو یوسف نے جواب دیا۔ "میں تو اپنے ماموں کے پاس کافی رہ چکا ہوں، میرا خیال ہے کہ اب وہاں جانا فضول ہے کیونکہ مجھے جو اکتساب کرنا تھا، کر چکا۔"

ماں نے کہا۔ "بیٹے! توبہ کر توبہ، یہ کیسی بات کہہ دی تو نے۔ تو نے اپنے ماموں سے سب کچھ کس طرح اکتساب کر لیا۔ شاید تجھ کو اپنے ماموں کی بزرگی اور علمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔"

ابو یوسف نے سادہ لوحی سے عرض کیا۔ "ماں! گستاخی معاف، ماموں آپ کے بھائی ہیں۔ اس لیے آپ انہیں اس سے زیادہ سمجھتی تھیں جتنے وہ ہیں لیکن میں انہیں کچھ زیادہ بڑا عالم نہیں سمجھتا۔"

ماں کے لیے یہ باتیں ناقابل برداشت تھیں، بولیں۔ "مجھ کو تجھے اپنے پاس بلا کر نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ میں نے تجھے یہاں رکھ کر غلطی کی ہے۔ افسوس تو اپنے فاضل اور بزرگ ماموں کے پاس کافی وقت گزار چکا ہے مگر تو ان کے مرتبے اور مقام سے ابھی تک لاعلم ہے۔"

ابو یوسف ماں کی افسردگی سے آزردہ ہو گئے، بولے۔ "ماں! آپ آزردہ نہ ہوں۔ میں نے آپ سے جو کچھ بھی کہا اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں آپ کو دکھ پہنچاؤں۔ میں نے سچ سچ وہ ساری باتیں کہہ دیں جو میرے دل میں تھیں کیونکہ میں ریاکاری نہیں جانتا۔"

ماں نے جواب دیا۔ "اچھا، اب تو اپنے ماموں کے پاس جا اور ان سے بیعت کر۔ اب میں تیری زبان سے ایسی کوئی بات بھی نہیں سننا چاہتی جس سے سوءظنی کی بو آتی ہو۔"

فرمانبردار بیٹے نے بے چون و چرا ماں کے حکم کی تعمیل میں گھر چھوڑ دیا اور اپنے ماموں کے پاس چلے گئے لیکن ان کے دل میں اپنے ماموں کے علم و فضل کے بارے میں اب بھی شکوک موجود تھے اور انہیں خود بھی اس کا علم نہیں تھا کہ ایسا کیوں ہے؟

ابو یوسف اپنے ماموں کے پاس پہنچے تو ابو محمد نے انہیں بغور دیکھا اور پوچھا۔ "اے ابو یوسف! کیا بات ہے؟ تو فکر مند کیوں نظر آتا ہے بیٹا؟"

ابو یوسف نے رک رک کر جواب دیا۔ "ماموں! مجھے ماں نے آپ کے پاس بیعت کے لیے بھیجا ہے۔"

ابو محمد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تیری ماں نے تو تجھے بیعت کی خاطر میرے پاس بھیج دیا لیکن تیرا دل بدستور شک و شبہے میں گرفتار ہے بیٹے۔"

ابو یوسف نے گھبرا کر عرض کیا۔ "ماموں! خدا کے لیے میرے دل سے وسوسوں کو دور فرما دیجیے۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

ابو محمد نے نہایت شفقت سے اپنے قریب کر لیا اور سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔ "ابو یوسف میرے بچے تو کس وہم و گمان میں ہے۔ کیا تجھ کو معلوم نہیں آتا کہ تیرے دل میں وسوسے آتے ہی کیوں ہیں؟"

آقا کو ایک دم ابو یوسف کا خیال آ گیا۔ وہ بدحواس بھاگتا ہوا آپ کے پاس پہنچا اور اپنی بپتا سنائی۔ آپ نے فرمایا۔ "بھائی! اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

آقا نے عاجزی سے کہا۔ "حضرت! میں اس کو آپ سے منسوب کر دوں گا۔ خدا کے لیے اس کے حق میں دعا فرما دیجیے۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔"

آپ نے نرمی سے سمجھایا۔ "یہ تیری غلط فہمی ہے ورنہ تیری بیٹی کی بیماری کا مجھ سے کیا تعلق؟"

آقا نے کہا۔ "لیکن میں کس طرح مان لوں آپ کی بات۔ خدا کے لیے آپ دعا کر دیجیے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اے عاقبت نااندیش امیر! اگر تو سننا ہی چاہتا ہے تو سن لے۔ میں نے جب تیری بیٹی کو دیکھا تھا تو میں نے اس کے چہرے پر اس بیماری کو بھی دیکھ لیا تھا چنانچہ میں نے فوراً ہی اپنے رشتے کی بات اس لیے کی تھی کہ اگر وہ میرے لیے محرم ہو جاتی تو میں اس کو اپنے سامنے بٹھا کر اپنے رب سے درخواست کرتا کہ میری زندگی کا نصف اس کو مرحمت فرما دے اس طرح وہ مزید زندگی پا جاتی لیکن اب ایسا نہیں ہو سکتا، تو اس پر صبر کر لے۔"

آقا رونے لگا اور اپنی عاقبت نااندیشی پر افسوس کرنے لگا۔ جب وہ گھر پہنچا تو پتا چلا کہ اس کی بیٹی کا انتقال ہو چکا ہے۔ پورے محل میں ایک کہرام برپا تھا۔

☆☆☆

آپ اپنی عمر کے چھتیسویں سال میں داخل ہو گئے تو کسی نے بتایا کہ آپ کے پیر و مرشد ماموں ابو محمد کا آخری وقت ہے۔ آپ ان سے ملاقات کر لیں۔

ابو یوسف اس خبر کو سن کر اپنے ماموں کے پاس چلے گئے۔ ابو محمد نے اپنے بھانجے کو شفقت کی نظر سے دیکھا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ نحیف آواز میں پوچھا۔ "ابو یوسف کیسی گزر رہی ہے؟"

ابو یوسف نے جواب دیا۔ "اچھی گزر رہی ہے۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

ابو محمد نے فرمایا۔ "ابو یوسف! میں زندگی بھر تجھے نصیحتیں کرتا رہا ہوں۔ ممکن ہے بعض نصیحتیں تجھے گراں بھی گزری ہوں۔"

ابو یوسف نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔ "نہیں ماموں جان، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں نے تو آپ کی ہر بات اور ہر نصیحت کو حرزِ جان سمجھ کر قبول کیا ہے۔"

ابو محمد نے فرمایا۔ "خدا تجھے صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ کیا تو جانتا ہے کہ میں تجھ سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟"

ابو یوسف نے جواب دیا۔ "غیب کا علم تو صرف خدا کو ہے۔ آپ ارشاد فرمائیں گے تو میں بھی جان لوں گا کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے۔"

ابو محمد نے فرمایا۔ "اپنا کان میرے منہ کے پاس لا کیونکہ میری قوتِ گویائی دوری کی متحمل نہیں ہو سکے گی۔"

ابو یوسف نے اپنا ایک کان ان کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ ابو محمد نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "اے ناصر الدین! میں ایک بار پھر تجھے یہی نصیحت کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ تیرے لیے یہ ضروری ہے کہ تو فقر و فاقہ اختیار کر اور فقیروں کی صحبت میں رہ، کیونکہ تمام فقرا کے سردار حضرت سرورِ کائنات ﷺ ہیں۔ ہمارے جملہ پیر دستگیر فقرا ہی کے زمرے میں تھے اور ہم پر ان کی پیروی فرض ہے۔"

ابو یوسف نے جواب میں رقت زدہ لہجے میں عرض کیا۔ "ماموں جان! جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ آپ کی ہر بات اور ہر نصیحت میرے لیے حرزِ جان ہے۔ میں اس پر دل و جان سے عمل پیرا رہوں گا۔"

ابو محمد نے پُرسکون لہجے میں فرمایا۔ "اے ناصر الدین! اب میں سکون سے ہوں، خدا تجھے اپنی امان میں رکھے۔"

کچھ عرصہ بعد ابو محمد کا وصال ہو گیا۔ ابو یوسف اس صدمے سے نڈھال ہو گئے۔

ابو محمد کے وصال کے بعد ابو یوسف نے گوشہ نشینی اختیار کی اور حجرے میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ حجرے سے بہت کم نکلتے تھے۔ اب آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ لوگ دور دراز علاقوں سے آ کر آپ کے حجرے کے سامنے دو پڑتے۔ آپ کو اندر اطلاع دی جاتی کہ فلاں فلاں علاقوں سے اتنے لوگ آئے ہوئے ہیں اور آپ کا دیدار کرنا چاہتے ہیں۔

آپ پوچھتے۔ "یہ لوگ میرا دیدار کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

اطلاع کرنے والا مطلع کرتا۔ "اس سوال کا جواب تو وہی لوگ دے سکیں گے جو آپ کی زیارت کو حاضر ہوئے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں ابھی ان سے نہیں مل سکتا۔ اگر وہ چاہیں تو دو ہفتے ٹھہر جائیں پھر ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

اطلاع دینے والا خاموش ہو گیا اور آپ بے چوں و چرا اٹھ کر باہر تشریف لے گئے اور وہاں اپنے عقیدت مندوں کا ہجوم دیکھ کر

بہت خوش ہوئے باہر سخت گرمی پڑ رہی تھی اور یہاں لوگوں کی سہولت کے لیے کچھ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ یہ گرمی کے دن تھے اور باہر چلچلاتی دھوپ میں لوگ بھوکے پیاسے پڑے ہوئے تھے۔ آپ کو باہر نکلا ہوا دیکھ کر مریدوں اور ارادت مندوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور اپنا اپنا دکھ بیان کرنا شروع کر دیا۔

ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور عرض کیا۔ "حضرت! میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "پھر تامل کس بات کا؟"

اس نے عرض کیا۔ "حضرت! آپ خود ملاحظہ فرمایئے کہ یہاں کس بلا کی گرمی پڑ رہی ہے۔ آپ کے عاشق اس تپتی زمین اور چلچلاتی دھوپ میں بھوکے پیاسے آپ کی زیارت کی امید میں کھڑے رہتے ہیں۔"

آپ نے پوچھا۔ "تو چاہتا کیا ہے، کچھ بتا؟"

اس نے جواب دیا۔ "یہ کہ اگر کھانے کا نہیں تو ٹھنڈے پانی کا انتظام تو ہو جائے۔"

آپ نے پوچھا۔ "مگر یہ انتظام ہو تو کس طرح؟"

مرید نے جواب دیا۔ "آپ اللہ والے لوگ ٹھہرے جس جگہ عصا ماردیں گے ٹھنڈے پانی کا چشمہ جاری ہو جائے گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "یہ کیسی بات کہہ رہا ہے تو۔ خدا کی مشیت میں دخل دے رہا ہے۔ میں کوئی موسیٰ نہیں ہوں، ایک عام سا بندہ ہوں۔"

مرید نے اصرار کیا۔ "میں خدا کی مشیت میں کیوں دخل دوں گا آپ اس کے برگزیدہ بندے تو ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں پانی کے چشمے کے لیے دعا کرتا ہوں، ممکن ہے خدا قبول فرمالے۔"

رات گزری...... صبح ہوئی تو ایک معجزہ سب کا منتظر تھا...... قریب ایک بڑے پتھر میں لکیر نمایاں نظر آ رہی تھی جہاں سے پانی کا چشمہ ابل رہا تھا پھر یہ پانی فوارے کی طرح ابلنے لگا اور کچھ ہی دیر میں اس فوارے میں اتنی شدت پیدا ہو گئی کہ گویا وہ چشمہ نہیں آبشار تھا۔ لوگ دیوانہ وار چشمے پر جھک گئے اور چلوؤں سے اپنی پیاس بجھانے لگے کوئی وضو کرنے لگا۔

آپ کھڑے یہ منظر دیکھتے رہے پھر اندر چلے گئے۔ لوگ چشمے میں اس طرح منہمک ہوئے کہ انہیں ابو یوسف کے چلے جانے کا بڑی دیر بعد احساس ہوا۔ انہیں بڑی شرمندگی بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ ایک ذرا سے پانی کے چکر میں وہ ابو یوسف کو کیوں نظر انداز کر گئے۔

یہ ننھا چشمہ اتنی تیزی سے بہتا رہا کہ دوسرے دن وہ ایک شاندار چشمے کی صورت اختیار کر گیا اور آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں نے اس کے ٹھنڈے پانی کی وجہ سے وہاں مستقلاً سکونت اختیار کر لی۔ کچھ عرصے بعد اس چشمے کا پانی مختلف امراض میں دیا جانے لگا اور خوش عقیدہ لوگ اس سے فائدے حاصل کرتے رہے۔

آپ کے حجرے کے دروازے پر ایک بڑا سا پتھر رکھا ہوا تھا۔ آپ اسی پر بیٹھ کر ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے انہیں معلوم نہیں کیا کام یاد آ گیا کہ وہ اٹھ کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ آپ کے اٹھتے ہی معلوم نہیں کس طرح یہ پتھر اپنی جگہ سے ہٹ کر زمین پر آ رہا اور پھر یہ ابو یوسف کے پیچھے پیچھے لڑھکنے لگا۔ آپ کے مریدوں نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا تو حیرت زدہ بس دیکھتے ہی رہ گئے۔

آپ اپنے حجرے سے کافی دور جا چکے تھے اور حجرے کے در کا پتھر آپ کے پیچھے یوں لڑھک رہا تھا گویا کسی نے لڑھکا دیا ہو۔ اس تماشے کو دیکھنے کے لیے مریدوں کی جماعت پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ یہ لوگ آپس میں زور زور سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ آپ نے اپنے پیچھے میوں کی بھنبھناہٹ سی محسوس کی تو پلٹ کر دیکھا۔ ایک مرید نے عرض کیا۔ "یا پیر و مرشد! اس پتھر کو دیکھیے اسے کیا ہو گیا ہے؟"

آپ نے پوچھا۔ "اس کو کیا ہو گیا ہے؟"

مرید نے جواب دیا۔ "یہ آپ خود ملاحظہ فرمائیں۔ میں اپنی زبان سے کیا عرض کروں؟"

آپ نے لڑھکتے ہوئے پتھر سے کہا۔ "قف مکانک۔"

پتھر جہاں تک آ چکا تھا اور جس انداز میں تھا۔ اسی انداز میں رک گیا۔ ایک عرصے بعد بھی یہ پتھر اسی جگہ اسی حالت میں موجود رہا اور لوگوں کا کہنا ہے کہ بعد میں ابو یوسف اور خواجہ خضر یہاں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔

☆☆☆

آپ دنیا کی سیر و سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔ آپ نے دوران سفر بڑی مشہور علمی اور روحانی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس طرح گھومتے پھرتے ہرات پہنچے۔ یہاں آپ کی شہرت آپ سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ ہرات کے ایک درویش نے آپ کی شاندار پذیرائی کی اور خواہش کی کہ آپ اس کو میزبانی کا شرف بخشیں چنانچہ آپ اس کے مہمان ہو گئے۔

درویش صبح سے شام تک آپ کی خدمت میں حاضر رہتا اور کسب فیض کرتا رہا۔

ایک دن وہ معمول سے پہلے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور دونوں ہاتھ ملنے لگا۔

آپ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، تو کچھ کہنا چاہتا ہے مجھ سے؟''

درویش نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں بڑی الجھن کا شکار ہو گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اور کیا نہ کروں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''الجھن کی کوئی ضرورت نہیں، اصل واقعہ بتا۔ ممکن ہے اس کا کوئی حل نکل آئے۔''

درویش نے شرماتے ہوئے عرض کی۔ ''حضرت! میری لڑکی نے ایک عجیب سا خواب دیکھا ہے۔ بس اسی خواب نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تیری لڑکی نے خواب میں کیا دیکھا ہے؟''

درویش بدستور پس و پیش کا شکار تھا، بولا۔ ''حضرت! میں کیا عرض کروں، میں بہت پریشان ہوں۔''

آپ نے ترشی سے فرمایا۔ ''لیکن اس پریشانی کا حاصل؟ میں کہہ جو رہا ہوں کہ تو اپنی پریشانی مجھے تو بتا۔''

درویش نے کہا۔ ''حضرت! میری بیٹی نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے۔ بس اس کی تعبیر سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں، آپ ہی بتائیں اس کی تعبیر؟''

آپ نے دریافت کیا۔ ''تیری بیٹی نے کیا خواب دیکھا ہے؟''

درویش نے جواب دیا۔ ''اس نے خواب دیکھا کہ چودھویں کا چاند اوپر سے اتر کر اس کی گود میں آ گیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں تجھے اپنی زوجیت میں لینا چاہتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''پھر اس کی کیا تعبیر نکالی ہے تو نے؟''

درویش نے جواب دیا۔ ''میں نے اس خواب کی جو تعبیر نکالی ہے اس کو بیان کرنے کی میں ہمت نہیں کر پا رہا ہوں۔''

آپ نے نرمی سے فرمایا۔ ''پھر بھی، اس میں ہمت کی کیا بات ہے؟''

درویش نے نظریں نیچی کر لیں، بولا۔ ''حضرت! میں لڑکی کا باپ ہوں اگر وہ میری بیٹی نہ ہوتی تو میں بڑی آزادی سے اس خواب کی تعبیر بتا دیتا۔''

آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں تیری تعبیر سے واقف ہوں۔ اب وہ تعبیر مجھ سے سن لے۔ وہ چاند، جو تیری بیٹی کی گود میں گرا ہے، میں خود ہوں۔ تیری بیٹی میری بیوی بنے گی۔ تو اس تعبیر سے خوب واقف ہے لیکن بتاتے ہوئے شرماتا ہے۔''

درویش اور زیادہ شرما گیا، بولا۔ ''بجا فرمایا آپ نے لیکن یہ بات میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اب جبکہ آپ بھی وہی تعبیر بتا رہے ہیں جو میرے دل میں تھی تو کیا میں امید کروں کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اے مرد خدا! میں ہرات میں آیا ہی اس لیے ہوں کہ میں اپنی متاہلانہ زندگی کے سلسلے میں مشیت ایزدی پوری کروں۔ یہ بشارت مجھے بہت پہلے دی جا چکی تھی۔''

درویش فرط خوشی سے نیم پاگل ہو گیا، بولا۔ ''حضرت! میں تو کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ جیسے عالی مرتبہ شخص کو اپنی بیٹی کے سلسلے میں خیال تک میں لاؤں۔ کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہ کیسی عدم اعتمادی کی بات کر رہا ہے۔ میں تیار ہوں۔''

درویش کو معلوم نہیں کیوں اب بھی شبہ تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''حضرت! پھر میں یہ خوش خبری اپنی بیٹی کو بھی سنا دوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر یہ بات ضروری ہے تو ضرور سنا دے۔''

درویش نے عرض کیا۔ ''یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ خواب بھی اسی نے دیکھا ہے۔ وہ خود بھی اس کی تعبیر جاننے کے لیے بے چین ہے۔''

درویش اندر اپنی بیٹی کے پاس چلا گیا اور اپنی بیٹی سے کہا۔ ''بیٹی! تو نے جس چاند کو خواب میں دیکھا تھا وہ تیرے گھر میں آ چکا ہے اور عنقریب تیری گود میں گر جائے گا۔'' لڑکی شرما گئی۔

کچھ دنوں بعد لڑکی کا عقد ابو یوسف سے کر دیا گیا۔ آپ اپنی دلہن کو لے کر وطن واپس چلے گئے اور کچھ عرصے بعد اس لڑکی کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام مودود چشتی رکھا گیا اور اس لڑکے نے چشتی خاندان کا نام روشن کر دیا۔ آپ کو سماع سے بڑی دلچسپی تھی۔ جن صوفیا کو موسیقی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ انہیں آپ کے سماع پر بڑا اعتراض تھا۔ اسی عہد کے صوفی خواجہ ابو بکر شبلی کو سماع سے کوئی رغبت نہ تھی اور وہ عموماً سماع سے دور ہی رہتے مگر جب کسی ایسی محفل میں جانے کا اتفاق ہوتا جس میں ابو یوسف بھی موجود ہوتے تو یہ قوالی ضرور سنتے اور ابو بکر شبلی کے مریدوں کو یہ بات بہت زیادہ گراں گزرتی تھی کہ ان کے پیر و مرشد ایک بلند مقام رکھنے کے باوجود ابو یوسف چشتی کے مسلک کو

اختیار کر لیتے ہیں اور قوالی سننے بیٹھ جاتے ہیں۔

یہ بات ایک عرصے تک چہ میگوئیوں کی شکل میں گونجتی رہی۔ ایک دن چند مریدوں کے ساتھ ابوبکر شبلی، ابو یوسف چشتی سے ملنے گئے۔ اس وقت ابو یوسف چشتی سماع کی محفل میں بیٹھے تھے۔ یہ بھی اپنے مریدوں کے ساتھ محفل سماع میں بیٹھ گئے۔ ابھی قوالی شروع نہیں ہوئی تھی کہ ایک مرید نے ابوبکر شبلی کے کان میں کہا۔ ''پیرو مرشد! کیا آپ واپس نہیں جائیں گے؟''

ابوبکر شبلی نے جواب دیا۔ ''واپس کیوں نہیں جاؤں گا لیکن کچھ دیر بعد۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! محفل سماع تھوڑی دیر میں گرم ہو جائے گی، قوالیاں سننا ہمارے مسلک کے خلاف ہے۔''

ابوبکر شبلی نے جواب دیا۔ ''بھائی! تو ابھی اس بات سے لاعلم ہے کہ میں ابو یوسف کے پاس قوالیاں کیوں سننے لگتا ہوں۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ ہمارے مسلک میں قوالی شامل نہیں ہے۔''

اس سرگوشی کو ابو یوسف چشتی بھی سن رہے تھے۔ ابوبکر شبلی سے پوچھا۔ ''شبلی! یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''

شبلی نے جواب دیا۔ ''حضرت کیا عرض کروں؟ میرا مرید مسلک کی باتیں کر رہا ہے۔''

ابو یوسف نے فرمایا۔ ''اس مرید کو میرے پاس بھیج دو۔''

شبلی نے مرید سے کہا۔ ''اے خوش قسمت انسان! چشتی کے پاس چلا جا۔ تیرے وسوسوں کو وہی دور کریں گے۔''

مرید کو ابو یوسف کے پاس جانے میں تامل ہوا لیکن شبلی نے ذرا سختی سے کہا۔ ''میں کیا کہہ رہا ہوں، کیا تو نے میری بات نہیں سنی؟ تجھے ابو یوسف چشتی اپنے پاس بلا رہے ہیں۔'' مرید مرعوب ہو کر ابو یوسف کے پاس چلا گیا۔

ابو یوسف نے مرید سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تو شبلی سے کیا کہہ رہا تھا؟''

مرید نے سر جھکا لیا، بولا۔ ''میرے پیرو مرشد اور آپ کے مسلک میں فرق ہے چنانچہ میرے پیرو مرشد کے ارادت مند اپنے مرشد کی اتباع میں سماع پسند نہیں فرماتے اس لیے میں اپنے مرشد سے پوچھ رہا تھا کہ کیا ہم محفل سماع میں موجود رہیں گے؟''

ابو یوسف چشتی نے فرمایا۔ ''اگر میں کہوں کہ سماع تیرے مسلک میں ہو یا نہ ہو تجھے سننا پڑے گا تو تو کیا کرے گا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''اگر میرے مرشد مجھے یہ حکم دے دیں گے کہ مجھے محفل سماع میں نہیں بیٹھنا ہے تو میں فوراً اٹھ کر چلا جاؤں گا۔''

ابو یوسف نے مسکرا کر فرمایا۔ ''ایسی باتیں نہیں کرتے۔'' اس کے بعد قوالوں کو حکم دیا کہ قوالی شروع کی جائے۔

حکم کا ملنا تھا کہ قوالی شروع ہو گئی۔ ابو یوسف نے شبلی کے مرید سے کہا۔ ''ادھر، میری طرف دیکھ۔''

مرید نے ابو یوسف پر نظریں گاڑ دیں۔ ابو یوسف نے بھی اس کو نہایت جذبے و شوق سے دیکھا۔ ان کی نظروں میں معلوم نہیں کیا اثر تھا کہ مرید تڑپنے لگا اور سماع نے اس سوز اور تڑپ میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد جب ابو یوسف نے اس شخص کو حکم دیا کہ وہ محفل سماع سے نکل جائے تو وہ رونے لگا، بولا۔ ''حضرت! اس سوز اور لذت عشق کو بجھائیے نہیں۔ میں اس محفل سے نکل کر کہاں جاؤں گا۔''

ابو یوسف نے فرمایا۔ ''سماع سننا تیرے مرشد کے مسلک ہی میں نہیں، تب پھر تو یہاں کیوں موجود ہے؟''

مرید نے وجد میں تڑپ کر جواب دیا۔ ''اے ابو یوسف! باتوں میں الجھا کر میرا مزہ نہ کرکرا کرو۔ اب میں بات تک کرنے کے لائق نہیں ہوں۔'' وہ شخص کئی گھنٹے یوں ہی تڑپتا اور آہیں بھرتا رہا۔

کافی دیر بعد جب قوالیاں ختم ہوئیں اور محفل سماع برخاست ہو گئی تو شبلی بھی ہوش میں نہیں آئے۔ ان کا مرید بھی بے حال کسی شرابی کی طرح ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ ابو یوسف نے اپنے ارادت مندوں کو حکم دیا کہ انہیں آرام سے لٹا دیا جائے۔

چنانچہ شبلی اور ان کے مرید کو بستر پر لٹا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد شبلی ہوش میں آ گئے اور اسی طرح سر پکڑ کر بیٹھ گئے گویا پورے جسم میں تھکاوٹ ہی تھکاوٹ ہو۔ نڈھال، ہلکان۔

شبلی کے بعد ان کا مرید بھی ہوش میں آ گیا۔ اس نے ہوش میں آتے ہی ہذیان بکنا شروع کر دیا۔ ''اے ابو یوسف! تم کہاں چلے گئے؟ یہ تم نے میرا کیا حال کر دیا ہے۔''

ابو یوسف نے جواب دیا۔ ''اے شخص ہوش میں آ۔ محفل سماع برخاست ہو چکی ہے۔ لوگ جا چکے ہیں، اب تو بھی واپس آ جا۔''

مرید نے عاجزی سے کہا۔ ''اے ابو یوسف! ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری آنکھوں میں، میں نے معلوم نہیں کیسا جلوہ دیکھ لیا تھا کہ ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا اور اسی ایک نظر نے مجھ کو محفل سماع میں موجود رہنے کا حوصلہ اور شوق عطا کیا۔ خدا کے لیے وہی نظر اور، ورنہ میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا۔''

شبلی نے اپنے مرید سے فرمایا۔ ''اے سادہ لوح انسان! تو نے ان آنکھوں کا سحر دیکھ لیا۔ ابو یوسف جس کو بھی نظر بھر کے دیکھ لیں وہ محفل سماع سے اٹھ نہیں سکتا۔ ابو یوسف کی نظروں میں معلوم نہیں کون سا سحر ہے جو اس شخص کو بے بس اور مجبور کر دیتا ہے جو ان سے ایک بار

بھی نظریں ملالیتا ہے۔"
مرید نے تائید کی۔" بے شک، بے شک۔ ان نظروں نے میرے سینے میں محبت کی ایک ایسی آگ جلا دی ہے جو شاید عمر بھر یوں ہی جلتی رہے۔ اب تو میں اس در کو چھوڑنے سے رہا۔"
شبلی نے ابو یوسف کی طرف دیکھا اور فرمایا۔" کیوں، ابو یوسف یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے۔ تم میرے مریدوں کو توڑنے لگے۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔"
ابو یوسف نے جواب دیا۔" شبلی! جس طرح دین میں کوئی جبر نہیں، اسی طرح ہم صوفیوں کے ہاں بھی کوئی جبر نہیں۔ جس کا جو مسلک اختیار کرنے کو جی چاہے اختیار کر لے۔"
مرید نے پوچھا۔" اگر میں آپ سے صدق دل سے کہوں کہ آپ مجھ کو اپنا مرید بنالیں تو کیا آپ اس سے انکار کر دیں گے؟"
ابو یوسف نے جواب دیا۔" نہیں، میں انکار تو نہیں کروں گا لیکن یہ ضرور سوچوں گا کہ ایک پیر کی موجودگی میں کسی دوسرے پیر سے رجوع ہونا کہاں تک جائز ہے؟"
شبلی نے جواب دیا۔" ابو یوسف! میرا تو خیال ہی اپنے دل سے نکال دو۔ میں اپنے تمام مریدوں سے کہہ دوں گا۔ وہ میرے علاوہ بھی جس پیر کو چاہیں اپنا بنالیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"
مرید نے شکر گزار نظروں سے اپنے مرشد کو دیکھا اور ابو یوسف سے عرض کیا۔" حضرت! آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ میرے مرشد نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ میں آپ کی مریدی کا شرف حاصل کر سکتا ہوں۔ انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"
ابو یوسف نے جواب دیا۔" لیکن میں تجھے مرید نہیں کر سکتا۔"
مرید نے اصرار کیا۔" آخر کیوں؟ آپ مجھے مرید کیوں نہیں بنائیں گے؟...... اس کا کوئی سبب؟"
ابو یوسف نے جواب دیا۔" کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ابو بکر شبلی ایک مرشد کامل ہیں۔"
مرید کی حالت غیر تھی، بولا۔" لیکن حضرت! وہ ایک نظر جس نے مجھے سرتاپا عشق کی آگ میں غوطہ دے دیا تھا۔ وہ نظر کہیں اور کیوں نہیں ملتی؟"
ابو یوسف نے جواب دیا۔" صرف ایک نظر کی خاطر تو ترک مرشد نہیں کیا جاتا۔"
مرید نے عرض کیا۔" حضرت! میں اس لذت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا جو مجھے آپ سے ملی ہے؟"
شبلی نے کہا۔" ابو یوسف! اگر کوئی مرید آپ کے پاس آئے گا تو میں اس میں خوشی محسوس کروں گا کیونکہ میں ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ عشق اور سوز کی دولت کتنوں کے پاس ہے جو وہ دوسروں کو عطا کریں گے۔ آپ کی نظروں کا سحر کوئی مجھ سے پوچھے۔ ان نظروں میں معلوم نہیں کیا ہے کہ آدمی مست اور سرشار ہو کر موت تک سے آنکھیں لڑانے پر تیار ہوتا ہے۔"
شبلی کا مرید ابو یوسف کے قدموں میں بیٹھ گیا اور آخری بار خوشامد کی۔" حضرت! مجھے اپنا مرید کر لیجیے اور مجھے اس لذت اور کیفیت سے مستقلاً آشنا کر دیجیے جو آپ کی نظروں کے علاوہ کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔"
ابو یوسف نے شبلی سے کہا۔" شبلی! تم اپنے اس مرید کو یہاں سے لے کیوں نہیں جاتے؟"
شبلی نے جواب دیا۔" جناب! آپ نے اس شخص کو جس مزے اور لذت سے آشنا کر دیا ہے اب یہ ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اس لیے اس پر رحم کر دیجیے۔"
ابو یوسف نے مرید سے کہا۔" دیکھ! میں نے جو بات ایک بار کہہ دی ہے، وہی زندگی بھر کہتا رہوں گا۔ میں نے جب ایک بار یہ بات ببانگ دہل کہہ دی ہے کہ میں تجھے اپنا مرید نہیں بناؤں گا تو تجھے اپنی ضد سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔"
مرید نے درخواست کی۔" اچھا چلیے، میں آپ کو اس پر مجبور نہیں کرتا کہ آپ مجھے اپنا مرید بنالیں بلکہ میری ذرا سی یہ درخواست ہے کہ آپ مجھ پر ایک بار پھر وہی نظر ڈال دیجیے جس نے مجھے ابھی تک ایک کیف، ایک سرور بخش رکھا ہے۔"
ابو یوسف نے جواب دیا۔" وہ نظر بار بار نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہاں میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ جب تو میری محفل سماع میں آیا کرے گا تو میں تجھ پر تیری مطلوبہ نظر ڈال دیا کروں گا۔"
مرید اس جواب سے مایوس تو ضرور ہوا مگر ابو یوسف کی بات مان لی اور اپنے پیر و مرشد شبلی کے ساتھ ہی واپس چلا گیا۔ اس کے بعد وہ بڑے اہتمام اور پابندی سے آپ کی محفل سماع میں شریک ہونے لگا۔

☆☆☆

ابو یوسف چشتی کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ ایک عمارت تعمیر ہوتے دیکھی۔ اس کو دیکھ کر قدم خود بخود رک گئے لوگوں سے پوچھا۔" حضرات! یہ کس کا گھر تعمیر ہو رہا ہے؟"

ایک شخص نے جواب دیا۔ ''خدا کا گھر، یہ مسجد ہے۔''

آپ نے چند آدمیوں کو شہتیر چڑھاتے دیکھا وہ پوری قوت سے شہتیر کو اوپر لے جانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ آپ ان کے پاس کھڑے ہو گئے اور شہتیر کے اوپر چڑھائے جانے کے منظر سے لطف اندوز ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد دس آدمیوں کی مدد سے شہتیر اوپر پہنچا دی گئی۔ آپ نے اس کو غور سے دیکھ کر فرمایا۔ ''ارے بھائیو! یہ تو غلط رکھی ہے۔ اس کو ایک طرف چار پانچ انگل کھسکنا چاہیے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا تو......''

آدمی بہت تھکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ آپ نے ان میں سے ایک کو مخاطب کیا۔ ''اے بھائی! ذرا میری ایک بات تو سننا۔''

وہ شخص آپ کے پاس چلا گیا۔ آپ نے دیوار پر رکھے ہوئے شہتیروں کو دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ''ابھی کچھ کسر باقی ہے۔ ابھی یہ دیوار پر صحیح طریقے سے نہیں رکھا گیا جو نقصان دہ ہے۔ اپنے ساتھیوں سے کہہ دے کہ اس کا یہ عیب دور کر دیں۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''حضرت! اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ یہ چار انگل نکلا ہوا شہتیر کہیں اور نہیں جا سکتا کیونکہ ہم دس آدمیوں کا جو حال اس کے چڑھانے اور رکھنے میں ہوا ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ اب میں یہ نہیں چاہتا کہ شہتیر کو ہلا جلا کر اور زیادہ غلط کر دوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اچھا تیری خوشی اگر اسی میں ہے کہ شہتیر جس طرح غلط رکھا ہوا ہے اس کو اسی طرح رہنے دیا جائے تو اب کوئی اصرار نہیں کیا جائے گا۔''

اس کے بعد آپ دیوار کے اوپر چڑھ گئے اور تن تنہا شہتیر کو ٹھیک کر دیا، بولے۔ ''جس کام کو میں تنہا کر سکتا ہوں اس کے لیے دوسروں کو کیا تکلیف دی جائے۔''

کئی لوگ نیچے سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اتنے بڑے شہتیر کو ابو یوسف نے اس کی صحیح جگہ پر رکھ دیا اور نیچے آ گئے، بولے۔ ''میں نفس کو دیکھ سکتا ہی نہیں اور رہی یہ بات کہ میں نے اتنے بڑے شہتیر کو اکیلے کس طرح ٹھیک کر لیا تو اس میں تعجب کی بات ہی کون سی ہے؟ خدا اپنے بندوں ہی سے کام لیتا ہے، معمولی بھی غیر معمولی بھی۔''

آپ کا یہ کارنامہ ایک عرصہ تک زائرین کی زیارت گاہ بنا رہا۔

☆☆☆

آپ کو بچپن میں قرآن پاک حفظ کروانے کی کوشش کی گئی تھی جو کسی نتیجے کے بغیر رک گئی تھی۔ اس کے بعد آپ عبادت اور ریاضت میں اتنے مصروف ہو گئے کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا کافی عمر گزارنے کے بعد بھی آپ کے دل و دماغ میں یہ خلش سوہان روح بنی ہوئی تھی کہ افسوس قرآن پاک حفظ نہیں کر سکا۔ کئی بار دوبارہ حفظ کی کوشش بھی کی لیکن بات جہاں تھی وہیں رہی آگے نہ بڑھ سکی۔

ایک رات وہ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں میں وعظ فرما رہے تھے۔ موضوع کلام الٰہی اور اس کی برکات تھا۔ آپ دیر تک اس موضوع پر بولتے رہے لیکن وعظ کے دوران ان میں مستقل یہ احساس طاری رہا کہ ابو یوسف جس موضوع پر تو وعظ کہہ رہا ہے تو خود اس پر پوری طرح حاوی نہیں ہے۔ تو نے تو ابھی تک کلام الٰہی کو حفظ بھی نہیں کیا۔ انہیں یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ بچپن کا ذہن ہر چیز اچھی طرح اور جلدی یاد کر لیا کرتا ہے جبکہ اس پختہ عمر میں یہ کام دشوار ہو جاتا ہے۔ آپ بڑی دیر تک اشک ندامت بہاتے رہے اور گڑگڑا کر خدا سے التجا کی کہ ان کی مشکل آسان کر دی جائے۔

عشا کے بعد نصف شب سے تہجد پڑھنا شروع کر دی لیکن اس وقت ان کا یہ حال تھا کہ وہ جہاں اور جس حال میں بھی تھے ان کے دل و دماغ میں قرآن پاک اور اس کے حفظ نہ کر سکنے کا احساس ندامت طاری تھا۔

فجر سے ساعت ڈیڑھ ساعت پہلے آپ بستر پر چلے گئے اور سوچتے سوچتے سو گئے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے پیرو مرشد اور ماموں ابو محمد تشریف لائے ہوئے ہیں اور ان کے چہرے کو بغور دیکھ کر پوچھ رہے ہیں کہ ''اے ابو یوسف تو ملول کیوں ہے اور تیرے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر کیوں ہیں؟''

ابو یوسف کو پرسش احوال پر اور زیادہ رونا آ گیا، بولے۔ ''ماموں جان! میں اس ندامت اور افسوس سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں کہ ابھی تک قرآن پاک حفظ نہیں کر سکا۔ اس زخم کو میں کس طرح مندمل کروں؟''

ابو محمد نے فرمایا۔ ''تو اب حفظ کر لے۔ اس میں افسوس کس بات کا؟''

ابو یوسف نے عرض کیا۔ ''حضرت! اب میں کس طرح حفظ کروں، جب یہ کام میرے لیے بچپن میں مشکل تھا تو اب تو اور زیادہ مشکل ہو چکا ہے۔ میں سوچ سوچ کر ہی پریشان ہو رہا ہوں۔ بتایئے میں یہ کام کس طرح انجام دوں؟''

ابو محمد نے فرمایا۔ ''اے ابو یوسف! تو فجر کی نماز کے بعد سو بار سورۂ فاتحہ پڑھ کر اپنا کام شروع کر دے اللہ نے چاہا تو بہت جلد قرآن پاک حفظ ہو جائے گا۔''

ابو یوسف نے فرط عقیدت سے اپنے ماموں کے ہاتھ کو بوسہ دیا، اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔

کچھ ہی دیر بعد موذن کی آواز سنائی دی۔ آپ اٹھے، وضو کیا، نماز ادا کی اور اپنے ماموں کے ارشاد کے بموجب سو بار سورۂ فاتحہ اور ورد کر کے کلام پاک کے حفظ کی کوشش شروع کر دی۔ انہیں جلد ہی اس حیرت انگیز بات کا احساس ہونے لگا کہ وہ جو کچھ بھی یاد کرتے ہیں لاف توقع بہت جلد یاد ہو جاتا ہے چنانچہ دس دن میں پورا کلام پاک حفظ ہو گیا۔

جس دن قرآن پاک پوری طرح حفظ ہوا تھا۔ آپ کو ٹھنڈے پانی کی خواہش ہو رہی تھی۔ آپ نے خوب جی بھر کے پانی پیا اور نفس سے کہا۔ "اے نفس! آج میں اپنی کامیابی کی خوشی میں، دو رکعت میں پورا قرآن ختم کرنا چاہتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تو بھی میرا ساتھ دے۔"

اس کے بعد آپ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے اور دو رکعت میں کلام پاک ختم کرنے کی نیت باندھ لی۔

آپ نے بیس پارے پڑھ ڈالے اور کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا مگر بیس کے بعد نیند غلبہ کرنے لگی اور اس غلبے میں اس پانی کی آسودگی کو بڑا دخل تھا جو آپ خوب جی بھر کے پی چکے تھے۔ آپ سجدے میں گئے تو آنکھ لگ گئی اور اس غضب کی نیند آئی کہ صبح تک سوتے رہے۔ جب آنکھ کھلی تو اپنے نفس پر سخت غصہ آیا۔ فرمایا۔ "اے نفس! تو نے مجھے دھوکا دیا۔ میں بھی تجھے پریشان کروں گا۔"

اندر سے آواز آئی۔ "اے ابو یوسف! اس میں میرا کیا قصور۔ آپ نے جی بھر کے پانی جو پی لیا تھا۔ اس نے مجھے بے اختیار کر دیا تھا۔"

آپ نے فرمایا۔ "اچھا، اگر یہ بات تھی تو میں تجھ کو یہ سزا دوں گا کہ آئندہ میں جی بھر کے پانی ہی نہیں پیوں گا۔" اس اعلان کے بعد آپ نے بیس سال تک جی بھر کے پانی نہیں پیا اور اپنے نفس کو مستقل اذیتیں پہنچاتے رہے۔

☆☆☆

آپ پچاس سال کی عمر تک خواجہ ابو اسحاق شامی کے مزار پر حاضری دیتے رہے پھر اچانک خیال آیا کہ یہاں اعتکاف کے لیے چھوٹا سا حجرہ ہونا چاہیے لیکن یہاں کی سرزمین پتھریلی تھی۔ آپ یہاں زیر زمین حجرہ تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے مزدوروں کو کام پر لگایا تو چند دنوں کی کوشش کے بعد یہ جواب دیا گیا کہ اس پتھریلی زمین پر کدال کام نہیں کر رہے ہیں اس لیے زیر زمین حجرہ تعمیر نہیں ہو سکتا۔

آپ آنکھیں بند کر کے اس کا حل سوچنے لگے۔ اچانک دل کے کانوں نے ایک آواز سنی، کوئی کہہ رہا تھا۔ "اے ابو یوسف! یہ کام بھی تو ہی اچھا انجام دے گا۔ اللہ کے نام سے اٹھ اور کدال لے کر کھدائی شروع کر دے۔"

آپ نے فجر کے بعد کدال سنبھالی اور اس پتھریلی زمین کی کھدائی شروع کر دی۔ حیرت انگیز طور پر ظہر تک کھدائی کا کام مکمل ہو گیا پھر اس جگہ زیر زمین ایک حجرہ تعمیر کیا گیا اور آپ نے اسی حجرے میں بارہ سال تک قیام کیا۔ یہیں آپ پر بے خودی طاری رہنے لگی۔ وضو کرتے کرتے بے خود ہو جاتے اور کسی بات کا ہوش ہی نہ رہتا۔ جب ہوش آتا تو بقیہ وضو کرتے چنانچہ ایک دوسرے صوفی خواجہ عبداللہ انصاری نے جب آپ کو اس طرح بے خود ہوتے دیکھا تو تحسین کرتے ہوئے فرمایا۔ "چشتیوں کی ہمیشہ یہی وضع اور روش رہی ہے۔"

آپ اپنی عمر کے آخری حصے میں بھی اسی حجرے میں رہے اور آپ کے مریدوں اور مداحوں نے یہ عجیب منظر دیکھا کہ حجرے کے دروازے پر دونوں طرف دو سانپ پھن اٹھائے دربانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور ارادت مند انہیں دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے۔

بعض ارادت مندوں نے اندر پہنچ کر آپ سے شکایت کی کہ "حضرت! آپ کے اکثر مرید اور مداح آپ سے ملے بغیر ہی چلے جاتے ہیں آپ ان سانپوں کو یہاں سے ہٹا کیوں نہیں دیتے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ میں دنیا داروں اور وقت برباد کرنے والوں سے نہیں ملنا چاہتا اور خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں سانپ انہیں خوب پہچانتے ہیں اور انہیں اندر نہیں آنے دیتے۔"

مرید نے پوچھا۔ "یہ انہیں کس طرح روکتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ان لوگوں کے دلوں پر ان کا خوف طاری ہو جاتا ہے اور اس خوف کی وجہ سے وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔"

لیکن آپ کے وصال کے بعد یہ دونوں سانپ بھی غائب ہو گئے۔ اس عہد کے دوسرے صوفیوں نے بتایا کہ وہ سانپ دراصل دو جن تھے جو ابو یوسف چشتی کے مرید اور دربان تھے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس زیر زمین حجرے میں آپ کے پاس رجال غیب آیا کرتے تھے اور آپ کی ان سے تا دیر صحبتیں رہتی تھیں۔ ان رجال غیب میں اجنہ بھی شامل تھے۔

خانوادہ چشتیہ کی بنیادیں جن بزرگوں پر قائم ہیں، ان میں ابو یوسف چشتی کا نام نامی بھی خاصی شہرت اور مقام رکھتا ہے۔

آپ نے 3 رجب 459ھ میں وصال فرمایا۔ "عارف کامل بودہ" سے آپ کا سن وفات نکلتا ہے۔



خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ تذکرۃ الاولیا، شیخ فرید الدین عطار۔ سکینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔ ریاض الریاحین، ابی جعفر۔ سفینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔

فیروز شاہ تغلق کے عہد میں تجس رائے نامی ہندو نے اسلام قبول کرلیا تو اس پر خاندان والوں کی طرف سے لعنت ملامت کی بوچھاڑ پڑنے لگی۔ اس کے خاندان والوں نے کہا۔ "تجس رائے! تو مسلمان ہوگیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون تجھے یاد رکھتا ہے۔ ہندو تو تجھے اس لیے بھلا دیں گے کہ تو نے ان سے بے وفائی کی ہے اور انہوں نے تجھ کو غیر سمجھ کر فراموش کر دیا ہے۔ رہے مسلمان تو وہ بھی اپنا نہیں سمجھیں گے کیونکہ اپنے دھرم اور خاندان سے غداری کرنے والا غیروں کی نظر میں بھی حقیر ہی رہتا ہے۔"

تجس رائے نے جواب دیا۔ "بھائیو! میں نے اسلام اس لیے نہیں اختیار کیا ہے کہ میں اس سے عہدہ و مرتبہ یا کسی قسم کی شہرت حاصل کروں، میں نے اسلام کو اس کی اچھائیوں اور خوبیوں کی وجہ سے قبول کیا ہے اور میرا ضمیر مطمئن ہے۔"

تجس رائے اپنے مخالفین اور معترضین کو اس قسم کے جوابات دیتے رہے۔

یہ نومسلم خاندان دو صدی سے زیادہ عرصے تک گمنامی میں رہا اور اس میں کوئی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا جو اس خاندان کو شہرت دوام عطا کر دیتا۔ عہد اکبری میں اس خاندان کے عثمان نامی ایک شخص نے دین داری میں علاقائی شہرت حاصل کرلی۔ لوگ اس کے

اس میں کوئی شک نہیں کہ غیب کا علم سوائے اللہ کے کسی کے پاس نہیں ہوتا لیکن . . . یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خالق کا کوئی نہ کوئی عکس مخلوق میں نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کسی نہ کسی صفات کے ذرہ برابر حصے سے ہی سہی اپنے مقبول بندوں کو بھی نوازا ہے... یہ اور بات کہ اس کے لیے اللہ نے اپنی عبادت اور ریاضت کی کڑی شرط رکھی اور ایک کھرا معیار رکھ دیا کہ جو اس پر پورا اترا وہی اس کا منظور نظر ٹھہرا... اور کسے خبر کہ اسے کس کی کب اور کیا ادا پسند آجائے... اور وہ اسے اس کی اوقات سے زیادہ نواز دے ... آپ کا شمار بھی ایسے ہی ولیوں میں ہوا جنہیں اس غفور الرحیم نے اپنی بے حساب کرامتوں سے نوازا۔

باطن کی روشنی سے منور ایک صاحب کشف کا قصہ

ضیا تسنیم بلگرامی

عالم باطن



زہد و تقویٰ سے بڑے متاثر رہے۔ یہ شخص کپڑے بُن کر روزی کماتا تھا اور بقیہ وقت خدا کی عبادت اور ریاضت میں گزار دیتا۔ ان کی بود و باش لاہور میں تھی۔ اسی دوران ان کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ عثمان نے اس لڑکے کا نام حسین رکھ دیا۔

دین دار باپ نے سات سال کی عمر سے حسین کو حافظ ابوبکر نامی فاضل کے حلقۂ درس میں بٹھا دیا اور استاد سے درخواست کی۔ ”حسین کو قرآن پاک حفظ کرا دیجیے۔“

حافظ ابوبکر نے حسین میں جوہر قابل محسوس کر لیا اور نہایت شوق سے انہیں دینی تعلیم دینے لگے۔ حسین نے کچھ ہی عرصے میں چھ سات پارے حفظ کر لیے۔

حافظ ابوبکر درس و تدریس کا کام اپنی مسجد میں انجام دیتے تھے۔ انہی دنوں قادری سلسلے کے مشہور صوفی شیخ بہلول دریائی لاہور تشریف لائے۔ وہ ادھر ادھر رہتے ٹھہرتے حافظ ابوبکر کی مسجد میں پہنچ گئے۔ بہلول دریائی نے شریک درس لڑکوں کو دیکھا اور خوشی کا اظہار کیا، بولے۔ ”لڑکو! تعلیم حاصل کرنے میں قال سے زیادہ حال پر توجہ دو، اگر کچھ حاصل کرنا ہے یا بننا ہے تو سمجھ لو کہ تمہارا مقصود حال ہی سے ہاتھ آئے گا۔“

حسین نے بہلول کی بات، دوسروں کے مقابلے میں زیادہ توجہ سے سنی اور پوچھا۔ ”حضرت! یہ قال اور حال کیا شے ہیں؟“

بہلول نے جواب دیا۔ ”ایک تو صرف باتیں بنانا ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ آدمی اسے اپنے آپ پر طاری کر لے۔ پہلا قال ہے اور یہ دوسرا حال ہے۔“

حسین کو ان باتوں میں بڑا مزہ آیا۔

کچھ دیر بعد بہلول نے حسین سے کہا۔ ”بیٹے حسین! دریا سے وضو کے لیے پانی تو لا دے جا کر۔ خدا تیری عمر دراز کرے اور تجھے نیک رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔“

حسین ذرا سی دیر میں پانی لے آئے۔ بہلول نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد بہلول دریائی نے بڑے خشوع و خضوع سے دعا مانگی۔ ”اے خدا! حسین کو اپنا عاشق اور عارف بنا دے۔ میری بڑی خواہش یہی ہے۔“

حسین نے یہ دعا سنی اور اسی دن آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔

بہلول، حسین پر خاص توجہ دے رہے تھے۔ ابھی بہلول کا قیام لاہور ہی میں تھا کہ رمضان آ گئے۔ تراویح شروع ہو گئی۔ آپ نے حسین کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ ”کیا تو جانتا ہے کہ رمضان شروع ہو چکے ہیں اور تراویح شروع ہو جائے گی۔“

حسین نے جواب دیا۔ ”جی حضرت! میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں، کوئی حکم؟“

بہلول نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں تراویح تو پڑھائے، میں تراویح میں امام تجھے بنانا چاہتا ہوں۔“

حسین نے عاجزی سے عرض کیا۔ ”حضور مجھ پر جو کرم فرما رہے ہیں اس سے میں کس طرح عہدہ برآ ہو سکوں گا۔“

بہلول نے جواب دیا۔ ”تراویح میں امام میں اس لیے بنا رہا ہوں کہ اس طرح میں تیرا قرآن بھی سن لوں گا۔“

حسین نے عرض کیا۔ ”جیسی حضور کی مرضی۔“

تراویح میں امام حسین کو بنا دیا گیا اور بہلول دریائی مقتدی بن گئے۔

بہلول نے حسین کے حق میں دعا کی۔ ”اے میرے رب! میں حسین کا بھلا چاہتا ہوں، اسے اپنا عاشق اور عارف بنا دے۔“

بہلول کی توجہ اور دعاؤں نے حسین کو چند ہی سالوں میں درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ حسین کو جو کچھ دینا تھا، دیا جا چکا ہے تو بہلول نے کہا۔ ”اب میں اپنے وطن چندیوٹ (چنیوٹ) واپس جاؤں گا۔“

حسین کو ملال ہوا، کہا۔ ”حضرت! اتنی جلدی! ابھی تو آپ ٹھہریے۔ کیا آپ کو مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی؟“

بہلول نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اپنا کام ختم کر چکا اس لیے مزید رکنا فضول ہے۔“

حسین نے بہ چشم پرنم اپنے پیر و مرشد کو رخصت کر دیا اور خود عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔



شیخ حسین نے اپنے پیر و مرشد کے جاتے ہی ویرانے کی راہ لی اور وہاں ریاضت و مجاہدے میں مشغول ہو گئے۔ ہاں رات کو حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر آ کر اعتکاف میں بیٹھ جاتے۔ اسی دوران شیخ حسین نے کئی بار اعتکاف کے دوران اپنے حجرے کو منور ہوتے دیکھا۔ یہ خوشی سے مست اور بے خود ہو جاتے کیونکہ انہیں اس عجیب و غریب روشنی کی بابت اچھی طرح

معلوم تھا کہ یہ ایک قسم کا فیضان ہے جو انہیں حاصل ہو رہا ہے۔ ایک دن تو بات کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ شیخ حسین نے اپنے حجرے میں دورانِ اعتکاف ایک پیرمرد کو داخل ہوتے دیکھا۔ انہوں نے استقبال کی خاطر کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔ "حضرت! آپ؟"

پیرمرد نے جواب دیا۔ "ہاں میں، شیخ حسین یہ میں ہوں شیخ علی ہجویری۔ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوا، مت پریشان ہو۔"

اب شیخ حسین نے شیخ سعد اللہ لاہوری کے گھر کا رخ کیا اور ان سے درخواست کی کہ تفسیر مدارک پڑھا دیں۔ سعد اللہ لاہوری نے تپاک سے جواب دیا۔ "کیوں نہیں۔ آپ جب چاہیں تفسیر مدارک مجھ سے پڑھ لیں۔"

چنانچہ شیخ حسین نے سعد اللہ لاہوری کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا اور تفسیر مدارک پڑھنے لگے۔ شیخ حسین کی ایک عادت استاد کے لیے تکلیف دہ تھی۔ وہ یہ کہ شیخ حسین کو ہر بات کی تہ میں جانے کی عادت تھی، کیوں اور کیسے، سے وہ استاد کو عاجز کر دیتے تھے۔

ایک دن وہ قرآن کی آیت **وما الحیوۃ الدنیا الا لھو ولعب** پڑھ رہے تھے۔ شیخ حسین پڑھتے پڑھتے رک گئے، پوچھا۔ "استاد محترم! ذرا اس کے معانی و مطالب تو بیان فرما دیجیے۔"

استاد نے شیخ حسین کی کیفیت سے یہ محسوس کر لیا کہ وہ عام حالت میں نہیں ہیں۔ جذب اور جلال ان کے چہرے سے عیاں تھا استاد نے پوچھا۔ "کون سے معانی و مطالب؟ قال کے یا حال کے؟"

شیخ حسین نے جواب دیا۔ "میں قال نہیں چاہتا، حال چاہتا ہوں۔"

استاد نے کہا۔ "حال میں نہیں جانتا۔"

شیخ حسین بیزاری سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے، اپنی کتابیں قریب کے کنویں میں پھینک دیں اور کہا۔ "مجھے قال نہیں حال درکار ہے، جو آپ کے پاس ہے وہ مجھے درکار نہیں، جو مجھے درکار ہے اس سے آپ کو سروکار نہیں۔ میں تو چلا، خدا حافظ۔"

شریکِ درس دوسرے طلبہ نے شیخ حسین کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور کہا۔ "جناب! کتابیں کنویں میں پھینک کر کہاں چلے؟ اگر آپ کو درس گاہ سے بھاگنا ہی تھا تو کتابوں کو چاہ برد کرنے سے آپ کو کیا حاصل ہوا؟"

شیخ حسین نے جواب دیا۔ "میں ان کتابوں کا کیا کرتا؟ جب مجھے ان سے کچھ حاصل ہی نہیں ہو رہا تھا تو میرے نزدیک ان کا غرقِ چاہ کر دینا ہی بہتر تھا۔"

ایک طالب علم نے کہا۔ "واہ جناب، یہ کیا دلیل دی؟ یہ کتابیں تمہارے لیے مخصوص تو نہیں تھیں۔ انہیں تم نہ پڑھتے، ہم لوگ پڑھتے لیکن کنویں میں ڈال دینے سے یہ کسی کے بھی کام کی نہیں رہیں۔"

شیخ حسین نے جواب دیا۔ "لوگو! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم سب محض کتاب کے کیڑے ہو، اگر تمہیں یہ کتابیں درکار ہیں تو میں انہیں کنویں سے ابھی نکالے دیتا ہوں۔"

کسی دوسرے لڑکے نے کہا۔ "لیکن اب وہ کتابیں ہمارے کام کی نہیں رہیں، کیونکہ اول تو ان کا کاغذ ہی بھیگ بھاگ کر تباہ ہو چکا ہوگا اور بفرضِ محال اگر کوئی کاغذ بچا بھی ہوگا تو اس کی سیاہی دھل گئی ہوگی۔ سادے کاغذ ہمارے کس کام کے؟"

شیخ حسین نے جواب دیا۔ "لیکن میں پھر بھی ان کتابوں کو کنویں سے نکالے دے رہا ہوں۔"

اس کے بعد شیخ حسین کنویں میں اتر گئے اور کچھ دیر بعد ساری کتابیں لے کر اوپر آ گئے۔ ان کے استاد اور دوسرے شریکِ درس طلبہ نے حیرت سے دیکھا کہ ساری کتابیں صحیح سلامت تھیں اور ان پر پانی کا اثر نہیں ہوا تھا۔ استاد نے حیرت سے پوچھا۔ "شیخ حسین! یہ کیا ہے؟ یہ کتابیں بھیگی کیوں نہیں؟"

شیخ حسین نے جواب دیا۔ "آپ کو اس کا جواب میں قال میں نہیں دے سکتا، حال میں دے سکتا ہوں۔"

استاد نے حیرت سے پہلے تو کتابوں کی طرف نظر ڈالی، اس کے بعد شیخ حسین سے کہا۔ "اب میں تجھ سے کیا سوال کروں، ہم دونوں کی راہیں مختلف ہیں۔"

شیخ حسین نے خلافِ معمول اور توقع کے برعکس ناچنا شروع کر دیا۔ استاد کو ان کی اس حرکت پر اور زیادہ حیرت ہوئی، وہ دوڑ کر شیخ حسین کو سینے سے لگانے کی کوشش کی لیکن یہ اس سے پہلے ہی باہر نکل گئے۔ انہوں نے سر، ڈاڑھی، مونچھ اور ابرو کا صفایا کرا دیا اور شراب پینے لگے۔ ناچ گانے کی محفلوں میں اپنا وقت گزارنے لگے۔ کچھ لوگوں کو آپ کی اس حالت سے عبرت ہوئی اور آپس میں کہنے لگے۔ "جناب! کتنے افسوس کی بات ہے کہ اچھا خاصا نوجوان لہو و لعب میں پڑ گیا۔"

کسی دوسرے نے کہا۔ "آدمی کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔"

لیکن تیسرے نے اس سے اختلاف کیا، کہا۔ "نہیں جناب، آپ لوگ شیخ حسین کے ظاہر پر جا رہے ہیں، جہاں تک میں کہتا ہوں شیخ حسین فرقہ ملامتیہ میں داخل ہو گئے ہیں، جن کی بابت حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے کشف المحجوب میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ ہر دلعزیز اور صاحب عزت ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کی طرف سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتے ہیں لیکن تکلف سے ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ لوگ ان سے متنفر ہو جاتے ہیں اور ان سے دور دور رہنے لگتے ہیں اور انہیں برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ ان کا تعلق فرقہ ملامتیہ سے ہوتا ہے اور ان پر ہر طرف سے لعنت ملامت ہونے لگتی ہے۔"

کسی اور نے کہا۔ "بھائی ان دلوں کا حال خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن بہ ظاہر شیخ حسین گمراہ نظر آتے ہیں۔"

کسی اور نے اپنے دونوں کان چھپائے اور توبہ تلا کرتا ہوا بولا۔ "جناب! یہ کیسی گستاخی فرما رہے ہیں آپ ایک عظیم المرتبت درویش کی شان میں۔ خدا سے ڈریئے اور توبہ کیجیے۔"

بازاروں، گلی کوچوں اور گھروں میں شیخ حسین پر اسی قسم کے متضاد تبصرے ہو رہے تھے اور شیخ حسین ان سب سے بے نیاز لہو و لعب میں مشغول تھے۔

یہ بات نہیں تھی کہ شیخ حسین تنہا رہتے ہوں، ان کا خاصا بڑا حلقۂ احباب تھا اور یہ سارے دوست بھی انہی جیسے تھے۔ رقص و سرود کے عاشق، عورتوں کے رسیا، شراب کے عادی اور دلدادہ۔ یہ ان سب کے ساتھ ہاؤ ہو کرتے رہتے۔ ان دنوں لاہور اور اس کے مضافات والے بارش نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ ان کے دوستوں نے کہا۔ "یار حسین! گرمی نے بہت پریشان کر رکھا ہے، چلو راوی کی سیر کریں۔"

شیخ حسین نے جواب دیا۔ "ہم تو یاروں کے یار ہیں، جہاں کہو چلے چلیں گے۔ چلو ابھی چلو، دیر کس بات کی؟"

ان کے ساتھی تو تیار ہی بیٹھے تھے، وہ شیخ حسین کو ساتھ لے کر دریائے راوی کی طرف نکل گئے۔ گھومتے پھرتے موضع منڈیا نوالہ میں داخل ہو گئے۔ لوگوں میں شور مچ گیا کہ شیخ حسین اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آیا ہے، وہی شیخ حسین جو بہلول دریائی کا مرید ہے اور اپنے اعمال اور کردار کے اعتبار سے ملعون اور مطعون ہے۔

منڈیا نوالہ کے زمیندار سردار بہادر خان کے کانوں میں بھی یہ آواز پہنچی۔ وہ بھاگا بھاگا آپ کے پاس آیا اور آپ سے خوشامدانہ درخواست کی۔ "حضرت! جب آپ نے یہاں تک قدم رنجہ فرمایا ہی ہے تو میرے غریب خانے تک بھی تشریف لے چلیں۔ بندہ بہت ہی شکر گزار ہوگا۔"

شیخ حسین نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "سنا تم نے؟ یہ فریبی مجھے گرفتار کرنے کی فکر میں ہے۔"

سردار بہادر خان نے عاجزی سے درخواست کی۔ "حضرت! آپ کے جی میں جو بھی آئے، فرماتے رہیں، میں درویشوں کی بات کا برا نہیں مانتا۔ اس وقت تو میں آپ کو اپنے غریب خانے تک لے کر ہی جاؤں گا۔"

شیخ حسین نے کہا۔ "اچھا چل، میں تجھ پر اعتبار کرتا ہوں جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔"

سردار بہادر خان انہیں ان کے ساتھیوں کے ہمراہ لے کر چلا اور پھر ان کے دوستوں کو دھوکے سے کسی جگہ قید کر دیا۔ شیخ حسین کو جس جگہ رکھا گیا تھا، ان کے دوست وہاں سے دور تھے۔ شیخ حسین دوستوں کی پروا کیے بغیر اپنے حال میں مگن مزے لیتے رہے۔ آخر ایک دن جو انہیں دوستوں کا خیال آیا تو سردار بہادر خان سے پوچھا۔ "جناب! کیا بات ہے؟ میرے دوست احباب کہاں ہیں؟"

سردار بہادر خان نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "جناب والا! وہ تو میں یہ طے کر کے گھر سے نکلا تھا کہ جب آپ میرے ہتھے چڑھیں گے تو میں آپ کے دوستوں کو قید خانے میں ڈال کر آپ سے درخواست کروں گا کہ بارش کی دعا فرمایئے اور جب تک آپ دعا نہیں فرمائیں گے، آپ کے دوست میرے پاس یرغمال رہیں گے۔"

شیخ حسین نے واویلا کیا، فرمایا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں دعائے استسقا کروں اور تم لوگ مزے میں مجھ سے تفریح لیتے رہو۔"

"حضور! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، میں اور آپ سے تفریح لوں۔ ناممکن ناممکن۔"

آپ نے کہا۔ "پھر یہ جو کچھ تو نے کیا، اس کا مقصد؟"

سردار بہادر خان نے عاجزی سے جواب دیا۔ "یہ کہ آپ دعائے استسقا فرما دیں۔"

شیخ حسین ہنسنے لگے، بولے۔ "میں بدکردار، گمراہ جو بھی دعا کروں گا وہ قبول ہونے کے بجائے ہم سب کے خلاف جائے گی اس لیے میرا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔"

سردار بہادر خان نے عرض کیا۔ "حضرت! آپ جو کچھ بھی ہیں ہم نہیں جانتے لیکن یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کی دعا بے کار نہیں جائے گی۔ آپ مستجاب الدعوات ہیں۔"

آپ نے سردار بہادر خان کے اصرار پر ایک شرط پیش کی، کہا۔ "اچھا بھائی میں دعا کروں گا لیکن ایک شرط پر۔ اس دن جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں آیا تھا تو میرے دوستوں نے نان مرغن اور شیر وشکر کی خواہش کی تھی اگر تو یہ چیزیں میرے سامنے میرے دوستوں کو کھلا دے تو میں بھی دعائے استسقا کر دوں گا۔"

سردار بہادر خان نے جواب دیا۔ "یہ ابھی لیجیے، یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

اس کے بعد اس نے آپ کے ساتھیوں کو آپ کے سامنے نان مرغن اور شیر وشکر پیش کیا۔ آپ انہیں کھاتے پیتے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اسی وقت کھلے میدان میں کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "خدایا! تو کیسا دوست ہے، مجھ سے تو میرے دوستوں نے جو خواہش کی تھی، وہ میں نے پوری کر دی، اب تو بھی میری خواہش پوری فرما۔ تیری مخلوق بارش نہ ہونے سے عاجز اور تنگ ہو رہی ہے۔ تو ان پر اپنا ابر کرم برسا۔ میری آبرو رکھ لے۔ میں کتنا ہی برا سہی لیکن تو تو ستار و غفار ہے۔"

آپ یہ دعا فرما ہی رہے تھے کہ مشرق سے بادلوں نے اٹھنا شروع کر دیا۔ ان کا رخ مغرب شمال کی جانب تھا۔ کچھ دیر بعد ہوا سنسنائی، پھر گوند الپکنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

سردار بہادر خان کا خوشی سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے آپ کو ساتھیوں سمیت مہمان خصوصی بنا لیا اور جب تک بارش ہوتی رہی آپ کے پاؤں دابتا رہا۔ آپ نے اسے جھڑک دیا، فرمایا۔ "یہ کیا فضول کام کر رہا ہے تو، یہ تیرا کام نہیں ہے، اس کے لیے دو خوبرو عورتوں کو لا اور انہیں حکم دے کہ وہ میرے پاؤں دابیں۔"

سردار بہادر خان نے دو عورتوں کا انتظام کر دیا اور یہ دونوں شیخ حسین کے پاؤں داتی رہیں۔ جن لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو یہ استغفار کرتے ہوئے منہ چھپانے لگے۔



اس کے باوجود کہ آپ کی زندگی تقویٰ سے دور، لہو ولعب میں گزر رہی تھی۔ مرید ہونے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ آپ کی خدمت میں دور دور سے لوگ آتے اور زیارت اور بیعت کر کے واپس جاتے۔ اس دوران حاجی یعقوب نامی ایک شخص مدینہ منورہ سے لاہور آیا۔ اس نے لوگوں سے شیخ حسین کی بزرگی اور کرامت کے بڑے قصے سن رکھے تھے۔ اس نے ایک شخص کو پکڑ لیا اور درخواست کی کہ مجھے شیخ حسین کے پاس لے چلو کیونکہ میں نے ان کا بڑا شہرہ سنا ہے۔

اس شخص نے جواب دیا۔ "جناب میں شیخ حسین کے پاس آپ کو ضرور پہنچا دوں گا لیکن یہ تو بتائیں کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟"

حاجی یعقوب نے کہا۔ "جناب والا! میں مدینہ منورہ سے آ رہا ہوں۔"

لوگوں نے حاجی یعقوب کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کہا۔ "جناب والا! آپ کتنے خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اقامت اور رہائش کے لیے دیار نبی ﷺ ملا ہوا ہے۔"

حاجی یعقوب نے جواب دیا۔ "اتنا برا میں بھی نہیں سمجھتا اپنے آپ کو لیکن جب تک میں شیخ حسین کو دیکھ نہ لوں، ان کے بارے میں کسی قسم کی رائے نہیں دوں گا۔"

ایک شخص نے کہا۔ "میں آپ کو ان کے پاس پہنچائے دیتا ہوں، آئیے میرے ساتھ۔"

جب یہ دونوں شیخ حسین کے پاس پہنچے تو انہوں نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔ چند باریش حضرات شرف مریدی حاصل کرنے آئے ہوئے تھے اور شیخ حسین انہیں سمجھا رہے تھے۔ "کیا تم لوگ میری شکل نہیں دیکھ رہے ہو؟"

ان دونوں نے جواب دیا۔ "ہم دونوں آپ کی شکل دیکھ رہے ہیں۔"

شیخ حسین نے کہا۔ "جب تم دونوں میری شکل دیکھ رہے ہو تو یہ بھی دیکھ رہے ہو گے کہ میرے چہرے پر داڑھی مونچھ ہے یا نہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "ہاں یہ بھی دیکھ رہے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ آپ چار ابرو کا صفایا کیے ہوئے ہیں۔"
شیخ حسین نے قدرے خفگی سے کہا۔ "جب تم دونوں سب کچھ دیکھ رہے ہو تو یہ اپنے اپنے چہروں پر مونچھیں اور داڑھیاں کیوں سجا رکھی ہیں؟ انہیں صاف کرا کے میرے پاس آؤ۔"
ان دونوں کو تذبذب ہوا تو آپ نے مزید فرمایا۔ "اور ہاں، ایک بات اور اپنے اپنے ذہنوں میں بٹھا لو۔ میں رقص و سرود سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں شاہد ان بازاری کا بھی رسیا ہوں، ان کا بھی فوراً ہی انتظام کر دیا جائے۔"
ان دونوں نے قدرے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "واہ جناب! یہ تو ایک ہی رہی۔ اگر آپ کا یہی اصرار ہے تو ہم آپ کی ہر شرط پوری کر دیں گے۔"
انہوں نے کہا۔ "اور میں شراب بھی پیتا ہوں۔"
دونوں مریدوں نے جواب دیا۔ "شراب بھی فراہم کر دی جائے گی۔"
حاجی یعقوب یہ منظر دیکھتا رہا۔ جو شخص حاجی یعقوب کو لے کر آیا تھا، وہ حاجی یعقوب کے چہرے پر نظریں جمائے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سامنے جو کچھ پیش آ رہا ہے اس کا حاجی یعقوب کے دل پر کیا اثر ہو رہا ہے۔ آخر جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے حاجی یعقوب سے پوچھا۔ "کیوں جناب، کیا اثر لیا آپ نے؟"
حاجی یعقوب کے چہرے پر حیرتوں کی یلغار تھی، اس نے کہا۔ "جناب میں بڑی دیر سے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس وقت میری نظروں کے سامنے شیخ حسین نامی جو شخص ہے یہ وہی ہے جسے میں رسول مقبول ﷺ کے مزار اقدس میں معتکف دیکھ چکا ہوں یا کوئی اور ہے۔"
حاجی یعقوب سے سوال ہوا۔ "پھر آپ کس نتیجے پر پہنچے؟"
حاجی یعقوب نے جواب دیا۔ "یہ دونوں ایک ہی ہیں مگر اب اس پر حیران ہوں کہ یہ دونوں ایک کس طرح ہو سکتے ہیں، اس شخص کا کردار اور اس کے اعمال ایسے تو نہیں ہیں کہ اسے مزار اقدس میں معتکف ہونے کا شرف حاصل ہو سکے۔"
یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دونوں مرید اپنی داڑھیاں اور مونچھیں صاف کرا کے آ گئے۔ اس وقت ان کے ہاتھوں میں شراب کے پیالے بھی تھے۔ شیخ حسین نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ "واللہ تم دونوں نے میرا جی خوش کر دیا۔"
شیخ حسین نے ان دونوں کو مرید کر لیا، دونوں کے پیالوں سے تھوڑی تھوڑی شراب پی اور پھر یہ جھوٹی شراب دونوں مریدوں کو پلا دی اور جوش مسرت میں اٹھ کر باہر چلے گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کے مرید بھی ہو لیے۔ بازار میں شیخ حسین کو نشے میں چور دیکھ کر ڈھول تاشے والوں نے بجانا شروع کر دیا۔ ڈھول تاشے کی آواز نے شیخ حسین کو اور زیادہ بدمست کر دیا۔ اس کی آواز پر رقص کرنے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے مریدوں نے بھی رقص کرنا شروع کر دیا۔
حاجی یعقوب یہ سارے مناظر دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے۔ یہ اس کا خواب ہے یا واقعہ؟ آخر حاجی یعقوب برداشت نہ کر سکا، شیخ حسین کے قریب جا کر پوچھا۔ "جناب! گستاخی معاف، مجھے تو آپ صریحاً فاسق و فاجر نظر آ رہے ہیں لیکن میں نے آپ کو کہیں اور بھی دیکھا ہے اور جب ان دونوں کو یکجا کرتا ہوں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسے حق جانوں اور کسے جھوٹ؟"
شیخ حسین نے سر کو جھٹکا دیا اور آنکھیں کھول کر حاجی یعقوب کی طرف دیکھا، بولے۔ "اے شخص! تیرا نام حاجی یعقوب ہی ہے نا؟"
حاجی یعقوب نے جواب دیا۔ "ہاں، آپ کو میرا نام بھی معلوم ہے؟"
شیخ حسین نے کہا۔ "ہاں، میں تیرے نام سے واقف ہوں اور اس شخص کو بھی جانتا ہوں جس کو تو میری ذات میں تلاش کر رہا ہے۔"
حاجی یعقوب نے پوچھا۔ "میں آپ کی ذات میں کس کو تلاش کر رہا ہوں؟"
آپ نے حکم دیا۔ "اپنی آنکھیں بند کر لے۔"
حاجی یعقوب نے آنکھیں بند کر لیں لیکن اسی وقت دل کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ شیخ حسین کو مدینہ منورہ میں روضہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر معتکف دیکھ رہی تھیں۔ آپ نے کہا۔ "تو اس شخص کو مجھ میں تلاش کر رہا تھا شاید؟"

حاجی یعقوب آپ کے قدموں میں گر گیا اور رو رو کر معافیاں مانگنے لگا۔

شیخ حسین کے مخالفوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک طرف تو ان کے مریدوں میں اضافہ ہو رہا تھا، دوسری طرف حاسدوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ حاسدوں نے آپ کا زور توڑنے کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ چند مخالفوں نے بادشاہ کے دربار کا رخ کیا۔ یہ اکبر اعظم کا زمانہ تھا۔ حاسدوں میں چونکہ بااثر لوگ بھی شامل تھے اس لیے بادشاہ نے انہیں طلب کر لیا۔

بادشاہ نے ان لوگوں سے پوچھا۔ ''آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟ اور تم سب حسین نامی ملامتی درویش سے اتنے خوفزدہ کیوں ہو؟''

حاسدوں کے نمائندے نے جواب دیا۔ ''ظل اللہ! ہمیں شیخ حسین سے کوئی عناد نہیں، ہاں اگر کسی بات کا دکھ ہے تو یہ کہ شیخ حسین درویشی کو بدنام کر رہا ہے۔ وہ اسلام کو ذلیل کر رہا ہے۔ جہاں پناہ خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ کسی درویش پر نماز اور روزہ کس طرح معاف کیا جا سکتا ہے۔ امرد پرستی کس مذہب میں جائز ہے؟ غرض شیخ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ شریعت کے مطابق نہیں ہے اور جب وہ سب شریعت کے مطابق نہیں ہے تو اسے درویش کس طرح مان لیا جائے؟''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''یہ امرد پرستی کا کیا چکر ہے؟''

جواب ملا۔ ''جہاں پناہ! مادھو نامی ایک ہندو حسین و جمیل لڑکا ہر وقت شیخ حسین کے ساتھ رہتا ہے اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مادھو نے شیخ حسین کی محبت میں اپنا مذہب ترک کر دیا ہے اور اسلام اختیار کر لیا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو ملک و ملت کے خلاف ہیں اور ان کا کسی نہ کسی طرح تدارک ہونا چاہیے۔''

اکبر نے جواب دیا۔ ''تم لوگ واپس جاؤ، میں شیخ حسین کے پاس آدمی بھیجوں گا، وہ تمہاری بتائی ہوئی باتوں کی تحقیقات کرے گا اور اگر یہ باتیں درست نکلیں تو شیخ حسین پر حد شرعی جاری کر دی جائے گی اور اسے اس کے کیے کی سزا مل کر رہے گی۔''

حاسد خوش خوش واپس چلے گئے کہ چلو معاملہ نمٹا اور شیخ حسین کا کام تمام ہوا۔ انہوں نے آپس میں مبارکبادیں دیں کہ آخر انہوں نے اپنے اور اسلام کے سب سے بڑے دشمن کو نیچا دکھا ہی دیا۔

اکبر نے مخدوم الملک، قاضی عبداللہ سلطان پوری، قاضی لاہور کو ایک تحریری فرمان جاری کیا کہ وہ فرمان کے ملتے ہی وہاں کے مشہور صوفی شیخ حسین سے ملاقات کریں اور دیکھیں کہ ان کے بارے میں جو خبریں گشت کر رہی ہیں ان میں کتنی صداقت ہے اور شیخ حسین کس حد تک فتنہ و فساد پھیلانے کا موجب قرار پاتا ہے۔

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ بے انتہا مال و زر رکھنے کے باوجود نہ حج کرتے ہیں، نہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور ان دونوں فرائض سے بچنے کا یہ حیلہ شرعی وضع کر لیا ہے کہ ہر سال رمضان سے پہلے ہی اپنا مال و زر اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیتے ہیں اور دوسرے سال اسے اپنے نام منتقل کر لیتے ہیں اس طرح اس مال و زر پر نہ سال پورا ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر حج اور زکوٰۃ واجب آتا ہے۔ ان کی اس حرکت کا بہتوں کو علم تھا لیکن کوئی کچھ کہتا نہیں تھا۔

مخدوم الملک نے شاہی فرمان کے پاتے ہی سواری تیار کی اور شیخ حسین کے پاس روانہ ہو گئے۔ ابھی ان کی سواری بازار ہی میں تھی کہ انہوں نے بازار میں ایک جگہ ہجوم دیکھا۔ اس ہجوم میں ڈھول بج رہا تھا اور ہجوم کوئی تماشا دیکھنے میں مشغول تھا۔ مخدوم الملک نے اپنے خادم سے کہا۔ ''ذرا معلوم تو کرنا یہ کیا ہو رہا ہے؟''

خادم بھاگا بھاگا ہجوم میں داخل ہو گیا اور ذرا دیر بعد واپس آ کر جواب دیا۔ ''حضور والا! ہجوم میں یہاں کے مشہور درویش شیخ حسین رقص کر رہے ہیں اور یہ ڈھول ان کے حکم پر بجایا جا رہا ہے۔''

مخدوم الملک نے سواری کا رخ ہجوم کی طرف کر دیا۔ ہجوم نے قاضی شہر کی سواری کو دیکھ کر راستہ دے دیا۔ مخدوم الملک نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ شیخ حسین رقص میں مشغول ہیں۔ انہوں نے ڈانٹا۔ ''شیخ حسین! تو یہ کیا کر رہا ہے؟''

شیخ حسین رک گئے۔ رقص موقوف ہوا۔ مخدوم الملک کو دیکھ کر مسکرائے، کہا۔ ''خوش آمدید تارک حج و زکوٰۃ۔''

مخدوم الملک نے سختی سے سوال کیا۔ ''تو یہ جو کچھ برسر عام کر رہا ہے، کیا یہ تجھے زیب دیتا ہے؟''

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ''جب تک یہ سب مجھے زیب دیتا ہے میں اس کا برسر عام اظہار کرتا رہوں گا اور جس دن یہ محسوس کروں گا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تو یہ کام نہ خلوت میں ہوگا نہ جلوت میں۔''

مخدوم الملک نے پوچھا۔ ”کیا تو درویشی کا دعوے دار ہے؟“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”میں کسی بات کا بھی دعوے دار نہیں، نہ درویشی کا نہ قلندری کا۔“

مخدوم الملک نے کہا۔ ”مجھے آج ہی فرمان شاہی موصول ہوا ہے اور اس میں مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں تیرے اقوال، افعال، احوال اور اعمال سے بادشاہ کو مطلع کروں۔“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”اقوال تو تو نے سن لیے کہ میں نے تجھے دیکھتے ہی خوش آمدید تارک حج وزکوۃ کہہ کر مخاطب کیا۔ اب رہا افعال کا مسئلہ تو میرا ایک فعل تو تیرے سامنے ہے تو جتنا کا بھی کچھ اندازہ کر سکتا ہے۔ رہا میرے اعمال اور احوال کا مسئلہ تو یہاں تک تیری رسائی نہیں، ان پر پردہ ہی پڑا رہنے دے۔“

مخدوم الملک نے غصے میں کہا۔ ”شیخ حسین! میں قاضی شہر ہوں۔ مجھ سے تمسخر نہ کر اور میری باتوں کے صحیح صحیح جواب دے۔“

شیخ حسین نے مخدوم الملک کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور پوچھا۔ ”عبداللہ! تو قاضی شہر ہے اور خوب جانتا ہوگا کہ ارکان اسلام کتنے ہیں؟ اگر نہ معلوم ہوں تو مجھ سے پوچھ لے۔“

مخدوم الملک نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ ارکان اسلام کتنے ہیں؟ یہ بیکار سوال مجھ سے مت کر۔“

شیخ حسین نے کہا۔ ”تو میرے سوال کو بیکار کہہ رہا ہے، حالانکہ میرے اس سوال کے جواب پر ہی اس بحث کا خاتمہ ہو جائے گا اور تو میرے مقابلے سے باز آجائے گا۔“

مخدوم الملک نے کہا۔ ”تو بہت ہوشیار معلوم ہوتا ہے، پوچھ مجھ سے، میں دیکھتا ہوں تو مجھ سے کس طرح پیچھا چھڑاتا ہے؟“

شیخ حسین نے پھر سوال کیا۔ ”ارکان اسلام کتنے ہیں قاضی شہر؟ ان کی تفصیل تو سنانا۔“

مخدوم الملک نے جواب دیا۔ ”پانچ، اول کلمہ توحید، دوم اقرار رسالت حضرت سرور کائنات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سوم صوم وصلوۃ، چہارم زکوۃ، پنجم حج۔“

شیخ حسین نے سینے میں اتر جانے والی نظروں سے مخدوم الملک کو دیکھا اور کہا۔ ”مخدوم الملک ابتدائی دو رکن کلمۂ توحید اور اقرار رسالت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہم دونوں ہی شریک ہیں لیکن بقیہ میں سے نماز اور روزے کا میں تارک ہوں اور حج وزکوۃ کا تو۔ اگر کوئی تعزیر ہے تو صرف مجھ پر ہی نہیں تجھ پر بھی ہے۔ تو بادشاہ کو لکھ دے کہ ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں، یکساں ہیں۔“

مخدوم الملک اس جواب سے چکرا گیا، پھر مسکرایا اور اپنے گھر واپس چلا گیا۔ اس نے بادشاہ کو لکھ دیا کہ میں نے شیخ حسین سے ملاقات کی، وہ ایک مست و مدہوش درویش ہے اور مستوں پر کوئی تعزیر نہیں۔ اس ناچیز کی ذاتی رائے کے مطابق شیخ حسین کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے۔

حاسدوں کا یہ حربہ بے کار گیا تو انہوں نے پھر بادشاہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے حسین ابن منصور حلاج کی مثال دی اور بادشاہ پر واضح کیا کہ عہد بنو عباس کا حسین بھی تو مست و مدہوش تھا۔ اس پر بھی حد شرعی جاری کر دی گئی تھی، پھر شیخ حسین کو کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے؟

اکبر کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ شیخ حسین کے خلاف کوئی کارروائی کس طرح عمل میں لائی جائے؟ اس نے یہ مسئلہ اس وقت تک کے لیے التوا میں ڈال دیا جب تک کہ وہ خود لاہور نہ پہنچ جائے۔

لاہور میں داخل ہوتے ہی بادشاہ کو مطلع کیا گیا کہ دو آدمیوں نے لاہور کے اہل ایمان اور شرفا کو بہت پریشان کر رکھا ہے۔

بادشاہ نے پوچھا۔ ”وہ دو کون کون ہے؟“

لوگوں نے جواب دیا۔ ”عبداللہ بھٹی راہزن اور شیخ حسین درویش۔ ایک تو لوگوں کے مال وزر کو لوٹ رہا ہے اور اس کی موجودگی میں کسی بھی شخص کا مال وزر محفوظ نہیں ہے اور دوسرے کی وجہ سے اہل اللہ اور اہل ایمان کے عقائد محفوظ نہیں ہیں۔“

بادشاہ نے شہر کے کوتوال کو طلب کیا اور اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے تو عبداللہ بھٹی راہزن کو گرفتار کیوں نہیں کر پاتا؟“

کوتوال نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”حضور کے اقبال سے یہ راہزن کئی بار قابو میں آتے آتے رہ گیا لیکن حضور کے قدم جیسے ہی لاہور میں داخل ہوئے، یہ ناچیز عبداللہ بھٹی راہزن کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ میری قید میں ہے اور اس کے بارے میں حضور جو حکم دیں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔“

بادشاہ نے کہا۔ "اس کو فوراً ہی پھانسی دے دی جائے، کیونکہ اگر وہ چھوٹ گیا تو لوگوں کو پہلے سے زیادہ تنگ کرے گا۔"

کوتوال حکم پا کر جانے لگا تو بادشاہ نے اسے روک لیا اور کہا۔ "ایک بات کا خاص خیال رکھنا۔"

کوتوال نے عرض کیا۔ "حضور کی ہر بات خاص خیال میں رکھنے کے لائق ہوتی ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "جب تو عبداللہ بھٹی راہزن کو پھانسی دینے لگے تو اس وقت اس کی مزاجی کیفیت بالکل مختلف ہوگی۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں وہ جو کچھ کہے تو انہیں من وعن لکھ کر میرے پاس بھیج دے گا۔"

کوتوال نے جواب دیا۔ "جیسا حضور کا حکم۔"

بادشاہ نے کہا۔ "اور اس کام سے فارغ ہو کر تو شیخ حسین کو گرفتار کرے گا پھر میں جو حکم دوں گا تو اس کی تعمیل کرے گا۔"

کوتوال چلا گیا۔ اس نے عبداللہ بھٹی راہزن کو قید خانے سے نکالا اور طنزاً کہا۔ "او بدبخت انسان! کیا تجھے معلوم ہے کہ بادشاہ نے تیرے لیے کیا حکم دیا ہے؟"

راہزن نے جواب دیا۔ "مجھے کیا پتا؟ جب تو بتائے گا تبھی تو میں جانوں گا۔"

کوتوال نے کہا۔ "بادشاہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فوراً ہی تجھے پھانسی دے دوں کیونکہ تیری زندگی میں ہمیشہ یہ اندیشہ موجود رہے گا کہ اگر تو کسی طرح رہا ہو گیا تو اللہ کی مخلوق پر پہلے سے کہیں زیادہ ظلم و جور کرے گا۔"

راہزن سزائے موت کا حکم سن کر سناٹے میں آ گیا، بولا۔ "اکبر کہنے کو تو بادشاہ ہے لیکن ہے بڑا کمین۔ اتنا بڑا بادشاہ اور ایک راہزن کے وجود سے یوں گھبراتا ہے گویا میں اس سے بھی بڑا راہزن ہوں۔ خدا چھوٹے راہزن جیسا بڑے راہزن کا بھی حشر کرے۔"

کوتوال نے راہزن کے آخری کلمات لکھ لیے اور اسے پھانسی دے دی۔ بادشاہ کو ساری روداد لکھ کر روانہ کر دی اور اس کے فوراً بعد شیخ حسین کی طرف متوجہ ہوا۔ شیخ کا کہیں پتا نہ تھا۔ آخر ایک بازار میں اس نے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ اس نے لوگوں سے پوچھا۔ "یہ ہجوم کیسا ہے؟"

کسی نے جواب دیا۔ "جناب کوتوال صاحب! اپنے شیخ حسین حالت وجد میں رقص فرما رہے ہیں۔"

مارے خوشی کے کوتوال کی باچھیں کھل گئیں۔ اپنے سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھا اور ہجوم کو منتشر کر دیا۔ کوتوال نے شیخ حسین کو للکارا۔ "حسین! خبردار جو بھاگنے کی کوشش کی۔ میں بادشاہ کے حکم پر تجھے گرفتار کرنے آیا ہوں۔"

شیخ حسین نے ہنس کر کوتوال کی طرف دیکھا اور کہا۔ "حیرت کہ مردہ زندہ کو گرفتار کر رہا ہے۔ غلام، آزاد کو پکڑ رہا ہے۔"

کوتوال پر ان کی ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا، بولا۔ "جو کچھ کہنا سننا ہے خوب اچھی طرح کہہ سن لے، پھر بولنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔"

شیخ حسین نے پوچھا۔ "کیا تو گرفتار کر کے میری قوت گویائی بھی چھین لے گا؟"

کوتوال نے جواب دیا۔ "میں کیوں چھیننے لگا تیری قوت گویائی، یہ اختیار تو بادشاہ کو ہے، وہ جو حکم دے گا اس پر عمل کیا جائے گا۔"

شیخ حسین نے پوچھا۔ "یہ اختیار کس کی ذات کو ہے؟ تیرے بادشاہ کو یا کل جہان کے بادشاہ کو؟"

کوتوال نے جواب دیا۔ "سردست تو میں اکبر بادشاہ کو جانتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس نے تیرے بارے میں کیا حکم دیا ہے یا کیا حکم دے گا؟"

شیخ حسین نے ہنس کر کوتوال کا مذاق اڑایا۔ "کوتوال! تیرا دماغ چل گیا ہے، یہاں ایک ہی بادشاہ کا حکم چلتا ہے، اکبر بادشاہ کا نہیں۔ اکبر بادشاہ تو خود نہیں جانتا کہ اس سے بڑے بادشاہ نے کیا حکم دے رکھا ہے۔"

کوتوال نے کہا۔ "مجھے لوگوں نے پہلے ہی سے یہ بتا دیا ہے کہ تو شعبدے باز بھی ہے اور باتیں بھی پراسرار اور چکر میں ڈال دینے والی کرتا رہتا ہے۔"

شیخ حسین نے کہا۔ "اچھا پھر جو تیری سمجھ میں آئے، کر۔"

کوتوال نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ انہیں زنجیروں سے جکڑ دیا جائے۔

سپاہی زنجیر لے کر آگے بڑھا اور شیخ حسین کو زنجیروں سے جکڑنے لگا لیکن جیسے ہی زنجیر ان کے جسم سے لگی، ٹوٹ کر نیچے گر

گئی۔ کوتوال نے حکم دیا۔ "دوسری زنجیر سے جکڑ دیا جائے۔"

دوسری زنجیر لائی گئی اور شیخ حسین کو اس سے جکڑنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ بھی ٹوٹ گئی۔ اب سپاہیوں کو خوف محسوس ہونے لگا اور وہ پیچھے ہٹ گئے، بولے۔ "جناب! ہم اس درویش کے عتاب میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے۔"

کوتوال نے ان سب کو ڈانٹا اور کہا۔ "تم سب ہٹ جاؤ، تم واہی ہو، حالانکہ تمہیں یہ بات پہلے سے معلوم ہونا چاہیے تھی کہ شیخ حسین لاہور کا بہت بڑا شعبدے باز ہے۔" پھر شیخ حسین سے کہا۔ "تو اپنے شعبدوں سے جو چاہے کر لیکن میں تجھے بھاگنے نہیں دوں گا، میں تیرے پاؤں میں میخیں ٹھونک دوں گا اور اسی حالت میں تجھے بادشاہ کے روبرو پیش کروں گا۔"

شیخ حسین مسکرائے بولے۔ "خوب! جو بات تیرے ساتھ پیش آنے والی ہے اس کو تو مجھ سے منسوب کر رہا ہے۔ ابھی ابھی میں نے خدا سے یہ درخواست کی ہے کہ خدایا تو شہر کوتوال کے جسم میں میخیں ٹھکوا دے اور تیرا اسی صدمے سے انتقال ہو۔ تو اپنے بادشاہ سے اس قسم کی کوئی درخواست کر، مجھے یقین ہے کہ وہ تیری درخواست نہیں مانے گا لیکن میرا بادشاہ جو کل جہانوں کا اور سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے میری درخواست نہیں رد کرے گا کیونکہ میں جو کچھ درخواست کرتا ہوں اس کی ایما اور خواہش پر کرتا ہوں۔"

کوتوال نے ہنس کر کہا۔ "تو واقعی پاگل معلوم ہوتا ہے۔ مخدوم الملک نے بادشاہ کو لکھا تھا کہ شیخ حسین مست و مدہوش انسان ہے، اب میں تجھے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے وقت عرض کروں گا کہ تو دیوانہ تو ہے لیکن ایسا دیوانہ جو بکار خویش ہوشیار ہوتا ہے اور جس پر تعزیر ضروری ہو جاتی ہے۔"

کوتوال نے شیخ حسین کو قید کر دیا۔ وہ ابھی اسی فکر میں تھا کہ بادشاہ کو شیخ حسین کی گرفتاری کی خبر بھیج دے اور معلوم کرے کہ انہیں کیا سزا دینی ہے کہ بادشاہ کا ہرکارہ ایک دوسرا فرمان لے کر حاضر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا اور اس شخص کے پیچھے شاہی سواروں کا ایک دستہ تھا۔ شاہی ہرکارے نے بادشاہ کا فرمان کوتوال کو پڑھ کر سنایا۔

"اس تحریر کے جرم میں جو کوتوال نے عبداللہ بھٹی کے آخری کلمات کے طور پر ہمیں لکھ بھیجا ہے، ہم کوتوال کو معزولی اور سزائے موت کا حکم دیتے ہیں۔ کوتوال کو اتنی عقل اور شعور تو ہونا ہی چاہیے کہ شاہوں کو یوں نہیں لکھا جاتا۔ وہ غور کرے کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے ما بدولت کو سخت ذہنی کوفت ہوئی ہے اور وہ کوتوال کو سزائے موت دینے میں خود کو حق بجانب خیال کرتے ہیں۔"

شاہی ہرکارے کے ساتھ جو شخص آیا تھا، اسے کوتوال مقرر کیا گیا تھا۔

سابق کوتوال کو عبداللہ بھٹی راہزن کی جگہ پر لے جا کر اس طرح ہلاک کر دیا گیا کہ اس کے سارے جسم میں میخیں ٹھونک دی گئی تھیں۔ اس کے بعد نیا کوتوال شیخ حسین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بولا۔ "شیخ حسین! تجھے بادشاہ نے طلب کیا ہے۔"

شیخ حسین نے جواب دیا۔ "بابا میرا کیا ہے جہاں چاہو بھیج دو لیکن میں بھی اپنی مرضی کا مالک ہوں، وہیں رہوں گا جہاں میرا جی چاہے گا۔"

کوتوال کی سمجھ میں ان کی بات نہیں آئی لیکن اس نے انہیں بادشاہ کے پاس روانہ کر دیا۔

شیخ حسین اس انداز میں بادشاہ کے روبرو گئے کہ ان کے ایک ہاتھ میں صراحی تھی اور دوسرے میں پیالہ تھا۔ بادشاہ نے دیکھتے ہی سوال کیا۔ "شیخ حسین! تو بہلول دریائی کا مرید ہے اور وہ سلسلۂ قادریہ کے بزرگ ہیں۔ کیا تیرے پیر و مرشد نے تجھے شراب نوشی کی اجازت دے رکھی ہے؟ اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تو امرد پرست بھی ہے؟"

اس وقت شیخ حسین کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور پورا جسم نشے سے چور محسوس ہو رہا تھا۔ شیخ حسین نے بادشاہ سے کہا۔ "کیا تو میری شراب نوشی اور امرد پرستی میں گواہ پیش کر سکتا ہے؟"

بادشاہ نے اس کی صراحی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس میں کیا ہے اور تیری سرخ آنکھیں اور مخمور جسم اس بات کے گواہ ہیں کہ تو مے نوشی کرتا ہے، رہا امرد پرستی کا معاملہ تو اس کے بھی گواہ مل جائیں گے۔"

شیخ حسین نے صراحی کو پیالے پر جھکا دیا اور پیالہ بھر کے بادشاہ کو پیش کیا، کہا۔ "ذرا اس کا ذائقہ تو ملاحظہ فرمائیں۔"

بادشاہ نے اسے چکھا تو یہ محض سرد پانی تھا۔

اس کے بعد اس صراحی سے دوسرا پیالہ بھرا اور بادشاہ کی طرف بڑھا دیا، کہا۔ "اور ذرا اسے تو چکھیے۔"

بادشاہ نے اسے چکھا تو یہ شربت نکلا۔

شیخ حسین نے تیسرا پیالہ پیش کیا۔ اس میں دودھ تھا۔ بادشاہ کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے کیا سنا تھا اور کیا واقعہ تھا۔ شیخ

حسین نے بادشاہ سے پوچھا۔ "میری بے ہوشی بادشاہ نے ملاحظہ فرمائی؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "ہاں، لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایک ہی صراحی سے یہ تین چیزیں کس طرح برآمد ہوئیں؟"

شیخ حسین نے کہا۔ "اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں اور نہ ہی شاہی قانون مجھ سے مواخذہ کر سکتا ہے کہ میں نے اس سوال کا جواب کیوں نہیں دیا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "بیشک آپ نے جو کچھ فرمایا، بجا ہے لیکن میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے خود کو بدنام کیوں کر رکھا ہے؟"

شیخ حسین نے جواب دیا۔ "بادشاہ! میں اپنے آس پاس عقیدت مندوں کا اژدحام نہیں پسند کرتا۔ میں چاہتا ہوں، لوگ میری پرستش نہ کریں۔ پرستش کے لیے خدا کی ذات کافی ہے۔ میں خود کو بدتر از خلائق اس لیے ثابت کرتا ہوں کہ میں بندہ ہوں اور بندہ ہی رہنا چاہتا ہوں۔ مخلوق کا کیا ہے یہ گھڑی بھر میں خالق بنا سکتی ہے۔"

بادشاہ نے حکم دیا۔ "اسے قید خانے میں ڈال دیا جائے، جب تک میں اچھی طرح تحقیق اور غور نہ کرلوں، شیخ حسین کو نہ تو کوئی سزا دے سکتا ہوں اور نہ ہی رہا کر سکتا ہوں۔"

بادشاہ کا یہ حکم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ عام اور خاص، سب کا یہی خیال تھا کہ بادشاہ کے دل پر شیخ حسین کی کرامت اور باتوں کا اثر ضرور ہوا ہوگا اور بادشاہ ان کے احترام اور رہائی پر مجبور ہو جائے گا لیکن جب بادشاہ نے شیخ حسین کو داخل زنداں کرنے کا حکم دیا تو حیران رہ گئے۔

بادشاہ شیخ حسین کو داخل زنداں کرا کے زنان خانے میں چلا گیا۔ وہاں بادشاہ بیگم کے پاس اس نے کسی کو کھڑے دیکھا۔ زنان خانے میں کسی غیر مرد کا کس طرح گزر ہو سکتا تھا۔ بادشاہ غصے میں آگے بڑھا اور بادشاہ بیگم سے پوچھا۔ "بادشاہ بیگم! یہ کون کھڑا ہے تیرے پاس؟"

بادشاہ بیگم نے مڑ کر بادشاہ کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ بادشاہ نے اس شخص کو پہچان لیا تھا۔ یہ شیخ حسین تھے جو چپ چاپ بادشاہ بیگم کے پاس کھڑے تھے۔ بادشاہ تو انہیں داخل زنداں کرآیا تھا، پھر یہ یہاں کس طرح آ گئے؟ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی۔ وہ زنان خانے سے باہر چلا گیا اور حکم دیا کہ میں قید خانے میں شیخ حسین سے ملنا چاہتا ہوں۔

بادشاہ کو اسی وقت قید خانے کا معائنہ کرایا گیا۔ وہاں شیخ حسین موجود تھے۔ بادشاہ نے کہا۔ "شیخ حسین! تم جو کچھ بھی ہو میں جانتا ہوں، پھر اس کرامت کی کیا ضرورت تھی؟"

شیخ حسین نے جواب دیا۔ "اگر تو مجھ سے واقعی واقف ہوتا تو مجھے اس کرامت کی ضرورت نہ پیش آتی۔ بادشاہ! سچ بتا، کیا تو نے مطمئن ہونے کے بعد بھی مجھے اس خیال سے داخل زنداں نہیں کرایا تھا کہ تیرے دل میں یہ ذرا سا شبہ اس وقت بھی موجود تھا کہ اگر میں واقعی کچھ ہوں تو زنداں میں ڈال دیے جانے کے بعد کسی نہ کسی طرح اس کا اظہار ہو جائے گا۔"

بادشاہ نے شرمندگی سے کہا۔ "بیشک، میں نے آپ کی بابت کچھ اسی طرح سوچا تھا اور اب اس پر شرمندہ ہوں۔"

شیخ حسین نے کہا۔ "اب اپنی شرمندگی دور کرلے اور اپنا اور میرا وقت نہ ضائع کر۔ مجھے جانے دے۔"

بادشاہ نے اسی وقت شیخ حسین کو رہا کر دیا۔

شیخ حسین قید خانے سے نکل کر زوراسنجیدہ ہو گئے۔



اس واقعے کے بعد چاروں طرف یہ بات مشہور ہونے لگی کہ شیخ حسین نے صراحی توڑ دی، پیالہ پھینک دیا۔ رقص و سرود سے منہ موڑ لیا اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے آپ کے اردگرد میلا سا لگا دیا لیکن آپ نے انہیں منع کیا کہ اگر خود کچھ نہیں کرتے تو ایک درویش کے اوقات بندگی میں مخل بھی نہ ہوں۔

اسی دوران عبدالرحیم خان خاناں کو ٹھٹھہ کی تسخیر پر مامور کر دیا گیا۔ خان خاناں سیدھا لاہور پہنچا اور آپ کی خدمت میں حاضری دی، بولا۔ "حضرت! میرا خیال ہے مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں آپ کی خدمت میں کیوں حاضر ہوا ہوں۔"

شیخ حسین نے جواب دیا۔ "اپنا کام بتا، میرا وقت نہ برباد کر، جہاں اور جس مقصد سے جا رہا ہے، چلا جا لیکن ایک بات میری بھی یاد رکھ۔"

خان خاناں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے پیر و مرشد؟"
آپ نے جواب دیا۔ "یہ بات کہ تیرے سپرد جو کام کیا گیا ہے اس کے صلے میں تجھے بہت کچھ ملے گا؟"
خان خاناں نے عرض کیا۔ "حضرت! میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آرہی ہے۔"
آپ نے کہا۔ "میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تیرے ذمے جو کام کیے گئے ہیں ان کا معاوضہ تو تجھے ملتا ہی ہوگا؟"
خان خاناں نے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ ان کا معاوضہ ملتا ہے اور اگر اس مہم میں کامیاب ہوا تو اور بہت کچھ ملے گا۔"
شیخ حسین نے فرمایا۔ "پھر میں نے بھی پانچ سو روپوں میں یہ معاملہ کیا۔ ٹھٹھہ کا ملک میں نے پانچ سو روپوں کے عوض دیا۔"
خان خاناں نے پانچ سو روپے دینا چاہے لیکن آپ نے نہیں لیے، فرمایا۔ "جاؤ مظفر و منصور ہوگے لیکن کسی اور ولی سے مدد نہ مانگنا۔"
خان خاناں نے پوچھا۔ "اور پانچ سو روپے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "واپسی میں دے دینا۔"
خان خاناں نے ٹھٹھہ جاتے ہوئے ملتان میں بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی اور فاتحہ خوانی کے بعد شیخ کبیر بالا پیر سجادہ نشین بارگاہ کی خدمت میں ایک سو روپے بطور نذرانہ پیش کیے۔ شیخ کبیر بالا پیر نے یہ رقم نہیں لی۔ خان خاناں نے پوچھا۔ "حضرت! نذرانہ قبول نہ کرنے کا سبب؟"
شیخ نے جواب دیا۔ "مجھے نذرانہ قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ بات بزرگوں میں مشہور ہو چکی ہے کہ شیخ حسین نے پانچ سو روپوں کے عوض ٹھٹھہ پہلے ہی آپ کے حوالے کر دیا ہے اس لیے نذرانہ قبول کرنے کی حاجت نہیں رہی۔"
خان خاناں ٹھٹھہ گیا اور کامیاب ہوا۔
لیکن اب شیخ حسین شریعت کی پابندی کر رہے تھے۔ اب تک ان کے مریدوں کی تعداد دو ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ ان میں سے سولہ خلفا نے بڑی شہرت پائی۔ آپ نے ان میں چار چار کو الگ الگ خطابات دے رکھے تھے۔ چار کا خطاب غریب تھا، مثلاً
پہلا شاہ غریب۔ ان کا مزار موضع رتی ٹھٹھہ وزیر آباد کے قریب واقع ہے۔ دوسرا شاہ غریب۔ موضع منگووالی تحصیل وزیر آباد۔ تیسرا شاہ غریب، بمقام اچیلا پور دکن۔ چوتھا شاہ غریب ہزاروی۔ ان کا مزار آپ کے مزار سے متصل ہے۔
چار کو دیوان کا خطاب ملا تھا۔
پہلا دیوان مادھو۔ یہ وہی مادھو ہیں، جن کی بابت یہ مشہور تھا کہ شیخ حسین کے منظورِ نظر ہیں۔ یہ قوم کے برہمن تھے لیکن شیخ حسین کی رغبت سے مسلمان ہو گئے تھے۔ شاہدرہ میں رہتے تھے۔ 983 ہجری میں پیدا ہوئے۔ 1052 ہجری میں وفات پائی۔
دوسرا دیوان گورکھ لاہور۔ ان کا مزار آپ کے مزار کی چوکھنڈی میں ہے۔ تیسرا دیوان بخش۔ بمقام بٹالپور۔ چوتھا دیوان اللہ دیوان۔ لاہور میں مدفون ہے۔
چار کو خاکی کا خطاب عطا ہوا تھا۔
پہلا مولا بخش خاکی۔ دوسرا خاکی شاہ لاہوری۔ ان کا مزار آپ کے مزار کے قرب و جوار میں ہے۔ تیسرا خاکی شاہ وزیر آباد۔ چوتھا حیدر بخش خاکی۔ ان کا مزار دکن میں ہے۔
چار کو بلاول کا خطاب بخشا گیا تھا۔ اول شاہ رنگ بلاول۔ دوم بدھو بلاول۔ سوم شاہ بلاول۔ یہ تینوں شیخ حسین کے مزار کے قرب و جوار میں دفن ہیں۔
چہارم شاہ بلاول۔ یہ دکن میں مدفون ہیں۔
شیخ حسین کی پیدائش 945 ہجری اور سن وفات 1008 ہجری ہے۔ آپ پنجابی زبان کے شاعر بھی تھے اور آپ کی کافیاں بہت مشہور ہیں۔ تقریباً اسی سال بعد شیخ حسین کی عظمت اور بزرگی کا مشہور صوفی شیخ محمد طاہر لاہوری نے اس طرح اعتراف کیا۔
"اگر مجھے علمائے ظاہر کے طعنوں کا خدشہ نہ ہوتا تو میں ضرور شاہ حسین لاہوری کے مزار پر جاتا اور استمداد کرتا۔"

خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ معارج الولایت، قلمی بحوالہ خزینۃ الاصفیا۔ حقیقۃ الفقرا، بحوالہ خزینۃ الاصفیا۔ مفتاح العارفین (قلمی)، عبدالفتاح بن نعمان۔ حسنات العارفین، شہزادہ دارا شکوہ۔

پتا ہم لوگوں کو دو دن کے بعد لگا جب میں اور شازیہ ہنگامی طور پر کنساس پہنچے۔ ہوا یہ تھا کہ اس دن ناہید اپنے تینوں بچوں کو اسلامک سینٹر کے مسجد کے امام کے گھر ان کی بیوی کے پاس چھوڑ کر آئی جس کے شوہر کو نادر اس کی جاسوسی کے لیے کہہ کر گیا تھا۔ امام صاحب نے اپنے بیٹے کے ساتھ ناہید کا پیچھا کیا اور دیکھا کہ وہ تن تنہا میریٹ ہوٹل گئی جہاں سے چھ گھنٹے بعد واپس آئی تھی۔ ہوٹل میں چار گھنٹے گزرنے کے ساتھ ہی انہوں نے نادر کو فون پر یہ خبر دی کہ بچے ان کے گھر پر ہیں اور ناہید کئی گھنٹوں سے ہوٹل کے اندر ہے۔

نادر کے لیے یہ بڑی ہولناک خبر تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فوری طور پر جہاز پکڑ کر واپس آیا اور رات دس بجے غیر متوقع طور پر گھر پہنچ گیا تھا۔ ناہید کے حیرت کے اظہار پر اس نے اس وقت ناہید کی پٹائی شروع کر دی، طرح طرح کے الزامات لگائے، خرافات بکی، گالیاں دیں۔ ''عیاشی کرتی ہے حرامزادی۔ یہ صلہ دیا ہے میرے احسانوں کا'' کہہ کر نہ جانے کیا مارا تھا کہ ناہید کا چہرہ خون خون ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ناہید کے 9 سالہ بیٹے نے باورچی خانے سے 911 پر فون کر دیا اور پولیس پہنچ گئی۔ ناہید کو سر اور منہ پر ٹانکے لگانے کے لیے اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ نادر کو پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔ مگر اچھا یہ ہوا کہ واپس آنے کے بعد ناہید نے جہنم سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے شازیہ کو فون کر کے بتایا تھا۔ میں اور شازیہ دوسرے دن ہی پہنچ گئے تھے۔

میرے سوال کا جواب مجھے اس دن نہیں دیا تھا اس نے کیونکہ اس دن وہ جہنم سے نکلنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے شہر کے مشہور یہودی وکیل سے بات کی جس نے عدالت سے ابتدائی فیصلہ کرایا تھا کہ اس کا شوہر اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ پولیس کی زیر نگرانی وہ اپنا کچھ سامان لے گیا تھا۔ عدالت کے حکم کے ہی مطابق اسے ناہید کو گھر اور بچوں کے لیے پیسے دینے تھے اور اسے ہفتے میں دو دن سوشل ورکر کے سامنے آ کر بچوں سے ملنے کی اجازت ملی تھی۔ میں نے 20 ہزار ڈالرز ناہید کے اکاؤنٹ میں جمع کرائے تھے تاکہ وہ یہ نہ محسوس کرے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ناہید کے دونوں بھائی جو دوسرے شہروں میں تھے وہ بھی آئے مگر انہوں نے ناہید پر زور دیا تھا کہ وہ نادر سے صلح کر لے، کراچی میں اس کے گھر والوں کا بھی یہی خیال تھا مگر میڈیکل کالج والی ناہید واپس زندہ ہو گئی تھی اس نے وہی کیا جس کا فیصلہ وہ کر چکی تھی۔

چھ مہینے کے اندر طلاق کی تمام شرائط طے ہو گئیں اور ناہید بچوں کو لے کر کنساس سے فلوریڈا شازیہ کے گھر کے پاس آ گئی جو میرے شہر سے بھی صرف دو گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ وہیں ایک مکان میں رہ کر ناہید نے ڈیڑھ سال کے اندر امریکن امتحان پاس کر لیے اور ہم سب کی مدد سے اسے ریذیڈنسی بھی مل گئی جو وہ ہمیشہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کا سارا اعتماد، وقار، خوب صورتی واپس آ گئی تھی، وہ وہی ناہید تھی جو کراچی میں ہمارے ساتھ ہوتی تھی۔

ایک دن میں نے دوبارہ اس سے اپنا سوال کر لیا کہ آخر کیوں پڑھی لکھی ہو کر وہ گھونسے لاتیں، تھپڑ کھاتی رہی۔ آخر ڈاکٹر کیوں بنی تھی وہ اگر اس کو یہی سب کچھ کرنا تھا۔

''بات یہ ہے کہ شادی کے شروع کے دنوں میں ہی ا... پھر اس کے بعد یکے بعد دیگرے حمل سے ہوتی چلی گئی کیونکہ نادر کی یہی خواہش تھی۔ اسے بچوں کا شوق تھا۔ پھر اس نے پہلے سال ہی پتا نہیں کیا کیا، یکے بعد دیگرے میرے دونوں چھوٹے بھائیوں کو امریکا بلوا لیا اور ان کی پڑھائی کی ذمہ داری بھی لے لی۔ انہی دنوں میرے ابو بیمار پڑے تو ایک خطیر رقم ان کے علاج کے لیے اس نے پاکستان بھیج دی۔ یہ سارے احسان تھے ایک کے بعد ایک۔ ایک طریقہ تھا مجھے اس بات پر راضی کرنے کا کہ مجھے پڑھنے کی اور خود مختار ہونے کی کیا ضرورت ہے اور اس جال میں، میں پھنستی چلی گئی۔ میں نے سب کچھ برداشت کیا زبردستی برقعہ، پردہ، مار پیٹ، پہلی شادی کا دھوکا، جاسوسی، سب کچھ محض اس لیے کہ اس کے احسانات تھے میرے بھائیوں پہ، میرے باپ پہ، میرے خاندان پہ اور شاید میں یہ قیمت دیتی ہی رہتی اگر اس دن میرے بیٹے نے 911 کو فون نہ کیا ہوتا۔ اس دن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شازیہ صحیح کہتی ہے کہ کہیں سے تو اس جہنم سے نکلنا ہوگا۔ تم اب سمجھ گئے ہو گے۔'' میری بات اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

میرے کچھ کہنے سے قبل بڑی اداسی سی اس کے چہرے پر آ گئی اور وہ بولی کہ اس کے دونوں بھائی ابھی تک اس کے خلاف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں نے خاندان کی عزت امریکا میں بیچ دی ہے۔ شکر ہے میں امریکا میں ہوں پاکستان میں نہیں۔ وہاں تو شاید یہ مجھے زندہ ہی جلا دیتے۔ اس کے چہرے پر اداسی گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

''خدا کرے میرے بھائیوں کی شادی پاکستان میں نہ ہو۔'' اس نے پھر دھیرے سے کہا۔

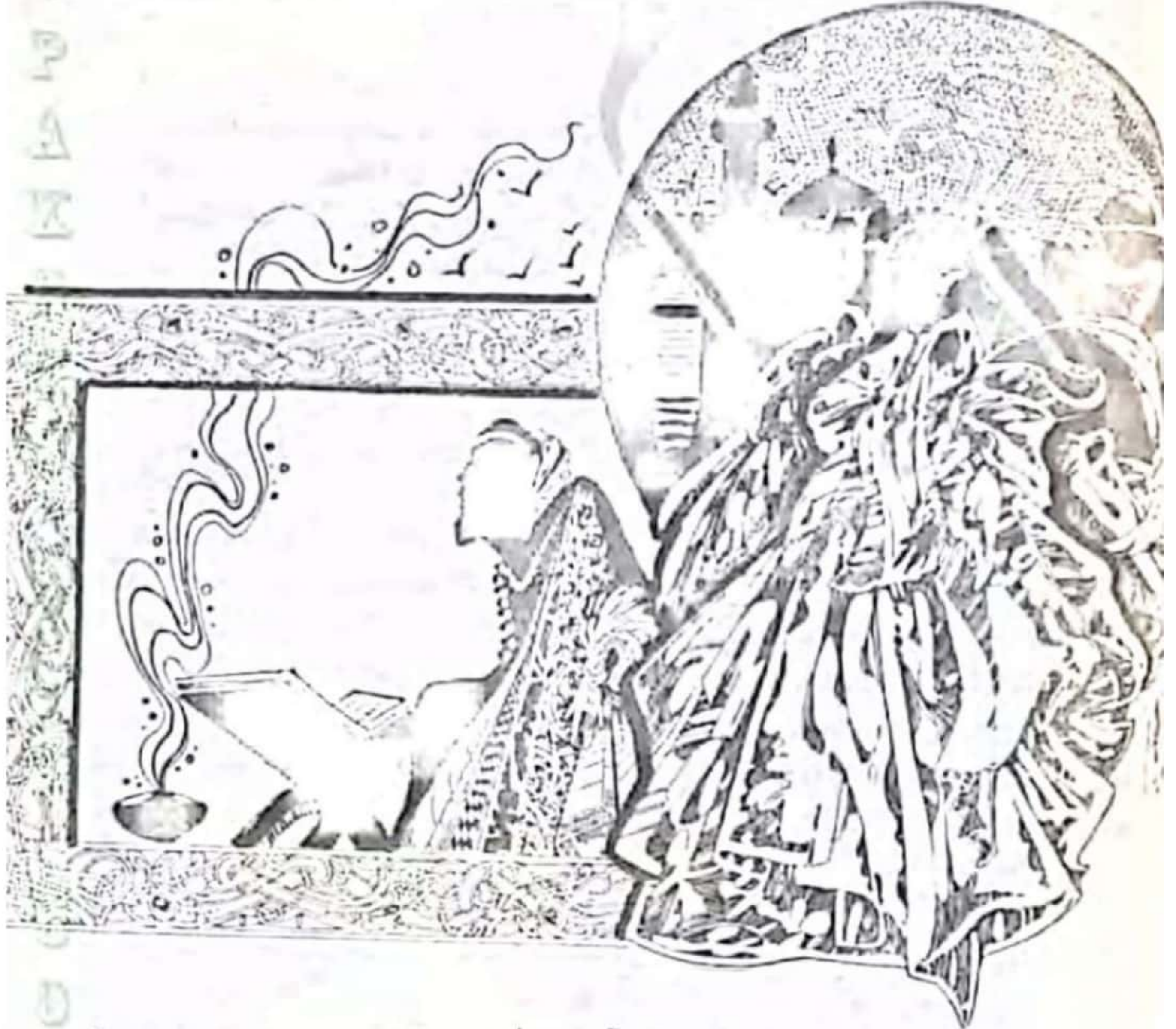
مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔ میں سوچتا رہا عورت آخر کب تک لڑے گی دوسروں کے لیے؟ کب کھڑی ہوگی اپنے لیے، اپنی ذات کے لیے؟

شمع فروزاں

ضیا تسنیم بلگرامی

ولیوں کی شان ہوتی ہے کہ وہ عہد ساز ہوکر بھی کسی دنیاوی عہدے کے متمنی نہیں ہوتے۔ محبت اور رواداری کا درس دیتے ہیں مگر کسی احسان کے روادار نہیں ہوتے... آپ کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا... جب کم سنی میں ہی آپ کو حج کرنے کا شوق ہوا اور ایک لمبا سفر اختیار کیا... اس کے بعد پھر آپ کو کسی ایک جگہ بیٹھنا بہت کم نصیب ہوا۔

کٹھن آزمائشوں میں پورا اترنے والے ایک اور معتبر ولی کا قصہ



بارہ تیرہ سال کی عمر ہی میں آپ نے خاموشی اختیار کرلی تھی، حصول علم کا بے حد شوق تھا۔ اسی دوران آپ نے حاجیوں کا ایک قافلہ دیکھا جو مکہ معظمہ کی جانب چلا جا رہا تھا۔ آپ نے دوڑ کر قافلے والوں سے ملاقات کی اور کہا۔ ”کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ لوگ ایک دن رک جائیں اور آپ کے قافلے میں، میں بھی شامل ہو جاؤں؟“

قافلے کے امیر نے لڑکے کو غور سے دیکھا اور جواب دیا۔ ”میاں صاحبزادے! آپ کی ابھی عمر ہی کیا ہے؟ آپ کے والد کیا

کرتے ہیں؟"
لڑکے نے جواب دیا۔ "والد بقیدِ حیات نہیں، ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا نام ابوبکر ہے۔ کتان فروشی ان کا پیشہ تھا۔"
امیر قافلہ نے مشورہ دیا۔ "تب پھر تم ابھی ماں کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ۔ وہ تمہیں اپنے پاس نہ پا کر بہت پریشان ہوں گی۔"
لڑکے نے جواب دیا۔ "میں اپنی ماں کی اجازت کے بغیر آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اسی لیے تو آپ سے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ آپ لوگ ایک دن کے لیے ٹھہر جائیں تاکہ میں اپنی ماں سے اجازت حاصل کرلوں۔"
امیر قافلہ نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تمہاری ماں تمہیں سفر کی اجازت دے دیں گی؟"
"کیوں نہیں دیں گی، ضرور دیں گی کیونکہ میں جس متبرک سفر کی ان سے اجازت مانگوں گا، وہ ایسا نہیں ہے جس کی اجازت نہ دی جائے۔"
امیر قافلہ کو آپ کے شوق سے بڑی دلچسپی ہوئی اور رحم بھی آیا۔ اس نے قافلے کو روک دیا اور قافلہ پڑاؤ ڈال کر رک گیا۔
آپ سیدھے اپنی ماں کے پاس پہنچے اور درخواست کی۔ "ماں! ایک قافلہ حج کو جا رہا ہے، میں نے ایک دن کے لیے اسے روک لیا ہے۔"
ماں نے پوچھا۔ "تو نے اسے کیوں روک لیا؟"
آپ نے جواب دیا۔ "ماں! میں بھی حج کرنا چاہتا ہوں۔"
ماں نے کہا۔ "لیکن تیری ابھی عمر ہی کیا ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "آپ میری عمر کے بجائے میرا شوق دیکھیے۔"
ماں نے بیٹے کو بڑی محبت اور شفقت سے دیکھا، بولیں۔ "اتنی سی عمر میں تو باتیں کیسی کرنے لگا ہے؟"
بیٹے نے جواب دیا۔ "ماں! میں باتیں کرتا نہیں ہوں بلکہ مجھ سے کوئی باتیں کرواتا ہے۔"
انہوں نے محسوس کیا، ماں اداس ہو گئی ہیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے ہیں، آپ نے اپنے دامن سے ماں کے آنسو خشک کرنے چاہے، بولے۔ "ماں! کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو کیسے ہیں؟ خوشی کے یا غم کے؟"
ماں نے مسکرانے کی کوشش کی بولیں۔ "یہ خوشی کے آنسو ہیں میرے بیٹے! میرا ننھا اس کم عمری میں حج کرنے جا رہا ہے بس اسی خوشی میں آنسو نکل آئے۔"
ماں نے بیٹے کو حج پر جانے کی اجازت دے دی۔ آپ کسی انتظام اور اہتمام کے بغیر حج کے قافلے میں پہنچے اور امیر قافلہ سے کہا۔ "آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری خاطر یہاں پڑاؤ ڈالا اور میرا انتظار فرمایا۔"
امیر قافلہ نے شفقت سے کہا۔ "نہیں بیٹے! شکریے کی کوئی بات نہیں، میں تمہارے شوق سے خوش ہوں۔"
قافلۂ حج روانہ ہو گیا۔ دورانِ سفر کئی دن بعد آپ کو اچانک یہ احساس ہوا کہ ماں نے سفر کی اجازت بہ خوشی نہیں دی ہے، بیٹے کو خوش کرنے اور خوش دیکھنے کے لیے دے دی تھی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ سفر سے طبیعت اچاٹ ہو گئی اور راستے ہی سے واپس آ گئے۔
جب یہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچے تو انہیں دروازہ کھٹکھٹانا نہیں پڑا کیونکہ ماں دروازے پر اس طرح کھڑی تھیں، گویا انہیں پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا بیٹا واپس آ گیا ہے۔ بیٹے نے ماں کو سلام کیا اور ماں نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور سر اور پشت پر محبت سے ہاتھ پھیرتی رہیں۔
بیٹے نے ماں سے پوچھا۔ "ماں! سچ بتایئے کیا آپ نے مجھے سفر کی اجازت نہیں دی تھی؟"
ماں نے جواب دیا۔ "میں نے تمہیں سفر کی اجازت دے تو دی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تم چلے گئے تو تمہارے بغیر میرا گھر میں جی نہیں لگتا تھا اور میں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک تم واپس نہیں آ جاؤ گے میں اپنا زیادہ وقت تمہارے انتظار میں دروازے پر ہی گزاروں گی۔"
آپ نے فرطِ جوش میں ماں کو چمٹا لیا اور کہا۔ "ماں! میں بھی آپ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ جب تک آپ موجود ہیں میں سفر نہیں کروں گا۔"
آپ نے کمسنی کے باوجود عبادت و ریاضت میں غیر معمولی محنت کی اور اپنا بیشتر وقت خدا کی یاد میں گزارنے لگے۔

آپ کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ یہ ایسا صدمہ تھا کہ ابوبکرؒ اس کا اثر ایک عرصے تک محسوس کرتے رہے۔ ان کا اپنے گھر سے دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ آپ نے گھر کو خیر باد کہا اور سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ آپ بزرگانِ دین کے مزاروں پر حاضریاں دیتے رہے۔ آپ قبرستانوں سے گزرتے تو قبر میں سونے والوں کی بے بسی اور بے چارگی سے عبرت حاصل کرتے۔

آپ کسی شکستہ قبر پر فاتحہ پڑھنے کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ قبر کا کچھ حصہ کھلا ہوا ہے اور اس کھلے حصے سے ایک برہنہ لاش صاف دکھائی دے رہی ہے۔ آپ نے اکثر لاشیں دیکھی تھیں اور مُردوں کا مشاہدہ کیا تھا، ان سب کے چہروں میں ایک مشترک کیفیت محسوس ہوتی تھی، اور یہ کیفیت تھی ان کی بے بسی، اداسیت اور نزع کے وقت کا کرب، جو مرنے کے بعد بھی مرنے والوں کے چہروں پر باقی رہتا ہے لیکن اس شکستہ قبر کا مردہ گویا مسکرا رہا تھا۔ آپ فاتحہ پڑھ چکنے کے بعد اس مُردے کو کچھ دیر بغور دیکھتے رہے، پھر اپنے آپ سے سوال کیا۔ ”حیرت ہے یہ کیا بات ہے کہ اس مردے کے چہرے پر کرب و اذیت کے بجائے مسکراہٹ پائی جاتی ہے؟“

آپ نے یہ سوال خود سے کیا تھا لیکن آپ کو جواب کسی اور نے دیا، کوئی کہہ رہا تھا۔ ”سنو! تمہیں میرے چہرے کی مسکراہٹ پر حیرت کیوں ہے؟“

آپ نے ادھر ادھر دیکھا کہ یہ جواب کس نے دیا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بہ آوازِ بلند سوال کیا۔ ”تم کون ہو جو میری بات کا جواب دے رہے ہو؟“

آپ کو جواب ملا۔ ”ذرا ادھر دیکھو میری طرف، میں جو شکستہ قبر میں پڑا ہوں، تمہاری بات کا میں ہی جواب دے رہا ہوں۔“

آپ نے ایک بار پھر حیرت سے شکستہ قبر کے مُردے کی طرف دیکھا۔ آپ کو جھرجھری سی آگئی، بولے۔ ”اگر تم خود ہی میری بات کا جواب دے رہے ہو تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تمہارے چہرے پر موت کا کرب و اذیت کیوں نہیں؟ یہ خلافِ واقعہ مسکراہٹ کیوں پائی جاتی ہے؟“

مُردے نے جواب دیا۔ ”اجی! تعجب ہے کہ تم اللہ کی محبت کا دم تو بھرتے ہو لیکن اس رمز سے واقف نہیں ہو کہ جو لوگ ”عشقِ خداوندی“ میں مبتلا ہوتے ہیں وہ دنیا کی کسی بھی اذیت اور کرب سے لاعلم اور بے نیاز ہوتے ہیں۔ ”عشقِ خداوندی“ کی لذت انہیں ہر حال میں بشاش اور خوش رکھتی ہے۔“

آپ چیخ مار کر رو دیے، آہ و زاری کرتے ہوئے بولے۔ ”اے اللہ العالمین! یعنی میں ابھی تک اس راز سے ناواقف تھا کہ عشقِ خداوندی انسان کے تمام دکھوں کو بے اثر بنا دیتا ہے۔ آہ، کتنا عبرت کا مقام ہے کہ میں راہِ عشق میں ہنوز مبتدی اور ناتجربہ کار ہی ہوں۔“

آپ کو جواب ملا۔ ”یہ! تم کس کی شکایت کس سے کر رہے ہو؟ گلہ اور شکوہ سچے عاشقوں کا شیوہ نہیں۔ جو عاشقِ صادق ہیں وہ راضی برضائے محبوب ہوتے ہیں اور گلہ و فریاد سے انہیں ذرا بھی سروکار نہیں ہوتا۔“

آپ نے فوراً سکوت اختیار کیا اور دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ آئندہ خاموش ہی رہیں گے لیکن پھر خیال آیا کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے اس میں توفیقِ ایزدی اس کے شاملِ حال ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ خدا سے یہ توفیق مانگ لی جائے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور دعا مانگی۔ ”خدایا! میں تیرا عاجز و درماندہ بندہ تجھ سے اس توفیق کے سوا کچھ بھی نہیں مانگتا جس کا تعلق تجھ سے ہے، تیری ذات سے، تیری مہربانیوں اور نوازشوں سے ہے۔ میں تجھ سے تیری توفیق چاہتا ہوں۔“

آپ کو سوتے میں رویائے صادقہ ہوا اور کسی نے آپ کو مطلع کیا۔ ”سن! تیری دعا قبول ہوئی، تو بے فکر رہ۔“

آپ کی جیسے ہی آنکھ کھلی آپ نے فوراً ایک اور دعا مانگی، بولے۔ ”میرے مولا! میری ایک اور دعا قبول فرما لے۔“

آپ کو رگ گلو سے جواب ملا۔ ”بول، وہ کون سی دعا ہے؟“

آپ نے شوخی اختیار کی، بولے۔ ”میرے مولا! میں جانتا ہوں کہ تو رگ گلو سے زیادہ قریب ہے، جب تو مجھ سے خود ہی مخاطب ہے تو میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو عالم الغیب ہے اور دلوں کے حال سے واقف ہے۔ میں اپنی دعا کو کیا بیان کروں تو خود ہی سمجھ لے اور اگر مناسب سمجھ تو مجھے بھی یہ بتا دے کہ میں تجھ سے کون سی دعا مانگنے والا ہوں۔“

جواب ملا۔ ”ابھی ... ! کیا تو مجھ سے یہ دعا نہیں مانگ رہا تھا کہ میں تیرا نقص دور کر دوں؟“

آپ کا دل بھر آیا، عاجزی سے جواب دیا۔ ”بیشک خداوندا بیشک، میں انسان ہوں اور انسان خطا و نسیاں کا پتلا ہے۔ میں تجھ سے استدعا کرتا ہوں کہ تو میرے عیوب اور نقائص کو دور فرما دے۔“

آپ کو جواب ملا۔ ”میں نے تیری دعا قبول کی اور کچھ؟“

آپ نے فرطِ جوش میں کہا۔ "بس خداوندا بس۔ تیرا کس طرح شکر ادا کروں؟ میں نے جو مانگا مجھے اس زیادہ ہی ملا۔"

اس دعا کے بعد آپ پر بے خودی طاری رہنے لگی، بہت کم ہوش آتا اور جب ہوش آتا تو زبان سے اللہ اللہ کے سوا کچھ بھی ادا نہ ہوتا۔ کافی عرصہ بعد کچھ ہوش آیا تو خیال آیا کہ ایسی بے خودی اور بے نیازی کس کام کی کہ میں نے اپنے رب سے کچھ مانگنا ہی چھوڑ دیا۔ آپ نے کہا۔ "خدایا یہ مجھ کو کیا ہو گیا ہے کہ میں تجھ سے کچھ مانگ ہی نہیں رہا۔"

آپ کو جواب ملا۔ "ابوبکرؒ! تمہیں یاد ہے نا کہ تم نے مجھ سے دعا مانگی تھی کہ میں تیرا نقص دور کر دوں اور تجھے یہ بات بھی معلوم ہے کہ میں نے تیری دعا قبول بھی کر لی تھی۔ چنانچہ بار بار دست طلب بڑھانا، یہ بھی ایک نقص ہے اور میں نے تیرے نقص تجھ سے دور کر دیے ہیں۔ اس لیے تو مجھ سے اب کوئی دعا بھی نہیں مانگ رہا۔"

ابوبکرؒ بے اختیار سجدے میں گر گئے، بولے۔ "خدایا! تو کتنا بندہ نواز ہے۔ شدت جذبات سے میرا کلیجا پھٹ جائے گا، میرا سینہ شق ہو جائے گا۔ تیری بندہ نوازیاں اور کرم فرمائیاں ایسی نہیں کہ انسان بہ آسانی چشم پوشی کر سکے۔"

آپ کو جواب ملا۔ "ابوبکرؒ! ہم تیرے ہیں جب یہ بات طے پا گئی کہ ہم تیرے ہیں تو پھر تجھے طلب کی ضرورت ہی کیا رہ گئی؟"

آپ کے ہم عصر ایک دوسرے بزرگ ابوالحسن مزین نے اللہ کے توکل پر اپنا سفر شروع کیا تو انہیں ایسے ایسے واقعات پیش آئے اور کچھ ایسی واردات قلبی گزریں کہ انہیں خود پر زعم سا ہو گیا اور انہیں یہ فخر محسوس ہوا کہ میں اس دور کا عظیم بزرگ ہوں کیونکہ میں نے اللہ کے بھروسے پر کسی زادِ سفر کے بغیر ہی سفر شروع کر دیا ہے اور کسی کے سامنے دست طلب نہیں دراز کر رہا ہوں۔ ابوالحسن مزین کے دل میں یہ خیال گزرا ہی تھا کہ کسی نے انہیں ڈانٹ دیا اور کرخت لہجے میں کہا۔ "ابوالحسن! تو اپنے نفس کے ساتھ دروغ گوئی کیوں کر رہا ہے؟"

ابوالحسن مزین نے آواز کی طرف مڑ کر دیکھا تو اپنے پاس ابوبکرؒ کو کھڑے ہوئے دیکھا، شرمندگی سے کہا۔ "حضرت! میں اپنے نفس کے تکبر پر شرمندہ ہوں۔ واقعی یہ دروغ گوئی ہے، مگر یہ دروغ گوئی میں نہیں، میرا نفس کر رہا ہے۔"

آپ نے ابوالحسن کو نصیحت کی۔ "ابوالحسن! یہ غلط فہمی ہے کہ تم خود کو اپنے نفس سے علیحدہ کر رہے ہو۔ تم اور نفس الگ الگ نہیں ہو، دونوں ایک ہی ہو۔ یہ غلط فہمی بھی تمہیں گمراہ کر سکتی ہے۔ اس لیے تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم خود کو اپنے نفس اور اعضا سے الگ مت تصور کرو۔"

آپ کی شہرت نے آپ کے ارد گرد مریدوں اور ارادت مندوں کا مجمع لگا دیا۔ یہ لوگ ہر وقت آپ کو گھیرے رہتے، اس سے آپ کو بڑی زحمت پیش آتی اور پریشان ہو جاتے لیکن اس خیال سے لوگوں کو منع نہیں کرتے کہ کہیں کسی کی دل آزاری نہ ہو جائے۔ ان لوگوں میں ایک ایسا شخص بھی شامل تھا جس کی موجودگی آپ کو سب سے زیادہ گراں گزرتی لیکن اسے منع نہ کر پاتے۔ یہ شخص عبادت بڑے خشوع و خضوع سے کرتا اور اپنے زہد و تقویٰ سے دوسروں سے ممتاز نظر آتا تھا۔

آپ کو یہ محسوس ہوتا کہ یہ شخص نام و نمود کا بندہ ہے اور اس طرح اپنی نمائش کرتا رہتا ہے۔ کچھ ارادت مند بھی اس کی عبادت کو نمود و نمائش تصور کرتے تھے۔ کسی مرید نے کہا۔ "حضرت! یہ شخص عجیب و غریب ہے، کم بولتا ہے، کسی شخص کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا۔ میرا خیال ہے اس شخص کو اپنے زہد و تقویٰ پر بڑا ناز ہے۔ آپ اس شخص کو کیوں گوارا کر رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اے شخص! یہ سوءِ ظنی ہے، کسی کے بارے میں بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ آدمی کے ظاہر و باطن میں بہت کم مطابقت ہوتی ہے اور اس عدم مطابقت سے خدا خوب واقف ہوتا ہے۔ ہم اس قسم کا حساب کتاب کیوں کریں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دوسرے مجھ سے زیادہ اچھے ہیں۔"

معترض چپ ہو گیا۔ لیکن ذرا سی دیر کے لیے آپ کو بھی یہ خیال آیا کہ یہ شخص نمائشی ضرور ہے اور ہم سب پر اپنی عبادات کا رعب ڈالتا رہتا ہے۔ آپ ان وسوسوں میں مبتلا تھے کہ اندر سے آواز آئی۔ "اے ابوبکرؒ! تو یہ کیا سوچ رہا ہے؟ اگر دیکھنا ہی ہے تو اپنے عیوب دیکھ، دوسروں کے عیوب دیکھنے کی کیوں کوشش کر رہا ہے؟"

آپ کی حالت غیر ہونے لگی۔ یہ ایک تازیانہ تھا جس نے آپ کو مضطرب و بے چین کر دیا۔ آپ نے اس سوءِ ظنی کی تلافی یوں کی کہ اپنی جائز کمائی کے دو سو درہم لے کر اس شخص کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت وہ مصروف عبادت تھا۔ آپ کچھ دیر اس کے پاس کھڑے رہے لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ اس کا کوئی بھروسا نہیں ہے کہ کب تک یونہی عبادت میں مصروف رہے، آپ نے وہ دو سو درہم اس کے مصلے کے نیچے رکھ دیے اور بہ آواز بلند کہا۔ "اے شخص! مجھے افسوس ہے کہ میں یہ دو سو درہم کی حقیری رقم ہی تیری خدمت میں پیش

کر سکا ورنہ میں اس سے زیادہ تجھے دینا چاہتا تھا جب تو اپنی عبادت سے فارغ ہو جائے تو اس رقم کو مصلے کے نیچے سے نکال کر اپنے خرچ میں لے آنا۔ میں کوشش کروں گا کہ تیری اور زیادہ خدمت کر سکوں۔"

آپ یہ کہہ کر چلے آئے اور اپنی طبیعت میں ہلکا پن محسوس کیا۔

اس دن آپ کی خدمت میں معلوم نہیں کہاں کہاں سے لوگ آئے ہوئے تھے اور آپ سے طرح طرح کے سوالات کر کے روحانی تسکین حاصل کر رہے تھے۔ ان میں ایک خراسانی بھی شامل تھا۔ یہ آپ سے عجیب تھکا دینے والے سوالات کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "حضرت! کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ ہمارے لیے سب سے زیادہ سودمند کیا شے ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "زہد و سخاوت اور نصیحت۔"

سوال کرنے والے نے اس کی وضاحت چاہی، پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

آپ نے جواب دیا۔ "زہد اس لیے کہ اس کے انہماک میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے اور دنیا کی برائیوں کا موقع نہیں ملتا۔ سخاوت اس لیے مفید ہے کہ انسان کے پاس کوئی چیز ذخیرہ نہیں ہو سکتی اور دوسروں کا اس سے کام نکلتا ہے، انسان، انسان کے کام آتا رہتا ہے اور جب کسی انسان کے پاس کوئی چیز ذخیرہ ہی نہیں ہوگی تو انسان اس کے حرص و طمع میں بھی مبتلا نہ ہوگا جو بہت ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح انسان کا دوسروں کو نصیحتیں کرتے رہنا بھی بہت مفید ہے۔ جب یہ دوسروں کو کسی اچھی بات کی نصیحت کرے گا تو اس پر خود بھی عامل اور کاربند رہنے کی کوشش کرے گا۔ گویا کوئی انسان جب کسی کو نصیحت کرتا ہے تو اپنے آپ کو اس نصیحت پر کاربند ہونے کا پابند سمجھتا ہے اور اس طرح یہ شخص شب و روز کے بیشتر اوقات میں خود اپنی اصلاح کرتا رہتا ہے۔"

اس شخص نے ایک اور سوال کر دیا، پوچھا۔ "زہد کیا شے ہے اور آپ زہد کسے کہتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "زہد کے بجائے میں زاہد کی بابت بتاؤں گا، اے شخص! زاہد وہ ہے جو نہ ملنے پر بھی خوش رہے۔ زندگی بھر ذکر الٰہی میں مشغول رہے۔ جب مصائب پڑیں تو صبر سے کام لے اور راضی بہ رضائے الٰہی رہے۔"

اس شخص نے کہا۔ "تو گویا آپ اس طرح تصوف کی تعریف فرما رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، صوفی انہی باتوں پر قائم رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تصوف سرتاپا اخلاق ہے اور جس شخص میں اخلاق کی حقیقی زیادتی ہوگی اس میں تصوف بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔"

آپ ابھی ان سوالات کے جوابات سے بھی فارغ نہ ہوئے تھے کہ وہ شخص آ گیا جس کے مصلے کے نیچے آپ دو سو درہم رکھ کر آئے تھے۔ اس نے آتے ہی دو سو درہم آپ کے آگے پھینک دیے اور ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ "حضرت! آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ میری عبادت کی لذت ہی چھین لی۔ میں کتنے خشوع و خضوع سے اللہ کے دربار میں کھڑا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں آواز آئی۔ "اے شخص! مجھے افسوس ہے کہ میں دو سو درہم کی حقیر رقم ہی تیری خدمت میں پیش کر سکا ورنہ میں تجھے اس سے زیادہ دینا چاہتا تھا۔ جب تو اپنی عبادت سے فارغ ہو جائے تو اس رقم کو مصلے کے نیچے سے نکال کر اپنے صرف میں لے آنا۔ میں یہ کوشش کروں گا کہ تیری اور زیادہ خدمت کر سکوں۔ ابوبکرؒ! کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری یہ آواز میرے حق میں کیا ثابت ہوئی؟ یہ ایک شعلہ تھا جس میں میری عبادت کی لذت جل گئی، پانی تھا جس میں میرے شوق کی آگ بجھ گئی۔ آہ، یہ تم نے کیا غضب کر دیا۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ پرسوز اور لذیذ لمحات میں نے کتنے میں خریدے تھے؟"

آپ نے پشیمان ہو کر دریافت کیا۔ "تو نے وہ لمحات کتنے میں خریدے تھے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "ستر ہزار درہم میں، میرے پاس میرے کاروبار سے جو کچھ آتا تھا، یہ ستر ہزار درہم اس کے علاوہ میرے پاس موجود تھے اور مجھ پر ان درہم کا جتنا نشہ رہتا تھا کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ اس نشے سے نشۂ محبت الٰہی دور رہتا تھا۔ میں عبادت کرتا تھا لیکن عبادت کی لذت سے محروم رہتا تھا۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے ان ستر ہزار درہم کی لعنت سے نجات حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ میں نے انہیں خدا کی راہ میں اہل احتیاج میں تقسیم کر دیا اور اس کے بعد یاد الٰہی میں مشغول ہو گیا اور خوش قسمتی سے وہ لذت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کی بہت دنوں سے آرزو کر رہا تھا۔ لیکن جب تم نے دو سو درہم میرے مصلے کے نیچے رکھے اور اس کی مجھے بہ آواز بلند اطلاع دی تو میں نے یہ محسوس کیا کہ میری آہ و زاری کے پرسکون تالاب میں دو سو درہم پھینک کر تم نے ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔ آہ، یہ تم نے کیا کیا۔ یہ اپنے دو سو درہم سنبھالو، اگر یہ صورت برقرار رہی تو میں تمہاری صحبت سے کنارہ کشی اختیار کر لوں گا۔"

آپ نے وہ دو سو درہم تو واپس لے لیے لیکن اس وقت آپ جیسی شرمندگی اور ندامت محسوس کر رہے تھے، کچھ وہی جانتے تھے ذرا دیر سر جھکائے رہنے کے بعد آپ نے اس شخص کی طرف دیکھا اور وفورِ جذبات میں کہا۔ ''اے شخص! میں نے واقعی غلطی کی ہے، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس وقت میں خود کو بہت ہی ذلیل و خوار اور رسوائے زمانہ سمجھ رہا ہوں تو ایک عظیم انسان ہے۔ اے کاش! اس عظمت کا ذرا سا حصہ مجھے بھی مل گیا ہوتا۔''

آپ باب شیبہ سے نکلے تو دیکھا کہ ایک عمر رسیدہ شخص کھڑا ہوا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ جیسے ہی اس کے قریب پہنچے، اس نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''السلام علیکم!''

آپ نے جواب دیا۔ ''وعلیکم السلام۔''

اس شخص نے کہا۔ ''جناب! آپ صورت شکل سے تو بڑے اچھے آدمی نظر آتے ہیں۔''

آپ نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''اچھی اور بے عیب ذات خدا کی ہے۔ میں انسان، مجسمہ خطا و نسیان۔ آپ اپنی منشا بیان کریں۔''

اس شخص نے متبسم ہو کر عرض کیا۔ ''جنابِ والا! مجھے معلوم ہوا ہے کہ مقام ابراہیم میں ایک بزرگ احادیث بیان فرما رہے ہیں، میری درخواست ہے کہ آپ بھی تشریف لے چلیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کیا وہ بزرگ کوئی محدث ہیں؟''

جواب ملا۔ ''ہاں، وہ محدث ہیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''وہ بزرگ کس سند سے احادیث بیان کرتے ہیں؟''

ان بزرگ نے جواب دیا۔ ''حضرت عبدالرحمٰنؒ، حضرت معمرؒ، حضرت زہریؒ اور حضرت ابوہریرہؓ کی اسناد سے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''لیکن بھائی میرے! میں کسی اور سے حدیث سن کر کیا کروں گا کیونکہ خود میرا دل تو میرے رب کی سند سے احادیث بیان کرتا ہے۔''

ان بزرگ نے آپ کو سر سے پیر تک دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ اس کی کوئی سند؟''

آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''آپ اس کی مجھ سے سند مانگ رہے ہیں واللہ! آپ یہ فرمائیں کہ کیا آپ حضرت خضر علیہ السلام نہیں ہیں؟ میں نے آپ کو کسی تعارف کے بغیر ہی پہچان لیا ہے۔''

وہ بزرگ حیران اور ششدر رہ گئے، بولے۔ ''ابوبکر! بخدا میں آج تک اسی وہم میں تھا کہ اس دنیا میں ایک بھی ایسا ولی نہیں ہے جو مجھے پہچان سکے اور میں اسے نہ پہچان سکوں۔ لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ یہاں ایسے بھی ولی موجود ہیں جن سے میں خود تو ناواقف ہوں لیکن وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''جنابِ خضر، میں نے خود کو پہچان کر آپ کو پہچانا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس نے خود کو پہچانا اس نے مجھے پہچانا۔ میرے لیے آپ کی پہچان کوئی ایسا نازک مسئلہ نہیں ہے۔''

اس کے بعد حضرت خضر علیہ السلام آپ سے بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

آپ کاندھے پر چادر ڈالے کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستہ سنسان تھا۔ جب آپ ایک موڑ پر پہنچے تو ایک طرف سے ایک شخص اپنے چہرے کو چھپائے ہوئے نمودار ہوا آپ کے کاندھے سے چادر اتار کر فرار ہو گیا۔ آپ نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا مگر اس کا تعاقب نہیں کیا اور بہ دستور چلتے رہے۔ ظہر کا وقت تھا، آپ مسجد میں داخل ہوئے، نماز ادا کی اور دعا سے فارغ ہو کر جیسے ہی مسجد سے باہر نکلے، آپ نے دیکھا ایک شخص آپ کی چادر لیے کھڑا ہے۔ آپ نے اس شخص پر کوئی توجہ نہیں دی اور اپنی راہ ہو لیے۔ وہ شخص چادر لیے ہوئے آپ کی طرف دوڑا، بولا۔ ''حضرت! آپ اپنی چادر تو لے لیجیے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کیا تیری ضرورت نکل گئی؟''

اس شخص نے حیرت سے کہا۔ ''میری ضرورت کیا معنی؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرا مطلب صاف ہے۔ اگر تجھے چادر کی ضرورت نہ ہوتی تو، تو کبھی میرے کاندھے سے اتار کر فرار نہ ہوتا۔ میں نے اسی خیال سے تیرا پیچھا نہیں کیا کہ تو اس چادر کا مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہے۔''

اس شخص نے شرمندگی سے گردن جھکالی، روتے ہوئے کہا۔ ''آپ خدا کے لیے اپنی چادر واپس لے لیجیے۔''

آپ نے پھر سوال کیا۔ ''آخر کیوں؟ کیا تم واقعی اس چادر کی ضرورت نہیں محسوس کر رہے ہو؟''
اس شخص نے بہ دستور روتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس چادر کی نہ تو پہلے ضرورت تھی اور نہ ہی آج اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے آپ کی چادر عادتاً چرائی تھی، حضرت! میں عادی چور ہوں۔''
آپ نے کہا۔ ''چلو، میں نے مان لیا کہ تم عادی چور ہو اور ضرورتاً نہیں عادتاً چوری کرتے ہو مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم میری چادر واپس کیوں کر رہے ہو؟''
چور نے جواب دیا۔ ''مجھے آپ کی چادر چرانے کی بدترین سزا مل چکی ہے۔''
آپ نے کہا۔ ''یعنی؟ میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔''
چور نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے ہیں ورنہ اصل واقعہ یہ ہے کہ آپ اس سزا سے اچھی طرح واقف ہیں جو چادر چرانے کے سلسلے میں مجھے مل چکی ہے۔''
آپ نے چور کے ایک ہاتھ کی طرف دیکھا جو بالکل خشک اور بیکار ہو چکا تھا۔ آپ نے اس ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تو نے اسی ہاتھ سے چادر چھینی تھی؟''
چور نے جواب دیا۔ ''جی جناب!''
آپ نے اس کا خشک ہاتھ پکڑ لیا اور اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہ پہلے بالکل درست تھا؟''
چور نے جواب دیا۔ ''جی جناب والا۔''
آپ نے مسکرا کر پوچھا۔ ''اب تو کیا چاہتا ہے؟''
چور نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کی چادر واپس کر دی ہے اور اب یہ چاہتا ہوں کہ آپ دعا فرمائیے کہ میرا یہ خشک ہاتھ دوبارہ ٹھیک ہو جائے۔''
آپ نے چور سے کہا۔ ''عظمتِ الٰہی کی قسم کہ مجھے چادر کے جانے کا ذرا بھی ملال نہ تھا اور نہ اس کے دوبارہ پانے کی خوشی ہے اس لیے تیرے ہاتھ کے خشک ہو جانے کا مجھے ملال تو ہے لیکن خوشی ذرا بھی نہیں۔ اس لیے میں بارگاہِ رب العزت میں دست بہ دعا ہوں کہ خدا تیرا ہاتھ درست فرما دے۔''
اچانک چور کو یہ محسوس ہوا گویا اس کے ہاتھ میں خون دوڑنے لگا ہے اس نے اپنے ہاتھ کو ادھر ادھر حرکت دی اور جب یہ اچھی طرح یقین ہو گیا کہ بہ ظاہر اس میں کوئی خرابی نہیں نظر آتی تو اس نے آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور آپ کو دعا دیتا ہوا چلا گیا۔
آپ نے چادر دوبارہ اپنے کاندھے پر ڈال لی۔
آپ نے دورانِ وعظ فرمایا کہ۔ ''لوگو! میں کئی مصیبتوں میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ مجھے ان سے بچاؤ۔''
اس وقت آپ کے آس پاس بہت سارے مرید جمع تھے۔ ایک مرید نے پوچھا۔ ''خدا خیر کرے، کیا آپ بتائیں گے کہ ان دنوں آپ کس مصیبت یا کن مصیبتوں میں گرفتار ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''عذاب، مصیبت اور ذلت میں گھرا ہوا ہوں اور ان تینوں سے سردست نجات مشکل نظر آ رہی ہے۔''
اس مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! یہ رمزیہ باتیں ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ آپ وضاحت سے بیان فرمائیے تو شاید آپ کے کام آیا جا سکے۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''اے شخص! میں ان دنوں مخلوق کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں اور مخلوق کی محبت میں گرفتار ہونے کا یہ مطلب ہے کہ میں ایک عذاب جھیل رہا ہوں۔ تم لوگ دعا کرو کہ کسی طرح اس عذاب سے نجات پا جاؤں۔ اس کے بعد ذرا سکون کی سانس لے سکوں گا۔''
مرید نے پوچھا۔ ''اور جناب! وہ کون سی مصیبت ہے جس میں آپ آج کل گرفتار ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''جس طرح مخلوق کی محبت باعثِ عذاب ہے اسی طرح اس کی صحبت باعثِ مصیبت ہے اور میں آج کل مخلوق کی محبت کی وجہ سے اس کی صحبت میں بھی رہنے لگا ہوں اور اس کی صحبت باعثِ مصیبت ہے۔''
مرید نے پوچھا۔ ''اور حضرت! یہ ذلت کیا چیز ہے؟ اور آپ کس قسم کی ذلت میں گرفتار ہو چکے ہیں اور کس طرح؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''بھائی میرے! جس طرح مخلوق کی محبت باعثِ عذاب اور اس کی صحبت باعثِ مصیبت ہے اسی طرح

مخلوق سے ربط ضبط باعث ذلت ہے اور میں آج کل مخلوق سے ربط ضبط پیدا کیے ہوئے ہوں جو میرے حق میں ذلت کا سبب بن رہا ہے۔"

مرید اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

اسی رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہایت حسین شخص آپ کے پاس کھڑا ہوا ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ "ارے بھائی! خدا تم سے راضی ہو، آخر تم ہو کون؟ مجھے تو تم بہت اچھے لگ رہے ہو۔"

اس خوبرو شخص نے جواب دیا۔ "ابوبکرؒ! میں تقویٰ ہوں اور مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ میں آپ کے پاس آجاؤں۔"

ابھی ان دونوں میں یہ گفتگو ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ آپ نے اپنے بائیں طرف دیکھا ایک نہایت بدصورت عورت کھڑی تھی۔ اس کی صورت سے وحشی پن ٹپک رہا تھا۔ آپ نے اس عورت سے پوچھا۔ "ارے مائی! تم کون ہو اور یہاں میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟"

عورت نے جواب دیا۔ "ابوبکرؒ! میرا نام مصیبت ہے اور میں ہمیشہ سے ان کے دلوں میں رہتی ہوں جو اہلِ نشاط کہلاتے ہیں۔"

آپ نے خوبرو شخص سے پوچھا۔ "اور تم کہاں رہتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "جناب! میرا مسکن غمزدوں کے قلوب میں ہے۔"

جب آپ بیدار ہوئے تو آپ پر اس خواب کا گہرا اثر تھا اور آپ نے یہ عہد کرلیا کہ جب تک زندہ ہوں ہمیشہ غمگین زندگی بسر کروں گا۔ صبح جب آپ وعظ کے لیے کھڑے ہوئے آپ کا دل بڑا گداز ہو رہا تھا۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا۔ "لوگو! تم مجھے اسیر سمجھتے ہو یا آزاد؟"

آپ کو جواب ملا۔ "آزاد بہ ظاہر اور گرفتارِ باطن۔"

آپ نے فرمایا۔ "نہیں۔ اولیاء اللہ ظاہر میں اسیر اور باطن میں آزاد ہوتے ہیں۔" اس کے بعد فرمایا۔ "لوگو! صوفی وہ ہے جو عبادت کو مشقت نہ سمجھے کیونکہ جب عبادت پر مشقت کا احساس ہونے لگے تو گویا عبادت کی لذت اور حلاوت ختم ہو چکی ہے اور جب عبادت میں لذت اور حلاوت ہی باقی نہ رہے تو گویا اس کی طبیعت تصوف پر مائل نہیں رہتی۔"

کسی نے پوچھا۔ "ایسی صورت میں، استغفار کا سہارا تو لیا جاسکتا ہے۔"

آپ نے کہا۔ "اے شخص! کیا تو استغفار کے معنی جانتا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "کیا استغفار کے معنی اس کے علاوہ بھی کچھ ہیں، جن سے ہم سب واقف ہیں؟"

آپ نے فرمایا۔ "استغفار کے کئی معنی ہیں۔ معصیت کے بعد ندامت کے ساتھ توبہ کرنا، یہ استغفار ہے۔ بعدازتوبہ گناہ کا کبھی قصد نہ کرنا، یہ بھی استغفار ہے۔ مرنے سے پہلے حقوق اللہ کی تکمیل کردینا، یہ بھی استغفار ہے۔ توبہ کے بعد جسم کو ایسی مشقتوں میں لگائے رکھنا جن کا جسم سے کبھی واسطہ نہ پڑا ہو اور ایسا لگے کو یا جسم بہت آرام اٹھا چکا ہے، یہ سب استغفار ہے۔ اگر کوئی شخص مذکورہ استغفار کا سہارا لے گا تو وہ ضرور عبادت کی لذت اور حلاوت کو دوبارہ حاصل کرلے گا۔ کیونکہ جب اس طرح توبہ کی جاتی ہے تو فوراً ہی درِ مغفرت کھل جاتا ہے۔"

آپ سے پوچھا گیا۔ "اور جناب! یہ توکل کیا چیز ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اتباعِ علم اور کامل یقین کا دوسرا نام توکل ہے۔"

کسی اور نے سوال کیا۔ "جناب! میں اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی تکمیل کے لیے بے چین ہو جاتا ہوں، اس پر کس طرح قابو حاصل کروں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جب تک نیند اچھی طرح غلبہ نہ حاصل کرے، مت سو۔ جب تک بھوک پوری شدت سے نہ لگے، مت کھاؤ۔ جب تک بات کرنے کی شدید ضرورت نہ محسوس ہو مت بات کرو۔" آپ نے مزید فرمایا۔ "جب تم ان تینوں پر قابو پالو گے تو دوسری چیزیں بھی قابو میں آجائیں گی۔"

کسی اور نے سوال کیا۔ "حضرت! دین کی اساس کون سی چیزیں ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "تین چیزیں۔"

پوچھا گیا۔ "کون کون سی تین؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اول حق، دوم عدل، سوم صدق۔ حق کا تعلق اعضاء سے ہے یعنی اعضاء کے ذریعے ذکرِ الٰہی کرتے رہو۔

عدل کا تعلق قلب سے ہے یعنی بذریعہ قلب نیک اور بد میں تمیز کرو اور صدق کا تعلق عقل سے ہے یعنی عقل کے ذریعے خدا کو پہچانو۔" پھر فرمایا۔ "ہر روز نسیم سحری دنیا میں پھر کر خدا کے بندوں کی گریہ وزاری اور طلب مغفرت اپنے دوش پر خدا کے حضور لے جاتی ہے۔"

آپ نے رات کو رسول مقبول ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے بڑی عاجزی سے درخواست کی۔ "یارسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جس سے حرص و ہوس کا خاتمہ ہو جائے۔"

جواب ملا۔ "پھر سنو! ہر روز چالیس بار اس دعا کو پڑھ لیا کرو۔ "ویاحی یا قیوم لا الہ انت اسئلک ان یحیی قلبی بنور معرفتک ابداً۔"

آپ نے بیداری کے بعد اس پر عمل کیا تو اس کے حیرت انگیز اثرات ظاہر ہوئے۔

ایک دن آپ کے پاس ایک درویش آیا اور آپ کے قدموں میں بیٹھ کر زارو قطار رونے لگا۔ آپ نے پوچھا۔ "اے شخص! تجھ پر کیا افتاد پڑی جو تو یوں زارو قطار رو رہا ہے؟"

درویش نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "بابا! میں تو تباہ و برباد ہو گیا۔ اب میں کیا کروں؟"

آپ نے دریافت کیا۔ "کچھ بتاؤ تو سہی، بات کیا ہوئی؟"

درویش نے روتے ہوئے کہا۔ "میں نے صبر اور قناعت کا راستہ اختیار کیا تھا اور اس میں اتنا ثابت قدم رہا تھا کہ بڑے بڑے کٹھن دور سے گزر گیا اور اپنے صبر اور قناعت میں کسی قسم کا ضعف نہیں آنے دیا۔"

آپ نے کہا۔ "تو فضول باتیں زیادہ کرتا ہے اور کام کی کم، ہوا کیا؟ بس یہ بتا؟"

درویش نے دم لیتے ہوئے کہا۔ "حضرت! وہی تو میں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے صبر اور قناعت کی روش اختیار کی اور بڑے دشوار مراحل سے بخیر و خوبی گزر گیا۔ پھر میں فاقوں کی مصیبت میں گھر گیا۔ فاقوں کی اذیت میں مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا اب میں ناکام ہو جاؤں گا اور میں کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

آپ نے گھبرا کے پوچھا۔ "پھر تو نے کسی کے آگے دست طلب دراز تو نہیں کیا؟"

درویش نے ایک سرد آہ بھری، بولا۔ "بس یہی افتاد تو ہے جس میں، میں گرفتار ہو چکا ہوں۔"

آپ نے افسوس سے گردن جھکالی، کہا۔ "اپنی بات پوری کر، پھر کیا ہوا؟"

درویش نے جواب دیا۔ "پھر یہ ہوا کہ مجھ پر پے در پے بیس فاقے گزر گئے اور ان فاقوں نے مجھے اتنا بدحواس اور پریشان کر دیا کہ میں کھانے کے لیے دست طلب دراز کر بیٹھا۔"

آپ نے بے چینی سے پوچھا۔ "پھر؟ پھر کیا ہوا؟"

درویش نے جواب دیا۔ "اس کا عبرتناک پہلو یہ ہے کہ میں نے جس کے آگے دست طلب دراز کیا تھا اس نے بھی میرا ساتھ نہ دیا اور معذرت کر لی۔"

آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا آپ نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

درویش نے جواب دیا۔ "جب اللہ کے بندے کی طرف سے انکار ہو گیا تو میں شرمندہ اور نادم ہو کر ایک گوشے میں پڑا رہا اور اپنی بے صبری کا ماتم کرنے لگا۔ لیکن کسی پہلو چین ہی نہ آتا تھا۔ ناگہاں یہ محسوس ہوا، گویا کوئی کہہ رہا ہے، اے بے صبرے انسان! اٹھ اور بازار کی راہ لے، خدا نے تیرے دکھ کا مداوا کر دیا ہے۔ مجھے اس آواز پر یقین نہیں آیا اور میں یہ سمجھا کہ شاید یہ آواز ابلیس ملعون کی ہے جو مجھ جیسے انسانوں کو خوار و ذلیل کرتا پھرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ دل یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اے شخص! بدگمانی اچھی بات نہیں، بازار کی راہ لے اور دیکھ کہ خدا تیرے لیے کیا کرتا ہے۔ چنانچہ میں بازار روانہ ہو گیا، راستے میں مجھے چند درہم ملے جنہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گویا وہ نئے نئے بنا کر راستے میں ڈال دیے گئے ہوں۔ میں بہت خوش ہوا کہ کسی انسان نے اگر میرے فاقوں کا خیال نہیں کیا تو کیا ہوا؟ میرے رب کو تو میرے فاقوں کا احساس ہے اور اب میں ان درہموں سے کھانا خریدوں گا اور بھوک کی اذیت سے پیچھا چھڑاؤں گا۔ میں درہموں کو لے کر جب بازار پہنچا اور روٹیاں خریدنا چاہیں تو دکاندار نے طنز کیا۔ "اے شخص! تو نے انسان سے روٹیاں مانگیں اور اس سے اپنے بیس فاقوں کا ذکر کیا۔ کیا تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ خدا تیرے حال سے واقف نہیں۔ کیا تو اس لاعلمی کا شکار تھا کہ اللہ اپنے بندوں کے حال سے واقف نہیں یا کیا تو یہ سمجھتا تھا کہ خدا اپنے بندوں کی احتیاج اور ضرورت سے بے فکر اور بے نیاز ہوتا ہے۔ افسوس کہ تو نے اس کی عنایت اور مہربانی کا انتظار کیے بغیر اپنے بیس فاقوں کا ذکر ایک انسان کے سامنے کر دیا۔ تو نے یہ

بھی دیکھ لیا کہ اگر اللہ کسی کو کچھ نہ دینا چاہے تو انسان کی یہ مجال نہیں کہ وہ اپنے ارادے اور اپنی کوشش سے کسی کو کچھ دیدے۔"

اتنا کہہ کر درویش زاروقطار رونے لگا۔

آپ نے کہا۔ "تجھ پر یہ طنز دکاندار نے کیا یا اللہ نے؟"

درویش نے جواب دیا۔ "زبان تو دکاندار کی تھی لیکن بات خدا کی، آخر اس دکاندار کو میرے حال کا علم کیوں کر ہوا؟ کیا وہ دکاندار کوئی صاحب کشف نہیں تھا؟"

آپ نے درویش کو تسلی دی۔ "اے درویش! جو کچھ ہوا، اس پر رونے دھونے سے حاصل؟ جا، ایک بار پھر صبر و توکل کی روش اختیار کر اور اس سے زیادہ مشکل حالات کے مقابلے کے لیے تیار رہ۔ کیونکہ امتحان میں ایک بار ناکام ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی ہمیشہ کے لیے امتحان میں ناکام ہو گیا ہے، دوسرے امتحان کی تیاری کرو، خدا اس میں تمہیں کامیاب کرے گا کیونکہ تمہارا عرق انفعال اس بات کی علامت ہے کہ تم میں پشیمانی کا جوہر موجود ہے اور جب تک کسی انسان میں یہ جوہر موجود ہے وہ خدا کا معتوب نہیں ہوسکتا۔"

درویش نے آپ کے پاس ہی اقامت اختیار کی اور آپ کی رہنمائی میں اپنی منزلیں طے کرنے لگا۔

آپ نے مستقلاً خانۂ کعبہ کے پرنالے کے نیچے قیام اختیار کیا۔ آپ کے مرید اور ارادت مند یہاں بھی پہنچ گئے۔ یہاں ایک چھوٹی سی بستی قائم ہو گئی۔ آپ نے ان لوگوں کو وہاں سے ہٹ جانے کی ہدایت کی اور کہا کہ بہترین طریقۂ عبادت یہ ہے کہ آدمی کہیں بھی ہو، اس کے صدق و زہد میں اتنی قوت آجائے کہ وہ خانۂ کعبہ کے پاس خود نہ آئے مگر خانۂ کعبہ اس کے پاس پہنچ جائے۔

آپ کے مریدوں نے اس پر عمل کیا اور کے میں پھیل گئے۔ ان میں ایک مرید نے اتنا کمال حاصل کیا کہ وہ واقعی جب چاہتا جس چیز کو دیکھنا چاہتا آنکھیں بند کر کے اپنے سامنے بلا لیتا۔ اسی دوران اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور روز بہ روز حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ آپ نے اس کی بیماری کا حال سنا تو اس کی عیادت کو پہنچ گئے اور پوچھا۔ "تیرا کیا حال ہے؟"

اس نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "بس چل چلاؤ ہے، اور اللہ کے بلاوے کا انتظار کر رہا ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔ "تیری کوئی خواہش؟"

مرید نے جواب دیا۔ "ہاں، میں کمزوری کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتا۔ مگر خواہش یہ ہے کہ ایک بار خانۂ کعبہ کی زیارت کر لوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "کیا میں تجھے خانۂ کعبہ تک پہنچا دوں؟"

مرید نے کہا۔ "میں خانۂ کعبہ کو یہیں بلوائے لیتا ہوں۔"

اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خانۂ کعبہ کی زیارت کرنے لگا۔ اسی وقت ایک طرف سے ایک اونٹ بھاگتا ہوا آیا اور اس نے ایک زوردار لات اس شخص کی آنکھ پر رسید کر دی جس سے اس کی آنکھ نکل کر باہر آگئی۔

مرید نے روتے ہوئے کہا۔ "یا اللہ! یہ کس بات کی سزا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اے بدنصیب انسان! تو اگر ذرا سا صبر کرتا تو تجھے مکاشفۂ حق حاصل ہو جاتا۔ چونکہ تو نے خانۂ کعبہ کی زیارت کی خواہش کر کے کم پر قناعت کر لی اس لیے خدا کو تیری یہ بات پسند نہیں آئی اور اس نے تیری آنکھ کا ڈھیلا نکلوا دیا۔"

آپ تیس سال تک خانۂ کعبہ کے پرنالے کے نیچے ہی اقامت گزیں رہے۔ آپ سے آخری وقت میں کسی نے پوچھا۔ "حضرتؒ! آپ کو اتنا بلند مقام کس طرح حاصل ہوا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے چالیس سال تک قلب کی یوں حفاظت کی ہے کہ اس میں کسی اور کو داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ اس میں خدا کے سوا کوئی بھی نہ رہا اور اب یہ حال ہے میں نے خدا کے سوا ہر چیز کو فراموش کر دیا ہے۔"

آپ نے ذرا سکوت اختیار فرمایا۔ پھر آخر ہچکی لینے سے پہلے ارشاد فرمایا۔ "اگر مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ یہ میرا آخری وقت ہے اور میں مزید زندہ نہیں رہوں گا تو میں یہ راز، راز ہی رکھتا اور اس طرح انکشاف نہ کرتا۔"

اس کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا اور خانۂ کعبہ کے قریب ہی آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

سفینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔
تذکرۃ الاولیا، شیخ فرید الدین عطار۔ انوار اولیاء، رئیس احمد جعفری۔
خزینۃ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری

متکلم صوفی

ضیا تسنیم بلگرامی

قدرت یوں تو روز ازل سے ہی انسان کے چونکنے اور سوچنے کے لیے بہت سے در وا کرتی آئی ہے لیکن انسان کی عقل کے پردے ان معاملات کی جانب متوجہ ہونے ہی نہیں دیتے۔ اس کے باوجود جہالت کی دبیز چادر کو ہٹانے کے لیے کچھ لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی چاہت اور اطاعت میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ گمراہی بہت پیچھے رہ جاتی ہے... آپ کو بھی اللہ نے یہ اعجاز دیا کہ بچہ جب بولنے اور سمجھنے کی سکت نہیں رکھتا آپ لوگوں کو نصیحت و وعظ فرماتے تھے... کچھ خبر نہیں خدا کی قدرت کب اور کس پر مہربان ہو جائے۔

اپنی کرامات و عبادات سے مخلوق کو فیض یاب
کرنے والے ولی کی روداد

تین سال کے بچے، عبداللہ کے بیٹے سہلؒ نے اپنے ماموں محمد بن سوار کو نماز تہجد پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان کے پیچھے خود بھی کھڑے ہو گئے۔ ماموں کا بہت زیادہ وقت عبادت و ریاضت ہی میں گزرتا تھا اور سہلؒ بن عبداللہ ایک عرصے سے اپنے ماموں کی ریاضت پر توجہ دیے ہوئے تھے۔ صبح فجر کی اذان سے ذرا پہلے ماموں نے سوچا کہ ذرا سی دیر کے لیے اگر کمر ٹکا لی جائے تو مناسب ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ مڑے اور اپنے پیچھے اپنے تین سال کے بھانجے کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے، پوچھا۔ "بیٹے سہلؒ! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

سہلؒ نے معصومیت سے جواب دیا۔ "ماموں! میں آپؒ کے ساتھ عبادت کر رہا تھا۔"

ماموں نے دریافت کیا۔ "کب سے؟"

جواب ملا۔ "جب سے آپؒ خود مصروف عبادت ہیں۔"

ماموں نے حیرت سے پوچھا۔ "تمہارے پیروں میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟"



بھانجے نے جواب دیا۔ ”پیروں کو تکلیف تو نہیں ہوئی، ہاں دل کو لذت ضرور ملی۔“

ننھے سے بچے کے عارفانہ جواب نے محمد بن سوارؒ کو اور زیادہ حیران کر دیا۔ ابھی یہ حیرت دور نہ ہوئی تھی کہ سہلؒ نے ایک اور عجیب و غریب بات کہہ دی، بولے۔ ”ماموں! میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں؟“

ماموں نے جواب دیا۔ ”ضرور بتاؤ۔“

بھانجے نے کہا۔ ”میں ازل سے آج تک عرش کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ کیا آپ میری بات سمجھ گئے؟“

ماموں کے دل کی جو حالت ہوئی، اسے وہ بیان نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے بھانجے کو تنبیہ کی۔ ”بھانجے! اپنے ننھے سے منہ سے اتنی بڑی بات تم کیوں کہہ رہے ہو؟ تم ابھی دنیا سے واقف نہیں ہو۔ اگر تمہاری یہ بات دوسرے لوگ سن لیں گے تو تمہیں دار پر چڑھا دیں گے۔ آیندہ یہ بات کسی اور کے سامنے نہ کہنا۔“

بھانجے پر شاید اس بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا، مزید عرض کیا۔ ”اور ماموں! آپ حیرت کریں گے کہ جب خدا نے مجھ سے کہا تھا الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) تو مجھے اپنا جواب بلیٰ (بے شک) آج تک یاد ہے۔“

ماموں نے اپنا سر پیٹ لیا، بولے۔ ”سہلؒ! خدا کے لیے تو اپنی زبان بند کر، تو ابھی بچہ ہے لیکن میں اس عمر میں ایسی باتیں نہیں کر سکتا۔“ بھانجے نے خاموشی اختیار کر لی۔

☆☆☆

سہلؒ نے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ ان کے افطار میں طرح طرح کی چیزیں سامنے رکھ دی جاتیں لیکن یہ ہمیشہ جو کی روٹی سے افطار کرتے۔ گھر والے سہلؒ کی عادات پر حیران رہتے اور عالم یہ تھا کہ ابھی کسی ایک عادت نے انہیں حیرت میں ڈالا ہی تھا اور یہ ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ کسی نئے واقعے، کسی نئی بات نے مزید حیرت میں ڈال دیا۔

سہلؒ کو غور و فکر کی بڑی عادت تھی۔ بارہ سال کی عمر میں کسی مسئلے نے انہیں الجھا دیا۔ یہ اپنی سمجھ کے مطابق اس پر غور و فکر کرتے رہے لیکن جب مسئلہ سمجھ میں نہ آیا تو آپؒ نے اپنے عہد کے بڑے بڑے عابد و زاہد اور لائق لوگوں کی ذہن میں ایک فہرست تیار کی کہ اس معاملے میں کس سے مدد لی جا سکتی ہے۔ آخر بصرے کے حبیب حمزہؒ کی طرف دل مائل ہو گیا اور بارہ سالہ لڑکے نے بصرے کا سفر اختیار کیا۔ حبیب حمزہؒ نے اس ہونہار نوعمر مہمان کی پیشانی میں چند ایسی علامتیں دیکھیں جو غیر معمولی تھیں۔ انہوں نے سہلؒ کا پرجوش استقبال کیا، پوچھا۔ ”بیٹے! تمہارا نام؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”سہلؒ بن عبداللہ!“

حبیب حمزہؒ نے پوچھا۔ ”کہاں سے آئے ہو؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”تستر سے۔“

حبیب حمزہؒ نے شفقت سے اپنے پاس بٹھا لیا، بولے۔ ”بیٹے! جب تک جی چاہے میرے پاس رہو اور جو کچھ جاننا یا پوچھنا چاہتے ہو، اس کے لیے میں حاضر ہوں۔“

کئی دن بعد سہلؒ نے حبیب حمزہؒ سے اپنے دل کے ترددات دور کیے اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہے۔ آخر مطمئن ہو کر تستر واپس چلے گئے۔ حبیب حمزہؒ کی صحبت نے ان میں یہ تبدیلی پیدا کر دی تھی کہ پہلے وہ افطار کے بعد کچھ کھا پی لیتے تھے لیکن اب اس میں بھی کمی پیدا ہو گئی کہ رات کو بس ایک چھٹانک کی دو ٹکیاں کھا کر عبادت میں مشغول ہو جاتے اور یہ ٹکیاں بھی جو کی ہوتیں۔ کچھ عرصے بعد اس میں بھی ترمیم کر دی۔ پہلے ہر روز افطار کر لیا کرتے تھے لیکن اب تین تین دن بعد افطار کرنے لگے پھر اس میں اور اضافہ کر دیا اور کئی کئی دن اور کئی کئی رات متواتر روزے رکھ کر صرف ایک بادام پر گزر کرنے لگے۔ جو لوگ آپؒ کے ذکر و شغل سے واقف تھے انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ آخر شب و روز کا، ہفتوں روزہ رکھ کر ان کا ایک بادام کھا لینا، ان میں توانائی کس طرح قائم رکھتا ہے۔ ایک شخص نے ڈرتے ڈرتے پوچھ بھی لیا۔

”حضرت! ذرا ایک بات تو بتائیے۔ آخر یہ ایک بادام، جو آپ شب و روز کے کئی ہفتوں کے ایک روزے کے بعد کھاتے ہیں، آپؒ کے جسم میں کس طرح توانائی قائم رکھتا ہے؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”تیرا سوال مناسب اور معقول ہے لیکن میں جن تجربات کے بعد یہاں تک پہنچا ہوں وہ کچھ عجیب اور حس سے ماورا ہیں۔ میں نے فاقہ کشی اور کھانے کا الگ الگ تجربہ کیا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ حال تھا کہ بھوک سے نقاہت محسوس ہونے لگتی تھی اور جب کھا لیتا تو توانائی بحال ہو جاتی تھی لیکن میں نے یہ تجربہ مسلسل جاری رکھا تو ایک عجیب و غریب نتیجہ برآمد ہوا۔

اب عالم یہ ہے کہ اگر میں کھالیتا ہوں تو روح میں نقاہت آجاتی ہے اور فاقہ کشی کرتا ہوں تو اسے توانائی حاصل ہو جاتی ہے۔"

جب سے آپ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ شعبان کے روزوں کی فضیلت زیادہ ہے۔ آپ شعبان کے روزے بالکل نہیں چھوڑتے تھے۔

آپ کی گفتگو میں علم کلام کی جھلک بہت زیادہ پائی جاتی تھی۔ آپ اہل تستر کے حال پر افسوس کرتے تھے، فرماتے تھے۔ "افسوس کہ لوگ پڑے سوتے ہیں اور جب یہ مر جائیں گے تو بیدار ہوں گے اور جب بیدار ہوں گے تو پچھتائیں گے اور جب پچھتائیں گے تو ان کا پچھتانا بے کار ہوگا اور انہیں کچھ فائدہ نہ دے گا۔" اس کے بعد فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ کو رات اور دن کی گھڑیوں میں دلوں کی اطلاع ہوتی رہتی ہے اور جب وہ کسی کے دل میں اپنے سوا کسی اور کی احتیاج دیکھتا ہے تو اس پر ابلیس کو مسلط کر دیتا ہے۔"

کسی نے سوال کیا۔ "حضرت! ایک صوفی کو کن باتوں کی پابندی کرنی چاہیے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "تین چیزوں کی۔ اول اپنے راز کی نگہداشت، دوم اپنے فقر کی حفاظت اور سوم اپنے فرائض کی ادائیگی۔ لوگو! یاد رکھو اللہ تعالیٰ نیت کا قبلہ ہے اور نیت، قلب کا قبلہ ہے۔ قلب بدن کا قبلہ ہے، بدن اعضا کا قبلہ ہے اور اعضا دنیا کے قبلے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو کہ جو گمان سے بچا وہ تجسس سے بچا۔ جو تجسس سے بچا وہ غیبت سے بچا، جو غیبت سے بچا وہ زور (جھوٹ، فریب، مکر) سے بچا، جو زور سے بچا وہ بہتان سے بچا۔"

جب آپ ایک عرصے تک ایسی باتیں کرتے رہے تو تستر کے بااثر حضرات ان سے عاجز آنے لگے۔ آپ ان سے ذرا بھی نہ ڈرتے تھے جو کہنا ہوتا تھا برملا کہہ دیتے تھے۔

ابن منصور حلاج کو آپ کی صاف گوئی اتنی پسند آئی کہ آپ کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ ابن منصور کی صاف گوئی تو بعد میں اتنی مشہور ہوئی کہ "انا الحق" کے شور نے انہیں دار پر چڑھوا دیا۔ تستر کے عوام، خواص اور عرفا، سہل بن عبداللہ کی مخالفت میں متحد اور یک زبان ہو گئے۔ ان تینوں کا ایک نمائندہ وفد کی شکل میں آپ کی خدمت میں پہنچا اور تند و تیز لہجے میں آپ کو منع کیا کہ ان کے خلاف زبان نہ کھولی جائے۔

آپ نے جواب دیا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے جبکہ دنیا کے سارے فتنے تم تینوں کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔"

ان میں عارف نے آپ کی بات کو بہت شدت سے محسوس کیا، پوچھا۔ "عوام اور خواص کے فتنوں کی تو میں بات اس لیے نہیں کروں گا کہ اپنی اپنی حالت سے یہ دونوں خود ہی واقف ہوں گے اور خود ہی جواب دے لیں گے لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ عارفوں کی طرف سے اہلِ دنیا میں کون سے فتنے نازل ہوتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں جو کچھ کہوں گا، اگر تم عارف ہو تو اس سے ضرور اتفاق کرو گے۔ عارف اسی کو کہتے ہیں ناں جو سب کچھ جانتا ہے یعنی وہ حق اور ناحق سے خوب اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے۔ اس واقفیت کے بعد جب وہ حق کے وجوب میں تاخیر سے کام لیتا ہے تو یہیں سے فتنوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔"

عامی نے سوال کیا۔ "اور حضرت! ہماری وجہ سے کون سے اور کس طرح فتنوں کا نزول ہوتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "تم پہلے عامی کی تعریف کو سمجھ لو اس کے بعد میں جواب دوں گا۔"

عامی نے کہا۔ "اس کی آپ ہی تعریف فرما دیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "عامی وہ شخص یا لوگ کہلائیں گے جو علوم عقلی و نقلی اور باطنی سے واقف نہیں ہوتے، اگر یہ ان علوم کو حاصل کر لیں گے مگر انہیں سمجھنے کی استطاعت اور لیاقت نہ رکھتے ہوں تو اس سے جو فتنے پیدا ہوں گے وہ عوامی فتنے کہلائیں گے۔"

خواص نمائندہ کیوں چپ رہتا، فوراً بولا۔ "اور حضرت! اب اس فتنے کی وضاحت بھی فرما دیں جسے آپ خواص کا فتنہ فرما رہے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "خواص وہ ہیں جو جانتے تو سب کچھ ہیں مگر ان کی عقل اور حیلہ جو دانش انہیں رخصت اور تاویل میں الجھا دیتی ہے یعنی جسے اختیار کرنا چاہیے اس سے نظریں چراتے ہیں اور تاویل میں ایک دوسرا عمل اختیار کر کے خود کو زبردستی حق بجانب قرار دیتے ہیں۔"

تینوں آدمی لاجواب ہو کر چلے گئے لیکن ان کے دلوں میں آپ کے خلاف کینہ بیٹھ گیا۔ ان لوگوں نے مل جل کر آپ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ انہوں نے علمائے مصر کو بھی آپ کے خلاف کر دیا اور کہا کہ عبداللہ کا بیٹا، عالموں جیسی باتیں کرتا ہے حالانکہ وہ محض صوفی ہے۔ وہ علما کو برا بھلا کہتا ہے۔

چند عالم آپ کی خدمت میں پہنچے اور دریافت کیا۔ "کیا یہ درست ہے کہ آپ ہمیں برا بھلا کہتے ہیں؟"

آپ نے کہا۔ "یہ کس نے کہا، میں تو علما کو برا بھلا نہیں کہتا۔"

عالموں نے کہا۔ ''تستر کے خواص میں سے ایک شخص نے ہمیں بتایا ہے کہ آپؒ نے کہا ہے کہ ہم لوگ حیلہ جو ہوتے ہیں اور رخصت اور تاویلات میں الجھے رہتے ہیں۔''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''رخصت اور تاویلات میں تو یہاں کے خواص الجھے رہتے ہیں اور یہ بھی ان کی تاویل ہی ہے کہ انہوں نے اس میں علما کو بھی شامل کرلیا۔''

عالموں میں سے کسی نے پوچھا۔ ''ویسے عالموں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''ہمارے ہم عصر علما تین باتوں سے مایوس ہوچکے ہیں یایوں کہو کہ ان میں ناکام ہو رہے ہیں۔''

عالموں نے بیک زبان دریافت کیا۔ ''کون سی تین باتوں میں؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''توبہ کی مستقل پابندی سے، سنت کی پیروی سے اور ترکِ مردم آزادی سے۔''

علما آپؒ کے پاس سے کدورتیں لے کر اٹھے اور لوگوں میں آپؒ کے خلاف اشتعال پھیلاتے رہے۔

آپؒ کے خلاف تستر میں اس قدر داویلا مچا اور لوگوں نے مل جل کر اتنا شور وغل کیا کہ آپؒ کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کرایا گیا۔ ابن منصور حلاج نے معلوم نہیں کیا سوچا کہ کچھ کہے سنے بغیر آپؒ سے علیحدگی اختیار کرلی اور ایک دوسرے صوفی عمرو بن عثمان کی کے پاس چلے گئے۔ آپؒ کو ابن منصورؒ کے اس رویے نے اذیت پہنچائی۔ آپؒ نے اپنا کل اثاثہ خدا کی راہ میں دے دیا اور مکہ معظمہ روانہ ہوگئے۔ آپؒ نے یہ عہد کرلیا تھا کہ وہ کسی سے کچھ بھی نہ مانگیں گے۔

دورانِ سفر آپؒ کو اکثر فاقہ کشی کرنا پڑی۔ آپؒ کا نفس آپؒ کو بہت مجبور کررہا تھا۔ آپؒ نے خود کو مخاطب کیا۔ ''اے میرے نفس! میں محسوس کررہا ہوں کہ تیری مسلسل فاقہ کشی سے بہت بری حالت ہورہی ہے لیکن میں بھی کیا کروں، مجبور ہوں اس لیے صبر کر۔''

نفس نے اندر سے خوشامد کی۔ ''اے سہلؒ! میں مچھلی اور روٹی کھانا چاہتا ہوں۔ اگر آپؒ میری یہ خواہش پوری کردیں تو میں آپؒ کو مکہ معظمہ تک نہیں ستاؤں گا اور خاموش رہوں گا۔''

آپؒ نے کہا۔ ''لیکن میں کیا کروں؟ میں نے تو یہ عہد کررکھا ہے کہ کسی سے کچھ مانگوں گا نہیں اور میرے پاس رقم نہیں ہے کہ اس سے مچھلی اور روٹی خرید کر تیری خواہش پوری کروں۔''

نفس نے جواب دیا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ آپؒ میری خواہش کس طرح پوری کریں گے لیکن میں روٹی اور مچھلی ضرور کھانا ضرور چاہتا ہوں۔''

آپؒ ذرا پریشان سے ہوگئے، بولے۔ ''ٹھہر جا، دیکھ تو میں تجھے کیسی سزا دیتا ہوں۔''

آپؒ نے ادھر ادھر گھوم پھر کر جائزہ لیا کہ یہاں کس قسم کی مشقت کرکے کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایک جگہ آپؒ نے دیکھا کہ ایک اونٹ چکی سے بندھا ہوا مشقت کررہا ہے۔ آپؒ چکی والے کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے پوچھا۔ ''بھائی! کیا یہ اونٹ اسی طرح دن بھر چکی میں لگا رہتا ہے؟''

چکی والے نے جواب دیا۔ ''ہاں، کیوں؟ تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

آپؒ نے پوچھا۔ ''یہ اونٹ کس کا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں نے اسے کرایے پر لے رکھا ہے۔''

آپؒ اس جواب سے بہت خوش ہوئے، پوچھا۔ ''اونٹ والے کو اونٹ کی دن بھر کی مشقت کا کیا معاوضہ دیتے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''دو دینار۔''

آپؒ نے کہا۔ ''چکی والے مجھ پر ایک مہربانی کردو۔ تم اس اونٹ کو کھول دو اور مجھے اس کی جگہ باندھ دو، شام کو مجھے دو دینار کے بجائے ایک دینار دے دینا۔''

چکی والے نے آپؒ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور تعجب سے پوچھا۔ ''اس اونٹ کی جگہ تم جتو گے؟''

''ہاں، کیونکہ اس وقت میرا نفس روٹی اور مچھلی کے لیے بہت تنگ کررہا ہے۔''

چکی والے کو تامل ہوا لیکن آپؒ نے اصرار کیا۔ ''اے شخص! تو فکر نہ کر، اس طرح میں اپنے نفس کو سزا دینا چاہتا ہوں تاکہ یہ آئندہ مجھے تنگ نہ کرے۔''

چکی والے نے اونٹ کھول دیا اور اونٹ کی جگہ آپؒ کو باندھ دیا۔ آپؒ دن بھر چکی میں جتے مشقت کرتے رہے۔ شام کو اس محنت کے عوض آپؒ کو ایک دینار مل گیا۔ آپؒ نے اس دینار سے روٹی اور مچھلی خریدی اور اپنے نفس کی خواہش پوری کردی۔ آپ تھک کر چکنا چور ہوچکے تھے۔ دن بھر کی مشقت نے برا حال کردیا تھا۔ آپؒ نے اپنے نفس سے کہا۔ ''دیکھ آئندہ جب بھی تو ایسی ویسی

خواہش کرے گا تو میں تجھے اسی طرح محنت و مشقت میں لگا دوں گا۔"
مکہ معظمہ میں آپؒ کی ملاقات ذوالنون مصری سے ہوگئی۔ آپؒ ان سے بیعت ہو گئے۔

☆☆☆

تستر واپس آ کر آپؒ نے نہایت خاموشی سے اپنا کام جاری رکھا۔ آپؒ لوگوں کو تعلیم و تلقین کر کے صدق و صفا کی راہ دکھاتے۔ آپؒ کی شہرت دور دور تک تو پہنچ گئی۔ اسی دوران عمرولیث نامی حاکم سخت بیمار پڑ گیا۔ اطبا نے جی جان سے اسے بچانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ عمرولیث نے بیماری سے تنگ آ کر اطبا کو ڈانٹ دیا۔

"تم نے حکمت پڑھی ہے یا گھاس کاٹی ہے۔ میں مہینوں سے بستر مرگ پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور تم مجھے تختۂ مشق بنائے ہوئے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟"

طبیبوں نے بے بسی سے جواب دیا۔ "حضور والا! ہم سب نے اپنے علم سے مقدور بھر کوشش کر ڈالی لیکن ناکام رہے۔ مشیت ایزدی کیا ہے ہمیں نہیں معلوم مگر یہ ضرور جانتے ہیں کہ اب معاملہ دوا کا نہیں دعا کا ہے۔ اب کسی خدا رسیدہ سے التجا کیجیے کہ وہ آپ کے حق میں دعا کرے۔"

عمرولیث نے مایوسی سے دریافت کیا۔ "لیکن وہ خدا رسیدہ ملے گا کہاں؟"

ایک طبیب نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ سہلؒ بن عبداللہ مستجاب الدعوات ہیں، خدا ان کی ضرور سنے گا۔"

عمرولیث نے افسوس سے کہا۔ "لیکن شاید وہ میرے حق میں کوئی دعا نہ کریں۔"

طبیب نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

عمرولیث نے جواب دیا۔ "وہ اس دور کے عوام، خواص، عرفا اور علما سبھی سے نفور اور نالاں ہیں۔ ظاہر ہے وہ مجھے اس لائق کیوں سمجھیں گے کہ دعا کریں۔"

طبیب نے کہا۔ "آپ کا خیال درست نہیں ہے۔ سہلؒ دکھی انسانوں کی خدمت پر ہر وقت کمر بستہ رہتے ہیں۔ آپ ان سے رجوع کریں گے تو میری ناقص رائے میں وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔"

عمرولیث نے کہا۔ "لیکن ان سے رجوع کس طرح کیا جائے؟"

طبیب نے جواب دیا۔ "آپ اپنا ایک آدمی اس درخواست کے ساتھ ان کی خدمت میں روانہ کر دیں کہ بندہ طلب گور آپؒ کی عنایات کا طالب بیٹھا زندگی کی سانسیں پوری کر رہا ہے۔ اگر یہاں تک آنے کی زحمت نہیں گوارا کر سکتے تو اس عاجز کے حق میں موت ہی کی بددعا فرما دیجیے۔"

عمرولیث نے طبیب کے مشورے پر عمل کیا۔ آپؒ فوراً عمرولیث کے پاس پہنچ گئے، فرمایا۔ "تو نے بددعا کی خواہش کی ہے، یہ میں کس طرح کر سکتا ہوں۔"

عمرولیث نے رقت سے عرض کیا۔ "میں آپؒ سے دعا کی درخواست کس منہ سے کروں؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "نہیں، تو دعا کی خواہش بھی کر سکتا ہے لیکن یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لے کہ دعا اسی کے حق میں اثر انداز ہوتی ہے جو تائب ہو چکا ہو۔ اس لیے پہلے تو تم توبہ کرو، اس کے بعد میں دعا کروں گا۔"

عمرولیث کی تو جان پر بنی ہوئی تھی فوراً توبہ استغفار کرنے لگا۔

آپؒ نے کہا۔ "اوں ہوں، یوں نہیں، توبہ استغفار کے ساتھ ساتھ تم ان قیدیوں کو بھی رہا کرو جو قید خانے میں یونہی بند کر دیے گئے ہیں۔" عمرولیث نے اس حکم کی بھی تعمیل کر دی۔

آپؒ نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے۔ گریہ وزاری کرتے ہوئے فرمایا۔ "اے اللہ! جس طرح تو نے اپنی نافرمانی کی ذلت سے عمرولیث کو دوچار کر دیا ہے اسی طرح میری عبادت کی عظمت بھی عمرولیث کو دکھا دے۔"

دعا ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ عمرولیث کو اپنے مرض میں افاقہ سا محسوس ہونے لگا۔

اسی وقت آپؒ کا ایک ارادت مند تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ آپؒ کو واپس لے جانا چاہتا تھا۔ آپؒ نے فرمایا۔ "ذرا دیر ٹھہر جا، عمرولیث کو اچھا ہو جانے دے پھر میں تیرے ساتھ چلوں گا۔"

وہ ٹھہر گیا اور عمرولیث کی حالت یہاں تک سدھر گئی کہ وہ بیمار لگتا ہی نہ تھا۔

آپؒ نے کہا۔ "عمرولیث! اب تم بالکل اچھے ہو چکے ہو اس لیے مجھے اجازت دو۔"

عمرولیث نے عاجزی سے کہا۔ ”حضرت! ایک ذرا توقف فرمائیں۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“

آپؒ رک گئے، عمرولیث اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد جب واپس آیا تو اشرفیوں کی تھیلی اس کے ہاتھ میں تھی، انتہائی ادب سے عرض کیا۔

”حضرت! یہ حقیر سا نذرانہ میری جانب سے قبول فرمالیں۔“

آپؒ نے خفگی سے جواب دیا۔ ”کیا تم یہ اشرفیاں میری دعا کی قیمت میں دے رہے ہو؟“

عمرولیث نے کانپ کر عرض کیا۔ ”حضرت! یہ میری مجال کہ میں اس قسم کا خیال تک لاؤں، استغفراللہ!“

آپؒ نے حقارت سے کہا۔ ”پھر انہیں وہیں لے جاکر رکھ دو جہاں سے نکال کر لائے ہو۔“

عمرولیث نے مجبوراً تھیلی نذر کرنے کے خیال سے توبہ کرلی۔

آپؒ کا مرید اس گفتگو کو نہایت افسوس سے سنتا رہا، واپسی میں ایک جگہ عرض کیا۔ ”حضرت! نذرانہ قبول نہ کرکے آپؒ نے اچھا نہیں کیا۔“

آپؒ نے پوچھا۔ ”کیوں؟ اگر قبول کرلیتا تو کیا ہوتا؟“

مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپؒ سے کیا چھپاؤں درحقیقت میں بے حد مقروض ہوں، اگر آپؒ نذرانہ قبول کرلیتے تو میں اپنے قرض سے سبکدوشی حاصل کرلیتا۔“

آپؒ نے فرمایا۔ ”تو زر چاہتا ہے؟ کتنا زر چاہتا ہے؟ اپنے سامنے دیکھ۔“

مرید نے سامنے جو دیکھا تو دور تک سونا ہی سونا دکھائی دیا۔ مرید کے منہ میں پانی بھر آیا۔ آپؒ نے فرمایا۔ ”خدا نے جس کو یہ مرتبہ عطا کیا ہو اس کو دولت کی تمنا کس طرح ہوسکتی ہے۔“

☆☆☆

جمعے کا دن تھا، ایک بزرگ آپؒ کی ملاقات کو حاضر ہوئے۔ آپؒ کے نزدیک ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ ان بزرگ کو سانپ کے خوف نے قریب نہیں جانے دیا۔ وہ دور کھڑے آپؒ کی اجازت کے منتظر رہے۔ آپؒ نے کہا۔ ”وہاں دور کھڑے کیا کررہے ہو میرے قریب آجاؤ۔“

ان بزرگ نے جواب دیا۔ ”حضرت! اس سانپ کو تو دور کیجیے۔“

آپؒ نے کہا۔ ”دوست، اس کی پروا کیے بغیر آجاؤ یہ تمہیں ستائے گا۔“

وہ بزرگ ذرا جھجکتے ہوئے آپؒ کے قریب پہنچے، سانپ ایک طرف ہٹ گیا۔

آپؒ نے ان بزرگ سے کہا۔ ”جو آسمان کی حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے وہی زمین کی چیزوں سے خوف کھاتا ہے۔“ وہ بزرگ کچھ شرمندہ سے ہوگئے۔

آپؒ نے دریافت کیا۔ ”کیا نماز جمعہ کا بھی خیال ہے؟“

بزرگ نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں لیکن جامع مسجد تو یہاں سے اڑتالیس گھنٹوں کے فاصلے پر ہے۔ ہم یہ فاصلہ آخر طے کس طرح کریں گے؟“

آپؒ نے کھڑے ہوکر فرمایا۔ ”اس کی فکر تم کیوں کرتے ہو۔ لو میرا ہاتھ پکڑلو ہم ابھی وہاں پہنچ جائیں گے۔“

ان بزرگ نے آپؒ کا ہاتھ پکڑلیا۔ پلک جھپکنے میں جو ان بزرگ کو ہوش آیا تو خود کو مسجد کے دروازے پر کھڑا دیکھا۔ وہ دونوں مسجد کے اندر داخل ہوگئے اور نمازیوں کے صف میں کھڑے ہوکر نماز جمعہ ادا کی۔ اس کے بعد آپؒ نے ان بزرگ سے فرمایا۔

”حضرت! مخلص صاحب ایمان تو بہت قلیل ہیں، البتہ کلمہ گو بہت زیادہ ہیں۔“

بزرگ تو خاموش ہوگئے لیکن شاید یہ بات اللہ کو اچھی نہیں لگی۔ دوسرے جمعے کو آپؒ وضو کرکے جامع مسجد تشریف لے گئے۔ مسجد بھری ہوئی تھی۔ امام خطبے کے لیے منبر پر چڑھ چکا تھا۔ سہلؒ بن عبداللہ لوگوں کے اوپر سے گزرتے ہوئے پہلی صف میں داخل ہوگئے۔ مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ آپؒ کے سیدھے ہاتھ پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ آپؒ نے اسے سرسری نظر سے دیکھا تو اس کی خوب صورتی نے آپؒ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اس کے پاس سے خوشبو کے بھبکے پھوٹ رہے تھے۔ اس نے ایک اونی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے بھی آپؒ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”سہلؒ! تیرا کیا حال ہے؟ ٹھیک تو ہے؟“

آپؒ نے قدرے مرعوب ہوکر جواب دیا۔ ”ٹھیک ہوں اے اللہ کے صالح بندے۔“

آپؒ پریشان تھے کہ اس نوجوان نے تو آپؒ کو پہچان لیا ہے لیکن آپؒ اسے پہچاننے سے قاصر رہے تھے۔ اسی وقت آپؒ کو پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی۔ آپؒ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آدمیوں کا زبردست ہجوم دیکھ کر ہمت پست ہوگئی۔ اتنی بہت ساری صفوں

کو پھلانگ کر پیشاب کے لیے جانا بڑا مشکل کام تھا۔ دوسری طرف پیشاب کی شدت کا یہ حال تھا کہ انتہائی صبر و برداشت کے باوجود رک نہیں رہا تھا اور یہ بھی اندیشہ تھا کہ واپس آتے آتے کہیں جماعت سے محروم نہ ہو جائیں۔ آپؒ اسی الجھن میں مبتلا تھے کہ اس اجنبی نوجوان نے آپؒ سے مسکرا کر دریافت کیا۔ ''اے سہل! کیا تمہیں پیشاب کی تکلیف ہو رہی ہے؟''

آپؒ نے حیرت سے جواب دیا۔ ''ہاں مگر تمہیں اس کا کیسے علم ہوا؟''

نوجوان نے اپنی چادر اتار کر آپؒ کو اوڑھا دی اور کہا۔ ''سہل! ان فضول سوال و جواب میں اپنا وقت ضائع نہ کرو، فوراً جا کر قضائے حاجت کر کے واپس آؤ اور نماز میں شامل ہو جاؤ۔''

آپؒ کی آنکھیں بند ہو گئیں کیونکہ نوجوان نے چادر کچھ اس طرح اوڑھائی تھی کہ اس میں آپؒ کا چہرہ بند ہو گیا تھا۔ آپؒ نے گھبرا کر اپنے چہرے پر سے چادر ہٹائی تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سامنے ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ نہ مسجد تھی نہ نمازیوں کی صفیں تھیں اور نہ مسجد کے آس پاس کا ماحول۔ سامنے ایک بڑا سا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازے پر ایک شخص کھڑا ہوا تھا، اس نے آپؒ سے کہا۔ ''سہل! اندر جاؤ اور قضائے حاجات سے فارغ ہو کر واپس آ جاؤ۔''

آپؒ اس محل میں داخل ہو گئے، یہ نہایت عالی شان تھا۔ اندر داہنی طرف ایک گھنا درخت کھڑا تھا۔ اس کی جڑ میں ایک لوٹا رکھا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ درخت سے ذرا آگے بیت الخلا تھا۔ آپؒ بیت الخلا سے فارغ ہو کر باہر جو نکلے تو درخت کی ایک شاخ سے ایک رومال لٹکا ہوا دیکھا۔ اس رومال میں ایک مسواک بندھی تھی، پیچھے سے آواز آئی۔ ''سہل! تم غسل کر سکتے ہو اس کے بعد وضو کر لینا۔''

آپؒ نے غسل کیا اور وضو کر کے کپڑے پہنے اور چادر اوڑھنے لگے۔ آپؒ نے ابھی چادر اپنے سر پر ڈالی ہی تھی کہ آپؒ نے آواز سنی۔ ''سہل! اگر تو اپنے کاموں سے فارغ ہو چکا ہے تو ہمیں مطلع کرتا کہ ہم تیری واپسی کا انتظام کریں۔''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''میں اپنے ہر کام سے فارغ ہو چکا ہوں۔''

اس نے آپؒ کے اوپر سے چادر کھینچ لی۔ آپؒ نے گھبرا کر آس پاس دیکھا تو وہیں امام کے سامنے پہلی صف میں، اس اجنبی نوجوان کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؒ نے پریشان ہو کر اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کیا اس نوجوان کے علاوہ کوئی اور شخص بھی اس واقعے سے واقف ہے۔ پتا چلا سبھی لاعلم ہیں۔ آپؒ اس سوچ میں پڑ گئے کہ یہ جو کچھ ہو چکا ہے کہیں کوئی خواب تو نہیں تھا۔ کبھی آپؒ اس پر یقین لاتے اور کبھی تکذیب کرنے لگتے۔ اسی ادھیڑ بن میں جماعت کھڑی ہو گئی۔ آپؒ نے نماز ادا کی لیکن نماز کے دوران بھی یہی واقعہ آپ کو پریشان کرتا رہا اور اس فکر نے آپؒ کو اور زیادہ تنگ کر دیا تھا کہ آخر یہ نوجوان ہے کون؟

نمازیں پڑھ پڑھ کر نمازی مسجد سے نکلنے لگے۔ آپؒ نے اس نوجوان کا پیچھا کیا اور مسجد سے باہر نکل کر اس کا خاموشی سے تعاقب کرنے لگے۔ کافی دیر چلتے رہنے کے بعد وہ نوجوان ایک بڑے سے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے ہی آپ بھی داخل ہو گئے۔ وہ نوجوان ایک دم پیچھے مڑا اور آپؒ سے کہنے لگا۔ ''اے سہل! تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟ کیا تم اس پر یقین نہیں کر رہے جو آج تمہارے ساتھ پیش آ چکا ہے؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''اپنے شک و شبہے کو دور کرنے کے لیے ہی تو میں نے تمہارا پیچھا کیا ہے۔ میری حیرت کسی طرح بھی کم نہیں ہو رہی ہے کہ آخر یہ اسرار کیا ہیں؟''

نوجوان نے کہا۔ ''اچھا پھر میرے پیچھے چلے آؤ۔''

آپؒ اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ اندر داہنی طرف وہی گھنا درخت کھڑا تھا۔ اس کی جڑ میں پانی سے لبریز لوٹا رکھا ہوا تھا۔ درخت سے ذرا آگے بیت الخلا تھا اور درخت کی ایک شاخ سے مسواک سمیت ایک رومال لٹک رہا تھا۔

نوجوان نے آپؒ سے کہا۔ ''مزید یقین کے لیے رومال کو چھو کر بھی دیکھ لو کہ یہ گیلا ہے یا نہیں؟''

آپؒ نے رومال چھوا تو وہ واقعی گیلا تھا۔ آپؒ نے شدتِ جذبات میں کہا۔ ''میں اس واقعے کی صداقت پر اسی طرح یقین لا رہا ہوں جس طرح خدا پر رکھتا ہوں۔''

نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ ''سہل! یاد رکھو جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے اس کی ہر شے اطاعت کرتی ہے، اسے ڈھونڈو گے تو ضرور پا لو گے۔'' پھر مسکرا کر کہا۔ ''اور سہل! تمہیں اپنا وہ فقرہ یاد ہے کہ مخلص صاحب ایمان تو بہت قلیل ہیں اور فکر کو بہت زیادہ ہیں۔''

آپؒ کے دل پر ایک چوٹ لگی، آنکھیں بھر آئیں۔ نوجوان نے اپنے دونوں ہاتھ آپؒ کی آنکھوں پر رکھ دیے اور آنسو پونچھنے لگا۔ اس نے آنسو پونچھ کر جیسے ہی دونوں ہاتھ آپؒ کے چہرے سے ہٹائے تو دیکھا، سامنے نہ تو وہ نوجوان تھا، نہ وہ محل اور نہ کوئی دوسری ایسی چیز جس کا محل کے متعلقات میں شمار ہوتا تھا۔ آپؒ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ آپ فوراً ہی اندر داخل ہو گئے

اور گریہ وزاری کرتے ہوئے سجدے میں گر گئے۔

☆☆☆

ایک عرصے بعد دوران سفر آپؒ کو ایک جنگل میں یوں محسوس ہوا گویا عبادت اور یادالٰہی کی یہ لذت انہیں پہلے کبھی نہیں حاصل ہوئی تھی۔ اس دوران نماز کا وقت آگیا۔ آپؒ نے سوچا کہ اس لذت میں مزید اضافے کے لیے وضو بہت ضروری ہے۔ لیکن اس ویران جنگل میں پانی حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ آپؒ غم و رنج سے اداس ہو گئے اور پانی کی عدم یافت سے پوری روح بے چین اور مضطرب سی ہو گئی۔ اچانک کسی کے آنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ آپؒ نے آہٹ کی سمت دیکھا، درختوں کی آڑ سے کوئی کالی شے حرکت کرتی بڑھی چلی آرہی تھی۔ آپؒ حیرت سے اس سمت غور سے دیکھنے لگے۔ کوئی کالا کلوٹا شخص دو پیروں پر آپؒ کی طرف چلا آرہا تھا۔ جب وہ درختوں کے درمیان سے نکل کر باہر سامنے آگیا تو آپؒ پریشان بھی ہوئے اور حیرت زدہ بھی۔ یہ ایک ریچھ تھا جس نے اپنے سر پر ایک گھڑا اٹھا رکھا تھا اور اس گھڑے کو اس نے اپنے اگلے دونوں پاؤں سے پکڑ رکھا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ بالکل آپؒ کے قریب آگیا۔ آپؒ کے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ اس نے اپنے سر سے گھڑا آپؒ کے سامنے اتار کر رکھ دیا اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔

آپؒ نے زیر لب سوال کیا۔ ”خدایا تیری شان ہے کہ یہ گھڑا اس طرح میرے پاس آگیا۔“

وہ ریچھ آپؒ کے سامنے مودب کھڑا رہا۔ آپؒ کے دل میں ایک علمی شبہ پیدا ہوا اور آہستہ سے ریچھ کو یوں مخاطب کیا، گویا اس سے جواب لینا مقصود نہیں ہے بلکہ محض اپنے علمی اعتراض کو زبان سے ادا کر کے دل کا بوجھ اتارنا ہے۔

”واللہ میں حیران ہوں کہ یہ پانی کا گھڑا جس طرح میرے پاس آیا ہے اس سے میں کیا سمجھوں؟“

انہیں ایسا محسوس ہوا گویا ریچھ جواب دے رہا ہے۔ ”اے سہلؒ! اہم درویش لوگ آج آپس میں ان لوگوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جو اللہ کی محبت اور توکل میں دنیا سے تعلقات چھوڑے ہوئے ہیں کہ اچانک یہ آواز آئی سہل بن عبداللہ وضو کے لیے پانی تلاش کرتے پھر رہے ہیں چنانچہ میں نے یہ گھڑا لیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔“

سہلؒ پر غشی طاری ہو گئی، جب ذرا ہوش آیا تو آپؒ نے دیکھا، پانی کا گھڑا سامنے رکھا ہوا ہے اور ریچھ جا چکا ہے۔ آپؒ نے اس پانی سے وضو کیا۔ کچھ پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ آپؒ نے پانی پینا چاہا تو آواز سنائی دی۔ ”اے سہلؒ! تمہیں یہ پانی پینے کے لیے نہیں وضو کے لیے بھیجا گیا ہے اس لیے پینے سے پرہیز کرو۔“

گھڑا آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ آپؒ نے اس سمت غور سے دیکھا۔ جدھر سے آواز آئی تھی لیکن ادھر کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے بعد جو گھڑے کی طرف دیکھا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔

آپؒ کو اپنے مرشد ذوالنون مصری کی یاد بہت ستاتی رہتی تھی۔ آپؒ دیوار سے ٹیک لگا کر نہیں بیٹھتے تھے اور نہ ہی کبھی پیر پھیلاتے تھے۔ لوگ آپؒ سے مختلف سوالات کر کے تقریر کرنے پر مجبور کرتے تھے لیکن جب سے آپ مکہ معظمہ سے واپس آئے تھے اس قسم کے جوابات اور تقریروں سے ہمیشہ گریز کیا کرتے تھے۔ ایک دن لوگوں نے دیکھا آپؒ اپنے پیر کی انگلیاں باندھ رہے ہیں۔ کسی نے دریافت کیا۔ ”حضرت! ان انگلیوں میں کیا ہو گیا؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”ان میں سخت درد اٹھ کھڑا ہوا ہے۔“

پوچھا گیا۔ ”کیا کہیں چوٹ لگ گئی ہے؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”نہیں، اس کی وجہ کچھ عرصہ بعد بتاؤں گا۔“

آپؒ چار ماہ تک انگلیوں کو باندھے رہے۔ لوگوں نے اس سلسلے میں بارہا سوالات کیے لیکن آپؒ نے جواب نہیں دیا۔

آپؒ کے مریدوں میں سے ایک شخص مصر گیا۔ وہاں آپؒ کے مرشد ذوالنون مصری سے ملاقات کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان کے پیر کی انگلیاں بھی بندھی ہوئی ہیں۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”حضرت! میں تستر سے آیا ہوں، وہاں میں نے اپنے مرشد سہلؒ بن عبداللہ کے پیر کی انگلیاں بھی اسی طرح بندھی دیکھی ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں ان سے بار بار پوچھا بھی لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟“

ذوالنون مصری نے جواب دیا۔ ”اے شخص! اس میں کوئی شک نہیں کہ سہلؒ کے علاوہ آج ایسا دوسرا کوئی بھی نہیں جو میرے حال سے باخبر ہو کر اس طرح میری پیروی کرے۔“ مزید فرمایا۔ ”میں تقریباً چار ماہ سے انگلیوں کے درد میں مبتلا ہوں۔“

وہ شخص جب تستر واپس پہنچا تو دیکھا سہلؒ نے انگلیاں کھول دی ہیں۔ وہ چونکہ اس راز سے واقف ہو چکا تھا اس لیے دوبارہ

جذبات سے مغلوب ہو کر آپؒ کے قدموں میں گر گیا اور کہنے لگا۔ "حضرت! اپنے پیر و مرشد کی مریدی کا جو حق آپؒ نے ادا فرمایا ہے میں یا کوئی اور اس کی ہمت نہیں کر سکتا۔"

ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ آپؒ خلافِ معمول دیوار سے پشت لگائے بیٹھے ہیں، لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی پھر آپؒ نے پیر بھی پھیلا دیے اور فرمایا۔ "لوگو۔۔۔! تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے مجھ سے پوچھ لو۔ آج میں تمہاری باتوں کے جواب دوں گا۔"

کسی نے پوچھا۔ "حضرت! یہ کیا ماجرا ہے کہ پہلے آپؒ نہ تو اس طرح دیوار سے پشت لگاتے تھے اور نہ اس طرح پیر پھیلا کر بیٹھتے تھے اور ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ جب آپؒ سے سوالات کیے جاتے تھے تو ان کے جوابات بھی نہیں دیتے تھے پھر آج یہ حیرت انگیز تبدیلی کس طرح آ گئی؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "تھوڑی دیر پہلے تک میرے مرشد حضرت ذوالنون مصری بقیدِ حیات تھے اور میں ان کے احترام میں یہ احتیاط روا رکھتا تھا لیکن اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اس لیے میں اب خود کو آزاد اور ہلکا سا محسوس کر رہا ہوں۔"

آپؒ نے حج کا دوبارہ قصد فرمایا اور بے سر و سامانی سے روانہ ہو گئے۔ کسی بیابان سے گزرتے ہوئے آپؒ کو ایک نہایت بدحال بڑھیا ملی۔ اس کی غربت اور افلاس کا یہ حال تھا کہ پورا جسم چیتھڑوں سے ڈھکا تھا اور شاید بھوک سے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ آپؒ نے ازراہِ ترحم اسے اپنے پاس سے کچھ دینا چاہا تو اس نے آپؒ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ سہلؒ لرز گئے، بولی۔ "سہلؒ! کیا تو اللہ سے زیادہ رحیم و کریم ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "ہرگز نہیں۔"

بڑھیا نے کہا۔ "پھر تو نے میرے حال پر رحم کی جرأت کس طرح کی؟ اللہ جو سب سے زیادہ رحیم و کریم ہے اور میرے چھپے ہوئے حالات سے باخبر ہے، کیا وہ میری مدد نہیں کر سکتا؟"

آپؒ نے ڈر کر جواب دیا۔ "کیوں نہیں کر سکتا۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی؟"

بڑھیا نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی مٹھی بند کر لی اور ذرا دیر بعد آپؒ کے سامنے کھول دی۔ آپؒ نے دیکھا اس کی ہتھیلی پر سونے کا ایک ڈھیر رکھا ہوا ہے۔ اس نے آپؒ کو حقارت سے مخاطب کیا۔ "سہلؒ! تم کسی کو دینے کے لیے اپنی جیب سے نکالتے ہو لیکن مجھے غیب سے ملتا ہے۔"

اس فقرے نے آپؒ کی جو حالت کر دی بس آپؒ ہی جان سکتے تھے۔ آپؒ نے ذرا دیر کے لیے اس کے پاس قیام کیا اور بارگاہِ ایزدی میں پیشانی رکھ دی، گڑگڑاتے ہوئے بولے۔ "اے اللہ! تیرا بندہ سہلؒ تو تیرے بندوں کو پہچاننے سے قاصر رہ جاتا ہے پھر تجھے کس طرح پہچاننے جانے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔"

جب آپؒ نے سجدے سے سر اٹھایا تو وہ بڑھیا پھر غائب ہو چکی تھی۔

آپؒ نے بیت اللہ پہنچ کر اس کا طواف شروع کر دیا۔ طواف سے فراغت پا کر آپؒ ایک طرف بیٹھ گئے تو اچانک وہ بڑھیا نظر آئی اور یہ دیکھ کر تو ان کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے کہ بڑھیا بیت اللہ کا طواف نہیں کر رہی تھی بلکہ بیت اللہ بڑھیا کا طواف کر رہا تھا۔ جب یہ طواف کر چکا تو آپؒ نے اس بڑھیا سے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ "کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ بیت اللہ نے تیرا کیوں طواف کیا؟"

بڑھیا ہنسنے لگی، بولی۔ "سہلؒ! کیا تو یہ ذرا سی بات بھی نہیں جانتا کہ جو لوگ اختیاری طور پر یہاں پہنچتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود بیت اللہ کا طواف کریں لیکن جو یہاں اضطراری عالم میں آتے ہیں، کعبہ ان کا خود طواف کرتا ہے۔" آپؒ پر ایک بار پھر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔

☆☆☆

آپؒ نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے اور بہت بڑا پرندہ میدانِ حشر میں جمع لوگوں کے سروں پر منڈلا رہا ہے اور پھر وہ ایک شخص کے کاندھے پر بیٹھ گیا اور اس شخص کو دھکیلتا ہوا ایک طرف غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد یہ پرندہ پھر نمودار ہوا، اس شخص کا کوئی پتا نہ تھا۔ یہ پرندہ ایک اور شخص کے کاندھے پر بیٹھ گیا اور پھر اسے بھی دھکیلتا ہوا ایک طرف لے گیا، یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تیسری بار پھر تنہا نمودار ہوا۔

آپؒ نے عاجزی سے سوال کیا۔ "اے اللہ! تیرے بعد تیرے سوا کون جان سکتا ہے، کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ یہ پرندہ کیا کر رہا ہے اور یہ ہے کون؟"

آپؒ کو جواب دیا گیا۔ "اے سہلؒ! یہ پرندہ میرے بندوں کا تقویٰ ہے اور یہ صاحبِ تقویٰ کو پکڑ پکڑ کر جنت میں داخل کر رہا ہے۔"

سحر پرندہ آپؒ کو بھی جنت میں لے گیا۔ وہاں آپؒ کی تین ایسے شناسا بزرگوں سے ملاقات ہوئی جو رحلت فرما چکے تھے اور آپؒ ان کی بزرگی اور عظمت سے اچھی طرح واقف تھے۔ آپؒ نے یکے بعد دیگرے ان تینوں سے ایک ہی سوال کیا، پوچھا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ دنیا میں آپ کو سب سے زیادہ ڈراؤنی شے کون سی پیش آئی؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''خاتمے کا ڈر۔'' ان تینوں کا ایک ہی جواب تھا۔ اس کے بعد آپؒ کی آنکھ کھل گئی اور محسوس کیا کہ انہیں بھی سب سے زیادہ خاتمے کا ہی ڈر ہے۔

کچھ عرصہ بعد آپؒ نے پھر ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ آپؒ نے دیکھا ابلیس آپؒ کے سامنے موجود ہے۔ آپؒ نے اس سے سوال کیا۔ ''ابلیس! میں تجھ سے ایک سوال کروں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''کیجیے۔''

آپؒ نے پوچھا۔ ''تو جھوٹ تو نہیں بولے گا؟''

ابلیس نے جواب دیا۔ ''سہلؒ! میں تم سے مایوس ہو چکا ہوں اس لیے جھوٹ نہیں بولوں گا۔''

آپؒ نے سوال کیا۔ ''کیا تو یہ بتائے گا کہ تیرے نزدیک سب سے زیادہ پریشان کن کیا بات ہوتی ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''بندے کا خدا کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول رہنا۔''

آپؒ نے کہا۔ ''تو معلم الملکوت رہ چکا ہے، خدا کی وحدانیت کا علم تجھ سے زیادہ کسے حاصل ہوگا، آج میں تیری زبان سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔''

ابلیس نے اللہ کی وحدانیت پر بولنا شروع کر دیا، وہ دیر تک بولتا رہا اور وہ رموز و اسرار بیان کیے کہ اس دنیا کا بڑے سے بڑا عارف بھی اتنی تشریح کے ساتھ معارف وحدانیت نہیں بیان کر سکتا۔

☆☆☆

آپؒ کے پڑوس میں دو بھائی رہتے تھے۔ ان میں سے ایک حج پر گیا۔ اس نے عرفات میں سہلؒ بن عبداللہ کو دیکھا۔ وہ آپؒ سے باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن موقع نہیں مل سکا۔ وہ جب گھر واپس آیا تو اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ ''بھائی! افسوس کہ سہلؒ بن عبداللہ کے قریب ہونے کے باوجود جب میدان عرفات میں آپؒ کو دیکھا تو کوشش کے باوجود میں آپؒ کے پاس نہ پہنچ سکا اور وہاں ملاقات کی سعادت سے محروم رہ گیا۔''

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ''بھائی صاحب! آپ ہوش میں تو ہیں، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں آٹھویں ذی الحجہ آپؒ کے پاس بیٹھا آپؒ کی باتیں سن رہا تھا پھر میں کس طرح یقین کر لوں کہ آپؒ نے حضرت کو میدان عرفات میں دیکھا؟''

بڑے بھائی کو غصہ آ گیا۔ ''تم مجھے جھٹلانے کی کوشش نہ کرو۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ میں نے انہیں عرفات کے میدان میں دیکھا تھا۔''

چھوٹے بھائی نے پوچھا۔ ''کس کی قسم؟''

بڑے بھائی نے جواب دیا۔ ''ہم دونوں آپؒ کے پاس چلتے ہیں، اگر آپؒ یہ کہہ دیں کہ ہاں میں انہیں عرفات میں دیکھ چکا ہوں تب کی بات ہے۔ آپؒ مجھے دیکھ کر مسکرائے بھی تھے۔ اگر میری بات غلط ثابت ہوئی تو مجھ پر میری بیوی حرام ہے۔''

دونوں بھائی آپؒ کے پاس پہنچے اور سارا قصہ بیان کر دیا۔

چھوٹے بھائی نے آپؒ سے کہا۔ ''کیا میں آٹھویں ذی الحجہ کو آپؒ کے پاس موجود نہیں تھا؟''

بڑے بھائی نے جوش سے کہا۔ ''اور حضرت! آپؒ سچ سچ فرمائیے کہ کیا میں آپؒ سے میدان عرفات میں نہیں ملا تھا؟ آپ تو مجھے دیکھ کر مسکرائے بھی تھے اور میں کوشش کے باوجود آپؒ کے پاس پہنچنے میں ناکام رہا تھا۔''

آپؒ نے چھوٹے بھائی سے کہا۔ ''تو اپنے بڑے بھائی سے ناحق الجھ رہا ہے، جا خدا کی عبادت میں مشغول ہو جا۔''

اور بڑے بھائی کو حکم دیا۔ ''کون ہے جو تجھے جھٹلا دے، تو اپنی بیوی کو مت چھوڑ۔''

بڑے بھائی نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا یہ بھی درست ہے کہ آپ آٹھویں ذی الحجہ کو یہاں موجود تھے؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''تو نے میدان عرفات میں جو کچھ دیکھا تھا، اب اسے کسی اور سے ہرگز بیان نہ کرنا۔'' دونوں بھائی ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔

ایک شخص آپؒ کی ملاقات کو حاضر ہوا اور آپؒ سے پوچھا۔ ''حضرت! یہ بتائیے نجات کس بات میں ہے؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''تین باتوں میں۔ خاموشی، تنہائی اور کم کھانے میں۔''

وہ شخص بہت خوش ہوا، بولا۔ "حضرت! میں آپؒ کی صحبت میں زندگی گزار دینا چاہتا ہوں۔"
آپؒ نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے تو رہ میری صحبت میں لیکن یہ تو بتا کہ میرے بعد تو کس کی صحبت اختیار کرے گا؟"
اس نے کہا۔ "پھر خدا کی صحبت اختیار کروں گا۔"
آپؒ نے جواب دیا۔ "پھر ابھی سے خدا کی صحبت کیوں نہیں اختیار کرتا کیونکہ اس کی صحبت سے کبھی تجھے مایوس نہیں ہونا پڑے گا۔"
آخری عمر میں آپؒ کے پاس درندے بے تکلف آنے جانے لگے۔ آپؒ نے ان کے لیے ایک کوٹھری وقف کردی تھی اور اس کوٹھری کا نام بیت السباع (درندوں کا گھر) رکھ دیا تھا۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ درندے دم ہلاتے ہوئے آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور انہیں ان کی کوٹھری میں پہنچا دیتے۔ وہاں ان درندوں کی گوشت سے تواضع کی جاتی۔
ایک دوسرے بزرگ شیخ ابوالغیث یمنیؒ کے سامنے جب یہ واقعہ بیان کیا گیا تو بعض آدمیوں نے اعتراضاً کہا۔ "بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ سہلؒ بن عبداللہ تستری کے پاس جنگلی درندے پالتو جانوروں کی طرح آتے جاتے رہیں اور کسی کو کوئی گزند نہ پہنچائیں؟"
شیخ ابوالغیث یمنیؒ نے غصے سے جواب دیا۔ "تم لوگ سہلؒ بن عبداللہ کے مرتبے سے واقف نہیں ہو جبھی اس قسم کی باتیں کررہے ہو۔"
کسی معترض نے کہا۔ "حضرت! آپ بھی تو صاحب کشف ہیں آخر آپ کی طرف سے کوئی ایسی کرامت کیوں نہیں ظاہر ہوتی؟"
آپؒ نے جواب دیا۔ "تو ذرا میرے ساتھ جنگل تک چل، وہاں مجھے ایک کام ہے اور وہیں تیرے اعتراض کا جواب بھی مل جائے گا۔"
شیخ ابوالغیث یمنیؒ اس معترض کو لے کر جنگل میں چلے گئے۔ یہ دونوں صاحبان اپنے اپنے گدھوں پر سوار تھے۔ جنگل میں شیخ ابوالغیث یمنیؒ تو گدھے کو چھوڑ کر لکڑیاں کاٹنے لگے اور معترض ادھر ادھر ہوا خوری کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک طرف سے شیر کے دہاڑنے کی آواز سنائی دی۔ معترض ڈر کر بھاگنا چاہتا تھا کہ اس نے ایک دہشت ناک منظر دیکھا۔ شیر نے شیخ یمنیؒ کے گدھے کو پھاڑ ڈالا تھا اور اسے غرا غرا کر چٹ کررہا تھا۔
معترض خوف کے ساتھ ساتھ دل میں اس بات پر ہنس رہا تھا کہ آج شیخ یمنیؒ کو وہ لاجواب کرکے رہے گا اور ان سے پوچھے گا کہ "حضرت! آپؒ کی کرامت کہاں چلی گئی کہ شیر آپؒ کی موجودگی میں آپؒ کے گدھے کو چیر پھاڑ کر کھا گیا۔ آپؒ نے اسے روک نہیں لیا۔"
آپؒ لکڑیوں کا گٹھا لیے ہوئے جنگل سے نمودار ہوئے اور ادھر ادھر اپنے گدھے کو تلاش کرنے لگے۔ شیر آپؒ کے گدھے کو ایک درخت کی آڑ میں کھانے میں مشغول تھا۔
شیخ یمنیؒ نے اپنے گدھے کو آواز دی تو معترض نے طنزاً کہا۔ "حضرت! آپ کا گدھا تو شیر کے پیٹ میں پہنچ چکا، اب آپؒ قیامت تک اسے پکارتے رہیے۔"
آپؒ نے پوچھا۔ "وہ شیر کہاں ہے؟"
معترض نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اس درخت کے پیچھے۔"
آپؒ نے پوچھا۔ "اور تو یہاں کھڑا کیا کررہا ہے۔ کیا تجھے شیر سے ڈر نہیں لگ رہا؟"
معترض نے جواب دیا۔ "چونکہ شیر کی یہ عادت ہے کہ اگر اس کا پیٹ بھر چکا ہو تو وہ بلاوجہ چیر پھاڑ نہیں کرتا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر شیر میری طرف رجوع ہوا تو میں اپنے گدھے کو اس کے حوالے کرکے کسی درخت پر چڑھ جاؤں گا۔"
شیخ یمنیؒ نے کہا۔ "افسوس کہ اب میں ان لکڑیوں کا گٹھا گھر تک کس طرح لے جاؤں گا؟"
معترض نے طنز کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اس کام کے لیے میں اپنا گدھا تو پیش کرنے سے رہا۔ شیر کو حکم دیں کہ وہ آپ کا گدھا اگل دے۔"
شیخ یمنیؒ شیر والے درخت کی طرف بڑھے، بولے۔ "کوئی ترکیب تو کرنا ہی پڑے گی۔"
معترض کی جان نکل گئی، خوشامد کرتے ہوئے بولا۔ "حضرت! واپس آجائیے، میرا گدھا حاضر ہے۔ یہاں سے نکلنے کی فکر کیجیے۔"
لیکن شیخ یمنیؒ رکے نہیں۔ درخت کے پیچھے شیر اس وقت بھی موجود تھا۔
آپؒ نے شیر کو ڈانٹا۔ "کم بخت! یہ تو نے کیا کیا کہ میرا گدھا چٹ کرگیا۔ اب میں اپنی لکڑیاں کس پر لاد کر لے جاؤں گا؟"
شیر نے کتے کی طرح دم ہلانا شروع کردی۔ آپؒ نے اس کا کان پکڑ لیا، بولے۔ "آج تو میں تجھے چھوڑنے سے رہا۔ اگر گدھا نہیں ہے تو کیا ہوا، تو تو موجود ہے۔ چل میری لکڑیوں کا گٹھا اپنی پشت پر لاد کر میرے گھر تک پہنچا۔"
معترض نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا تو اس کے ہوش و حواس تتر بتر ہو گئے۔ آپؒ نے اس سے کہا۔ "تو کیوں گھبراتا ہے، میں بات انصاف کی کررہا ہوں۔ جب اس نے میرا گدھا کھایا ہے تو لامحالہ لکڑیاں بھی اس کی پشت پر لادی جائیں گی۔"

آپؒ نے لکڑیوں کا گٹھا شیر کی پشت پر رکھ دیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ خوف زدہ معترض آپؒ کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔
آپؒ نے اپنے دروازے پر پہنچ کر لکڑیوں کا گٹھا شیر کی پشت سے اتار لیا اور شیر کو حکم دیا۔ "اب تو جنگل واپس جا۔"
شیر اس طرح دم دبا کر فرار ہوا جس طرح بکری بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔
آپؒ نے خوف زدہ معترض سے پوچھا۔ "سہل بن عبداللہ کے اس واقعے کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے جس میں لوگ یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے درندوں کے لیے بیت السباع قائم کر رکھا ہے؟"
اس نے سہم کر جواب دیا۔ "اب آپؒ جو کچھ فرمائیں گے میں یقین کروں گا۔"

☆☆☆

وفات کے قریب آپؒ کے مریدوں نے پوچھا۔ "حضرت! آپؒ کے بعد آپ کا خلیفہ کون ہوگا؟"
آپؒ نے جواب دیا۔ "شاد دلگیر آتش پرست۔"
لوگوں نے پوچھا۔ "برسر منبر وعظ کون کہے گا؟"
آپؒ نے اپنا پہلا جواب دہرایا۔ "شاد دلگیر آتش پرست۔" لوگ حیرت کی وجہ سے زبان سے تو کچھ بھی نہ کہہ سکے لیکن ان کی صورتیں کہہ رہی تھیں کہ ایک آتش پرست آخر کس طرح ان کا خلیفہ بنے گا اور اسے برسر منبر مسلمان کس طرح جانے دیں گے۔
آپؒ نے شاد دلگیر آتش پرست کو بلوایا اور اسے نصیحت کی۔ "شاد دلگیر! میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ میرے انتقال کے تیسرے دن یہاں آجانا اور ظہر کی نماز کے وقت سے وعظ کہنا شروع کر دینا۔"
آپؒ کے انتقال فرمانے کے تین دن بعد شاد دلگیر آپؒ کی خانقاہ میں داخل ہوا اس وقت وہ اپنا مذہبی لباس پہنے ہوئے تھا۔ وہ اسی لباس میں منبر پر چڑھ گیا اور حاضرین کو مخاطب کیا۔ "لوگو! تمہارے سردار نے مجھے داعی بنایا ہے تمہیں اس میں کوئی اعتراض تو نہیں؟"
لوگوں نے جواب دیا۔ "ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"
مجمعے میں سے کسی نے سرگوشی کے انداز میں اعتراض کیا۔ "لیکن جناب! یہ بات ہے کتنی عجیب کہ ایک آتش پرست، خدائے واحد کے منبر سے ہماری راہ نمائی کرے۔"
شاد دلگیر آتش پرست نے ہنس کر جواب دیا۔ "تیرا شبہ درست ہے لیکن اس ہدایت میں جو سہلؒ بن عبداللہ نے میرے حق میں فرمائی تھی، یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ میں آتش پرستی کو ترک کر دوں۔"
اتنا کہہ کر اس نے اپنا آتش پرستی کا لبادہ اتار دیا۔ اس کے اندر اسلامی لبادہ موجود تھا۔ اس نے کہا۔ "اب میں مسلمان ہو رہا ہوں۔" شاد دلگیر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔
اس کے بعد اس نے پہلا وعظ جو کیا، اس کے مشہور الفاظ یہ تھے۔ "لوگو! میں نے تو ظاہری لبادہ اتار کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا ہے لیکن تم لوگ مسلمان ہو اور اگر تم روز محشر سہلؒ بن عبداللہ سے ملنا اور ان کے قریب رہنا چاہتے ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے دلوں پر سے غیر اللہ کے لبادے اتار پھینکو۔"
ان جملوں نے لوگوں کے دلوں کی حالت بدل دی اور وہ سب زاروقطار رونے لگے۔
آپؒ کے جنازے میں ایک آتش پرست بھی موجود تھا۔ اس نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اوپر سے فرشتوں کا نزول دیکھ رہا ہوں۔ اے کاش تم بھی دیکھ سکتے۔" اس کے بعد وہ آتش پرست بھی مسلمان ہو گیا۔
آپؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ زندگی چار قسم کی ہوتی ہے۔ فرشتوں کی زندگی، جو ہمیشہ اطاعت میں گزرتی ہے۔ نبیوں کی زندگی، جو علم اور وحی میں گزرتی ہے۔ صدیقوں کی زندگی، جو بے چون و چرا اقتدا میں گزرتی ہے اور باقی لوگوں کی زندگی، خواہ وہ عالم ہوں یا جاہل ہوں، زاہد ہوں یا عابد ہوں۔ ان سب کی کھانے پینے میں گزرتی ہے۔" اس کے بعد مزید فرماتے۔ "ضرورت نبیوں کے لیے ہے، قیام صدیقوں کے لیے، قوت مومنوں کے لیے اور راتب چوپایوں کے لیے۔"
آپؒ کی ایسی باتوں نے آپؒ کو علمائے متکلمین میں شامل کر دیا ہے اور اہلِ تستر ہمیشہ اس بات پر نازاں رہے کہ ان کے وطن کے سہلؒ بن عبداللہ ایک بہت بڑے صوفی ہی نہیں، بہت بڑے متکلم بھی تھے۔

مآخذ: خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ معارج الولایت، قلمی بحوالہ خزینۃ الاصفیا۔ حقیقۃ الفقرا، بحوالہ خزینۃ الاصفیا۔ مفتاح العارفین (قلمی)، عبدالفتاح بن نعمان۔ حسنات العارفین، شہزادہ دارا شکوہ۔

شیخ محمد

ضیا تسنیم بلگرامی



دنیا کے اندھیروں میں نور کی کچھ کرنیں اب بھی اس کائنات کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں اور ان کا ثبوت ولیوں کی وہ گراں قدر شخصیات ہیں جنہوں نے اپنی زندگی عبادتِ الٰہی اور خدمتِ خلق کے لیے وقف کردی، اس کے باوجود تشنگی سے دوچار رہے۔ اپنے مقصد حیات کے ادھورے پن کا احساس انہیں مضطرب رکھتا اور اسی اضطراب نے انہیں کبھی یادالٰہی سے غافل نہ ہونے دیا۔

پیدائش انسان کے رمز کو پانے والے ولیوں میں سے ایک انتخاب

شیخ محمد حضرت ولی اللہ شاہ دہلویؒ کے جد مادری تھے۔ اپنے آبائی وطن نارنول میں کچھ عرصہ رہ کر شیخ ابوالرضا کی خدمت میں چلے گئے۔ وہیں ان کی ملاقات حضرت شاہ ولی اللہ کے والد شیخ عبدالرحیمؒ سے ہوئی اور ان دونوں نے شیخ محمدؒ کی تعلیم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ نارنول چھوڑ کر دہلی کی سکونت اختیار کی اور شب و روز تحصیل علم میں مشغول رہے۔ چونکہ شیخ ابوالرضا پر استغراق کا عالم طاری رہتا تھا اس لیے وہ اپنے نوعمر شاگرد اور مرید شیخ محمدؒ پر تعلیم و تربیت کے سلسلے میں زیادہ وقت نہیں دیتے تھے اور اسباق تھوڑے تھوڑے ہوتے تھے جبکہ شیخ محمدؒ میں ہوسِ علم اور تشنگی عرفان کی یہ شدت تھی کہ زیادہ کی فکر میں ہروقت مضطرب اور پریشان رہتے تھے۔ کئی بار جی میں آئی کہ اپنے پیرومرشد اور استاد سے کہیں کہ "حضرت! اس طرح تو یہ خاکسار برسوں معلق رہے گا اور یہ عاجز ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہے گا۔ خدا کے لیے جو بتانا سکھانا ہے اس میں عجلت اور شدت اختیار کیجیے ورنہ تاخیر اور تعویق تو اس ناچیز کے لیے برداشت سے باہر ہے۔"

شیخ ابوالرضا نے مئے عرفان سے مخمور آنکھوں سے اپنے مضطرب شاگرد و مرید کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔ شیخ محمدؒ ڈر گئے کہ کہیں

وہ ناراض تونہیں ہو گئے۔ لیکن شیخ ابوالرشا نے بڑی نرمی اور ملامت سے کہا۔ ''شیخ محمدؒ! تو کس عجلت اور ہوس کی بات کر رہا ہے؟ وہ عجلت جو تجھے اور ہر انسان کو اپنے دادا حضرت آدم علیہ السلام سے ورثے میں ملی ہے، اور وہی عجلت جو انسان کو شرمندہ و خجل کر دیا کرتی ہے، ہوس عرفان بڑی اچھی چیز ہے مگر بیگانا ہوس نا قابل توجہ ہوتی ہے۔ میں تیرا مرشد بھی ہوں اور استاد بھی، میں جانتا ہوں کہ تو کتنے دنوں میں فارغ التحصیل ہو جائے گا۔ بس اس مدت کو ذہن میں رکھ کر تجھ پر محنت کی جا رہی ہے اور توجہ دی جا رہی ہے۔''

اس جواب نے شیخ محمدؒ کو مطمئن نہیں کیا، وہ بہ دستور اس خلجان میں مبتلا رہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو جلد از جلد فارغ التحصیل ہو لیا جائے لیکن فی الحال اپنے پیرو مرشد اور استاد سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور سکوت اختیار کیا۔ بے چینی اور اضطراب میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ وہ آتش زیر پا شخص کی طرح دہلی کے گلی کوچوں اور بازاروں کی شاہراہ نوردی میں مشغول رہے۔

ایک دن وہ شہر کے ایک ایسے مکان کے پاس سے گزرے جہاں طالب علموں کی بھنبھناہٹ بڑی دور تک گونج رہی تھی۔ شیخ محمدؒ اس مکان کے دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے، زرا اندر کی آوازیں سننے لگے۔ استاد اپنے شاگردوں کو بڑی توجہ سے پڑھانے میں مشغول تھا۔ کچھ دیر اسی طرح کھڑے رہنے کے بعد ان پر ذوق شوق نے غلبہ کیا اور بہ اجازت لیے بغیر مکان میں داخل ہو گئے۔ اندر کا منظر بڑا دل نشین اور سحر انگیز تھا۔ شیخ محمدؒ پر اس کا خاص اثر ہوا۔ انہوں نے اپنی زبان سے تو ایک لفظ بھی نہ ادا کیا۔ بس شاگردوں اور...... طلب علموں کے سامنے ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ باریش نورانی چہرے والے استاد نے ایک اجنبی نوجوان کو درس گاہ میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ بھی بس دیکھتا رہا۔ استاد کی نظر میں یہ عجیب نوجوان جس پر اس کی درس گاہ کے طالب علموں کی کیفیت نے ایک نشہ سا طاری کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ...... وہ بالآخر ان سے کوئی درخواست کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور کچھ دیر بعد جب محویت ٹوٹی اور شیخ محمدؒ ہوش میں آئے تو اپنے آس پاس گھبرائی گھبرائی نظریں ڈال کر مکان سے باہر نکل گئے۔ درس گاہ کے استاد نے اپنے شاگردوں کو حکم دیا۔ ''یہ کون شخص ہے، کہاں سے اور کیوں آیا تھا؟ چاہتا کیا ہے؟ اس کو روکو اور اس سے یہ ساری باتیں کر کے جواب حاصل کرو۔''

تیز طرار شاگردوں نے باہر نکل کر دوڑ لگائی اور دم کے دم میں شیخ محمدؒ کو پکڑ لیا۔ آپ بہت پریشان ہوئے پوچھا۔ ''دوستو! کیا بات ہے؟ یہ تم کس کے حکم پر مجھے گرفتار کر رہے ہو؟''

ایک شاگرد نے ہنس کر جواب دیا۔ ''ہم اپنے استاد محترم کے حکم پر تجھے پکڑنے آئے ہیں۔ تو ہمارے ساتھ اپنے پیروں سے چل دے تو بہتر ہے ورنہ ہمیں دوسرا طریقہ بھی آتا ہے۔''

شیخ محمدؒ نے جواب دیا۔ ''بھائیو! تمہیں زبردستی اور جبر کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں یوں ہی چلا چلوں گا۔ لیکن جانے سے پہلے میری چند باتیں ضرور سن لو۔ اگر ان کے جوابات ممکن ہوں تو ان سے بھی شاد کام کر دو ورنہ تمہاری مرضی!''

اسی شاگرد نے اپنے بقیہ ساتھیوں کی طرف دیکھا، کئی نے اپنی گردن کو خفیف سی جنبش دی، گویا کہہ رہے ہوں، کوئی حرج نہیں اس کے سوالوں کے جواب ضرور دیے جائیں۔

شاگرد نے آپ کو جواب دیا۔ ''صاحبزادے! ہماری یہ عادت تو نہیں کہ استاد محترم اگر کسی کو ہم سے بلوائیں تو ہم اس سے فضول سوال جواب کر کے خواہ مخواہ وقت ضائع کریں لیکن ہم تمہارے سوالوں کا جواب ضرور دیں گے اور تم بھی اس کا خیال رکھو کہ سوالات زیادہ اور طویل نہ ہوں۔''

شیخ محمدؒ نے پوچھا۔ ''تمہارے استاد ہمیں کیوں بلوا رہے ہیں؟''

شاگرد نے جواب دیا۔ ''یہ سوال چونکہ استاد محترم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کا جواب بھی وہی دیں گے۔''

شیخ محمدؒ نے دوسرا سوال کیا۔ ''اس مدرسے میں کیسی پڑھائی ہوتی ہے؟''

شاگرد نے جواب دیا۔ ''جناب! یہ ایک مثالی ادارہ ہے، یہاں کی پڑھائی کا دور دور شہرہ ہے۔''

شیخ محمدؒ نے پوچھا۔ ''یہ پڑھائی باقاعدہ جلدی جلدی ہوتی ہے یا رک رک کر وقفوں سے؟''

شاگرد نے چڑ کر کہا۔ ''فضول سوالات میں وقت نہ ضائع کر جو کچھ پوچھنا ہے استاد محترم کے سامنے چل کر پوچھ۔ وہیں جوابات مل جائیں گے۔''

شیخ محمدؒ شاگردوں کے ساتھ استاد کی خدمت میں پہنچا دیے گئے، استاد کے چہرے سے غضب اور پریشانی ہویدا تھی۔ شیخ محمدؒ کو دیکھتے ہی غصہ میں کہا۔ ''تو کون ہے؟ اور یہاں کیا لینے آیا تھا؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں ان فضول سوالوں کے جواب اگر نہ دوں تو......؟''

استاد نے غصے میں کپکپاتے ہوئے کہا۔ "نالائق! یہ تو کیسی بحثیں کر رہا ہے مجھ سے؟"
آپ نے فرمایا۔ "بحث کرنا کوئی بری بات نہیں، اس کے دل و دماغ کے بنجر اور فضول حصوں میں بہت ساری بے کار باتیں جمع ہو گئی ہوں۔"
استاد نے مشتعل ہو کر سوال کیا۔ "کس کے بنجر اور فضول دل و دماغ میں؟"
آپ نے جواب دیا۔ "جو بے کار سوال و جواب میں وقت ضائع کر رہا ہو۔"
استاد نے گرمی سے پوچھا۔ "میں پوچھتا ہوں کہ تو یہاں کیا لینے آیا تھا؟"
آپ نے جواب دیا۔ "استاد محترم! میں آپ کے مدرسے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اب بھی ہوں۔ یہی میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں تدریس با قاعدہ ہوتی ہے یا بے قاعدہ؟"
استاد نے کہا۔ "صاحب زادے! ہم وقت برباد کرنے کے قائل نہیں، یہاں کا سند یافتہ نوجوان کہیں مار نہیں کھا سکتا۔"
شیخ محمدؒ کی حریص طبیعت نے انگڑائی لی، پوچھا۔ "حضرت! اگر میں پڑھنا چاہوں تو؟"
استاد نے جواب دیا۔ "اگر اس مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کی لیاقت رکھتے ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہیں مایوس کیا جائے!"
شیخ محمدؒ نے پوچھا۔ "تو کیا میں کل سے حاضر ہو جاؤں؟"
استاد نے جواب دیا۔ "بالکل، کسی مزید اجازت کے بغیر۔"
شیخ محمدؒ مکتب سے گھر چلے آئے۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے شیخ ابوالرضاؒ سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے لمحہ بھر کے لیے شیخ محمدؒ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کے بعد ایک کاغذ پر چند الفاظ لکھ کر شیخ محمدؒ کو دے دیا۔ شیخ محمدؒ نے اس پرزے کو نہایت احترام سے رکھ لیا۔ جب یہ پرزہ تنہائی میں کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا۔
"آج تم کہاں گئے ہوئے تھے؟ کیونکہ میں تمہارے اندر ایک ظلمت دیکھ رہا ہوں۔"
شیخ محمدؒ پرزہ پڑھ کر لرز گئے اور پیر و مرشد کے قدموں میں گر گئے، بولے۔
"حضرت! غلطی ہوئی میں اس پر نادم اور شرمسار ہوں۔"
مرشد نے جواب دیا۔ "شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں اب تو وہاں نہیں جائے گا۔"
شیخ محمدؒ اپنے مرشد کے قدموں میں سر رکھے دیر تک روتے رہے اور شیخ ابوالرضاؒ انہیں تسلیاں دیتے رہے۔

☆☆☆

شیخ ابوالرضاؒ کے آس پاس اور سامنے مریدوں کا ہجوم تھا۔ آپ فضائل ذکر بیان فرما رہے تھے۔ جب اس سے فراغت ملی تو ایک تنومند مرید کو اپنے پاس بلا کر حکم دیا۔ "دیکھو حجرے کے باہر ایک بکری بندھی ہوئی ہے اس کو کھولو اور میرے اس عزیز کو پہنچا دو جو مسجد کے سامنے رہتے ہیں۔"
مرید کو تامل ہوا، رک رک کر پوچھا۔ "کون سے عزیز؟ جو یہاں سے تقریباً نصف میل دور مسجد کے سامنے رہتے ہیں؟"
مرشد نے جواب دیا۔ "ہاں، انہی عزیز کے گھر۔"
مرید نے کچھ پس و پیش کیا اور کہا۔ "حضرت، بکری تو خاصی وزنی ہے اور شاید اس کا ایک پاؤں زخمی بھی ہے اس حالت میں اس کو نصف میل چلا کر لے جانا شاید مشکل کام ہے۔"
مرشد نے فرمایا۔ "لیکن اس کا لے جانا بہت ضروری ہے، جس طرح چاہو لے جاؤ۔"
مرید نے کہا۔ "میرا خیال ہے ایک مزدور کر لیا جائے۔"
شیخ ابوالرضاؒ نے ناگواری سے کہا۔ "میں نے کہہ تو دیا کہ جس طرح چاہو لے جاؤ۔"
مرشد اور مرید کی باتیں دوسرے مریدوں نے بھی سنیں۔ شیخ محمدؒ بھی گوش بر آواز ہی رہے۔ آخر مریدوں میں وہ پہلے شخص تھے جو اس مرید کے ساتھ باہر چلے گئے۔ مرید مذکور باہر نکل کر بکری کے پاس پہنچا۔ اسے کھڑا کر کے زبردستی چلانا چاہا پھرایا۔ وہ اچک اچک کر چلتی اور گر جاتی، مرید نے اسے کھینچنا شروع کیا۔ رسی کی رگڑ نے بکری کو احتجاج پر مجبور کر دیا۔ وہ ممیں ممیں کرنے لگی۔
شیخ محمدؒ نے مرید سے کہا۔ "بھائی! اس پر اتنا ظلم نہ کرو کہ یہ چیخنے چلانے لگے۔"
مرید نے جھنجلا کر شیخ محمد کی طرف دیکھا اور کہا۔ "جناب! اس بکری کو جہاں تک لے جانا ہے، وہ یہاں سے نصف میل دور ہے! یہ

اگر نخرے کرے گی تو میں اس کو کھینچتا ہوا لے جاؤں گا۔"
شیخ محمدؒ نے فرمایا۔"تم اگر اس طرح لے گئے تو یہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے یا تو مر جائے گی یا ادھ مری ہو جائے گی اور وہ عزیز حضرت شیخ مرشد سے تمہاری شکایت کریں گے۔اس وقت تم کیا جواب دو گے؟"
مرید نے لال پیلے ہو کر جواب دیا۔"اس وقت میں پیر و مرشد سے کہوں گا کہ حضرت! آپ کو معلوم نہیں تھا کہ بکری لنگڑی بھی ہے اور وزنی بھی، وہ اپنے پیروں سے جانے کے لائق تھی ہی کب؟ چنانچہ اس کو مجبوراً کھینچ کر لے جانا پڑا۔اب وہ مرے یا جیئے، میں کیا کرسکتا ہوں؟"
شیخ محمدؒ نے مشورہ دیا۔"کوئی طاقتور مزدور لے آؤ۔وہ اسے گود میں اٹھا کر پہنچا دے گا۔"
مرید نے خونخوار نظروں سے شیخ محمدؒ کی طرف دیکھا۔"مزدور لے آؤں؟ کہاں سے مزدور لے آؤں، مزدوری کون دے گا؟ میرے پاس تو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔"
شیخ محمدؒ نے جواب دیا۔"مزدوری میں دے دوں گا، آخر پیر و مرشد کی رضا حاصل کرنی ہے۔"
مرید کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، بولا۔"آدمی دلچسپ بھی ہو اور مرشد کے وفادار اور محب بھی۔"اس کے بعد ایک طرف جاتے ہوئے کہا۔"میں ابھی آیا مزدور لے کر۔"
مرید جیسے ہی گیا۔شیخ محمدؒ نے بکری کو گود میں اٹھانے کی کوشش کی، بکری کلبلائی اور اچھلنے کودنے لگی۔دو کوششیں بیکار گئیں۔لیکن تیسری کوشش میں کامیاب ہو گئے اور اس کو گود میں اٹھا کر ایک طرف بھاگنے لگے۔بھاری بکری، طویل مسافت، شیخ محمدؒ پسینا پسینا ہو گئے۔ ہر دو ڈھائی سو قدم پر وہ سستانے لگتے۔کافی دیر بعد انہوں نے شیخ ابوالرضا کے عزیز کے گھر بکری پہنچا دی۔
مرید مزدور لے کر واپس آیا تو وہاں بکری ملی نہ شیخ محمدؒ۔وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگا۔وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ شیخ محمدؒ اس بکری کو اپنی گود میں اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔وہ پریشان، حواس باختہ اندر مرشد کے پاس پہنچا اور سارا ماجرا بیان کر دیا، بولا۔"اب آپ فرمائیں کہ شیخ محمدؒ کو کہاں تلاش کروں۔"
مرشد نے جواب دیا۔"تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اطمینان سے یہیں میرے پاس بیٹھے رہو۔شیخ محمدؒ جہاں کہیں بھی ہوں گے بالآخر یہاں آئیں گے۔"
مرید نے عرض کر دیا۔"حضرت! مشکل تو یہ ہے کہ میں اس مزدور کا کیا کروں جو باہر کھڑا ہوا ہے، اس سے کیا کہوں؟"
مرشد نے فرمایا۔"اس سے کہہ دو کہ واپس چلا جائے، اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔"
مرید نے عرض کیا۔"لیکن حضرت! آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں اس کو مزدوری طے کر کے لایا تھا، کیا وہ مجھے شرمندہ نہیں کرے گا کہ کیا مذاق لگا رکھا ہے؟"
مرشد نے مسکرا کر نرمی سے حکم دیا۔"مزدور کو اس کی مزدوری دے دو، وہ خوشی خوشی واپس چلا جائے گا۔"
مرید نے شرما کر عرض کیا۔"حضرت! اس وقت تو میرے پاس ایک حبہ بھی نہیں میں مزدور کو مزدوری کہاں سے دوں گا؟"
مرشد نے چبھتا ہوا اعتراض کیا۔"جب پاس ایک حبہ بھی نہیں تھا تو مزدور کو لائے ہی کیوں تھے؟"
مرید نے جواب دیا۔"حضرت مجھ سے شیخ محمدؒ نے وعدہ کیا تھا کہ مزدور لے آؤں۔وہ مزدوری دے دیں گے۔"
مرشد نے مزدوری کے پیسے اپنے پاس سے دے دیے اور مرید سے کہا۔"تم مزدور کو رخصت کر دو اور میرے پاس موجود رہو۔"
مزدور کو اس کی اجرت دے کر رخصت کر دیا گیا، مرید، مرشد کے پاس دیر تک بیٹھا شیخ محمدؒ کا انتظار کرتا رہا۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شیخ محمدؒ بکری کو لے کر کہاں چلے گئے؟
کافی دیر بعد جب شیخ محمدؒ واپس آئے تو مرید بے چینی سے کھڑا ہو گیا، پوچھا۔"بھائی! کہاں چلے گئے تھے؟ وہ بکری کہاں ہے؟"
شیخ محمدؒ نے بتایا۔"وہ بکری میں نے پہنچا دی۔"
مرید نے پوچھا۔"کہاں پہنچا دی؟"
جواب دیا۔"جہاں پہنچانا تھی۔"
مرید نے حیرت سے پوچھا۔"لیکن کس طرح؟ میں تو مزدور لایا تھا اس کے لیے!"
شیخ محمدؒ نے جواب دیا۔"میں نے بکری کو گود میں اٹھا کر پہنچا دیا۔"

شیخ ابوالرضا نے دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "اے شخص! میں نے بکری کو اپنے عزیز کے گھر پہنچانے کا حکم تجھے دیا تھا تو نے تساہل سے کام لیا لیکن شیخ محمدؒ نے یہ کام اپنی خوشی سے کر دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ شیخ محمدؒ کو اس کے حسن خدمت کی وجہ سے مقربین میں شامل فرمائے گا۔ لیکن تجھے تیرے قصور کی وجہ سے مقام سے محروم رکھے گا۔"

اس دن ان کے مرشد پر عجیب سی کیفیت طاری رہی، مرید تو دل برداشتہ ہو کر چلا گیا لیکن شیخ محمدؒ ان کے پاس ہی موجود رہے۔ رات ہو گئی لیکن ان کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخر نصف رات گزرنے کے بعد شیخ ابوالرضا کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے اس کے بعد شیخ محمدؒ سے فرمایا۔ "شیخ محمدؒ میں تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے ذرا غور سے سن لے۔"

شیخ محمدؒ نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ "آپ کی ہر بات میرے لیے ایسی ہے کہ میں دنیا جہاں کو فراموش کر کے پوری توجہ سے سنوں، فرمائیں! میں سننے کو تیار ہوں۔"

مرشد نے فرمایا۔ "شیخ محمدؒ! خدا نے تجھے اس لائق کر دیا ہے کہ تو اس کے انسانوں کی رہبری کرے۔ اگر کوئی طالب راہ سلوک تجھ سے رجوع کرے تو یہ تیرا فرض ہوگا کہ تیرے پاس میرا دیا ہوا جو کچھ بھی ہو تو اس کی تلقین کرے، تجھے اس کی اجازت دے رہا ہوں۔"

شیخ محمدؒ ذرا پریشان ہو گئے۔ وہ اس لیے پریشان ہوئے تھے کہ ان کے دل میں کسی قسم کا ایسا ویسا خیال تک نہیں آیا تھا۔ پھر پیر و مرشد نے ایسی بات کیوں کہی۔

شیخ ابوالرضا اپنے فرمانبردار اور سعادت مند مرید کے تمام دلی وسوسوں کو بھانپ گئے، فرمایا۔ "دیکھ شیخ محمدؒ! میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ اس وقت میرے رب نے ان تمام لوگوں کے نام مجھے بتا دیے ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ تجھ سے بیعت کریں گے۔ اگر تو کہے تو میں ان کے نام تک تجھے بتا دوں۔"

شیخ محمدؒ نے جواب دیا۔ "حضرت! میں تو آپ کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔ آپ سے یہ درخواست نہیں کروں گا کہ آپ ان سب کے نام بتا دیجیے۔"

شیخ ابوالرضا نے بھی نام نہیں بتائے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

☆☆☆

اللہ گو درویشوں کی جماعت آپ کے پاس آئی اور خواہش کی کہ اپنا کچھ وقت ہمیں دیں۔ یہ درویش چونکہ اللہ اللہ بہت زیادہ کرتے تھے اس لیے ان کا نام اللہ گو مشہور ہو گیا۔ ان کے بے حد اصرار پر آپ ان درویشوں کے ساتھ چلے گئے۔ درویش گلیوں کوچوں میں اللہ اللہ کرتے پھر رہے تھے۔ یہ درویش جب ایک محلے میں پہنچے جہاں امرائے سلطنت رہتے تھے تو ایک امیر کا دروازہ اچانک کھلا اور اس میں سے ایک شخص نکل کر درویشوں کے پیچھے دوڑا۔ اس نے درویشوں سے پوچھا۔ "میں ایک غرض مند انسان ہوں، بتاؤ میں تم میں سے کس شخص سے بات کروں؟"

ایک درویش نے شیخ محمدؒ کی طرف اشارہ کر دیا۔ "ان سے، کیونکہ ہم میں سے ان جیسا ایک بھی نہیں۔"

وہ شخص شیخ محمدؒ کے پاس پہنچا اور دو زانو بیٹھ کر آپ کا دامن پکڑ لیا، بولا۔ "حضرت! اب یہ دامن اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ آپ میری مشکل حل نہ فرما دیں گے۔"

شیخ محمدؒ نے پوچھا۔ "اپنی مشکل تو بتاؤ یوں دامن پکڑنے سے کیا حاصل؟"

اس نے عرض کیا۔ "حضرت! یہ جو محل نظر آ رہا ہے میں اس کا ادنیٰ سا ملازم ہوں، میرا آقا انتہائی نیک اور شریف النفس ہے، وہ آج کئی دن سے پیشاب بند ہو جانے کی بیماری ...۔ میں مبتلا ہے دنیا کے معالجوں نے مایوسی کا اظہار کر دیا ہے۔ بس ایک آپ ہی کی ذات ہے جو مستجاب الدعوات ہیں، آپ چاہیں گے تو میرا آقا صحت یاب ہو جائے گا ورنہ بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "دہلی میں بڑے بڑے معالجین موجود ہیں ان کے پاس جا اور اپنے آقا کا علاج کرا۔"

اس شخص نے عرض کیا۔ "حضرت! اگر ایسا ممکن ہوتا تو اس وقت میں آپ کو ہرگز تنگ نہ کرتا۔ اب تو آپ ہی میرے آقا کو صحت یاب کریں گے۔"

آپ نے پوچھا۔ "کیا تیرا آقا بہت اچھا آدمی ہے جس کی صحت یابی کے لیے تو اتنا بے چین ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "حضرت! اس سے کہیں زیادہ اچھا۔ جتنا خیال کیا جا سکتا ہے، اگر میرا آقا نہ رہا تو میں بھی اس قصر سے نکل جاؤں ...۔ کیونکہ میرے آقا کے بعد اس قصر میں ایک بھی جوہر شناس نہیں رہ جائے گا۔"

آپ نے فرمایا۔ ''تو چلو، میں چلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں اسے کیا بیماری ہے اور وہ کیوں نہیں اچھا ہوتا۔''

آپ اس شخص کے ساتھ قصر میں داخل ہو گئے۔ اس شخص نے انہیں بیمار امیر کے سرہانے کھڑا کر دیا۔ امیر کی آنکھوں میں حسرت و یاس ... اور مجبوری کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے اپنے سرہانے ایک درویش کو کھڑے دیکھا تو دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے

آپ نے پوچھا۔ ''تیرا کیا حال ہے؟''

امیر نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ ''اللہ کے شکر کے سوا کیا عرض کروں، اگر وہ اسی مرض میں اٹھانا چاہتا ہے تو میں راضی بہ رضائے الٰہی ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کیا تو صحت یاب ہونا چاہتا ہے؟''

امیر نے جواب دیا۔ ''آپ سے رجوع کرنے کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''خدا کی راہ میں کچھ دینا پڑے گا!''

امیر نے کہا۔ ''آپ جو فرمائیں، حاضر کر دیا جائے گا۔''

آپ نے سکوت فرمایا اور کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔ ''فی الحال ایک ہزار روپے فراہم کر دے۔''

امیر نے حکم دیا اور اسی وقت ایک ہزار روپیہ آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ نے ملازم سے کہا۔ ''جا اور اعلان کر دے کہ حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کی جائیں گی، امیر کے دروازے پر جمع ہو جائیں۔''

ملازم نے اسی وقت بازاروں اور گلی کوچوں میں یہ اعلان کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حاجت مندوں کا مجمع لگ گیا۔ آپ نے یہ روپیہ ان میں تقسیم کر دیا۔ لیکن یہ رقم ناکافی رہی اور حاجت مندوں کا ہجوم پھر بھی موجود رہا۔

آپ اندر امیر کے پاس گئے اور پوچھا۔ ''اب تیرا کیا حال ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''کوئی افاقہ نہیں ہوا، میرا پیٹ پھولتا جا رہا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تب پھر ایک ہزار روپے اور دلوا دے۔''

امیر نے کہا۔ ''یہ کون سی بڑی بات ہے ابھی لیجیے۔''

اس کے بعد اس نے ایک ہزار روپے اور دلوا دیے۔ آپ نے یہ روپے بھی ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیے اور اندر جا کر مریض سے دریافت کیا۔ ''کچھ افاقہ ہوا؟''

امیر نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ''کوئی افاقہ نہیں ہوا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تب پھر ایک مصلیٰ لایا جائے۔''

خدمت گار نے اسی وقت مصلیٰ آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ اس پر بیٹھ کر دعا گو ہوئے۔ ''اے میرے رب! میں نے اس بیمار سے دو ہزار روپے لے کر غرباء میں تقسیم کر دیے۔ میرا خیال تھا اس کے اثر سے امیر کے مرض میں کمی واقع ہو جائے گی لیکن اس کا مرض جوں کا توں موجود ہے۔ اب میں اس سے روپے بھی نہیں مانگ سکتا۔ کیونکہ مجھے مانگتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے تو ہی میری شرم کی لاج رکھ لے اور اس شخص کو صحت یاب کر دے۔ میں اس وقت تک اس مصلیٰ سے نہیں اٹھوں گا جب تک کہ یہ صحت یاب نہ ہو جائے گا۔''

آپ سجدے میں گر گئے اور سجدہ گاہ کو رو رو کر تر کر دیا۔

امیر کو اپنے پیٹ سے کوئی شے نیچے رینگتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پیشاب کی دھار جاری ہو گئی اور وہ خوشی سے چیخ پڑا۔ ''ہوا، ہوا، اثر ہوا، حضرت مرشد آپ کی دعا کا اثر ہو گیا۔ آہ اب میں صحت یاب ہو جاؤں گا، اب میں اچھا ہو جاؤں گا۔''

آپ نے اس کی آواز سنی اور بہ دستور سجدے میں پڑے رہے، سر نہیں اٹھایا۔

کچھ دیر بعد وہ بالکل صحیح ہو گیا۔ گھر والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ پورا قصر خوشیوں سے جگمگا اٹھا۔ خدمت گار آپ کے پیچھے بیٹھ گیا اور نہایت ادب سے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ کی دعا قبول ہو گئی، خدا نے آپ کی سن لی، سجدے سے سر اٹھایئے!''

کچھ توقف کے بعد آپ نے سر اٹھایا اور یہ منظر بھی نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ رونے کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا اور آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

امیر کو بستر سے اٹھا کر غسل خانے پہنچا دیا گیا۔ اس نے غسل کیا اور لباس بدل کر آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے پوچھا۔ ''اب تیرا کیا حال ہے؟''

امیر نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں، مجھے دوبارہ زندگی ملی ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''میرا نہیں، اپنے رب کا شکر ادا کر جس نے تجھے دوسری زندگی عطا فرمائی۔''
امیر نے کہا۔ ''لیکن میں آپ کا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔ کیونکہ اگر آپ وسیلہ نہ بنتے اور دعا نہ فرماتے تو شاید میں صحت یاب نہ ہوتا، اس سے پہلے میرا پورا خاندان میری صحت یابی کی دعائیں مانگ چکا تھا لیکن میں صحت یاب نہیں ہوا تھا۔''
آپ نے جانے کی اجازت مانگی۔ ''اچھا اب میں چلا، اپنے رب کو ہمیشہ یاد رکھو۔''
امیر نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں آپ کو ابھی نہیں جانے دوں گا، آپ چند دن میرے مہمان رہیے۔''
قصر کے در پر اللہ کو درویش اس وقت بھی موجود تھے۔ انہوں نے اللہ اللہ کی صدائیں لگانا شروع کر دیں۔
آپؒ نے فرمایا۔ ''دیکھو مجھے وہ بلا رہے ہیں۔''
امیر نے روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن آپ نہیں رکے اور باہر نکل کر درویشوں کے ساتھ چل دیے۔

☆☆☆

قریہ سرائے کا رئیس آپ کا بے حد معتقد تھا۔ شیخ محمد جب بھی قریہ سرائے جاتے، یہ رئیس چوبیس گھنٹے کی حاضری دیتا۔ آپ بھی اس پر بڑی شفقت فرماتے۔ اس رئیس کو ہر طرح کا اطمینان حاصل تھا مگر ایک کانٹا ایسا بھی تھا جو ہر وقت چبھتا رہتا۔ رئیس کا بیٹا سید علی سخت نافرمان تھا۔ شراب اس کی گھٹی میں پڑی تھی، جوئے کا وہ رسیا تھا۔ دنیا بھر کی برائیاں اس میں جمع ہو گئی تھیں۔ نیکی اور بھلائی سے اسے چڑ تھی۔ باپ سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ چکا تھا۔ رئیس نے سوچا کہ اگر اس کو شیخ محمدؒ کی خدمت میں پہنچا دیا جائے تو شاید ان کی صحبت کچھ اثر کر جائے اور یہ سدھر جائے۔ لیکن سید علی کا یہ حال تھا کہ اسے درویشوں کے ذکر سے چڑ تھی۔ جب بھی ذکر چھڑتا وہ اٹھ کر باہر چلا جاتا۔
ایک بار آپ کا قریہ سرائے میں قیام ہوا اور رئیس بھی ان کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے رئیس کے چہرے سے اس کی پریشانی محسوس فرمائی، پوچھا۔ ''کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟''
رئیس نے جواب دیا۔ ''حضرت! کیا عرض کروں مجھے میرے بیٹے نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔''
آپ نے پوچھا۔ ''کیوں، وہ کیا کہتا ہے؟''
رئیس نے جواب دیا۔ ''حضرت! وہ کہتا تو کچھ بھی نہیں، لیکن دنیا کی جتنی بھی برائیاں ہیں اس میں موجود ہیں۔ میں تو اس کے ذکر تک میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں اس کو میرے پاس لے آؤ۔''
رئیس نے کہا۔ ''میں اس کو آپ کے پاس کس طرح لے آؤں، وہ تو نیکی کے ذکر سے بھاگتا ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''جاؤ اس سے کہو، میں اس کو یاد کر رہا ہوں وہ نہیں بھاگے گا۔ میرے پاس ضرور آئے گا۔''
رئیس نے بے دلی سے عرض کیا۔ ''آپ فرماتے ہیں تو کہہ دوں گا لیکن مجھے یقین نہیں کہ وہ یہاں تک آ بھی جائے گا کیونکہ میں بارہا کہہ چکا ہوں اور اس نے ہر بار انکار کیا ہے۔''
آپ نے نرمی سے فرمایا۔ ''چلو ایک بار اور سہی۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟''
رئیس امید و بیم میں گھر پہنچا، اس کا لڑکا سید علی کہیں جانے کے لیے بنا سنورا کھڑا تھا۔ رئیس نے جاتے ہی پوچھا۔ ''کہاں چلے؟''
سید علی نے مذاق میں جواب دیا۔ ''آپ کے پیر و مرشد شیخ محمدؒ کے پاس۔''
باپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ہاں چل، کیونکہ تجھے شیخ صاحب نے یاد فرمایا ہے، میں تجھ کو لینے آیا ہوں۔''
سید علی نے جو بات غیر ارادی طور پر مذاق میں کہی تھی اب وہ سنجیدہ ہو چکی تھی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ باپ سے کہہ دے کہ یہ تو میں نے مذاق میں کہا تھا۔ میں نہیں جاؤں گا لیکن وہ نہیں کہہ سکا اور خود کو باپ کے ساتھ جانے پر مجبور محسوس کرنے لگا، آہستہ سے بولا۔ ''میں تیار ہوں، چلیے!''
رئیس حیرت زدہ، اپنے لڑکے کو لے کر روانہ ہو گیا۔ شیخ کی یہ کیسی کرامت تھی؟ ماورائے عقل، مابالائے خرد، برتر از وہم و گمان۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ شیخ محمدؒ کی خدمت میں پہنچ گیا، وہاں اور بہت سے لوگ بھی موجود تھے۔ آپ نے اس وقت تو سید علی پر کوئی توجہ نہ دی۔ دوسرے افراد سے باتیں کرتے رہے۔ لیکن ایک بار آپ اچانک اپنی جگہ سے اٹھے اور سید علی کے پاس پہنچ گئے، پوچھا۔ ''میاں

صاحبزادے، اب ہم اتنے برے ہیں کہ تمہیں ہمارا ذکر تک پسند نہیں۔"
سید علی نے شرمندگی سے جواب دیا۔ "نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کو برا کون کہہ سکتا ہے۔"
آپ نے فرمایا۔ "پھر کیا وجہ ہے کہ تمہیں میرے پاس لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور تم ادھر ادھر بھاگنے کی سوچنے لگتے ہو۔ آخر جب میں نے تمہیں زبردستی پکڑ کر بلوایا تو تم آگئے، ورنہ شاید آج بھی نہ آتے۔"
باپ کو خدشہ تھا کہ کہیں نالائق بیٹا شیخ سے گستاخی سے نہ پیش آئے لیکن بیٹے کو بھیگی بلی بنا دیکھا تو سرتا پا حیرت میں ڈوب رہا۔ بیٹا سید علی شیخ کو جواب دے رہا تھا۔ "حضرت! آپ نے جیسے ہی یاد فرمایا میں حاضر ہو گیا۔ مجھ سے ایسی گستاخی کبھی نہیں ہوئی کہ آپ نے یاد فرمایا ہو اور میں نے ٹال مٹول سے کام کیا ہو۔"
شیخ نے پوچھا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ اب تک تم کہاں تھے اور کہاں نوکر ہو؟"
سید علی کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے اپنے اندر ایک انقلاب محسوس کیا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش کچھ سوچتا رہا۔ آپ نے پھر پوچھا۔ "ہاں سید علی تم نے میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا!"
سید علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نظریں جھکا کر جواب دیا۔ "میں آپ کے سوالوں کا جواب واپس آ کے دوں گا۔ آپ ذرا توقف فرمائیں۔"
وہ غصے اور جوش میں محفل سے نکل گیا۔ گھر پہنچا، شراب بہادی، آلات مے کشی توڑ دیے۔ غسل خانے میں گیا۔ غسل کیا اور لباس تبدیل کیا۔ اس کے بعد دوبارہ شیخ محمد کی محفل میں پہنچ گیا۔ اور پوچھا۔ "ہاں جناب شیخ! آپ نے مجھ سے کیا پوچھا تھا؟"
شیخ نے اپنا سوال دُہرایا۔ "اب تک تم کہاں تھے اور کہاں نوکر ہو؟"
سید علی نے جواب دیا۔ "اب تک میں جہاں کہیں بھی تھا رسوائے زمانہ اور بدنام عصر تھا لیکن اب آپ کا نوکر ہوں جیسا حکم دیں گے بجالاؤں گا۔ میں نے شراب بہادی اور آلات مے کشی توڑ دیے۔ میں نے غسل کیا اور ساری نجاست پانی میں بہادی۔ میں نے اپنا پرانا لباس اتار کر پھینک دیا اور اب یہ نیا لباس پہن کر آگیا ہوں اور آپ سے عہد کرتا ہوں کہ اس لباس کی عزت اور حرمت کا ہمیشہ خیال رکھوں گا۔"
شیخ محمد نے مسکرا کر سید علی کے باپ کی طرف دیکھا جسے ان تبدیلیوں اور اعلانات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ کیسا انقلاب تھا جو اتنی آسانی سے آگیا تھا۔ سید علی نے اس محفل میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ کی صحبت میں صبح و شام گزارنے لگا۔
کچھ عرصہ بعد سید علی کو کاروبار کے سلسلے میں کابل جانے کا منصوبہ بنانا پڑا۔ پہلے تو وہ اس کو ٹالتا رہا لیکن جب مجبور ہو گیا تو آپ سے عرض کیا۔ "پیر و مرشد! میری پوری کوشش یہ تھی کہ اپنی پوری زندگی آپ کی صحبت اور محبت میں گزار دوں لیکن ایک اہم ضرورت سے کابل کا سفر درپیش ہے۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو چلا جاؤں گا ورنہ ٹال دوں گا۔"
آپ نے جواب دیا۔ "تم کابل ضرور جاؤ لیکن اپنا عہد یاد رکھنا کہ تم نے برائیوں سے توبہ کر لی ہے اور اب ان سے بچتے رہو گے۔"
سید علی نے عرض کیا۔ "حضرت! میں نے جو بیعت کی ہے اور آپ سے جو عہد کیا ہے اس پر زندگی کے آخری لمحوں تک قائم اور پابند رہوں گا یہ میرا مکرر عہد ہے۔"
شیخ نے فرمایا۔ "جواب میں میں ایک شعر سناتا ہوں اس کو لکھ لو اور ہمیشہ یاد رکھنا۔" اس کے بعد آپ نے فارسی کا مشہور شعر سنایا۔

گر در یمنی   چو با منی   پیش منی
در پیش منی   چو بے منی   در یمنی

(چاہے تم یمن میں رہو لیکن مجھے اپنے ساتھ رکھو تو یہ یوں ہے جیسے تم میرے سامنے ہو اور اگر تم میرے ساتھ بھی رہو مگر میرے تصور کے بغیر رہو تو یہ ایسا ہے جیسے تم یمن میں ہو)
شعر سنا کر پوچھا۔ "کیا تم میرا مطلب سمجھ گئے۔"
سید علی نے کہا۔ "اللہ نے چاہا تو آپ میرے ساتھ ہی رہیں گے، چاہے میں کابل میں رہوں، کاشغر میں رہوں یا خراسان اور ماوراء النہر میں۔"
آپ نے فرمایا۔ "اور یہ وعدہ بھی کرو کہ میری موجودگی میں تم کوئی بری حرکت نہیں کرو گے؟"
سید علی نے جواب دیا۔ "میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ آپ کی موجودگی اور عدم موجودگی میں، میں کوئی بری حرکت نہیں کروں گا۔"
آپ نے کابل جانے کی اجازت دے دی۔ "اب تم کابل جا سکتے ہو۔"

سید علی نے سامان سفر تیار کیا اور کابل روانہ ہوگیا۔ کابل میں سید علی کو ایک سال گزر گیا۔ عبادت و ریاضت اور شیخ کے حضور نے ہر برائی کو مغلوب کر رکھا تھا۔ کبھی کبھی اگر کوئی برائی ذرا سا سر اٹھاتی تو سید علی لاحول پڑھ کر اس پر غلبہ حاصل کر لیتا لیکن ایک سال بعد سید علی کے خیالوں میں عورت آنے لگی۔ اس بھوک نے پہلے تو کسی کسی وقت تھوڑا بہت ستایا اور سید علی نے لاحول کے وار سے اس کو زیر کر لیا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد عورت کی خواہش پھر بیدار ہو جاتی۔ کسی خطرناک اور سریع الاثر مرض کی طرح پہلے تو یہ خیال وقفے وقفے سے آتا رہا لیکن اس کے بعد آہستہ آہستہ اس نے پوری طرح قبضہ جما لیا۔ اور ذہن و دل پر عورت ہی عورت چھا گئی۔ سید علی کی پریشانی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ابھی عورت ذہن و دل پر مستور ہی تھی کہ ایک حسین ترین نوجوان لڑکی کی سید علی سے ملاقات بھی ہوگئی۔ اس لڑکی کا باپ کوئی ہندستانی تاجر تھا جو اسے اور اس کی ماں کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کی ماں کا چند ماہ پیشتر انتقال ہوگیا تھا۔ اس لڑکی کو جب یہ معلوم ہوا کہ ایک ہندوستانی مسلمان تاجر کابل آیا ہوا ہے اور وہ کام ختم کر کے ہندوستان واپس چلا جائے گا تو اس نے سید علی سے اپنے سلسلے میں مدد چاہی۔ لڑکی کی خواہش تھی کہ اسے ہندوستان میں اس کے باپ کے پاس پہنچا دیا جائے۔

لڑکی اتنی حسین اور شباب میں چور تھی کہ سید علی اس کو دیکھ کر کانپ گیا اور گناہ کی خواہش طوفان کی طرح سرکشی دکھانے لگی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جواب دیا۔ ”لڑکی میں تیرے باپ کو ہندوستان میں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔ اگر اس کا کوئی پتا نشان ہوتا تو میں تیری مدد ضرور کرتا۔“

لڑکی نے سید علی کے دونوں شانے پکڑ لیے اور جھنجوڑ کر کہا۔ ”یہ تم نے اپنی آنکھیں کیوں بند کر لیں؟ میں یوں تو نہیں مانوں گی، تمہیں ایک مسلمان کے ناتے میرا ساتھ دینا پڑے گا۔“

سید علی نے ہمت کی اور آنکھیں کھول دیں۔ لیکن جیسے ہی لڑکی پر نظر پڑی، تمام شیطانی خواہشیں عود کر آئیں، اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ”لڑکی! اس وقت تو، تو چلی جا، پھر کسی وقت آجانا۔ میں سوچ کر جواب دوں گا۔“

لڑکی تن کر کھڑی ہوگئی، بولی۔ ”لیکن یہ تو بتاؤ کہ میں جاؤں تو کہاں؟ میرا کوئی ٹھکانا بھی تو نہیں۔“

سید علی نے جواب دیا ”اب میں کیا بتاؤں کہ تم کہاں جاؤ، کہیں بھی جاؤ لیکن یہاں سے چلی جاؤ۔“

لڑکی نے شوخی سے مسکرا کر کہا۔ ”میں یہاں سے نہیں جاؤں گی کیونکہ میں تم پر تو اعتبار کر سکتی ہوں کسی اور پر نہیں۔“

سید علی نے ایک بار پھر لڑکی کے سراپا کا جائزہ لیا اور منہ میں پانی بھر آیا، کہا۔ ”لڑکی! تم ایک بار پھر غور کر لو، کہیں اور ٹھکانا کر لو تو بہتر ہے ورنہ پھر میرے ہی پاس رہ جانا۔“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”میں کہیں اور ٹھکانا نہیں کر سکتی۔ مجھے چند دن تمہارے ہی پاس رہنا ہے، تم مانو یا نہ مانو۔ میں زبردستی رہ پڑوں گی۔“

سید علی میں شیطنیت بیدار ہوگئی، بولا۔ ”بہتر ہے تم میرے ہی پاس رہ جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس کا خاص خیال رکھنا کہ میں زیادہ بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتا۔“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتی کہ زیادہ بے تکلفی سے آپ کی کیا مراد ہے؟ ویسے میں کیا کوئی بھی لڑکی پہل کرنا پسند نہیں کرتی، یہ مرد ہی ہے جو اسے ورغلاتا اور گمراہ کرتا ہے۔“

سید علی نے کہا۔ ”لیکن میں وہ مرد نہیں ہوں جو عورتوں اور لڑکیوں کو ورغلاتے اور گمراہ کرتے ہیں۔ میں نے اپنے مرشد سے عہد کیا تھا کہ میں برائیوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ مجھے اپنا یہ وعدہ ہر قیمت پر پورا کرنا ہے۔“

لڑکی نے شوخی سے پوچھا۔ ”میں کہاں رہوں؟ کس کمرے میں۔“

سید علی نے اپنے کمرے سے ملحق کمرے میں لڑکی کو ٹھہرا لیا۔

رات کو سید علی نے بڑی پریشانی محسوس کی۔ اس کی نظریں بار بار لڑکی کے کمرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں جو دوسری طرف سے بند تھا۔ کئی بار جی میں آیا کہ دروازے پر دستک دی جائے لیکن پھر معلوم نہیں کیا سوچ کر ایسا نہیں کیا۔

رات کا پچھلا پہر آگیا، مگر سید علی کو نیند نہیں آئی، اس کی بڑی بری حالت تھی۔ سید علی نے مصلیٰ بچھایا اور جلدی جلدی دو رکعتیں پڑھ کر سجدے میں گر گیا۔ وہ گڑگڑا رہا تھا۔ ”اے میرے مولیٰ! تو نے مجھے یہ کس آزمائش میں ڈال دیا؟ میں اس سے کس طرح نکلوں؟ میری مدد کر، کیونکہ تیری مدد کے بغیر آگے کے اس دریا کو عبور کرنا ناممکن ہے۔“

وہ سجدے میں پڑا رو رہا تھا اور گڑگڑا رہا تھا کہ کسی نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا اور بڑی نرمی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ یہ رونا

کیسا؟ یہ پریشانی کس بات کی؟"
سید علی نے لرزتے ہوئے سجدے سے سر اٹھایا اور اپنے سامنے لڑکی کو دیکھ کر بہت زیادہ پریشان ہوا، اس نے لڑکی کو ڈانٹ دیا۔
"لڑکی! یہ کیا بدتمیزی ہے؟ جب میں نے تجھے ایک الگ کمرا دے دیا ہے تو تیرا رات کی تاریکی میں میرے پاس آجانا کیا معنی رکھتا ہے؟"
لڑکی نے جواب دیا۔ "مجھے اس کمرے میں ڈر لگتا ہے، میں وہاں اکیلی نہیں رہ سکتی میرے ساتھ کسی اور کو بھی رہنا پڑے گا۔"
سید علی کو طیش آ گیا، کہا۔ "لڑکی! اب زیادہ تنگ نہ کر اور اسی وقت میرے کمرے سے نکل کر جہاں جی چاہے چلی جا، لیکن میرا پیچھا چھوڑ دے۔"
مگر لڑکی پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہو رہا تھا، اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "تم کچھ بھی کہو میں نہ تو اس کا برا مانوں گی اور نہ ہی کہیں اور جاؤں گی۔ میں کوئی احمق تو نہیں۔"
سید علی نے عاجز آ کر کہا۔ "اچھا بابا تو یہیں میرے ہی مکان میں رہ لیکن اس وقت تو اپنے کمرے میں چلی جا کیونکہ اگر کسی نے یہاں دیکھ لیا تو معلوم نہیں کس غلط فہمی کا شکار ہو جائے۔"
لڑکی سید علی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اٹھلا کر بولی۔ "میں نے کہہ جو دیا کہ میں تنہا نہیں رہ سکتی۔ مجھ کو ڈر لگتا ہے۔ اب یا تو تم بھی میرے ہی کمرے میں چل کر آرام کرو۔ یا پھر مجھ کو اپنے کمرے میں سو جانے کی اجازت دے دو۔"
سید علی نے بڑی کمزور آواز میں کہا۔ "یہ کیسی ضد کر رہی ہے لڑکی، خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دے ورنہ میں صحرا کو نکل جاؤں گا۔"
لڑکی نے جواب دیا۔ "اگر تم صحرا کو نکل جاؤ گے تو تمہارے پیچھے پیچھے میں بھی آجاؤں گی کیونکہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔"
سید علی ایک بار پھر ڈانواں ڈول ہو گیا، بولا۔ "تو تو نے واقعی یہ فیصلہ کر لیا ہے تو میرا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔"
لڑکی نے جواب دیا۔ "میں نے یہ بات کہہ جو دی۔"
سید علی نے پوچھا۔ "تو نے اپنی بات کے معانی اور مطلب پر بھی غور کیا؟"
لڑکی نے جواب دیا۔ "میں جو بات کہتی ہوں پہلے اس پر اچھی طرح غور کر لیتی ہوں۔"
سید علی کو ان باتوں میں بڑا مزہ آ رہا تھا، پوچھا۔ "تب پھر اپنی بات کے معانی اور مطلب مجھے بھی بتا، تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"
لڑکی سید علی سے بھڑ کر بیٹھ گئی، بولی۔ "تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں؟ میں بتاؤں کیا چاہتی ہوں؟ کیا تم واقعی اتنے بھولے بھالے ہو کہ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکے یا معصوم بن کر دھوکا دے رہے ہو؟"
سید علی نے دور ہٹنے کی کوشش کی، کہا۔ "لڑکی! تو میری بات پر یقین کر، میں تیری بات کا مطلب نہیں پا سکا۔"
لڑکی نے کالی کالی مخمور آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔ "اے شخص! جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے، تمہیں اپنا لینے کی خواہش اپنے دل میں محسوس کر رہی ہوں۔ جیسے جیسے تم سادگی اور بھولے پن کا اظہار کرتے ہو، میرا دل اور زیادہ گھائل ہو جاتا ہے۔"
سید علی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، حیرت سے پوچھا۔ "لڑکی! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟"
لڑکی نے جواب دیا۔ "میں نے جو کچھ کہا، اب بار بار نہیں دُہراؤں گی۔"
سید علی نے مصلّٰی چھوڑ دیا اور لڑکی سے کہا۔ "لڑکی! تو خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں تجھ سے جتنا بھاگنا چاہتا ہوں تو اس قدر مجھ سے قریب ہوتی جا رہی ہے۔"
لڑکی اٹھلا کر اٹھی اور سید علی سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "میں نے جو فیصلہ کر لیا، کر لیا۔ اب تم بھی بے جا ضد نہ کرو، ہندوستان میں میرا باپ ملے یا نہ ملے، میں رہوں گی تمہارے ہی پاس۔"
سید علی پر جو مصیبت نازل ہوئی تھی وہ اس چھت کے مانند تھی جو اپنے مکین پر آ گری ہو۔ کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ "لڑکی! مجھے تیری بات منظور ہے، میں تیری خواہش کے مطابق تجھے اپنی بیوی بنالوں گا مگر یہ بات اس وقت تو ممکن نہیں۔ اب تو آرام کر، صبح یہ کام باقاعدہ انجام پا جائے گا۔"
لڑکی سید علی سے چمٹ گئی، بولی۔ "سچ؟ کیا تم نے میری بات مان لی؟"
سید علی نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ جو دیا۔"
لڑکی نے بے اختیار کئی بوسے لیے اور کہا۔ "آج میں اپنے خدا سے جو مانگتی مل جاتا۔ بہرحال اب تم میرے ہو اور میں تمہاری، ابھی

اسی وقت سے۔"

سید علی تو پہلے ہی بے چین تھا، لڑکی کی رضامندی اور اجازت نے بالکل بے بس کر دیا۔ لیکن اسی وقت شیخ محمدؒ کا خیال آ گیا۔ اس نے لڑکی کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی آیا، تو میرا انتظار کر، مجھے حاجت محسوس ہو رہی ہے۔"

لڑکی نے اجازت دے دی۔ سید علی نے باہر نکل کر دروازے کو بند کر دیا اور باہر ہی سے بہ آواز بلند کہا۔ "لڑکی، جو کام جائز طریقے پر ممکن ہے اس کو حرام کیوں کر دیا جائے۔ اب تو آرام کر، کل صبح ملاقات ہو گی۔"

لڑکی کو بڑا غصہ آیا، بپھر کر بولی۔ "تم نے مجھے دھوکا دیا ہے یہ برا کیا۔ میں تمہیں سچا سمجھتی تھی۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ تم جھوٹے بھی ہو۔ میں تم پر آئندہ اعتبار نہیں کروں گی۔"

سید علی نے باہر ہی سے جواب دیا۔ "نہیں اعتبار کرتی تو نہ کر۔ لیکن میں نے اپنے شیخ سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ میں منکرات سے باز رہوں گا، میں اپنے اس عہد کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

لڑکی نے ناگواری سے پوچھا۔ "تمہارا پیر کون ہے اور کہاں ہے، مجھے وہاں پہنچا دو۔ پھر میں دیکھوں گی کہ ان کا زہد و تقویٰ کدھر چلا گیا ہے میں جس سے ایک بار مل لوں۔ وہ مجھ سے بار بار ملنے کی خواہش کرے گا۔"

سید علی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "ہوسکتا ہے تو اپنے دعوے میں سچی ہو لیکن میری مثال تیرے سامنے ہے۔ میں جس شیخ کا مرید ہوں۔ اس کے حکم کا پابند ہوں۔ اس نے مجھے یہ حکم دیا تھا کہ میں عورتوں سے بچوں گا چنانچہ میں بچ گیا۔ جس کے مرید کا یہ حال ہو اس کے شیخ کا کیا جواب۔"

لڑکی خاموش ہو گئی اور سید علی اپنے دوسرے کمرے میں بند ہو گیا۔

☆☆☆

لڑکی سید علی سے ناراض ہو گئی۔ وہ روٹھی روٹھی، دور دور رہی لیکن مکان نہیں چھوڑا۔ سید علی اسے جب بھی دیکھتا شوق کی تحریک شدت اختیار کر جاتی۔ لڑکی بھی بڑی ہنر مند تھی، اب وہ بھی سید علی سے دور دور رہ کر سید علی کی آتش شوق کو ہوا دے رہی تھی۔ لڑکی کا یہ ایسا خطرناک حربہ تھا کہ اس نے سید علی کو زیر کر لیا۔ اب سید علی کو یہ بے چینی تھی کہ لڑکی اس کو نظر انداز کیوں کر رہی ہے۔ کئی بار جی میں آئی کہ لڑکی کو دونوں شانوں سے پکڑ کر گرا دیا جائے اور پوچھا جائے کہ۔ "اے لڑکی، تو اتنی مغرور کیوں ہو گئی ہے؟"

سہ پہر کو اس نے محسوس کیا کہ لڑکی اپنے کمرے سے اسے دیکھ رہی ہے لیکن جیسے ہی سید علی سے نظر ملی وہ منہ پھیر کر سامنے سے ہٹ گئی۔

سید علی طیش میں لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا لیکن وہ اندر سے بند تھا، سید علی نے غصے میں کہا۔ "لڑکی! دروازہ کھولو؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "سید علی! واپس جاؤ۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

سید علی نے دروازے کو زور سے دھکا دیا اور دھمکی دی۔ "اگر تو شرافت سے دروازہ نہیں کھولے گی تو میں دروازہ توڑ کر اندر آ جاؤں گا۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں دروازہ نہیں کھولوں گی، چاہے تم دروازہ توڑ دو۔"

سید علی غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے زور زور سے دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ دروازے ہل رہے تھے۔ بالکل اس طرح گویا دروازے ٹوٹ کر گر جائیں گے۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا اور اندر سے لڑکی کا ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ شوخی سے بولی۔ "تم تو بلا کے شریر۔ اپنی مرضی پر تو دروازے تک توڑنے پر تیار ہو گئے اور جب میں بضد تھی تو تم حاجت محسوس کرنے لگے تھے۔"

سید علی نے جواب دیا۔ "اب اس کا ذکر چھوڑ دے، میں تیرے شباب اور حسن کا شیدائی اپنی آتشِ شوق کو جلد از جلد بجھانا چاہتا ہوں ادھر آ، میرے گلے سے لگ جا۔"

لڑکی نے شوخی سے کہا۔ "ابھی ایسی غلطی کرنا بھی نہیں، اپنے پیر و مرشد سے پوچھ لیا یا نہیں۔"

سید علی جواب دیا۔ "میں کسی سے بھی نہیں پوچھتا۔ کیونکہ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں، جو جی میں آئے گا کروں گا پیر و مرشد کا میرے اعمال اور افعال سے کیا تعلق؟"

لڑکی سید علی کے قریب آ گئی۔ سید علی نے جیسے ہی..... فرطِ شوق میں نظریں اٹھائیں اور دروازے کی طرف دیکھا کہ وہ بند ہے یا کھلا اس نے دروازے کے اندر اپنے پیر و مرشد کو کھڑے دیکھا جو کلمہ طیبہ والی انگلی کو بند مٹھی میں سے نکالے ہوئے منع کر رہے تھے کہ خبردار کیا تو

نے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ تو برائیوں سے ہر قیمت پہ بچے گا لیکن اب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تو میری پروا کیے بغیر من مانی کیے جا رہا ہے۔
اس کے بعد مرشد نے فارسی کا شعر پڑھا جس کا مفہوم تھا۔
"چاہے تم یمن میں رہو لیکن مجھے تم اپنے ساتھ رکھو، تو یہ یوں ہے جیسے تم میرے سامنے ہو، اور اگر میرے ساتھ بھی رہو مگر میرے تصور کے بغیر رہو تو یہ ایسا ہے جیسے تم یمن میں رہو۔"
سید علی کانپ گیا اور لڑکی کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شیخ کی طرف دیکھا۔ شیخ بہ دستور موجود اسے منع کر رہے تھے۔ آخر سید علی لڑکی کو چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اس کا نشہ نفسانی اور خواہش شہوانی یکسر معدوم ہو چکی تھی۔ عورت کے خیال میں کوئی مزہ نہ رہا تھا۔ لڑکی کا تصور پھیکا اور بے مزہ ہو گیا تھا۔ گھنٹوں کی آوارہ گردی کے بعد جب وہ گھر میں واپس آیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ لڑکی کو ذلیل و خوار کر کے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد سید علی تین چار سال تک کابل میں رہا لیکن ہمیشہ یہی محسوس کرتا رہا کہ وہ رجولیت سے محروم ہو چکا ہے لیکن جب وہ ہندوستان واپس گیا اور اپنی بیوی کے پاس گیا تو عورت کی خواہش بڑی شدت سے ابھری اور وہ برسوں کے بھوکے کی طرح بیوی کی آغوش میں دبک کر چھپ گیا۔

☆☆☆

شیخ محمدؒ کے ایک مرید سید بُرہان بخاری آپ کی خصوصی توجہ میں رہتے تھے، ہر روز حاضری دیتے اور جب آپ اجازت دیتے چلے جاتے۔ سید بُرہان بخاری بھی جب تک آپ کی زیارت نہ کر لیتے، سکون نہ ملتا۔ مریدوں کو سامنے بٹھا کر آپ وعظ و تلقین میں مشغول ہو جاتے۔ ایک دن شیخ نے سید برہان بخاری کو مجلس میں نہیں دیکھا تو بے چین ہو گئے۔ مریدوں سے پوچھا۔ "کیا بات ہے، آج سید بُرہان بخاری نہیں نظر آ رہے، کہاں رہ گئے؟"
ایک مرید نے جواب دیا۔ "حضرت! برہان بخاری بڑی تکلیف میں ہیں۔ آج صبح میں ان کے پاس گیا تھا۔ اس وقت ان کے پاس کئی معالج علاج میں مشغول تھے۔"
شیخ نے پوچھا۔ "اسے تکلیف کیا ہے؟"
مرید نے جواب دیا۔ "حکماء نے دردِ قولنج تشخیص کیا ہے!"
شیخ نے بہت افسوس کیا اور فرمایا۔ "ہم اسے دیکھنے جائیں گے، ہم سے جو ہو سکا ضرور کریں گے۔"
اس دن شام کو آپ برہان بخاری کے گھر تشریف لے گئے اطباء نے افیون دے کر مدہوش کر دیا تھا۔ آپ نے برہان بخاری کے پاس بیٹھ کر دریافت کیا۔ "بخاری! کیا حال ہے؟"
بخاری نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نیم وا ہو کر رہ گئیں۔ انہیں ایسا لگا جیسے بڑی دور سے آواز آ رہی ہو، وہ کوئی جواب نہ دے سکے، آپ نے پھر پوچھا۔ "بخاری کچھ بتاؤ تو سہی کیا حال ہے؟ درد کس جگہ ہوتا ہے؟"
بخاری پھر کوئی جواب نہ دے سکے۔ گھر کے کسی تیماردار نے جواب دیا۔ "جناب شیخ! انہیں دردِ قولنج اٹھا تھا۔ اس نے انہیں ہلکان کر ڈالا ہے۔ اطباء علاج سے عاجز آ چکے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کیا علاج کیا جائے؟"
آپ برہان بخاری کے سرہانے بیٹھ گئے اور فرمایا۔ "ذرا دیر خاموش رہو اس کا مرض سلب کیے لیتا ہوں۔"
آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ پڑھ پڑھ کر اپنا داہنا ہاتھ۔ پورے جسم پر پھیرتے رہے۔ تقریباً نصف پون گھنٹا اس طرح کرتے رہے، درد کے خاتمے پر آپ نے فرمایا۔ "میں نے اس درد کو سلب کر لیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اب کبھی بھی یہ درد نہیں اٹھے گا۔"
آپ ذرا دیر اور رک کے اس کے بعد چلے آئے۔ دوسرے دن علی الصباح برہان بخاری نے آپ کی خانقاہ میں حاضری دی، اب وہ بالکل صحت یاب ہو چلے تھے۔ برہان بخاری نے شیخ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "حضرت! میں زندگی بھر آپ کا یہ کرم نہیں بھلا سکتا۔"
آپ نے جواب دیا۔ "برہان بخاری! جب میں نے مراقبے میں تیرے جسم میں مرض کی مدت دیکھی تو وہ تا زندگی نظر آیا۔ چنانچہ میں نے اس کو اپنی زندگی میں داخل کر لیا اور تجھے اس سے محفوظ کر دیا۔"
اس واقعے کے بعد دردِ قولنج کبھی کبھی آپ کو پریشان کرنے لگا۔ میر عبداللہ آپ کے مرید ہی نہیں، دوست بھی تھے اور یہی وہ شخص تھے جس نے برہان بخاری کی بیماری کی اطلاع آپ کو دی تھی۔
آپ ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ منزل پر پہنچنے کے بعد میر عبداللہ بخار میں مبتلا ہو گئے اور بخار اتنا تیز چڑھا کہ ان کی واپسی محال ہو گئی، انہوں نے شیخ سے کہہ دیا۔ "حضرت آپ میری وجہ سے کیوں رکیں، تشریف لے جائیں میں بعد میں آ جاؤں گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں ایسا نہیں ہوگا، تجھ کو ہمارے ساتھ ہی چلنا ہوگا۔''
میر عبداللہ نے عاجزی سے کہا۔ ''حضرت! بخار اتنا تیز ہے کہ اگر میں چلا تو چکرا کے ڈھیر ہو جاؤں گا۔''
کسی دوسرے مرید نے کہا۔ ''میں ان کے لیے سواری کا انتظام کرتا ہوں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''سواری کی کیا ضرورت ہے۔ ہم سب کے پاس سواری تو موجود ہے یہ اگر پیدل چلیں تو زیادہ بہتر ہے۔''
میر عبداللہ نے عرض کیا۔ ''میں پیدل کس طرح چلوں گا مجھ سے تو گھوڑے کی پشت پر بیٹھا بھی نہیں جائے گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''لیکن انہیں سواری ملے گی کہاں؟ انہیں تو پیدل ہی چلنا پڑے گا۔''
مریدوں نے عرض کیا۔ ''ہم کوشش کرتے ہیں، شاید مل جائے۔''
وہ لوگ کافی دیر تک سواری کے لیے سرگرداں رہے لیکن ناکامی رہی، آخر واپس آکر عرض کیا۔ ''سواری تو نہیں ملی۔ اب جیسا آپ فرمائیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''انہیں پیدل چلاؤ!''
میر عبداللہ نے خوشامد کی۔ ''حضرت! مجھے یہیں رہنے دیں، بعد میں آجاؤں گا۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔ تمہیں ہمارے ساتھ ہی چلنا ہوگا۔'' آپ کے اصرار نے سب کو لاجواب اور خاموش کر دیا۔
آپ نے میر عبداللہ سے فرمایا۔ ''عبداللہ! آج میں تجھے ایک مزے کا تماشا دکھاؤں گا۔ بخار نے تجھے کمزور اور بے حال کر دیا ہے، تیرا تو کھڑا ہونا بھی مشکل ہے اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجھ کو اپنے گھوڑے کے آگے رکھوں تاکہ میرا گھوڑا تیری رہنمائی میں اپنا سفر کرے۔''
میر عبداللہ نے حیرت سے عرض کیا۔ ''میں آپ کے گھوڑے کے آگے پیدل چلوں! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟''
آپ کی یہ بات بعض دوسرے مریدوں نے بھی سنی، ایک نے آہستہ سے کہا۔ ''آج شیخ یہ باتیں کیسی کر رہے ہیں؟ کیا یہ مریض کو ہلاک کر دینا چاہتے ہیں؟''
آپ نے بہ آواز بلند فرمایا۔ ''حکم ربی یہی ہے اور اسی میں اس کے مرض کی شفا ہے۔''
میر عبداللہ نے عرض کیا۔ ''شیخ کا حکم سر آنکھوں پر، میں پیدل چلنے پر تیار ہوں۔''
میر عبداللہ نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے، نقاہت نے انہیں بالکل بے بس اور مجبور کر دیا تھا۔
آپ نے میر عبداللہ کو سہارا دیا۔ اور بہ مشکل اپنے گھوڑے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ پھر اپنے گھوڑے کی طرف واپس آتے ہوئے فرمایا۔
''عبداللہ، میں جیسے ہی کہوں چلو، تم سب چل پڑنا اور میر عبداللہ تمہارا قدم سب سے پہلے اٹھے گا۔''
آپ اپنے گھوڑے پر بیٹھ چکے..... تو میر عبداللہ کو حکم دیا۔ ''ہاں عبداللہ! اب کوچ ہونا چاہیے۔''
میر عبداللہ نے اپنے پاؤں اٹھائے تو ابھی انہوں نے چلنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی کہ پاؤں خود بخود اٹھنے لگے۔ عبداللہ نے پہلے ہی مرحلے پر تیز تیز چلنے کا معیار قائم کر دیا۔ مریدوں کو حیرت ہو رہی تھی کہ جو شخص بیماری اور بخار کی شدت کی وجہ سے کھڑے ہونے کی طاقت بھی نہ رکھتا تھا، وہ گھوڑے کے آگے آگے چل کس طرح رہا تھا۔
کسی مرید نے پوچھا۔ ''عبداللہ! کیا حال ہے؟ طبیعت کیسی ہے؟''
میر عبداللہ نے جواب دیا۔ ''کمزوری رخصت ہوگئی، بخار بھی جاتا رہا، اب میں خود کو توانا محسوس کر رہا ہوں۔''
میر عبداللہ نے چلنے میں گھوڑے کی رفتار کو پیچھے چھوڑ دیا۔ جب یہ لوگ منزل مقصود پر پہنچے تو میر ی عبداللہ بالکل صحت یاب ہو چکے تھے۔ شیخ نے مریدوں کو متحیر دیکھ کر فرمایا۔ ''میں جانتا تھا کہ اس بخار کا علاج ہی یہ ہے کہ میر عبداللہ میرے گھوڑے کے آگے آگے پیدل چلے۔''
لیکن مریدوں کو اس پر یقین نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس میں شیخ محمد کی دعائیں شامل ہیں۔
آپ نے مریدوں کو منع کیا کہ وہ ذکر و فکر میں مشغول ہونے والے ہیں کسی کو حجرے میں نہ آنے دیا جائے۔ لیکن آپ نے جیسے ہی حجرے کا دروازہ اندر سے بند کیا، ایک شخص دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اور مریدوں سے کہا۔ ''شیخ سے کہو، تمہارے چچا کا بیٹا عبدالوہاب تم سے ملنا چاہتا ہے۔''
مریدوں نے جواب دیا۔ ''لیکن ہم اس وقت اندر نہیں جاسکتے، مجبوری ہے!''
چچا کا بیٹا عبدالوہاب مشتعل ہوگیا۔ ''کیا مجبوری ہے، میں گھر سے بے گھر ہوا جا رہا ہوں اور تم لوگ مجھے میرے بھائی سے ملنے نہیں دیتے۔''

یہ آوازیں اندر بھی پہنچ گئیں۔ آپ نے حجرے کا در کھول دیا۔ پوچھا۔ ''کیا بات ہے عبدالوہاب؟ کیسے آنا ہوا؟''

عبدالوہاب فوراً حجرے میں داخل ہوگیا اور گڑگڑا کر عرض کیا۔ ''بھائی صاحب! میں برباد ہوگیا، تباہ ہوگیا۔ میں کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''ہوا کیا، یہ تو بتاؤ، کس نے برباد کر دیا، کیونکر تباہ ہو گئے؟''

عبدالوہاب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، کہا۔ ''بھائی صاحب! میں جس جگہ رہتا ہوں، اس کا رئیس رستم میری عدم موجودگی ... میں میرا مکان گرا دینا چاہتا ہے، میں اتنی جلدی گھر پہنچ نہیں سکتا۔ آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟''

آپ نے فرمایا ''واقعی یہ تو بڑی نامناسب بات ہے، رستم میرے بھائی کا مکان گرا دے، یہ نہیں ہو سکتا۔ جنگ وجدل تو ہم فقراء کا شیوہ نہیں البتہ میں دیکھتا ہوں کہ وہ جائے موقع پر کس طرح پہنچتا ہے، میں اسے پہنچنے ہی نہیں دوں گا۔''

ادھر آپ یہ فرما یار ہے تھے، دوسری طرف رئیس رستم کے لشکر میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ اور وہ لوگ آپس میں ہی لڑ پڑے، اس علاقے کے عامل کا بھائی اس تنازعے میں مارا گیا اور مواخذے میں رستم گرفتار کرلیا گیا اور بالآخر تہ خانے میں ہی جاں بحق ہوا۔

اپنے آخری دنوں میں فرمایا۔ ''لوگو، مجھے خدا نے اتنا زیادہ کمال عطا فرمایا ہے کہ میں اگر چاہوں تو میں یہاں سے بلے بغیر متمثل ہو کر دنیا کے دوسرے کنارے پہنچ جاؤں۔''

پاس ہی ایک عمر رسیدہ خاتون بیٹھی تھی۔ آپؒ کی بات سن کر بولی۔ ''شیخ صاحبؒ! اس وقت جو چاہو کہہ لو لیکن ان باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، مرنے کے بعد کوئی کس طرح متمثل ہو سکتا ہے۔ اگر میں مرگئی تو آپ میری مدد ضرور کیجیے اور اگر مجھ سے پہلے آپ چلے گئے تو متمثل ہو کر آیئے گا اور میں دیکھوں گی کہ میں نے آپ کو پہچانا بھی یا نہیں۔''

اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔ آپ کا 8 جمادی الاول 1225ھ میں وصال ہوگیا۔ عورت کو آپ کا وعدہ یاد تھا۔ اس نے آپ کا انتظار شروع کر دیا۔ لیکن آپ نہیں پہنچے۔ اسی انتظار میں وہ بیمار پڑ گئی، تپ لرزہ نے اس کی حالت خراب کر دی۔

رات ہوئی تو اس تنہا عورت کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اس کی تیمارداری کون کرے گا۔ اس دن گھر میں کوئی دیا جلانے والا بھی نہ تھا، عورت کراہ رہی تھی اور اندھیرے گھر میں آنکھیں کھولے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رات کو پچھلے پہر اس کو پیاس محسوس ہوئی لیکن اس میں اٹھنے کی طاقت ہی نہیں تھی۔ ابھی پیاس تو تنگ کر رہی تھی کہ سردی لگنے لگی۔ لحاف پائنتی پڑا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اسے اوڑھ ہی لیتی۔ آخر نیم غنودگی میں اس نے دیکھا، کوئی شخص دیا روشن کر رہا تھا۔ جب دیا جل گیا اور گھر میں روشنی ہوگئی تو اس نے اس شخص کو پہچان لیا۔ یہ شیخ محمدؒ تھے۔ دیا جلانے کے بعد وہ ایک پیالے میں پانی لے آئے اور عورت کو پلایا۔ اس کے بعد لحاف کو جسم پر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد جب عورت کی حالت سنبھلی تو اس نے لحاف الٹ دیا اور شیخ محمدؒ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اب وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

شیخ محمدؒ کے انتقال کے بعد شاہ ولی اللہؒ دہلوی کے والد نے ان کے مزار پر حاضری دی۔ اس وقت ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی تھے۔ شاہ عبدالرحیمؒ والد شاہ ولی اللہؒ نے ساتھیوں کو حکم دیا کہ ذکر بالجہر کیا جائے۔ حکم کی دیر تھی کہ زور زور سے ذکر کیا جانے لگا۔ شاہ عبدالرحیم خود بھی اس میں شامل تھے۔

ذکر بالجہر سے فارغ ہونے کے بعد شاہ صاحب نے حاضرین سے فرمایا۔ ''حاضرین! ابھی ابھی میں نے کچھ دیکھا ہے، اگر اس کو ظاہر کردوں تو تم سب حیران ہو جاؤ گے۔''

حاضرین میں سے چند نے خواہش ظاہر کی کہ آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اس کو ظاہر ضرور فرمائیں۔

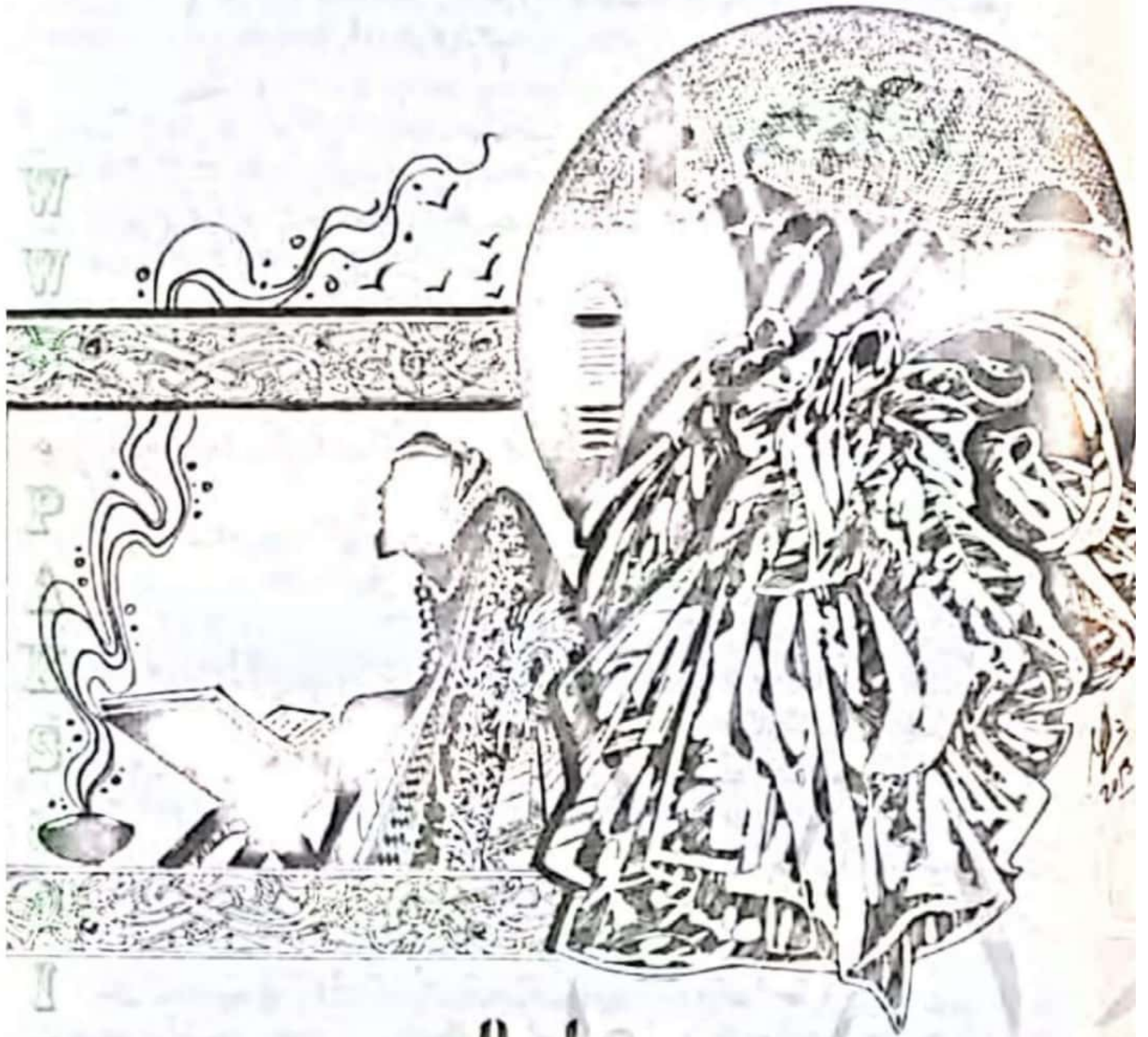
شاہ عبدالرحیمؒ نے فرمایا۔ ''لوگو! ابھی ابھی میں نے شیخ کی روح کو اپنے سامنے دیکھا، وہ مجھ سے فرما رہے تھے کہ۔ ''عبدالرحیمؒ! میں چاہتا تھا کہ اپنے جسم سمیت آپ کے پاس آؤں، کیونکہ خدا نے اس وقت بھی اتنا اختیار دے رکھا ہے لیکن یہ بات مصلحت کے خلاف ہے اس لیے میں نہیں آیا۔''

شاہ عبدالرحیمؒ نے مزید فرمایا۔ ''اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حیات اولیاء ایک حقیقت ہے۔''

یہ شیخ محمدؒ جن کا ذکر کیا گیا، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے جدِ مادری تھے، وہی شاہ ولی اللہ دہلوی جن سے آج دنیائے اسلام بہت اچھی طرح واقف ہے اور جنہیں امام وقت کا خطاب عطا ہوا۔

ماخذات

الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ روضۃ الریاحین، ابی محمد عبد اللہ۔ سفینۃ الاولیاء، شہزادہ داراشکوہ۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار



محیطِ عالم

ضیا تسنیم بلگرامی

محبت روپ بدل بدل کر انسانوں کے دلوں میں اترتی ہے اور جہاں قیام پذیر ہوجائے وہاں حالت ہی بدل جاتی ہے اور اگر... خالق ومخلوق کے درمیان یہ تعلق قائم ہوجائے تو عام انسان بھی خاص بن جاتا ہے اور... اس عام انسان نے بھی جب محبت کے تمام تر تقاضے نباہے تو ولی کا مرتبہ اس کا مقدر بن گیا۔

عشق حقیقی کا سحر انگیز احوال

مرو کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں عبداللہ نے ہوش سنبھالا تھا۔ ان کے باپ کا نام مبارک تھا۔ عبداللہ نے مروجہ علوم حاصل کیے لیکن مزاج میں استغنا اور بے نیازی اتنی زیادہ تھی کہ مادی اور علمی دولتوں کی حصولیابی نے ان کے دل و دماغ پر کوئی ناقص اثر نہیں ڈالا۔ وہ اپنے آپ کو نہ تو دولت مند کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور نہ ہی ایک نمایاں علمی شخصیت ہونے کا کوئی گھمنڈ تھا۔ معلوم نہیں، قدرت کا یہ کون سا اصول ہے کہ خدا جنہیں محبوب رکھتا ہے انہیں ان کے باپ کے سایے

سے بچپن ہی میں محروم کر دیتا ہے۔ عبداللہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ باپ کی عدم موجودگی میں ماں نے دونوں ذمے داریاں قبول کرلیں۔ ماں کا خیال تھا کہ ان کا بیٹا عبداللہ جب بڑا ہو جائے گا تو انہیں بڑی بے فکر ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بیٹے کے مشاغل اور روزمرہ کے معمولات ایسے نہیں تھے کہ انہیں محسوس ہی نہ کریں۔ صبح، دوپہر، شام اور رات، عبداللہ کے لیے وقتوں کا یہ پیمانہ ایسا نہیں تھا کہ انسان ان کی ناپ تول میں اپنی عمر گزار دے۔ عبداللہ کسی وقت بھی گھر سے دور کی ویرانے میں پہنچ سکتے تھے۔ ماں حیرت اور افسوس سے سوچتیں کہ ان کا بیٹا عبداللہ مستقبل میں معلوم نہیں کیا کرے گا؟

اس دن فجر کی نماز پڑھ کر عبداللہ نے گھر سے جو قدم نکالا تو دوپہر تک اس کا کوئی پتا نہ چلا۔ ماں بدحواس ہوئیں اور انہوں نے عبداللہ کی تلاش میں کئی آدمی چھوڑ دیے۔ دوپہر تک عبداللہ کی کوئی خبر نہ ملی لیکن دوپہر کے بعد ایک دیہاتی بھاگا بھاگا عبداللہ کی ماں کے پاس پہنچا اور اپنی دانست میں ایک عجیب و غریب خبر سنائی۔

''اماں! آپ کا بیٹا خطرے میں ہے۔ میرے ساتھ آیئے اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے کہ ان حالات میں آپ اس کی کیا مدد کر سکتی ہیں۔''

ماں کا دل دھک دھک کرنے لگا، گھبرا کے پوچھا۔ ''آخر میرا بیٹا عبداللہ کہاں ہے؟ وہ کس مصیبت میں مبتلا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔''

دیہاتی نے جواب دیا۔ ''میں کچھ بتانے کے بجائے دکھا دینا چاہتا ہوں، آپ میرے ساتھ تو آیئے۔''

پریشان حال اور حواس باختہ ماں دیہاتی کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں، وہ انہیں ایک باغ میں لے گیا۔ وہاں گلاب کے ایک کنج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ذرا اس کنج میں جا کر دیکھیے، آپ کا بیٹا کس حال میں ہے؟''

ماں گھبرائی ہوئی گلابوں کے کنج میں داخل ہوئیں تو انہیں ایک ہوشربا منظر دکھائی دیا۔ ان کا بیٹا اس کنج میں بے خبر سویا ہوا تھا اور پاس ایک طرف پھن اٹھائے ہوئے ایک سانپ بیٹھا تھا۔ عام حالات میں شاید ماں کی ایک خوفناک چیخ نکل جاتی لیکن انہیں دیہاتی کا مشورہ یاد تھا کہ آپ کا بیٹا خطرے میں ہے ذرا سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے کہ ان حالات میں آپ اس کی کیا مدد کر سکتی ہیں؟ وہ کچھ دیر مبہوت کھڑی یہ خوفناک منظر دیکھتی رہیں۔ عبداللہ کے منہ پر شہد کی مکھیاں بیٹھنے لگیں، ماں گھبرائیں کہ کہیں یہ مکھیاں عبداللہ کو کاٹ نہ لیں، وہ مکھیاں اڑانے کی کوئی ترکیب ابھی سوچ بھی نہ سکی تھیں کہ سانپ نے پودے کی ایک لمبی شاخ لے کر عبداللہ کے منہ پر حرکت دی، مکھیاں اڑ گئیں، ماں کو اطمینان ہو گیا۔

دیہاتی نے پوچھا۔ ''اس موذی سے نجات دلانے کی کیا ترکیب سوچی آپ نے؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''کوئی ترکیب نہیں، کیونکہ جس سانپ کو تم موذی سمجھ رہے ہو یہ موذی نہیں ہے، میرے بیٹے کا محافظ ہے۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ابھی ابھی شہد کی مکھیوں کو میرے بیٹے کے چہرے پر سے اس سانپ نے اڑایا ہے۔''

دیہاتی سمجھا، ماں کو اپنے بیٹے کی طرف سے غضب کا اعتماد ملا ہے، اس نے اپنی راہ لی۔ ماں دیر تک بیٹے کی بیداری کی منتظر رہیں۔

کافی دیر کے بعد عبداللہ کی آنکھ کھلی تو وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سانپ نے اپنی راہ لی، لیکن اس سانپ کو عبداللہ نہیں دیکھ سکے۔ وہ اٹھ کر کنج سے باہر آئے تو سامنے ماں کو کھڑا دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ ''ماں! آپ یہاں کہاں؟ خیریت تو ہے؟''

ماں نے پورا قصہ سنا دیا، بولیں۔ ''میں تو خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی لیکن جب میں نے یہ عجیب منظر دیکھا کہ وہ تیرے چہرے سے شہد کی مکھیاں اڑا رہا ہے تو میں مطمئن ہو گئی۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''لیکن ماں، میں نے تو اس سانپ کو دیکھا نہیں!''

ماں نے کہا۔ ''اسے تو کیسے دیکھتا کیونکہ وہ تیرے بیدار ہوتے ہی کہیں چلا گیا۔''

دونوں گھر چلے آئے لیکن ماں کو اپنے بیٹے کی عظمت کا علم ہو چکا تھا۔

☆☆☆

عبداللہ نے جوانی کی حد میں قدم رکھا لیکن ابھی تک عبداللہ کے اعمال اور اشغال میں کوئی ایسی بات نہیں ملی تھی جس سے ان کی عظمت اور بزرگی کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا۔

آپ کے پڑوس میں ایک انتہائی دولت مند شخص رہتا تھا۔ اسے عورتوں کا بڑا شوق تھا۔ کئی حسین بیویوں کے ساتھ ہی منتخب کنیزیں بھی گھر میں رکھ چھوڑی تھیں۔ اپنی نیکی اور اعلیٰ ظرفی کی وجہ سے عبداللہ کا اس گھر میں آنا جانا رہتا تھا۔ کنیزیں عبداللہ کے سامنے آتی تھیں۔ انہیں ایک کنیز بہت اچھی لگی۔ یہ جب تک کنیزوں میں رہتے، یہی کنیز ان کی توجہ کا مرکز بنی رہتی وہ بات کسی سے بھی کرتے لیکن دھیان اسی کنیز کی طرف رہتا۔ وہ گھر آتے تو خیال میں بھی یہی کنیز ہنستی مسکراتی رہتی۔ خوابوں میں بھی اس کا عمل دخل رہتا۔ یہ ہمہ وقتی دھیان آہستہ آہستہ شدید عشق کی صورت اختیار کر گیا۔ انہوں نے کئی بار یہ ارادہ کیا کہ اس کے روبرو اپنی محبت کا اظہار کر دیں۔ لیکن یہ سوچ کر باز رہے کہ اگر کنیز کے مالک نے ان کی یہ بات سن لی تو اپنے گھر میں ان کا داخلہ بند کر دے گا۔ وہ ایک عرصے تک عشق کی اس خاموش آگ میں سلگتے جھلستے رہے۔

کنیزوں کا مالک اپنے کسی کام سے شہر سے باہر چلا گیا، عبداللہ کے نفس نے سرکشی اختیار کی اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے دوڈھائی سالہ عشق کا اپنی محبوبہ کے روبرو اظہار ضرور کر دیں گے۔ انہیں اس سے کیا کچھ کہنا ہے، اس کی تفصیلات پر غور کرتے ہوئے جب یہ اپنی محبوبہ کے سامنے پہنچے تو زبان گنگ ہو گئی اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ یہ دیر تک اس کے سامنے کھڑے اس کی صورت دیکھتے رہے۔ کنیز نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے عبداللہ؟ آج تمہاری آنکھوں میں کسی... جذبے کی شدت کیوں پائی جاتی ہے۔ تم خاموش کیوں ہو؟ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

عبداللہ چور سے بن گئے، ایسے چور جس کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو، گھبرا کے سر جھکا لیا، بولے۔ ”نہیں، میں تم سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا۔“

کنیز نے ہنس کر کہا۔ ”عبداللہ! ایک عورت ہوں اور میں مردوں اور نوجوان کے دل کی بات ان کے چہروں سے معلوم کر لیا کرتی ہوں۔ میں تمہارے اندرونی طوفان سے اچھی طرح آگاہ ہوں لیکن میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ تم سب کچھ صاف صاف اپنی زبان سے بتا دو۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو پچھتاؤ گے۔“

عبداللہ کے جی میں آئی کہ جب یہ عورت ان کے دل کی بے چینی کو محسوس کر ہی چکی ہے تو اسے چھپانے سے فائدہ؟

کنیز نے ہنس کر کچوکا لگایا۔ ”عبداللہ! نوجوانی اور احتیاط! اسے میں پاگل پن سمجھتی ہوں۔“

عبداللہ نے ذرا اٹک اٹک کر کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ اس گھر میں، میں اپنا اعتبار کھو دوں!“

”میں یہ کب کہتی ہوں کہ تم اس گھر میں اپنا اعتبار کھو دو، لیکن میں اس تحمل اور ضبط کی بھی قائل نہیں جس کا تمہاری طرف سے خوانخواہ اظہار ہو رہا ہے۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”تب پھر میں، جو کچھ میرے دل میں ہے صاف صاف کہہ دوں؟“

کنیز نے کہا۔ ”آخر کتنی بار اس کی اجازت دوں؟“

عبداللہ نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ ”معلوم نہیں کیا بات ہے کہ سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، چلتے پھرتے اگر کسی کا تصور قائم رہتا ہے تو وہ تم ہو۔ تمہاری صورت، تمہاری شبیہ ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس عارضے کو دوسرے کیا کہیں گے۔“

کنیز نے ہنس کر جواب دیا۔ ”دوسرے ان جذبات کو محبت کہتے ہیں۔ اس کا ایک نام عشق بھی ہے۔“ پھر کسی خیال میں ڈوب کر بے خیالی میں کہا۔ ”تو تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو! خوب!“

عبداللہ نے گھبرا کر کہا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو کہ میں محبت کرنے لگا ہوں، خود میں نے تو ایسی بات نہیں کہی۔“

کنیز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم خوفزدہ کیوں ہو؟ دل کا معاملہ تو ایسا ہے کہ اس پر کسی کا بس ہی نہیں چلتا۔“

عبداللہ نے اٹک اٹک کر کہا۔ ”معلوم نہیں یہ کیسی آگ ہے جو سینے میں ہر وقت فروزاں رہتی ہے۔“

کنیز نے شوخی سے کہا۔ ”اگر تم یہ چاہو کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جاؤں تو اس کے لیے تمہیں اپنے دماغ کو بھی کام میں لانا پڑے گا۔“

عبداللہ نے جلدی پوچھا۔ ”کیا اگر میں خواہش کروں تو تم واقعی میرے ساتھ اور پاس رہنے پر آمادہ ہو جاؤ گی؟“

کنیز نے اسی شوخی سے جواب دیا۔ ”تم زبان تو کھولو اپنی، پھر دیکھو کہ تمہارے لیے کیا کچھ ہو سکتا ہے!“

”اور تم اپنے آقا کو کیا جواب دو گی؟“

”یہ میرا اپنا معاملہ ہے، میں اس سے کیا کہوں گی اور اسے تمہارے لیے کس طرح آمادہ اور راضی کروں گی، یہ میرا

مسئلہ ہے۔ تم اس میں اپنا سر کیوں کھپاؤ۔"
عبداللہ چپ ہو گئے۔
عبداللہ کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ دوسری کنیزیں ان کی نگرانی کرنے لگی ہیں۔ اس کی تائید ان کی محبوبہ نے بھی کی، اس نے کہا۔ "عبداللہ! ذرا احتیاط سے کام لو، دوسری کنیزیں کوشش کرتی ہیں کہ وہ کسی طرح ہم دونوں کی باتیں سن لیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اپنے مالک کے لیے جاسوسی کا فرض انجام دے رہی ہیں۔"
عبداللہ کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے، کہا۔ "اپنے اس حشر سے میں پہلے ہی واقف ہو گیا تھا۔ لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود تیری یاد کو اپنے دل سے نہیں نکال سکا۔ اب تو ہی بتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"
کنیز نے بے بسی سے جواب دیا۔ "میں کیا بتاؤں، میری عقل کام ہی نہیں کر رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"
عبداللہ نے ذرا خفگی سے کہا۔ "میں تو پہلے ہی یہ کہتا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہم دونوں سمجھ بیٹھے ہیں۔ لیکن تو یہ کہہ کر ٹال دیا کرتی تھی کہ یہ میرا اپنا معاملہ ہے میں کیوں فکر کروں۔ اب تو اپنے اس معاملے کو کس طرح انجام کو پہنچائے گی، ذرا میں بھی تو سنوں؟"
کنیز نے افسوس سے جواب دیا۔ "میں تم سے ایک درخواست کر رہی ہوں، خدارا اس پر عمل ضرور کرنا۔"
"کون سی، کیسی درخواست؟"
کنیز نے جواب دیا۔ "میں چاہتی ہوں، تم چند دن میرے پاس بالکل نہ آؤ۔ میں تمہاری عدم موجودگی میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ گھر کی دوسری کنیزیں ہم دونوں کی نسبت سے کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ان باتوں کی روشنی میں ہم دونوں کوئی قدم اٹھائیں گے۔"
عبداللہ نے کنیز کی بات مان لی اور گھر میں اعتکاف اختیار کیا۔ کئی دن گزر گئے لیکن عبداللہ کنیز کے پاس نہیں گئے۔ ان کا خیال تھا کہ کنیز کے سینے میں جو آتش فرقت بھڑک رہی ہے اس کی تپش اور سوزش اسے مستقل بے قرار رکھے گی اور وہ انہیں بلانے پر مجبور ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا، کنیز بالکل خاموش رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن عبداللہ خود ہی اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ کنیز انہیں بلائے یا نہ بلائے، وہ بغیر بلائے ہی اس کے پاس چلے جائیں گے۔ چنانچہ ایک دن علی الصباح یہ اس کنیز کے پاس پہنچ گئے۔ کنیز کو معلوم نہیں کس طرح، عبداللہ کی آمد کا علم ہو گیا تھا، اس نے انہیں دروازے ہی پر روک لیا، گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "عبداللہ! اب بات حد سے آگے نکل گئی ہے۔ ان نازک حالات میں اگر میں تمہارا ساتھ دیتی ہوں تو مجھے ہر وقت دو خوف ستائے رہیں گے۔ ایک خوف تو یہ کہ میرا آقا یہ پسند ہی کیوں کرنے لگا کہ تم اپنی ناپاک خواہشات کے ساتھ اس کے گھر میں آؤ جاؤ۔ جس دن بھی اسے یہ بات معلوم ہوگئی وہ ہم دونوں کو ذلیل اور رسوا کر ڈالے گا اور دوسرا خوف یہ ہے کہ تمہاری ماں مجھے قبول ہی کیوں کرے گی؟"
عبداللہ نے جواب دیا۔ "میں اپنی ماں کو آمادہ کرلوں گا، تو کیوں فکر کرے۔"
کنیز نے پریشانی سے کہا۔ "تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ میرا آقا بس آتے ہی والا ہے۔ تم خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ اور اس وقت تک یہاں نہ آنا جب تک میں خود تمہیں نہ بلا بھیجوں!"
کنیز نے عبداللہ کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا، انہیں دھکا دے کر باہر کر دیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ کنیز کی اس روش بے رخی نے عبداللہ کے دل پر آرے سے چلا دیے تھے۔ ان پر غیرت نے حملہ کر دیا اور وہ گھنٹوں اپنی ذلت پر آنسو بہاتے رہے۔
اس رات جب یہ بستر پر گئے تو آدھی رات کے بعد انہیں ایسا محسوس ہوا گویا بستر انہیں دھکا دے کر حکم دے رہا ہے کہ چل نکل، کوئے یار کا رخ کر۔ انہوں نے بستر چھوڑ دیا اور پڑوسی کے مکان کے سامنے کھڑے ہو کر کنیز کی ایک جھلک دیکھنے کا انتظار کرنے لگے۔
رات بالکل تاریک تھی۔ کنیز کا مکان سیاہی کی چادر میں لپٹا خاموش کھڑا تھا۔ مکان کے کسی روزن سے ہلکی ہلکی روشنی چھن رہی تھی۔ ان کے سینے میں بھی ایک آگ روشن تھی، اس کی گرمی کے سہارے یہ ایک درخت سے پشت لگا کر کھڑے

ہو گئے اور کنیز کے تصور میں گمن، مکان پر ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگے۔ اس وقت ان کے دل سے ہوک سی اٹھ رہی تھی اور انہیں کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اس کام میں ان کے لیے عزت ہے یا ذلت۔ اسی طرح پوری رات گزار دی، صبح مؤذن نے اذان کہی تو انہیں ذرا ہوش آیا۔

ماں کئی بار خالی بستر دیکھ کر واپس جا چکی تھیں۔ انہیں حیرت اور پریشانی تھی کہ عبداللہ کچھ بتائے بغیر آخر چلے کہاں گئے؟ فجر کے وقت بیٹے کو گھر میں داخل ہوتے جو دیکھا تو ماں نے انہیں آغوش میں لے لیا اور مضطرب لہجے میں دریافت کیا۔ ”بیٹا! تو رات بھر غائب کہاں رہا؟“

عبداللہ کا چہرہ اترا ہوا تھا اور صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے بے زار ہیں۔ جب بیٹے نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو ماں نے ذرا درشتی سے پوچھا۔ ”عبداللہ! تو میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا، میں تجھ سے کیا پوچھ رہی ہوں؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”ماں، میں آپ کی بات کا کیا جواب دوں! میں بہت پریشان ہوں آج کل۔“

”تو مجھے بتا اپنی پریشانی، شاید میں اس کا کوئی علاج بتا سکوں!“

وہ اور زیادہ اداس ہو گئے، بولے۔ ”ماں! مجھے معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کہ میرا دل ہر وقت ویرانے میں جانا چاہتا ہے۔“

ماں حیرت اور تشویش سے عبداللہ کی صورت دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔ ”اچھا تو مجھے ایک بات تو بتا۔ یہ کنیز کا کیا چکر ہے کہیں تو سچ مچ اس کی محبت میں گرفتار تو نہیں ہو گیا ہے؟“

عبداللہ سے جھوٹ نہیں بولا گیا، بولے۔ ”ماں! میں بالکل مجبور اور بے بس ہو گیا ہوں!“

اس کے بعد وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگے۔

ماں سامنے سے ہٹ گئیں۔ وہ اس موضوع پر مزید کوئی بات کر کے لڑکے کا بیاؤ نہیں کھولنا چاہتی تھیں۔ عبداللہ نے ہوش میں آ کر جب سر اوپر اٹھایا تو ماں کو موجود نہ پا کر بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ ”او خدایا! میں کتنا ظالم ہوں کہ میں نے ایک کنیز کی چاہ میں پوری رات برباد کر دی۔ میں نے ایک مادی اور فانی شے سے عشق کر کے خود کو کتنا حقیر اور ذلیل کر لیا ہے۔ اگر یہی وقت میں تیری یاد میں گزارتا تو شاید تو مجھے مایوس نہ کرتا۔“

وہ دیر تک بیٹھے آنسو بہاتے رہے آخر وہ یہ فیصلہ کر کے اٹھے کہ اب انہیں کنیز کا خیال نہایت بے دردی سے نکال دینا ہے۔

☆☆☆

عبداللہ نے خود کو خدا کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے دنیا چھوڑ دی۔ مرو میں چاروں طرف یہ شہرہ ہو گیا کہ مبارک کے نوجوان بیٹے عبداللہ نے ایک کنیز کی محبت سے تائب ہو کر خدا سے لو لگا لی ہے اور ان کی عبادت اور ریاضت کا یہ حال ہے کہ بڑے بڑے عابد اور زاہد بھی اس پائے کی ریاضت نہیں کر سکتے۔

کنیز کے دل پر چوٹ سی لگی کہ یہ کیا ہو گیا۔ ایک رات، اندھیرے میں چھپتی چھپاتی وہ عبداللہ کے حجرے کے در پر آ کھڑی ہوئی۔ اس نے قدرے تامل کے بعد دروازے پر دستک دی۔ اس وقت آپ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، سلام پھیرنے کے بعد دریافت کیا۔ ”کون؟“

کنیز نے نہایت دلکش لہجے میں کہا۔ ”عبداللہ! دروازہ کھولو!“

عبداللہ نے بے رخی سے کہا۔ ”اندر آ کر کیا کرو گی؟ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔“

کنیز نے خوشامد کا سہارا لیا، بولی۔ ”دیکھو، میں پھر یہ کہوں گی کہ تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔“

”ہو سکتا ہے تیری یہ بات درست ہو لیکن میں اس وقت حجرے سے باہر نہیں نکلوں گا، تجھے جو کچھ کہنا سننا ہے باہر سے کہہ سن لے۔“

کنیز نے غمزدہ انداز میں کہا۔ ”کیا تم مجھ سے ناراض ہو گئے؟ خدا کی قسم تم مجھ سے جس کی چاہو قسم لے لو، میں آج بھی تمہی سے محبت کرتی ہوں، تم معلوم نہیں کیوں میری بات پر اعتماد نہیں کر رہے۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں تو بس اتنی سی بات جانتا ہوں کہ اس رات تو نے مجھ پر اگر یہ رحم نہ کیا ہوتا تو شاید میں اپنے اللہ سے بھی نہ رجوع ہوا ہوتا۔ اب تو واپس چلی جا۔“

کنیز نے دھمکی دی۔ ''عبداللہ! اگر تم نے دروازہ نہ کھولا تو میں یہیں بیٹھ جاؤں گی اور چیخ چیخ کر روؤں گی، یہاں تک کہ یہاں لوگوں کا مجمع لگ جائے گا اس وقت میں تمہیں ذلیل اور رسوا کر ڈالوں گی۔''

عبداللہ نے ہنس کر کہا۔ ''عورت! میں دنیا سے نہیں ڈرتا، میں اپنے خدا سے ڈرتا ہوں۔ اس وقت بھی میں اسی لیے دروازہ کھول رہا ہوں کہ کہیں خدا یہ نہ سمجھے کہ میں تجھ سے یا تیرے جیسی دوسری عورتوں سے خوفزدہ رہتا ہوں، آ اور بے تکلفی سے میرے روبرو آ کے کھڑی ہو جا اور تجھے قسم ہے کہ اپنے ناز و ادا کے جتنے کرشمے دکھا سکتی ہے، مجھ پر آزما ڈال، میں دیکھوں گا کہ میں ان سے کس طرح گھائل ہوتا ہوں۔''

حجرے کا در کھل گیا۔ کنیز اندر داخل ہو گئی۔ رنگین لباس میں ملبوس کنیز آسمانی حور معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اشکبار نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''عبداللہ! کیا تم نے مجھے واقعی بھلا دیا؟''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''میرے پاس اس فضول سوال کا کوئی جواب نہیں۔''

کنیز نے کہا۔ ''میں تمہاری جدائی اور مفارقت میں زندہ نہیں رہوں گی۔''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''یقیناً جب گناہ بڑھ جائیں اور نیک بننے کی راہیں بند ہو جائیں تو اس شخص کے لیے زمین کا اوپر نہیں، اندر بہتر ہے۔''

کنیز نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اب تم اتنے بڑے دیندار ہو گئے ہو کہ تمہارے دل میں انسانی حسن کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ کیا تم دنیا سے اس حد تک تعلق منقطع کر لو گے کہ اس کی کسی شے کی تمہیں ضرورت ہی نہ پیش آئے؟''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''میں نے دنیا سے اپنا تعلق منقطع ہی کہاں کیا ہے۔ ہاں اس کی عیاریوں اور مکاریوں سے بچنے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔ اگر اس کی مدد شامل حال رہی تو میں اپنی کوشش میں کامیاب ضرور ہو جاؤں گا۔ اس کی تائید کے بغیر ہر کام مشکل ہے۔''

کنیز نے پوچھا۔ ''کیا میں واپس جاؤں؟''

عبداللہ نے کہا۔ ''ہاں تو واپس جا اور یہ سمجھ لے کہ وہ عبداللہ جو کبھی اپنے سینے میں تیرے عشق کا چراغ فروزاں رکھتا تھا، وہ مر چکا اب اس کی جگہ دوسرے عبداللہ نے لے لی ہے اور اس عبداللہ کے دل میں جو چراغ روشن ہوا ہے اسے بجھایا نہیں جا سکتا۔''

کنیز کھڑی حسرت سے عبداللہ کو دیکھتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے واپس چلی گئی۔

☆☆☆

آپ ایک عرصے تک خلوت نشین رہے اور عبادت و ریاضت کی کڑی مشقیں جھیلتے رہے، پھر سیر و سیاحت کا شوق ہوا۔ مرو سے نکل کر مختلف دیار و امصار کی سیر کرتے رہے۔ اب ان میں وہ اوصاف پیدا ہو چکے تھے جو مردانِ خدا و خود آگاہ کا خاصہ سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کو ان دنوں یہ خواہش بہت ستاتی رہتی تھی کہ خدا انہیں اپنا مقبول بندہ بنا لے، اس خواہش کو لیے ہوئے وہ نیشاپور میں داخل ہوئے۔ یہ شدید سردیوں کا موسم تھا، اس کڑے موسم میں آپ نے نیشاپور کے ایک بازار میں کسی شخص کو سردی میں ٹھٹھرتے سکڑتے دیکھا۔ آپ کو اس کی حالت زار پر رحم آ گیا، اس سے پوچھا۔ ''اے شخص! تو کون ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں اس شہر کے ایک رئیس کا غلام ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کیا تیرے پاس سردیوں سے بچنے کا لباس نہیں ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''کیا تو نے میری بات نہیں سنی؟ میں نے ابھی ابھی تجھے بتایا ہے کہ میں اس شہر کے ایک رئیس کا غلام ہوں اور گرم لباسوں کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔''

آپ نے کہا۔ ''پھر تو اس سے ایک آدھ پوستین ہی مانگ لے، تاکہ تو سردی کی اذیت سے بچ جائے۔''

غلام نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''تو کیسا نوجوان ہے کہ تیری سمجھ میں میری کوئی بات ہی نہیں آتی۔ پوستین وغیرہ میرے مالک کے پاس ہیں۔ کیا اسے انہیں معلوم کہ یہ شدید سردیوں کا موسم ہے اور اس میں ہر جاندار کو گرمی کی ضرورت ہے۔ کیا میرا مالک یہ نہیں جانتا کہ مجھے گرم لباس کی ضرورت ہے، پوستین کی ضرورت ہے؟ اسے میری یہ بنیادی ضرورت کسی خواہش اور مطالبے کے بغیر ہی پوری کر دینا چاہیے۔ اگر اسے اس کا خود خیال نہیں ہے تو میں بھی درخواست کر کے اپنی بات بیکار نہیں کروں گا

چاہتا۔"

عبداللہ کے دل میں ایک تیر سا پیوست ہوگیا۔ غلام نے معرفت کا وہ نکتہ بیان کر دیا تھا جو ابھی تک ان کی فکر و نظر سے اوجھل تھا۔ آپ نے آہستہ سے کہا۔ "بیشک جب اسے تیری ضرورتوں کا یقینی علم ہے تو اسے زبان سے ادا کرنا فضول اور بے معنی ہے۔"

آپ نے اسی وقت اپنے دل میں سے یہ خواہش نکال دی کہ خدا انہیں مردان خدا و خود آگاہ کی صف میں شامل فرما کے اپنا مقبول بندہ بنالے۔

آپ حج کے لیے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں تاخیر ہوگئی اور آپ کو اس احساس نے پریشان کر دیا کہ حج میں صرف چار دن باقی رہ گئے ہیں اور راستہ دس بارہ دن سے زیادہ کا تھا۔ ابھی وہ اسی فکر میں تھے کہ انہیں ایک بڑھیا اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ بڑھیا قریب آکر بولی۔ "نوجوان! تو پریشان کیوں ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "بڑی بی! مجھے اپنے حج کے ضائع جانے کا بڑا افسوس ہے۔ حج میں چار دن باقی رہ گئے ہیں، اب میں وہاں کسی طرح بھی نہیں پہنچ سکتا۔"

بڑی بی نے کہا۔ "تو فکر نہ کر، میں حج کراؤں گی تیرا، آ میرے ساتھ چل۔"

آپ نے حیرت سے کہا۔ "کیا میں یہ طویل سفر چار دن کے اندر طے کرلوں گا؟"

بڑی بی نے اسے اطمینان سے جواب دیا۔ "تو فکر نہ کر، میرے ساتھ چل۔"

عبداللہ بڑی بی کے ساتھ سفر کرنے لگے۔ یہ دونوں دیر تک سفر کرتے رہے۔ راستے میں دریا آگیا۔ عبداللہ نے بے بسی سے کہا۔ "اب اس دریا کو کس طرح عبور کروں گا۔ نہ کشتی ہے نہ پل۔"

بڑی بی نے کہا۔ "اپنی آنکھیں بند کرلے نوجوان۔"

عبداللہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ بڑی بی اس کا ہاتھ پکڑ کے دریا میں داخل ہو گئیں۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ دریا عبور کرنے لگے۔ عبداللہ نے محسوس کیا کہ وہ کمر تک پانی میں سفر کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد بڑی بی نے حکم دیا۔ "اپنی آنکھیں کھول دے نوجوان۔"

عبداللہ نے آنکھیں کھول دیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ دریا کو عبور کر چکے ہیں۔ راستے میں کئی دریا آئے اور انہیں اسی طرح عبور کیا گیا اور پھر انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ دونوں اپنی امید اور توقع سے زیادہ سفر طے کر چکے ہیں۔ ہر دریا کو عبور کرنے کے بعد وہ خاصا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ یہاں تک کہ ٹھیک چوتھے دن وہ دونوں عرفات کے میدان میں داخل ہو چکے تھے۔ دونوں نے حج کیا۔ عبداللہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔

بڑی بی نے عبداللہ سے کہا۔ "اب تیرا حج ہو چکا، اب کیا ارادے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "جیسا آپ حکم دیں۔"

بڑی بی نے کہا۔ "اگر تیرے پاس وقت ہے تو ذرا میرے ساتھ چل، میں تجھے اپنے بیٹے کے پاس لے چلوں۔ اس سے ملاقات کراؤں، امید ہے تو اس سے مل کر بہت خوش ہوگا۔"

آپ نے کہا۔ "میں آپ کی بات کس طرح ٹال سکتا ہوں۔"

بڑی بی عبداللہ کو ساتھ لے کر ایک جگہ پہنچیں وہاں ایک دبلا پتلا نحیف و نزار نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نقاہت اور کمزوری میں بھی اس کے چہرے سے نور ٹپک رہا تھا۔ بڑی بی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے میرا بیٹا۔ اس سے مل، میں اسی کی خاطر اتنا لمبا سفر طے کر کے آئی ہوں۔"

کمزور نوجوان، ماں کو دیکھتے ہی ان کے قدموں میں گر گیا اور بشاش لہجے میں کہنے لگا۔ "ماں! میں جانتا ہوں کہ آپ دونوں یہاں کیوں آئے ہیں؟"

آپ نے پوچھا۔ "بھلا بتا تو ہم دونوں یہاں کیوں آئے ہیں۔"

نوجوان نے جواب دیا۔ "میری تجہیز و تکفین کے لیے!"

بڑی بی نے عبداللہ سے کہا۔ "کیا تو میرے بیٹے کے چہرے پر کوئی خاص بات محسوس کر رہا ہے؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''ہاں میں اس کے چہرے پر حیرت انگیز طمانیت اور بشاشت محسوس کر رہا ہوں، حالانکہ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے انسان کو بڑا دکھ اور خوف محسوس ہوتا ہے۔''

نوجوان نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن جن کے نامۂ اعمال میں راضی بہ رضائے الٰہی لکھا ہوتا ہے وہ کسی قسم کا خوف یا دکھ نہیں محسوس کرتے۔''

بڑی بی نے کہا۔ ''ہم لوگ مشیت الٰہی پر شاکر رہتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اس میں خدا کی طرف سے کسی ظلم وزیادتی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔''

نوجوان نے ماں سے کہا۔ ''ماں! میں جارہا ہوں، خدا حافظ۔''

بڑی بی نے اٹھ کر بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اس نے آخری ہچکی لی اور دنیا سے رخصت ہوگیا۔

دونوں نے اس کی تکفین وتدفین کا کام انجام دیا۔ عبداللہ نے سوچا کہ معلوم نہیں اب بڑی بی انہیں کیا حکم دیں۔ بڑی بی نے خود ہی کہا۔ ''نوجوان! اب تو جاسکتا ہے۔ میں یہیں بیٹے کی قبر کی مجاوری کروں گی۔''

عبداللہ نے دکھ سے پوچھا۔ ''اب آپ سے کب اور کہاں ملاقات ہوگی؟''

بڑی بی نے جواب دیا۔ ''کبھی اور کہیں بھی نہیں۔ یہاں سے ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں گے!''

عبداللہ نے بے چینی سے پوچھا۔ ''یہ کیوں؟ آخر ایسا کیوں؟''

بڑی بی نے کہا۔ ''عبداللہ! میں جانتی ہوں کہ تو اگلے سال پھر ادھر آئے گا لیکن اس وقت تک میں اس دنیا سے رخصت ہوچکی ہوں گی۔''

عبداللہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

بڑی بی نے اس نمی کو محسوس کرلیا، بولیں۔ ''کیا تو ابھی تک راضی بہ رضائے الٰہی کے نکتے سے واقف نہیں ہوا؟ تو روتا کیوں ہے جا اور میرے بعد میرے حق میں دعائے خیر کرتا رہ۔''

عبداللہ وہاں سے چلے آئے اور اپنے وطن واپس پہنچے۔ یہاں انہوں نے اپنے لیے ایک معمولی پیشہ اختیار کیا۔ آپ نے طے کیا کہ ایک سال تو حج کریں گے، دوسرے سال جہاد میں شریک ہوں گے اور تیسرے سال تجارت کریں گے اور اس سے جو نفع کمائیں گے اسے مستحقین میں تقسیم فرمادیں گے، چنانچہ اس پر آپ نے سختی سے عمل کیا۔

آپ نے حج اور جہاد کے بعد تجارت شروع کی اور اس سے جو نفع کمایا اسے مستحقین اور فقرا میں تقسیم کردیا۔ اس موقع پر آپ نے ایک عجیب سا طریقہ اختیار کیا۔ آپ نے فقرا کے سامنے بہت ساری کھجوریں رکھ دیں اور کہا۔ ''کھجوریں کھا کھا کر گٹھلیاں اپنے سامنے رکھتے جاؤ۔''

جب یہ لوگ کھجوریں کھاچکے تو آپ نے ان کے سامنے رکھی ہوئی گٹھلیاں شمار کیں اور جس کے سامنے جتنی گٹھلیاں رکھی ملیں آپ نے اسے اتنے ہی درہم مرحمت فرمادیے۔

آپ کے گھر میں ایک غلام کام دھندے پر متعین تھا۔ آپ نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ اگر تو مجھے اتنی رقم ادا کردے جتنی میں نے تیری خریداری پر خرچ کی ہے تو میں تجھے آزاد کردوں گا۔ یہ غلام گھر کے کاموں سے فرصت پاکر محنت مزدوری کرنے چلا جاتا۔

ایک دن آپ کے پاس قبرستان سے ایک آدمی آیا اور آپ سے پوچھا۔ ''جناب! آپ کا غلام گھر کے کاموں سے فرصت پاکر کہاں چلا جاتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنے غلام سے یہ وعدہ کررکھا ہے کہ اگر وہ اپنی ادا کی ہوئی قیمت مجھے ادا کردے تو میں اسے آزاد کردوں گا۔ وہ اس رقم کی حصولیابی کے لیے محنت مزدوری کرنے نکل جاتا ہے۔''

اجنبی نے کہا۔ ''حضرت! آپ کا یہ خیال ہی خیال ہے کہ وہ محنت مزدوری کرنے جاتا ہے لیکن میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ فرصت پاکر ہر روز قبرستان پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے کفن چرا کر اسے فروخت کردیتا ہے۔''

آپ نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا یہ تم پورے وثوق سے کہہ رہے ہو؟''

اجنبی نے جواب دیا۔ ''یہ سب کچھ میں پورے وثوق اور اعتماد سے کہہ رہا ہوں!''

''اس کا ثبوت؟''

''اس کا پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ آپ ذرا سوچ کر بتائیے کہ آپ کا غلام کیا رات کو بھی گھر کے اندر ہی موجود رہتا ہے؟''

آپ نے غور کیا تو یاد آیا کہ ان کا غلام واقعی رات کو گھر میں موجود نہیں ہوتا۔ کہاں جاتا ہے؟ انہیں کچھ پتا نہ تھا۔ اجنبی کو جواب دیا۔ ''ہاں، مجھے یاد آیا کہ وہ رات کو گھر میں نہیں ہوتا۔''

اجنبی نے کہا۔ ''تب پھر آپ آج کی رات میرے ساتھ زحمت کیجیے۔ میں سارا تماشا دکھا دوں گا۔''

آپ نے اس اجنبی کو گھر ہی میں روک لیا۔ رات کو حسب معمول غلام، گھر کے کام دھندوں سے نجات حاصل کر کے باہر نکلا، اسی وقت غلام کے پیچھے اجنبی کے ساتھ آپ بھی چل پڑے۔ غلام واقعی قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ آپ کو اس وقت بہت دکھ ہوا۔ انہیں اس وقت یہ غم بہت ستا رہا تھا کہ اب تک غلام نے انہیں جتنی رقم ادا کی تھی وہ ساری کفن چوری کر کے دی گئی تھی۔

غلام قبرستان میں داخل ہو کر ایک قبر کے قریب جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر وہ یوں ہی کھڑا رہا پھر اس نے قبر کے اوپر سے پتھر ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔ آپ اجنبی کے ساتھ باہر کھڑے غلام کی واپسی کا انتظار کرتے رہے لیکن جب وہ دیر تک باہر نہ نکلا تو آپ نے احتیاط سے اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر ایک دیا روشن تھا، آپ نے اس کی روشنی میں دیکھا، غلام نے ٹاٹ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اس کے گلے میں ایک طوق پڑا تھا، وہ عبادت میں مشغول تھا، پھر آپ نے اس کی گریہ وزاری کی آوازیں سنی۔ آپ کو اپنے شک وشبہ اور سوء ظنی پر بے حد افسوس ہوا۔ آپ کو رونا آ گیا، اجنبی سے کہا۔ ''تو تو یہ کہتا تھا کہ میرا غلام چوری کرتا ہے، کفن چرا کے فروخت کرتا ہے لیکن اس کے برعکس میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟''

اجنبی بھی شرمسار تھا، افسوس کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے قبر کے اندر سے نکلتے دیکھا تھا اس لیے یہ خیال ہوا کہ کفن چوری کرتا ہے۔ دلوں کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔''

آپ نے اجنبی سے کہا۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔''

اجنبی نے پوچھا۔ ''کیا آپ یہیں ٹھہریں گے؟''

''ہاں۔''

''کب تک؟''

''جب تک یہ قبر کے اندر رہے گا۔ جب یہ باہر نکلے گا تو میں اس سے معافی چاہوں گا۔''

اجنبی چلا گیا۔ غلام اندر نماز پڑھتا رہا اور آپ باہر عبادت میں مشغول رہے۔

فجر کی نماز سے ذرا پہلے غلام قبر سے باہر نکلا، آپ نے بھی عبادت بند کی اور اس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ وہ ایک مسجد میں داخل ہو گیا، آپ بھی مسجد میں چلے گئے۔ وہاں دونوں نے الگ الگ صفوں میں کھڑے ہو کر نماز فجر ادا کی۔ لوگ نماز پڑھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ آپ غلام سے ذرا دور وہیں موجود رہے۔ غلام نے بارگاہ ایزدی میں الحاح وزاری شروع کر دی۔ ''خدایا! میں نے پوری رات حسب معمول تیری یاد میں گزار دی، کیونکہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تیرے ذکر سے افضل بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ اب میں اپنے مالک کے پاس جاؤں گا وہ مجھ سے درہموں کا مطالبہ کرے گا۔ اب تو ہی بتا کہ میں درہم کہاں سے لاؤں؟''

ابھی اس کی دعا ختم بھی نہ ہوئی تھی اوپر سے ایک نور سا نمودار ہوا۔ اس کا رخ غلام کے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کی طرف تھا۔ یہ نور ہتھیلیوں میں درہموں کی شکل اختیار کر گیا۔ آپ اسی وقت غلام کے قدموں میں گر گئے۔ غلام آپ کو اپنے قدموں میں گرا ہوا دیکھ کر گھبرا گیا، آپ کو قدموں سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''حضرت! یہ آپ، آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟''

آپ نے رقت زدہ لہجے میں فرمایا۔ ''کاش میں ترا غلام ہوتا اور تو میرا آقا۔ میں تجھ سے بہت شرمسار ہوں۔''

غلام نے آپ کو قدموں سے اٹھا کر، خدا سے دعا کی۔ ''اے اللہ، میرا راز فاش ہو چکا ہے اس لیے میں اب اس دنیا میں نہیں رہنا چاہتا۔ تو مجھے اٹھا لے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ آپ کی آغوش میں گر گیا اور جان دے دی۔ آپ نے اسے اسی ٹاٹ کے لباس میں دفن کر دیا۔ اسی

آپ نے کہا۔ ''عبادات اور مجاہدوں نے تیری صحت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، کیا اب بھی تو خدا کے راستے سے واقف نہیں ہوا؟''

پادری نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''عبداللہ! یہ حقیقت ہے کہ میں نے خدا کو اب تک نہیں پہچانا اور راستہ نہ پہچاننے کے باوجود اس سے خوفزدہ ہونے کا یہ عالم ہے کہ میں ہر دم سوکھتا چلا جا رہا ہوں اور تم عارف ہونے کے باوجود اس سے خوفزدہ نہیں نظر آتے۔''

پادری کی باتوں نے آپ کو اتنا خوفزدہ کر دیا کہ اس کے بعد کوئی دن بھی ایسا نہ آیا کہ آپ نے اللہ کا خوف نہ محسوس کیا ہو۔

اسی خوفزدگی کی حالت میں لوگ آپ سے ملے تو بڑا تغیر محسوس کیا۔ ملنے والے آپ کی پریشانی کا اصل سبب نہیں جانتے تھے۔ وہ طرح طرح سے دل جوئی اور دل داری کرتے رہے لیکن آپ کو کسی طرح سکون ہی نہ ملتا تھا۔ انہی لوگوں میں ایک آتش پرست بھی آپ کے پاس آیا۔ اس نے حاضرین سے کہا۔

''لوگو! میں نہیں جانتا کہ عبداللہ کیوں پریشان ہیں؟ لیکن میں ایک بات ضرور جانتا ہوں۔ تم میں سے جو لوگ اس پر پہلے ہی سے کاربند ہیں، انہیں اس پر توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن جو اس نکتے سے ناواقف یا لاعلم ہیں انہیں اس پر آج ہی سے عملدرآمد شروع کر دینا چاہیے۔''

آپ نے کہا۔ ''تو بولتا ہی رہے گا یا کچھ کہے گا بھی؟''

آتش پرست نے کہا۔ ''دانشور وہ ہے جو اول دن ہی وہ کام انجام دے جس کو نادان تیسرے دن انجام دیتے ہیں۔''

پھر حاضرین سے پوچھا۔ ''کیا تم لوگوں نے میری بات کا مفہوم پالیا؟''

آپ نے لوگوں سے کہا۔ ''لوگو! اس آتش پرست کے قول کو ہر وقت اور ہمیشہ یاد رکھنا۔ یہ بڑی عظیم نصیحت ہے اور اس نصیحت سے لاعلم رہ کر میں اپنے ماضی کا ماتم کر رہا ہوں۔''

اسی موقعے پر لوگوں نے آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! یہ تو بتائیے کون سی عادتیں سودمند ہو سکتی ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''عقل کامل سے متعلقہ عادتیں سودمند ہوتی ہیں۔''

کسی نے کہا۔ ''اگر کسی کے پاس عقل کامل نہ ہو تو؟''

آپ نے کہا۔ ''پھر تو اس کے پاس حسن ادب کا ہونا ضروری ہے۔''

کسی دوسرے نے کہا۔ ''اگر کوئی حسن ادب سے بھی محروم ہو تو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تب پھر اسے اتنا شفیق بن جانا چاہیے کہ لوگ اسے اپنا مخلص اور شفیق بھائی سمجھ کر مشورے کیا کریں۔''

کسی اور نے کہا۔ ''اگر یہ بھی ناممکن ہو تو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''پھر تو اسے سکوت اختیار کر لینا چاہیے کیونکہ سکوت بہت سے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے۔''

معترض نے کہا۔ ''اگر کوئی اس پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تب پھر ایسے شخص کے لیے مرگ ناگہاں بہت سودمند ہے تاکہ لوگ اور وہ خود اپنی نحوست سے چھٹکارا پا جائے۔''

اسی مجلس میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے سکوت اختیار کر رکھا تھا، ان میں سے کسی نے دریافت کیا۔

''حضرت! یہ تو فرمایئے کہ قلب کا معالجہ کس طرح کیا جائے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''لوگوں سے کنارہ کشی اور قرب الٰہی سے۔''

اس نے وضاحت چاہی۔ ''وہ کس طرح؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''لوگوں سے بچو اور کوشش یہ رہے کہ ان کی امداد و اعانت کے عادی نہ رہو۔ اللہ پر توکل رکھو۔''

کسی نے دریافت کیا۔ ''تواضع کا مفہوم کیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تواضع کا اصل مفہوم یہ ہے کہ تم امراء سے غرور کرو اور فقرا کے ساتھ عاجزی سے پیش آؤ۔'' پھر

ذرا سکوت اختیار کیا اور دوبارہ فرمایا۔ ''لوگو! جو لوگ دنیاوی مراتب میں تم سے برتر ہوں، ان کے ساتھ تم تکبر سے پیش آؤ اور جو تم سے کمتر ہوں ان کے ساتھ عاجزی اور انکساری سے پیش آؤ۔''

کسی نے پھر سوال کیا۔ ''کیا رجا سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہ درست ہے لیکن جس رجا میں خوف نہ شامل ہوگا وہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔''

ایک نے کہا۔ ''اور آپ کے نزدیک مراقبے کا کیا مطلب ہے؟''

آپ نے کہا۔ ''مراقبے دو ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری دوسرا باطنی۔ دونوں مراقبوں کا مطلب یہ ہے کہ قلب کا خوف دور ہو جائے اور اس کی جگہ سکون لے لے۔''

کسی نے اپنے کسی ساتھی کی شکایت کی۔ ''حضرت! میرا ایک دوست ہے وہ اکثر کسی نہ کسی کی غیبت کیا کرتا ہے آپ اس کے حق میں دعا فرمایئے کہ اس کی یہ عادت قبیحہ چھوٹ جائے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تو اپنے دوست سے کہہ دے کہ اگر اسے غیبت ہی کرنا ہے تو سب سے پہلے اپنے والدین کی غیبت کر، کیونکہ ان کے گناہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی اولاد کی نیکیاں ان کے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہیں۔''

اس دوران ایک شخص شرمسار و پشیمان آپ کے قریب پہنچا اور آہستہ سے کہا۔ ''حضرت! میں ایک ایسے گناہ کا مرتکب ہو گیا ہوں کہ ندامت کی وجہ سے آپ کے سامنے نہیں بیان کر سکتا۔''

آپ نے کہا۔ ''اگر تو سب کے سامنے کہتے ہوئے شرماتا ہے تو چپکے سے میرے کان میں کہہ دے۔''

اس نے کان میں کہا۔ ''حضرت! میں زنا کا ارتکاب کر بیٹھا ہوں۔''

آپ نے کہا۔ ''تو یہ ہے میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شاید تو نے غیبت کا گناہ کیا ہے کیونکہ زنا کا تعلق تو خدا کے گناہ سے ہے جو توبہ کے بعد معاف بھی ہو سکتا لیکن غیبت بندے کا گناہ ہے جس کو بندہ ہی معاف کرے تو کرے۔''

☆☆☆

آپ کہیں جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک سید کا گزر ہوا۔ یہ سید اپنے افعال کے اعتبار سے رسوائے زمانہ تھا۔ اس نے آپ کو دیکھا تو ذرا تمکنت سے کہا۔ ''میں سید ہوں اور اس اعتبار سے تجھ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوں۔''

آپ کو اس کا طرز تخاطب پسند نہیں آیا۔ آپ نے جواب دیا۔ ''بیشک تیرے جد اعلیٰ خاتم الانبیا ﷺ تھے۔ اور میرا باپ گمراہ مگر تیرے جد اعلیٰ نے جو ترکہ چھوڑا تھا اس کو میں نے حاصل کر لیا اور اس وجہ سے مجھے یہ مرتبہ حاصل ہو گیا اور میرے باپ کی گمراہی تو نے ترکے میں حاصل کر لی اس لیے تو رسوا ہو گیا۔''

سید چپ ہو کر ایک طرف چلا گیا۔

اس رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ آپ سے بہت ناراض ہیں۔ آپ نے وجہ دریافت کی۔

''یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا۔ ''اے عبداللہ! میں تجھ سے یہ پوچھتا ہوں کہ تو نے میری آل کے عیوب کی پردہ داری کیوں کی؟''

اسی وقت آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ پریشان اور خوفزدہ اس سید کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے۔ یہ ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ سید سے ملاقات ہو گئی۔ وہ خود بھی آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی لپٹ گیا اور روتے ہوئے بولا۔ ''اے عبداللہ! میں نے تم سے جو کچھ کہا اس پر شرمندہ ہوں، ابھی ذرا دیر پہلے میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ وہ مجھے ڈانٹ رہے تھے کہ اگر تیرے اعمال و افعال بہتر ہوتے تو عبداللہ تیری اہانت کیوں کرتا؟''

آپ نے اپنا خواب بیان کر دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر روتے رہے اور اپنے اپنے رویوں سے تائب ہو گئے۔

آپ کی خدمت میں ایک بدطینت حاضر ہوا اور گزارش کی۔ ''حضرت! مجھے کچھ دن اپنی صحبت میں رہنے کا شرف عطا فرمائیں تاکہ میں آپ کے فیضان روحانی سے نیک اور خدا رسیدہ بن جاؤں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میری صحبت اختیار کرنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا جب تک کہ تو خود بھی نیک بننے کا ارادہ

اور کوشش نہ کرے۔ یہ تیرا خیال خام ہے کہ میری صحبت تجھے نیک اور پارسا بنا دے گی۔"
اس شخص نے کہا۔ "اگر آپ کی صحبت مجھے نیک اور پارسا نہ بنا سکی تو پھر آپ کی بزرگی اور عظمت کا فائدہ؟"
آپ نے جواب دیا۔ "بھائی! میں تو ایک معمولی انسان ہوں۔"
لیکن وہ شخص نہیں مانا اور آپ کی صحبت میں رہنے لگا لیکن اس کا عالم یہ تھا کہ وہ آپ کی نہ تو باتیں سنتا تھا اور نہ آپ کے مشاغل میں دلچسپی لیتا تھا۔ کچھ عرصہ رہ کر جانے کی اجازت طلب کی، آپ نے کہا۔ "اس میں اجازت طلب کرنے کی کیا بات ہے، تو جا سکتا ہے۔"
اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن حضرت! یہ یاد رہے کہ میں جیسا آیا تھا ویسا ہی جا رہا ہوں، اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔"
آپ نے کہا۔ "اس میں افسوس کی کیا بات ہے۔ کوا اگر زندگی بھر بلبلوں کی صحبت میں رہے تو اس کی کائیں کائیں میں فرق نہ آئے گا۔"
جب وہ چلا گیا تو آپ نے لوگوں سے فرمایا۔ "صد حیف کہ وہ تو مجھ سے رخصت ہو گیا لیکن اس کی بری خصلتیں اس سے رخصت نہ ہو سکیں۔"
آپ کے ہم عصر ایک دوسرے بزرگ سہیل اکثر آپ کے پاس آتے رہتے تھے، لیکن ایک بار آئے تو واپس ہوتے وقت غیر متوقع شکایتاً عرض کیا۔ "عبداللہ افسوس کہ یہ ہم دونوں کی آخری ملاقات ہے، اب میں یہاں کبھی نہ آؤں گا۔"
آپ نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟ آپ کو یہاں کی کوئی بات ناگوار گزری؟"
سہیل نے آزردہ خاطری سے جواب دیا۔ "میں اس گھر کو فضل و برکت کا گھر سمجھ کر آتا رہا لیکن آج یہاں میرے ساتھ جیسا سلوک کیا گیا ہے اسے میں بیان کرتے ہوئے بھی شرما رہا ہوں۔"
آپ نے کہا۔ "سہیل! تمہیں جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔ آخر اس گھر میں وہ کون سی بات تمہیں ناگوار گزری ہے کہ تم یہاں آئندہ نہ آنے کی قسم کھا رہے ہو!"
سہیل نے کہا۔ "عبداللہ! آج خلاف معمول آپ کی چھت پر سے کنیزوں نے مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ وہ مجھے، سہیل یہاں آؤ میرے پاس آؤ سہیل، کہہ کر بلا رہی تھیں۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ میری زندگی بھر کا تقویٰ یوں ضائع جائے؟"
آپ نے اپنے ارادت مندوں سے کہا۔ "لوگو! اٹھو اور میرے ساتھ سہیل کی نماز جنازہ ادا کرو۔"
لوگوں نے حیرت سے سہیل کو اور سہیل نے حاضرین کو دیکھا لیکن اسی وقت سہیل گر گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے ایک بار پھر اپنے ارادت مندوں سے کہا۔ "کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آؤ میرے ساتھ سہیل کی نماز جنازہ ادا کرو۔ اب اٹھو، ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کر کے نماز جنازہ پڑھا دیں اور پھر دفن کر دیں۔"
لوگوں نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن آپ کو ان کی موت کا علم کیونکر ہو گیا تھا؟"
آپ نے جواب دیا۔ "سہیل نے کہا تھا کہ میری چھت پر سے کنیزیں پکار رہی تھیں حالانکہ تم لوگ خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے یہاں ایک بھی لونڈی نہیں اس لیے یقیناً وہ حوریں تھیں جو سہیل کو بلا رہی تھیں اس لیے مجھے یقین ہو گیا کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔"
آپ حج کرنے خانہ کعبہ تشریف لے گئے۔ بعد فراغت حج آپ بیت اللہ ہی میں سو گئے۔ آپ نے خواب میں دیکھا دو فرشتے باتوں میں مشغول ہیں۔ ایک فرشتے نے دوسرے سے پوچھا۔ "اس سال کتنے لوگ حج میں شریک ہوئے؟"
دوسرے نے جواب دیا۔ "چھ لاکھ انسانوں نے حج کیا ہے۔"
پہلے فرشتے نے پوچھا۔ "ان میں سے کتنوں کا حج قبول کیا گیا؟"
دوسرے نے جواب دیا۔ "دمشق کا ایک موچی حج میں شریک تو نہیں ہو سکا لیکن خدا نے اس کا حج قبول کر لیا اور اس کے طفیل میں دوسروں کا حج بھی قبول کر لیا گیا۔"
اس کے بعد آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ نے فوراً دمشق کا رخ کیا۔ آپ اس موچی کو دیکھنا چاہتے تھے جو حج کرنے تو نہیں

آسکا تھا لیکن اس کا حج قبول کرلیا گیا اور اس کے طفیل میں دوسروں کا حج بھی قبول کرلیا گیا۔ آپ نے دمشق میں اسے تلاش کرلیا اور اس سے دریافت کیا۔ ''تو حج پر کیوں نہیں جاسکا؟''

اس نے پوچھا۔ ''تمہارا نام؟ تم کہاں سے آئے ہو اور مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرا نام عبداللہ بن مبارک ہے۔''

وہ آپ کا نام سنتے ہی چیخ مار کر رو دیا۔ جب ذرا ہوش و حواس درست ہوئے تو کہا۔ ''عبداللہؒ! ایک عرصے سے میں حج کی خواہش میں جی رہا تھا اور میں نے اپنے موچی کے پیشے سے اس مقصد کے لیے تین سو درہم جمع کرلیے تھے اور جب میں حج کا سفر اختیار کرنے والا تھا۔ ایک دن میرے پڑوسی کے یہاں سے کھانا پکنے کی خوشبو آئی۔ یہ خوشبو اتنی اچھی لگی کہ میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ اپنے پڑوسی کے پاس جاؤ اور جو کچھ پک رہا ہے اس میں سے ذرا سا مانگ لاؤ۔ میں پڑوسی کے پاس پہنچا اور اس سے تھوڑا سا کھانا مانگا۔ اس نے جواب دیا، افسوس کہ وہ کھانا تیرے مطلب کا نہیں ہے ورنہ ضرور حاضر کردیتا۔ میں نے پوچھا'' وہ کیوں، میرے مطلب کا نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میرے اہل و عیال سات دن سے مسلسل فاقہ کشی کر رہے تھے۔ آج میں نے ایک گدھے کو مرا ہوا پڑا دیکھا، میں نے اس کو غنیمت جانا اور اس مردہ گدھے کو بہ مشکل گھر تک لے آیا اور اس کا گوشت پکا رہا ہوں تاکہ کسی طرح اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا جہنم بھر سکوں۔'' میں اس کی باتوں سے لرز گیا، اسی وقت گھر آیا اور حج کے لیے جمع کی ہوئی رقم اس شخص کے حوالے کردی اور یہ تصور کرلیا کہ ایک مسلمان کی امداد میرے حج کے برابر ہے۔''

آپ نے موچی کو اپنا خواب سنایا اور کہا۔ ''تیرے حج کی قبولیابی کی خوش خبری میں سن چکا ہوں اب تو بھی سن لے، واقعی اللہ تعالیٰ قضا و قدر کا مالک ہے۔''

آخری دنوں میں آپ نے لوگوں سے کہا۔ ''لوگو! مشائخ نے ادب کی بہت سی تعریفیں کی ہیں لیکن میرے نزدیک ادب، نفس شناسی کو کہتے ہیں۔'' مزید فرمایا۔ ''قرض حسنہ میں ایک درہم دینا، خیرات میں ہزار درہم دینے سے زیادہ موجب ثواب ہے۔ لوگو! جس نے ناجائز مال کا ایک حصہ بھی لیا وہ توکل سے محروم رہے گا، اور جانتے ہو توکل کسے کہتے ہیں؟ توکل وہ نہیں ہے جس کو تمہارا نفس سمجھتا ہے بلکہ وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ توکل سمجھے۔ اہل توکل کا اتنا پس انداز کرلینا کہ بیماری اور موت میں کام آجائے معیوب نہیں ہے۔''

لوگوں نے پوچھا۔ ''اگر ہم جہاد کے ثواب سے محروم رہیں تو اس کے بدلے میں ہمیں کون سا عمل اختیار کرنا چاہیے؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''اگر تم اپنے بال بچوں کی پرورش کے ساتھ علم دین بھی سکھلاؤ تو اس کا اجر جہاد سے فزوں تر ہے۔''

وصال سے پہلے آپؒ نے اپنا سارا اثاثہ فقراء میں تقسیم کردیا۔ کسی ارادت مند کو اس پر اعتراض ہوا، اس نے کہا۔ ''حضرت! آپؒ کی تین صاحبزادیاں ہیں آپ نے ان کے لیے کیا چھوڑا؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''میں نے ان کے لیے خدا چھوڑا ہے، کیونکہ جس کا کفیل اللہ ہو اس کو عبداللہؒ کی کیا حاجت؟''

موت سے تھوڑی دیر پہلے آپؒ نے آنکھیں کھولیں اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''عمل کرنے والوں کو ایسے ہی عمل کرنا چاہیے۔'' اس کے بعد آپؒ کا انتقال ہوگیا۔

آپؒ کو، اس عہد کے مشہور صوفی بزرگ فضیل بن عیاض اور سفیان ثوری نہایت ادب و احترام سے دیکھتے تھے۔ ایک بار آپ کو آتے دیکھ کر سفیان ثوری نے کہا تھا۔ ''دیکھو مرد مشرق آ رہا ہے!''

فضیل بن عیاض نے کہا۔ ''مرد مشرق ہی نہیں مرد مغرب بھی اور مشرق و مغرب کے درمیان جو کچھ ہے وہ بھی۔'' بعد میں عظیم مشائخ نے متفقہ طور پر یہ کہا کہ جس کی تعریف میں فضیل بن عیاض اور سفیان ثوری جیسے بزرگوں نے اہم جذبات کا اظہار کیا ہو، اس کے اوصاف کوئی اور کیا بیان کرسکتا ہے۔

ماخذات: تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔ الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ روضۃ الریاحین، ابی محمد عبداللہ بن اسعد یمنی۔ خزینۃ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری۔ افائین الیا سمین، مترجمہ مولانا جعفر علی نگینوی۔ اخبار الاخیار، عبدالحق محدث دہلوی

اللہ کے برگزیدہ بندے ہر دور کی ضرورت رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جہالت کی تاریکی تہہ در تہہ بڑھتی جاتی مگر ان کے نور سے پھیلنے والے اجالے نے دنیا کے اندھیروں کو دور کرنے کا سلسلہ جاری رکھا جو اگر رک جاتا تو آج اچھے برے کی تمیز اور نیک انسانوں کا سراغ تک نہ ملتا۔.۔ یہ بھی ایک تاریک دور میں پیدا ہونے والے معصوم ولی کی داستان ہے جن کے ذمہ اپنے والد کے ادھورے مقصد کی تکمیل تھی۔ بالآخر انہوں نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔

ولادت سے قبل ہی ولایت کی سعادت پانے والی شخصیت کا ماجرا

معصوم ولی

ضیا تسنیم بلگرامی



حضرت مجدد الف ثانیؒ جو مقصد لے کر آئے تھے اور جن امور کا احیا اور قیام چاہتے تھے، ایک زمانہ ان کا مخالف تھا اور ان مخالفوں میں بادشاہ سرفہرست تھا۔ یہ اکبر اعظم کا عہد تھا۔ اکبر رخصت ہوا تو اس کے بیٹے جہانگیر کا دور شروع ہوا اور اس نے اپنے باپ سے ورثے میں جو کچھ پایا، اس پر سعادتمند بیٹے کی طرح عمل پیرا ہوا۔ مجدد الف ثانیؒ کو اپنے رب کی طرف سے القا ہوا کہ وہ سرکش اور گمراہ حکمران کے سر مغرور اور فرق کبر کی کجی کو دور فرما دیں۔ آپؒ مشیت ایزدی کی چٹان بن کر دبدبۂ شاہی اور کر و فر مطلق العنانی پر گرے اور کجی دور فرما دی۔ آپؒ نے بادشاہ کی اصلاح کی اور پھر عامیوں کی اصلاح شروع

کردی۔ اپنی پوری جدوجہد اور مساعی جلیلہ میں انہیں یہ احساس پریشان کرتا رہا کہ اپنی چند روزہ زندگی میں وہ پہاڑ جیسا کام کس طرح انجام دیں گے۔ انہیں اتنی ہی زندگی اور درکار تھی جتنی وہ اپنے رب سے لے کر آئے تھے۔ وہ اکثر ملول ہو جاتے اور اللہ سے کہتے۔

"الٰہ العالمین! کام زیادہ اور طویل المیعاد ہے اور زندگی تھوڑی، میں زندگی سے محبت نہیں کرتا لیکن پھر بھی زیادہ عمر کا طلب گار ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی کو بڑے کاموں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ مجھے اتنی زندگی مزید دے دے کہ میں بقیہ کام کو خوش اسلوبی اور مستقل مزاجی سے انجام دے سکوں۔"

ان دنوں گھر میں ولادت کے لمحوں کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ مجدد الف ثانیؒ کی بیوی اپنے ننھے مہمان کی منتظر تھیں۔ آپؒ شاہی لشکر سے نکل کر اپنے گھر تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں بھی تبلیغ و تلقین سے غافل نہیں تھے اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ تبلیغ و تلقین کا فریضہ ہر جگہ ادا کیا جا سکتا ہے۔ آپؒ نے مغرب کی نماز پڑھی اور خشوع و خضوع سے اپنے مصلے پر بیٹھے رہے۔ ذکر زیر لب جاری تھا۔ اچانک آپؒ پر نیند نے غلبہ کیا اور آپؒ کی دونوں آنکھیں بند ہو گئیں۔ آپؒ نے دیکھا مشرق سے مغرب تک نور ہی نور پھیلا ہوا ہے۔ اس نور میں آپؒ نے رسول مقبول ﷺ کو دیکھا۔ آپ کی زبان نے درود شریف کا ورد شروع کر دیا۔

اچانک رسول مقبول ﷺ نے آپ کو مخاطب کیا۔ "شیخ احمد!"

آپ نے جوش عقیدت میں جواب دیا۔ "یارسول اللہ ﷺ! میری جان و مال اور جو کچھ بھی میرا ہے، آپ پر قربان، ارشاد۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ عنقریب تیرے گھر میں بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کا نام محمد معصوم رکھنا۔ کیونکہ یہ تمام عمر معصوم ہی رہے گا۔"

اس کے بعد مجدد الف ثانیؒ کی آنکھ کھل گئی۔ آپؒ درود شریف پڑھتے ہوئے بیوی کے پاس پہنچے، بیوی پر غنودگی طاری تھی۔ آپؒ کچھ دیر سامنے کھڑے رہے۔ ذرا دیر بعد بیوی کی آنکھ کھل گئی اور اپنے سامنے شوہر کو کھڑے دیکھ کر شپٹا گئیں، جھجکتی ہوئی بولیں۔

"آپ کب تشریف لائے؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "ذرا دیر پہلے، کیوں خیریت تو ہے؟"

بیوی نے رک رک کر کہا۔ "اس وقت میں نے ایک اچھا خواب دیکھا اور خواب کیوں کہوں، میں اسے رؤیائے صادقہ کہوں گی۔"

آپؒ نے پوچھا۔ "تم نے خواب میں کیا دیکھا؟"

بیوی نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ "کیا عرض کروں؟"

آپؒ نے اصرار کیا۔ "بتاتی کیوں نہیں؟ کیا میں بتادوں کہ تم نے خواب میں کیا دیکھا؟"

بیوی نے حیرت سے آپؒ کو دیکھا، پوچھا۔ "کیا آپ میرے خواب سے واقف ہیں؟"

آپؒ نے فرمایا۔ "ہاں، بحمد للہ، تم نے خواب میں دیکھا کہ مشرق سے مغرب تک نور ہی نور پھیلا ہوا ہے پھر اس نور میں تم نے رسول مقبول ﷺ کو دیکھا۔ آپؐ فرما رہے تھے کہ اس گھر میں جو لڑکا پیدا ہوگا اس کا نام محمد معصوم رکھنا کیونکہ وہ عمر بھر معصوم رہے گا۔"

بیوی کے فرط خوشی سے آنسو آ گئے۔ بے اختیار کہا۔ "واللہ آپ درست فرما رہے ہیں۔ میں نے خواب میں یہی کچھ دیکھا ہے جو آپ نے فرما رہے ہیں۔"

آپؒ نے جواب دیا۔ "بہرحال مبارک ہو، میں چند دن پہلے ذرا پریشان تھا اور یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ میں جو کام احیائے دین اور اصلاح ملت کے لیے انجام دے رہا ہوں، اس کو میرے بعد کون جاری رکھے گا لیکن اس خواب میں رسول اللہ ﷺ کی بشارت نے مجھ کو مطمئن کر دیا۔ میرا یہ بیٹا جو آنے والا ہے، میرے کام کو آگے بڑھائے گا اور اللہ نے چاہا تو قیوم ثانی ثابت ہوگا۔"

چنانچہ شوال 1007ھ کی 11 تاریخ کو اس گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا، والدین نے اس کا نام محمد معصوم رکھ دیا۔ چند دنوں کے بعد ہی سب کو یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ لڑکا غیر معمولی ہے۔ یہ بچہ رونا نہیں جانتا تھا، ہفتوں کے تجربے کے بعد یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بچے کے کپڑے بول و براز سے محفوظ رہتے ہیں۔ بچے کو برہنگی سے نفرت ہے اور حجاب کا یہ عالم ہے کہ اگر جسم سے کپڑا سرک جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی بچہ بھی سکڑ جاتا تھا اور جب تک اچھی طرح ستر پوشی نہ ہو جاتی بچہ پریشان اور سکڑا رہتا۔ بچہ دودھ پینے میں بے چینی یا بے صبرے پن کا ذرا بھی اظہار نہ کرتا اور اس وقت دودھ پیتا جب اسے دودھ پلایا جاتا۔

مجدد الف ثانیؒ اپنے بیٹے محمد معصوم پر بڑی توجہ دینے لگے، پیدائش کے بعد پہلی بار رمضان کا چاند دیکھا جا رہا تھا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ چاند نظر آ جائے لیکن وہ نہیں نظر آیا۔ ناکامی نے اضطراب میں اضافہ کر دیا۔ ان سب کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ "کیا کل کا روزہ ہو جائے گا؟"

ان لوگوں کا ایک وفد مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں پہنچ گیا اور پوچھا۔ "حضرت! کچھ ارشاد فرمائیے۔ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ فضا ابر آلود ہے اس لیے چاند نظر نہیں آئے گا پھر ہمیں یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ کل روزہ ہے یا نہیں؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "اگر میں اس بے چینی کا علاج کر دوں تو؟"

لوگوں نے کہا۔ "پھر یہ کہ ہم سب آپ کے بندۂ بے دام ہو جائیں گے۔"

آپؒ نے جواب دیا۔ "آپ لوگ کل صبح روزہ رکھیں۔ میرے گھر میں جس ذات نے ظہور کیا ہے وہ معصوم ہے اور زندگی بھر معصوم رہے گا۔ کل صبح یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے دودھ پیا یا نہیں۔ چنانچہ اگر وہ دودھ پئے گا تو کل روزہ نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ دودھ نہیں پئے گا تو روزہ ہوگا۔"

لوگوں نے آپؒ کے فیصلے پر عمل کیا اور آپ کی ہدایت کے بموجب دوسرے دن روزہ رکھ لیا۔ مجدد الف ثانیؒ گھر میں اپنے بیٹے کی نگرانی فرماتے رہے چنانچہ نصف دن کی نگرانی نے یہ ثابت کر دیا کہ رمضان کا چاند ہو چکا ہے اور اس دن روزہ ہے۔ لوگوں نے روزے کی نیت پہلے ہی سے باندھ رکھی تھی جو برقرار رہی اور اللہ کے اس معصوم بندے نے لوگوں کو ایک روزے کے زیاں سے بچا لیا۔

☆☆☆

خواجہ معصوم نے تعلیم کی تحصیل کا آغاز کیا تو ان کے سامنے لائق فائق باپ تھا۔ مجدد الف ثانیؒ نے انہیں پڑھانا شروع کر دیا۔ ابھی آپ کی عمر صرف تین سال تھی کہ جوہر ذاتی وصفاتی کا ظہور ہونے لگا۔ چنانچہ اپنے بیٹے کے علو استعداد کو محسوس کر کے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے ایک خط میں یوں ذکر کیا۔

"اپنے فرزند محمد معصوم کے بارے میں کیا لکھوں، وہ خود اس دولت یعنی ولایت خاصۂ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کی استعداد رکھتے ہیں۔ یہ اس کی علو استعداد کا تقاضا تھا کہ تین سال کی عمر ہی میں اس نے جامعیت استعداد و حقیقت جگی ذاتی اور توحید میں لب کشائی کی اور کہنے لگا۔ میں آسمان ہوں، میں زمین ہوں، میں فلاں ہوں اور فلاں ہوں۔"

چوں زلیخا کز سپند آں تا بعود
نام جملہ چیز یوسف کردہ بود
(جیسا کہ زلیخا نے ہر چھوٹی بڑی چیز کا نام یوسف کر دیا تھا)

خواجہ معصوم نے سات سال تین ماہ میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ آپ کے آس پاس معتقدین میں معترضین بھی شامل تھے۔ وہ کبھی کبھی شک وشبے سے سوچتے رہتے کہ جب خواجہ معصوم پیدائشی ولی اور علو استعداد کے حامل ہیں تو یہ انہیں تحصیل علوم میں لگا دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ شک اور یہ اعتراض مجدد الف ثانیؒ کے باطن پر القا ہوا اور آپ نے انہیں جواب دیا۔ "علم میراث حال ہے اس لیے اس کو حاصل کیے بغیر چارہ نہیں۔" اس کے بعد خواجہ معصوم سے فرمایا۔ "بیٹے! ان علوم کی تحصیل سے جلد از جلد فارغ ہو جاؤ ہم کو تم سے بڑے بڑے کام لینا ہیں۔"

خواجہ معصوم نے سات سال کی عمر اور تین ماہ کی مدت میں قرآن حفظ کیا اور گیارہ سال کی عمر میں دوسرے علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ 27 ذی الحجہ 1021ھ کو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے خواجہ معصوم کی شادی اپنے ایک مرید اور خلیفہ میر صغیر احمد رومی کی صاحبزادی بی بی رقیہ سے کر دی۔

خواجہ معصوم تحصیل علوم سے فارغ ہونے کے بعد ہر وقت غور وفکر میں لگے رہتے۔ عبادت میں انہماک ایسا تھا کہ لوگ آپ کی بڑائی کے دل سے قائل ہونے لگے۔ اب خواجہ معصوم پر اسرار منکشف ہونے لگے تھے۔ وہ ذرے ذرے میں وہ کچھ دیکھنے لگے تھے جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ایک دن فجر کی نماز پڑھ کر باہر جو نکلے تو انہیں آسمان سے زمین تک نور ہی نور دکھائی دیا۔ خواجہ معصوم نے اس نور کے منبع کا پتا چلانا چاہا تو بڑی مایوسی ہوئی۔ کیونکہ یہ ہر چیز میں اس طرح پیوست تھا کہ یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ نور نے اشیا میں سرایت کیا ہے یا ان چیزوں سے خارج ہو رہا ہے؟ انہوں نے یہی نور انسانوں اور حیوانوں کے چہروں اور جسموں سے خارج ہوتے

دیکھا اور اسی کو درختوں اور ان کے پتوں میں سرایت کرتے دیکھا۔ انہیں یہ نور پتے پتے اور ذرے ذرے میں سرایت کیے ہوئے دکھائی دیا۔ اس منظر اور مشاہدے نے خواجہ معصوم کو حیران و پریشان کر دیا۔ آپ اپنے والد کے پاس پہنچے اور رک رک کر عرض کیا۔

''باوا جان! آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ خدا کے لیے بتایئے کہ آج کل میں کیا دیکھ رہا ہوں اور اس کا انجام کیا ہوگا۔''
باپ نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ''بیٹے! تو اپنے وقت کا قطب ہے، یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ تو میرا بیٹا ہے بلکہ اس لیے کہ مجھے ایسا بتایا گیا ہے اور واقعات اور مشاہدات اس کی گواہی دے رہے ہیں۔''

مجدد الف ثانیؒ کے مرید اور ارادت مند برابر یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ آپ اپنے بیٹے خواجہ معصوم کی بے حد عزت کرتے ہیں اور دونوں میں باپ بیٹے کا ادب و لحاظ نہیں پایا جاتا۔ اس دوران ایک دن یہ منظر بھی دیکھنے میں آ گیا کہ حجرے کے باہر خواجہ معصوم سو گئے۔ اس بستر پر مجدد الف ثانیؒ استراحت فرمایا کرتے تھے۔ وہ اندر ذکر و شغل میں مصروف تھے کچھ دیر بعد مجدد الف ثانیؒ کو آرام کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ حجرے سے باہر آ گئے۔ وہ اپنے بستر کے پاس جا کر ٹھٹکے اور وہاں اپنے بیٹے خواجہ معصوم کو محو استراحت پا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی اور یہ اندازہ لگا کر کہ وہ گہری نیند میں ہیں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ آپ کے چند مرید یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! کیا میں انہیں بیدار کر دوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ خود بیدار ہو جائیں گے۔''
مرید نے مایوسی سے عرض کیا۔ ''حضرت! آثار تو یہ نہیں کہتے۔ شاید یہ ابھی تو نہیں جاگیں گے۔''
آپ نے حجرے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''شاید تم سچ کہہ رہے ہو۔ اگر یہ ابھی نہیں جاگیں گے تو میں بھی یہاں کیوں کھڑا رہوں۔ میں اپنے حجرے میں واپس جا رہا ہوں۔ پھر آ جاؤں گا۔''
مرید نے سکوت اختیار کیا اور آپ حجرے میں واپس چلے گئے۔ کافی دیر بعد آپ حجرے سے برآمد ہوئے اور اپنے بستر کی طرف بڑھے۔ لیکن یہاں خواجہ معصوم ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ اسی مرید نے آپ کے پاس جا کر عرض کیا۔
''حضرت! خواجہ معصوم تو ابھی تک بیدار نہیں ہوئے اور آپ ہمیں بے حد اداس اس اور فکر مند دکھائی دے رہے ہیں۔ ہم آپ کی یہ اداسی دور کر سکتے ہیں اگر آپ اجازت دیں تو ہم خواجہ معصوم کو جگا دیں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں۔ وہ خود بیدار ہو جائیں گے۔''
آپ کچھ دیر بیٹھ کر اپنے حجرے میں واپس چلے گئے۔
آخر کچھ دیر بعد تشریف لائے اور خواجہ معصوم کو بہ دستور سویا دیکھ کر مسکرا دیے، مرید نے ایک بار پھر جسارت کی اور عرض کیا۔ ''حضرت! اب تو میں جگائے بغیر نہیں رہوں گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''نہیں۔ اللہ کا ایک دوست سو رہا ہے، اس میں تمہیں مخل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''
اس بار مجدد الف ثانیؒ واپس نہیں گئے، وہیں دھوپ میں بیٹھ گئے۔ دھوپ کی تمازت نے فرش کو آگ کی طرح تپا دیا تھا۔ آپ کے مرید حیران تھے کہ ایک بزرگ باپ اپنے بیٹے کی اتنی عزت کیوں کر رہا ہے؟ آپ کشف سے ان کی کشمکش اور الجھن کو معلوم کر چکے تھے، فرمایا۔
''لوگو! جیسا کہ میں کچھ دیر پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ خدا کا دوست ہے اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں خدا کے دوست... کو تکلیف پہنچاؤں...... خواجہ معصوم کا جو مرتبہ ہے اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ لیکن وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہیں جب لوگ میری ان باتوں کی تصدیق کریں گے۔''
انہی باتوں کے درمیان خواجہ معصوم کی آنکھ کھل گئی اور اپنے باپ کو دھوپ میں بیٹھا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ فوراً اٹھے اور باپ کی طرف بڑھے مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا۔ ''معصوم! کیا بات ہے؟ تم پریشان کیوں ہو رہے ہو؟''
بیٹے نے خجالت سے جواب دیا۔ ''باوا جان! آپ نے مجھے بیدار کیوں نہیں کر دیا؟''
باپ نے کہا۔ ''میں اس لیے نہیں جگا سکا کہ کہیں اللہ تعالیٰ میرے اس فعل سے ناخوش نہ ہو جائے کیونکہ مجھے بار بار یہ بتایا گیا ہے کہ معصوم میرا دوست ہے، میں اللہ کے دوست کو جگانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔''
خواجہ معصوم نے پشیمانی سے کہا۔ ''باوا جان! آپ مجھ کو برابر شرمندہ کیے جا رہے ہیں۔ آپ ایسا نہ کیجیے۔''

باپ نے جواب دیا۔ ''میں تجھ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔''
بیٹے نے بستر خالی کر دیا اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کچھ دیر کے لیے بستر پر لیٹ گئے۔

☆☆☆

نصف رات گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ برابر کے حجرے میں خواجہ معصوم اپنے اللہ سے لو لگائے مصروف عبادت تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ دنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنے رب کے ذکر اور فکر میں گم تھے، آپ کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حجرے کے باہر کیا ہو رہا ہے۔

کچھ دیر بعد حضرت مجدد الف ثانیؒ دنیا سے اتنے غائب ہو گئے کہ جو لوگ ان کے اس پاس تہجد پڑھ رہے تھے۔ آپ انہیں دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ آپ کو اپنے چاروں طرف ایک نور سا پھیلاؤ دکھائی دے رہا تھا۔ آپ کو اس نور نے اپنے احاطے میں لے لیا اور آپ خود کو ہلکا اور لطیف سا محسوس فرمانے لگے۔ پھر آپ کو یوں محسوس ہوا گویا آپ کے جسم سے لباس اتارا جا رہا ہے۔ آپ کو خوف محسوس ہوا اور دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اے کاش میرے جسم سے لباس نہ اتارا جائے لیکن یہ لباس اتار لیا گیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ایک دوسرا لباس پہنایا جانے لگا۔ یہ لباس پہلے لباس سے کسی طرح کم نہ تھا اور آپ کو اس نئے لباس میں اپنا قد کچھ زیادہ بڑا محسوس ہونے لگا۔ آپ نے نور کے ہالے میں اپنے اترے ہوئے۔ لباس کو دیکھنے کی کوشش کی وہ سامنے ہی رکھا ہوا تھا۔ آپ کو اپنے اترے ہوئے لباس سے انس و محبت باقی تھی اور یہی جی چاہتا تھا کہ یہ لباس بھی انہی کے پاس رہے۔

آپ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ آہستہ سے کہا۔ ''اے الہٰ العالمین یہ اترا ہوا لباس کیا مجھے نہیں مل سکتا؟''

یکا یک جواب ارشاد ہوا۔ ''کیوں نہیں؟ لیکن ایک جسم پر دو لباس زیب نہیں دیتے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''درست میرے رب! بجا ارشاد۔ اگر میرے جسم پر دو لباس مناسب نہیں رہیں گے تو کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ میرا یہ لباس میرے بیٹے معصوم کو مرحمت فرما دیا جائے۔''

جواب ملا۔ ''ایسا ممکن ہے اور نہ صرف ممکن بلکہ یہ لباس تیرے بیٹے معصوم ہی کے لیے اتارا گیا ہے۔ یہ لباس کیا ہے؟ یہ کس قسم کا لباس ہے؟ کچھ پتا ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''ہر بات کا علم صرف تجھے حاصل ہے میں ضعیف انسان، میں کوئی دعویٰ کس طرح کر سکتا ہوں۔''

جواب ملا۔ ''شیخ احمد! تیرا یہ لباس تیرے جسم سے اس لیے اتارا گیا ہے کہ اس کو معصوم کے جسم پر ڈال دیا جائے، یہ لباس کیا ہے؟ کچھ معلوم ہے؟ یہ منصب قیومیت ہے اور اس کا تعلق تربیت و تکمیل سے ہے۔''

مجدد الف ثانیؒ کو اس خوش خبری نے بے حد خوش کر دیا اور آپ کے دل سے یہ تشویش دور ہو گئی کہ ان کے بعد ان کے کام کو جاری کون رکھے گا؟

1034ھ میں مجدد الف ثانیؒ کا وصال ہو گیا اور یکم ربیع الاول 1034ھ کو آپ نے ارشاد و قیومیت کی مسند سنبھالی۔ اس روز تقریباً پچاس ہزار افراد نے آپ سے بیعت کی اور ان میں دو ہزار وہ بزرگ بھی شامل تھے جنہیں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلفاء ہونے کا شرف حاصل تھا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وصال کی خبر شہنشاہ جہانگیر کو پہنچی تو وہ تعزیت کے لیے سرہند پہنچا اور خواجہ معصوم سے تعزیت کی۔

شاہجہاں ابھی بادشاہ نہیں بنا تھا کہ خواجہ معصوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت ہونے کی خواہش کی۔ آپ نے اسے بیعت کیا اور دنیا اور آخرت میں کامیابی اور سرخ روئی کی دعا دی۔ شاہجہاں کو خدشات تھے کہ محلاتی سازشیں اور امراء کی رقابتیں کہیں جہانگیر کو اس کی طرف سے بدظن نہ کر دیں اور باپ اس کی جگہ کسی اور کو نامزد کر دے۔ آپ نے شہزادہ خرم (شاہ جہاں) کو دعا دی اور خوش خبری سنائی کہ محلاتی سازشیں ضرور ہوں گی اور امراء کی مخالفتیں اور رقابتیں بھی جاری رہیں گی لیکن حکومت ہر حال میں اسی کو ملے گی۔

شاہجہاں خوش خوش اور مطمئن ہو کر واپس چلا گیا۔

1037ھ بروز اتوار، 27 صفر بوقت صبح (نومبر 1627ء) کو جہانگیر کا انتقال ہو گیا اور نور جہاں نے اپنے داماد شہر یار کو برسر اقتدار لانے کی سر توڑ کوشش کر ڈالی مگر شاہجہاں کے مقابلے میں ناکام رہی۔ آخر شاہ جہاں کامیاب ہوا اور شہاب الدین شاہجہاں کے نام سے مغل تاج و تخت کا مالک بنا۔ اس نے نظم و نسق پر قابو پاتے ہی خواجہ معصوم سے ملاقات کا اہتمام کیا اور نہایت ادب و احترام سے آپ کی خدمت میں حاضری دی۔ نئے بادشاہ نے آپ کے دونوں ہاتھوں کو مصافحے کے

بعد اپنے سینے پر رکھ لیا اور رقت زدہ لہجے میں درخواست کی۔
''مجھے آئندہ بھی آپ کی دست گیری درکار رہے گی، اس لیے کبھی چھوڑ نہ دیجیے گا۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''شاہجہاں! میں تیرے حق میں دعا گو رہوں گا۔ لیکن تجھ کو بھی میرے کہنے پر عمل کرنا ہوگا۔''
بادشاہ نے عرض کیا۔ ''بسر و چشم، میں ہر طرح حاضر ہوں۔ آپ ارشاد فرمایئے، بلکہ حکم دیجیے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''خوب جانتا ہے کہ میرے والد بزرگوار سے تیرے مرحوم باپ کا ایک عرصہ تک اختلاف رہا ہے اور دونوں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ بعد میں تیرے باپ نے میرے والد مرحوم کی بہت ساری باتیں مان لیں۔ لیکن کچھ باتیں ایسی باقی رہ گئی تھیں جو نہیں مانی گئی تھیں۔ میرے والد اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے اور ان کی جگہ میں نے سنبھال لی ہے اس لیے میرا فرض ہے کہ میں اپنے والد مرحوم کے منصوبے کے بقیہ حصوں پر کام کروں اور انہیں ایک ایک کر کے پورا کروں۔''
شاہجہاں نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''حضور روشن ضمیر ہیں جو فرمائیں گے، اسے پورا کر دیا جائے گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''عرصہ سے مسجدیں نہیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب مساجد کی تعمیر شروع ہو جانا چاہیے۔''
شاہجہاں نے جواب دیا۔ ''آپ کے حکم پر آج ہی عمل درآمد شروع ہو جائے گا اور فرمایئے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''مساجد کے ساتھ مدرسوں کا قیام بہت ضروری ہے۔''
شاہجہاں نے جواب دیا۔ ''اس پر بھی عمل ہو جائے گا اور کچھ؟''
آپ نے فرمایا ''سکے پر کلمہ طیبہ کی مہر ہونی چاہیے۔''
بادشاہ نے کہا۔ ''اس پر بھی کل ہی سے عمل شروع ہو جائے گا۔''
آپ نے مزید فرمایا۔ ''علماء کے وظائف مقرر کیے جائیں کیونکہ یہ لوگ جتنے اہم ہوتے ہیں ان پر اتنی توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا کوئی مستقل علاج ہونا چاہیے۔''
بادشاہ نے خندہ پیشانی سے عرض کیا۔ ''حضرت! میں نے آپ کو زبان دی ہے۔ ایک بادشاہ نے زبان دی ہے۔ آپ جو کچھ بھی چاہتے ہیں اس پر آپ کی مرضی اور خواہش کے مطابق عمل ہوگا۔ میں آپ کو یقین جو دلا رہا ہوں کہ میں اپنے والد مرحوم کے عہد کی بدعتوں کو دور کر دوں گا۔''
آپ نے شاہ جہاں کے حق میں دعا کی اور بادشاہ دعائیں لے کر اپنے محل میں واپس چلا گیا۔
آپ تبلیغ و تلقین کا کام اپنے بزرگ باپ کی طرح انجام دے رہے تھے۔ ہر طرف آپ ہی کا شہرہ تھا۔ اس دوران آپ کی والدہ بھی رحلت فرما گئیں۔ آپ پر اس سانحے کا گہرا اثر ہوا۔ یہاں تک کہ آپ نے کئی دن تک کسی سے ملاقات تک نہیں کی، آپ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں مگر روتی آنکھوں سے دل کہیں زیادہ غمگین تھا۔ اس پر غم کا پہاڑ گر پڑا تھا اور یہ آپ ہی کی ہمت تھی کہ اس کو برداشت کر گئے تھے۔
جب دل کے زخم پر وقت نے مرہم رکھ دیا اور گھاؤ مندمل ہونے لگا تو آپ ایک بار پھر تندہی سے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی شہرت اور بزرگی کا نقش برصغیر کے ہر دل پر بیٹھ چکا تھا۔ ملک کے گوشوں سے آپ کی خدمت میں حاضری دینے والوں کا تانتا بندھا رہتا اور آپ ان سب کے مضطرب دلوں کو سکون اور طمانیت سے بھر دیتے۔ ان آنے والوں میں ایک دن ایک مغل شہزادہ بھی شامل ہو گیا۔ اس نے خاموشی سے سرہند کا سفر کیا اور راستے کی صعوبتیں جھیلتا ہوا آپ کے دروازے پر دستک دی، خادموں نے آپ کو مطلع کیا۔
''حضرت! شہزادہ محی الدین باریابی کا خواستگار ہے۔''
آپ کے چہرے پر خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ پوچھا۔ ''شہزادہ محی الدین شاہ جہاں کا بیٹا اور جہانگیر کا پوتا محی الدین یعنی دین کو زندہ کرنے والا! بلاؤ۔ اس کو فوراً بلاؤ، ابھی اسی وقت، یہ تو بڑے کام کا نظر آتا ہے۔''
ایک خادم نے شہزادے کو خوش خبری سنائی۔ ''شہزادے معلوم نہیں کیوں حضرت آپ سے بے خوش نظر آتے ہیں۔ آپ کو فوراً ہی یاد فرمایا ہے۔''
شہزادہ چپ چاپ اندر داخل ہوا اور السلام علیکم کہہ کر اپنی آمد کی اطلاع دی۔
آپ نے شہزادے کو بہت غور سے دیکھا اور چہرے پر دیر تک نظریں جمائے رہے پھر فرمایا۔ ''محی الدین! میں تیری

پیشانی میں ایک ایسی چمک دیکھ رہا ہوں جو کم ہی کسی کی پیشانی میں دیکھی گئی ہے۔"

شہزادے نے کہا۔ "قبلہ میں تو آپ کی خدمت میں بیعت اور دعاؤں کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔ اگر آپ واقعی ولی ہیں تو آپ کشف کی مدد سے یہ بتادیں کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا ہوں؟"

آپ نے بھی آنکھیں بند کرلیں اور کچھ دیر یوں ہی چپ بیٹھے رہے پھر فرمایا۔ "غیب کا علم صرف خدا کو ہے، ہم لوگ تو صرف اندازے اور قیاس سے دوسروں کا حال بتاتے رہے ہیں یا پھر وہاں لب وا کیے ہیں جہاں ہونٹوں کو حرکت دینے کی اجازت دے دی گئی ہے۔"

شہزادے نے عاجزی سے کہا۔ "حضرت! میں کیا کرسکتا ہوں، میں تو محض آپ کی مدد اور تائید کے بل بوتے پر قدم اٹھا سکتا ہوں ورنہ میری کیا مجال کہ آپ کے روبرو یوں گستاخی سے بات کروں۔"

آپ نے شہزادے کو روک لیا اور فرمایا۔ "کیا بات ہے شہزادے، تم چپ کیوں ہوگئے۔ کہو کہو، آگے کہو۔"

شہزادے نے رک رک کر کہا۔ "حضرت! میں حکومت نہیں چاہتا لیکن میں ملک میں دین کا احیا ضرور چاہتا ہوں۔"

آپ نے آہستہ سے فرمایا۔ "سبحان اللہ! اللہ تیری عمر اور دولت واقبال میں برکت دے۔"

شہزادہ اپنی کہتا رہا۔ "اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ مغل تاج وتخت کسی ایسے شخص کے ہاتھوں میں نہ چلا جائے جو علم تو بہت زیادہ رکھتا ہو لیکن اسلام کی صحبت اور محبت سے محروم ہو۔ اگر کسی ایسے شخص کے ہاتھوں میں مغل حکومت چلی گئی تو اس ملک کا اور اس ملک میں اسلام کا کیا بنے گا؟"

آپ نے مسکرا کر بڑی محبت سے فرمایا۔ "جس ملک میں.... محی الدین موجود ہو وہاں اسلام اور تاج وتخت کو کوئی خطرہ نہیں۔ تو تیار رہ اس دن کے لیے جب مشیت ایزدی تیرے کاندھوں پر اہم ترین بوجھ ڈال دے۔"

شہزادہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے خلا میں گھور رہا تھا۔ آہستہ سے پوچھا۔ "کیا آپ مجھ کو تاج وتخت کی بشارت دے رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، تاج وتخت کی بشارت بھی اور دین کی سرداری کی نوید بھی۔ خدا کو تجھ سے کئی کام لینا ہیں۔ جا وقت کا انتظار کر اور چوکس اور مستعد رہ، معلوم نہیں کب اور کس وقت دین اور دنیا دونوں ہی تیرے دروازے پر دستک دیں اور تو ان کی دستک نہ سن سکے۔"

شہزادے نے پوچھا۔ "کیا سچ؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ میں نہیں کہہ رہا مجھ سے یہ سب کچھ کہلوایا جارہا ہے اور یہ کون کہلوا رہا ہے؟ خود ہی سمجھ لے اور دستک کا منتظر رہ۔"

شہزادے نے کہا۔ "کیا میں مرید ہوئے بغیر ہی واپس چلا جاؤں؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "جا، میں نے تجھے مرید کیا۔"

شہزادہ واپس مڑا ہی تھا کہ ایک زنانہ سواری بھی اندر داخل ہوئی۔ شہزادے نے اس معزز خاتون کو پہچان لیا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا اور پوچھا۔

"روشن آرا بہن! کہو کیسے آنا ہوا؟"

بہن بھی اپنے بھائی کو آپ کے حجرے میں دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ وہ سٹپٹا گئی تھی، اس نے پوچھا۔ "بھائی، یہاں کیا لینے آئے تھے؟"

بھائی نے جواب دیا۔ "بہن یہ وہ آستانہ ہے جس نے مغل تاج وتخت کو لرزہ براندام کردیا تھا۔ اصل حکومت اس آستانے میں ہے، باہر جو کچھ ہے اس کے زیر اثر، اس آستانے کے فیض سے۔"

بہن نے شوخی سے بھائی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔ "بھائی تمہیں یہاں سے کیا ملا؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "دین اور دنیا کی بشارتیں، نویدیں، خوشخبریاں۔ حضرت نے فرمایا ہے کہ عنقریب میرے در پر دین اور دنیا ایک ساتھ حاضر ہوں گی اور وہ دونوں ہی ایک ساتھ میرا دروازہ بھی کھٹکھٹائیں گی، دستک دیں گی۔ اس کے بعد جب میں لبیک کہہ چکا ہوں گا تو پھر یہاں میرے ہاتھوں دین کا احیا ہوگا اور اگر میں اس میں کامیاب ہوگیا تو گویا دین اور دنیا کی سعادتیں میرے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔"

روشن آرا نے کہا۔ "اچھا آپ کو جو کچھ لینا تھا، لے چکے جو کچھ ملنا تھا مل گیا، اب مجھ کو جانے دیجیے کچھ میں بھی حاصل کرلوں۔"

بھائی نے بہن کو اندر جانے دیا اور روشن آرا بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوگئی۔

☆☆☆

آپؒ نے حج بیت اللہ کا قصد کیا اور بہت سے عزیزوں اور ارادت مندوں کو لے کر براستہ سورت بندر حج کے لیے روانہ ہوگئے۔ آپ سفر کی صعوبتوں کو شوق وافر سے زیر کرتے ہوئے مکۂ معظمہ میں داخل ہوگئے۔ آپؒ نے یہاں کچھ اور ہی سماں دیکھا۔ یہاں ہر طرف دور دور تک ہر شے ایک روح پرور اور جال افزا نور میں گم نظر آئی۔ یہ نور آپ کے دل میں پیوستہ ہوگیا۔ آپ اس نور میں انوار الٰہی سے مشابہت محسوس کررہے تھے۔ آپ نے عاجزی سے اپنے رب سے رجوع کیا۔ ''یاالٰہی! میں عاجز و ناتواں انسان جو بنیادی طور پر ضعیف البنیا کہلاتا ہے۔ بتا تو سہی کہ یہ نور جو یہاں کی ہر چیز میں جاری و ساری نظر آتا ہے کیا تیرا نور ہے؟ سوال اور شبہ یوں پیدا ہوتا ہے کہ اس نور میں تیرے انوار کی مشابہت تو ضرور پائی جاتی ہے لیکن یہ اس کے علاوہ بھی محسوس ہوتا ہے۔''

اس سوال کے کچھ دیر بعد آپ کو جواب القا ہوگیا۔ ''اے میرے معصوم بندے، اس وقت تو کہاں آیا ہوا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ دیار نبی ﷺ میں، مولد نبوی ﷺ میں۔''

بشکل القا وضاحت ہوئی۔ ''یہ انوار نبویہ ﷺ ہے۔ یہاں کی ہر شے انوار نبویہ ﷺ میں گم ہے۔''

آپؒ نے درود کا ورد شروع کردیا اور بتدریج یوں محسوس کیا گویا انوار نبویہ ﷺ نے آپ کو اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ آپ نے منیٰ میں قیام فرمایا تو حالت ہی کچھ اور ہوگئی۔ آپؒ پر استغراق اور وجد نے غلبہ کیا اور وفور شوق میں آپؒ اپنے آپ میں نہیں رہے۔ اس وقت آپؒ کا ہر عضو حمد و درود میں مشغول تھا۔

منیٰ کے بعد آپ گیارہویں ذی الحجہ کو طواف کعبہ اور زیارت کے لیے مکۂ معظمہ تشریف لے گئے۔ آپؒ وفور شوق میں کعبے کے چاروں طرف پھرنے لگے۔ یہاں آپ نے ایک ایسا عجیب و غریب اور ماورائے عقل منظر دیکھا کہ سکتے میں رہ گئے۔ آپؒ کے آگے پیچھے نہایت حسین وجمیل عورتیں بھی طواف کعبہ میں مشغول تھیں۔ اور ان عورتوں میں مرد بھی شامل تھے۔ اور یہ بھی سب کے سب بہت ہی حسین تھے۔ آپؒ نے ان کے اشتیاق کا اپنے شوق سے موازنہ کیا تو مختلف نظر آیا۔ آپ کو حیرت تو یہ تھی کہ طواف کعبہ میں ان کی دنیا کے اور لوگ بھی شریک تھے۔ لیکن ان حسین وجمیل مردوں اور عورتوں کو عام انسانوں سے الگ ہی نظر آتا تھا۔ پھر اس منظر نے آپؒ کو حیرت زدہ کردیا کہ ان عورتوں اور مردوں کے قد بڑھ گئے اور ان کے ساتھ ہی کعبے کا قد بھی اونچا ہوگیا۔ پھر ان حسین وجمیل طویل القامت مردوں اور عورتوں نے کعبہ کو اپنی آغوش میں لے کر بوسے دیے اور کعبہ ان کی طرف یوں کھنچا گویا اسے مقناطیس کھینچ رہا ہو۔

آپؒ نے ایک بار پھر اپنے رب سے سوال کیا۔ ''خدایا! میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟ میں تیرے اشارے کے بغیر اس کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔''

بصورت القا جواب ملا۔ ''اے میرے معصوم اور پاک بندے! یہ مرد میرے فرشتے اور عورتیں حوریں ہیں۔ یہ سب بھی کعبے کی زیارت وطواف کی خاطر یہاں کی حاضری دیا کرتے ہیں اور ان کے اور انسانی اشتیاق میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ کعبہ ان کے لیے اونچا اور لمبا ہوجاتا ہے کیونکہ ان کے قد بھی اونچے اور لمبے ہیں۔ پھر یہ جس شوق اور وجد میں کعبے کو اپنی آغوش میں لے کر بوسے دیتے اور چومتے ہیں اس شوق اور وجد میں کعبہ بھی ان سے ہم آغوش ہو کر چومتا اور بوسے دیتا ہے۔''

آپ بے اختیار ہوگئے اور عجز وانکسار سے درخواست کی۔ ''یاالٰہی، میں تیرا عاجز و عاصی بندہ جس کو تو نے پاک اور معصوم کہا، کیا میں اپنے شوق اور وجد کا یوں اظہار نہیں کرسکتا جس طرح تیرے فرشتے اور حوریں کررہے ہیں۔ میں بھی کو اپنی آغوش میں لینے کا خواہش مند ہوں اور اے کاش یہ مجھے اپنے آغوش میں لے سکتا۔''

آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور گریہ وزاری نے آپ کے دل و دماغ کو ہلا دیا۔ طواف جاری تھا اور فرشتوں اور حوروں کے مرتبے اور اعزاز سے پیدا ہونے والے بشری رشک نے آپ کو غمزدہ اور متاسف کر رکھا تھا۔ اچانک آپ نے اپنے قد کو بڑھتا ہوا محسوس کیا اور یہ قد آہستہ آہستہ بڑھنے لگا اور بڑھتے بڑھتے فرشتوں اور حوروں سے بھی اونچا ہوگیا۔ آپؒ حیرت سے اپنے قدموں میں پھیلے ہوئے انسانی ہجوم کو دیکھ رہے تھے۔ پھر آپؒ نے کعبہ کو بھی اونچا ہوتا محسوس کیا اور یہ بھی اتنا اونچا ہوگیا کہ بالکل آپؒ کے برابر آگیا، آپؒ نے بے اختیار اللہ کے گھر کو اپنی آغوش میں لے لیا اس طرح چومنے لگے گویا ان کا محبوب ہم آغوش ہو اور وہ اسے بوسے دے رہے ہوں۔

آپؒ نے اپنے اس اعزاز اور مرتبے کی خوشی اور شکرانے میں نمازیں پڑھیں اور سربسجود ہو کر الطاف کریمانہ اور نوازش ربی کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔ آپ کو حیرت تھی کہ دوسرے انسانوں کے قد کتنے چھوٹے اور کوتاہ ہیں۔
کچھ دیر تک سربسجود رہے اور اپنے رب کی تسبیح و تہلیل کرتے رہے۔
اس کے بعد آپؒ نے عرفات جانے کے ارادے سے کوچ کیا اور وہاں پہنچ کر مسجد خیف میں نماز ادا کی۔ اس مسجد میں وہ قبہ بھی ہے جس کے نزدیک رسول مقبول ﷺ نے اپنا خیمہ نصب فرمایا۔ آپ نے اس مسجد میں تھوڑی دیر قیام کیا اور پھر اس مینار میں تشریف لے گئے جس کے نیچے حضرت آدم علیہ السلام کی قبر ہے۔ اسی میں آپ نے تمام چیزوں کو انوار میں مستغرق ہوتے دیکھا اور آپ کو بتایا گیا کہ ابھی ابھی رسول ﷺ کا بڑے کروفر سے گزر ہوا ہے۔
آپؒ نے ربیع الاول میں مدینۂ منورہ کا سفر اختیار کیا۔ دوران سفر آپؒ کی بے چینی اور شوق کی فراوانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آپ راستے بھر چپے چپے میں رسول مقبول ﷺ کے آثار تلاش کرتے رہے۔ آپؒ ذرے ذرے میں رسول اللہ ﷺ کے قدموں سے مس ہونے کا اثر محسوس کررہے تھے۔ یہ سوچ سوچ کر آپؒ کا دل بھر آتا اور آنکھیں نم ہوجاتیں کہ انہی راستوں پر صدیوں پہلے رسول اللہ ﷺ بھی سفر کرچکے ہیں۔ آپؒ نے راستے میں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے آثار دیکھے اور قیاس سے یہ سمجھنے میں کامیاب ہوگئے کہ یہ قبریں ضرور رسول اللہ ﷺ کے صحابیوںؓ کی ہونگی۔ آپؒ نے انہیں فاتحہ پڑھ کر ایصال ثواب پہنچایا۔
اس طرح جب آپؒ مدینہ کے قریب پہنچے تو شام ہوچکی تھی۔ آپ نے وہ رات مدینہ کے باہر ہی گزاری اور...... یہاں بھی انوار نبویہ ﷺ کی فراوانی محسوس کی۔ آپؒ کے شوق اور اضطراب میں بہت زیادہ اضافہ ہوچکا تھا۔ وہ رات آپؒ نے باہر ہی گزاری اور دوسرے دن صبح شہر میں داخل ہوگئے۔ آپؒ دیوانہ وار رسول اللہ ﷺ کے مزار مبارک پر تشریف لے گئے اور وہاں اتنا روئے، اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ روتے روتے ایک دم سنبھلے اور سامنے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر آپؒ نے تبسم فرمایا اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔
''لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ رسول اللہ ﷺ مجھ سے بغل گیر ہوئے ہیں تو تم کیا کہو گے؟''
آپؒ کے ساتھی نے جواب دیا۔ '' آپ منجانب اللہ معصوم ہیں اس لیے میں آپ کی بات پر یقین کرلوں گا۔''
آپؒ نے فرمایا۔ ''تب پھر اے میرے ساتھیو! تم یقین کرو کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو بغل گیری کا شرف بخشا ہے۔''
پھر اسی دن شام کو آپ نے ارشاد فرمایا۔ ''لوگو! آج میں جنت البقیع گیا تھا وہاں میں نے حضرت عثمانؓ اور حضرت عائشہؓ سے ملاقات کی اور یہ دونوں مجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے۔''
آپؒ نے وہاں کی حکومت سے روضۂ ﷺ کے اندر جانے کی اجازت مانگی جو دے دی گئی۔ جب آپ روضہ ﷺ کے اندر تشریف لے گئے تو وہاں ان پر بے خودی طاری ہوگئی اور آپؒ نے ایک طویل مراقبہ کیا اور اس مراقبے میں آپ نے محسوس کیا کہ ان کے جسم پر ایک نورانی خلعت ڈال دی گئی۔ آپ کے علم و فضل اور تقدس و پرہیز گاری کا بڑا چرچا تھا اور آپ ان باتوں کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ آپ کی کسی بات سے تقوے اور پرہیز گاری کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ چنانچہ آپؒ نے یہاں ایک شب اور دو دن اعتکاف فرمایا۔
آپ مدینۂ منورہ سے مکۂ معظمہ واپس ہوئے۔ راستے میں آپ کو وجع المفاصل کا عارضہ لاحق ہوگیا، تکلیف کی شدت سے آپ بے حد پریشان ہوئے اور اللہ اللہ کا ورد فرماتے رہے۔ آخر اس میں حیرت انگیز طور پر افاقہ ہوگیا اور آپ نے کراہنا بند کردیا۔ آپ کے ساتھیوں کو حیرت ہوئی اور پوچھا۔ ''حضرت! آپؒ نے وجع المفاصل کی کوئی دوا بھی نہیں کھائی پھر یہ افاقہ کیونکر ہوا؟''
آپؒ نے جواب دیا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا، میں نے عالم رؤیا میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کو یہ فرماتے سنا کہ شیخ احمد سرہندی کے بیٹے خواجہ معصومؒ اللہ تیری تکلیف دور کرے گا چنانچہ اس کے بعد سے میں بالکل ٹھیک ہوں۔''
آپؒ نے 1067ھ میں سفر حج اختیار کیا تھا اور 1069ھ میں وطن مراجعت کی۔ اس عرصہ میں ہندوستان میں خانہ جنگیاں شروع ہوچکی تھیں۔ دارا شکوہ اور اورنگ زیب آپس میں دست بہ گریباں تھے اور آخر میں اورنگ زیب کامیاب ہوا اور دارا شکوہ نے ہزیمت اٹھائی۔
اورنگ زیب کو آپؒ کی واپسی کی اطلاع ملی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے حکم دیا کہ ہندوستان کے تمام علماء اور مشائخ اور امرا آپؒ کے استقبال کو پہنچیں۔ جگہ جگہ استقبال اور ضیافت کے لوازمات مہیا کردیے گئے اور عوام اور خواص اس طرح

خوشی کا اظہار کر رہے تھے گویا عید منائی جا رہی ہو۔
آپؒ نے وطن پہنچ کر رشد وہدایت کا فریضہ انجام دینا شروع کر دیا۔ آپؒ کے معتقدین اور مریدین میں بے پناہ اضافہ ہونا شروع ہو گیا اور آپ سے کرامات کا ظہور ہونے لگا۔
آپؒ کے ایک خلیفہ خواجہ محمد صدیق پشاوری پر حال کا شدید غلبہ ہوا اور وہ جنگل کی طرف نکل گئے۔ وہ بڑی دیر تک ادھر ادھر پھرتے رہے، انہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ آخر انہیں پیاس نے ستانا شروع کر دیا۔ اب جو خواجہ صدیق کو پانی کی خواہش ہوئی تو انہوں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور یہ جان کر خوفزدہ ہو گئے کہ آبادی کا کوسوں پتا نہ تھا۔ پیاس کی شدت میں پھر زیادہ ہی اضافہ ہو گیا۔ یہ پریشان حال پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگے۔ لیکن پانی کا کہیں پتا نہ تھا۔ واپسی کا ارادہ کیا تو پیاس نے پاؤں پکڑ لیے اور یہ تھک کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ شام قریب تھی اور پانی کے بغیر سفر ناممکن تھا۔ آخر یہ سوچ کر دل بھر آیا کہ میں تو خواجہ معصومؒ کے وعظ سے متاثر ہو کر ادھر آ گیا تھا اس لیے یہ مشکل بھی انہی کو حل کرنا چاہیے۔
خواجہ صدیق پشاوری نے بے اختیار کہا۔ ''خواجہ معصومؒ! خدا سے سفارش فرمایئے ورنہ میں یہاں سے نکل نہ سکوں گا۔''
وہ یہ التجا کر رہے تھے اور روتے جا رہے تھے۔ اس عالم میں ان کی نظریں سامنے کی طرف اٹھ گئیں۔ انہوں نے اپنے سامنے خواجہ معصومؒ کو دیکھا تو محبت عود کر آئی اور یہ پیاس کو بھلا کر خواجہ معصومؒ کی طرف دوڑ پڑے۔ خواجہ صدیق کی نظریں اپنے پیر و مرشد پر گڑی ہوئی تھیں اور انہیں ایسا لگا گویا خواجہ معصومؒ انہیں ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ خواجہ صدیق جب ان کے پاس پہنچے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پیر و مرشد وہم کی طرح غائب ہو چکے تھے۔ انہوں نے خواجہ معصومؒ کو ایک درخت کی آڑ میں جا کر دیکھا اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ وہاں پانی کا چشمہ لہریں لے رہا ہے۔ خواجہ صدیق نے اپنی پیاس بجھائی اور نہایت ذوق و شوق سے مراجعت کی۔

☆☆☆

ایک دن آپ نے باتیں کرتے کرتے اچانک ایک شخص سے کہا۔ ''ذرا جانا تو میرے خادم کو بلا کر لاؤ۔''
مرید نے پوچھا۔ ''حضرت! آپؒ کا خادم کہاں رہتا ہے؟''
آپ نے خادم کا پتا بتایا، کہا۔ ''اسے فوراً بلاؤ، وہ بہت زیادہ پریشان ہے۔''
مرید نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''حضرت! یہ اچانک آپ کو اپنے خادم کی پریشانی کا خیال کیونکر آ گیا؟''
آپؒ نے جواب دیا۔ ''وہ پریشانی بھی ابھی ابھی اسی وقت اس کو لاحق ہوئی ہے۔''
مرید نے آپؒ کے حکم کی تعمیل کی اور خادم کو بلانے چلا گیا۔ خادم کا مکان زیادہ دور نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ آپؒ کے سامنے حاضر کر دیا گیا۔ آپ نے خادم کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور پوچھا۔ ''کیوں میاں، خیریت تو ہے؟''
خادم نے جواب دیا۔ ''حضرت! بالکل خیریت سے ہوں۔ بس آپؒ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔''
آپؒ نے فرمایا۔ ''میں تجھ سے غافل نہیں رہتا۔ اس وقت بھی غافل نہیں ہوں۔''
خادم نے کچھ کہنے کے لیے زبان کھولنا چاہی مگر آپؒ نے ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کا حکم دیا اور فرمایا۔ ''بھائی خاموش رہ، کچھ دیر خاموش رہ۔''
خادم چپ ہو گیا۔
کچھ دیر بعد آپؒ کی خدمت میں کہیں سے آموں کے ٹوکرے آ گئے۔ آپ نے ٹوکرے میں سے دس آم نکال کر خادم کی طرف بڑھا دیے، فرمایا۔ ''یہ تیرا حصہ ہے۔''
خادم نے انہیں اپنے سامنے رکھ لیا۔ آپ نے مزید دس آم نکال کر خادم کے آموں میں شامل کر دیے، فرمایا۔ ''یہ دس آم تیرے ایک مہمان کے لیے ہیں۔''
پھر دس آم اور بڑھا دیے اور فرمایا۔ ''یہ تیرے دوسرے مہمان کے لیے ہیں۔''
اسی طرح آپ نے اپنے خادم کو چالیس آم اور دیے اور جب چھ مہمانوں کے ساتھ آم دے چکے تو فرمایا۔ ''مجھ کو جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ تیرے گھر میں چھ مہمان آ گئے ہیں اور ان کی تواضع کے لیے تیرے گھر میں کچھ نہیں تو میں پریشان ہو گیا اور میں نے اپنے مرید کے ذریعے تجھ کو بلا لیا۔''

خادم پر رقت طاری ہوگئی اور سر جھکا کے رونے لگا۔
آپؒ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنی جیب سے چھ اشرفیاں نکال کر اس کے حوالے کیں، فرمایا۔ "میں تجھے اپنا فرزند سمجھتا ہوں۔ جب بھی تجھ کو ضرورت ہو مجھ سے لے جا۔"
مرید یہ باتیں سن رہا تھا۔ چند دنوں تک تو وہ خاموش رہا۔ اس کے بعد ایک دن تخلیے میں عرض کیا۔ "حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو بندہ کچھ عرض کرے۔"
آپؒ نے ملائمت سے فرمایا۔ "اجازت ہے، عرض کر۔"
مرید نے عرض کیا۔ "حضرت! آپؒ نے ایک دن اپنے خادم سے فرمایا تھا کہ آپ اس کو اپنا فرزند سمجھتے ہیں۔ کیا آپ اپنے مریدوں کو بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟"
آپؒ نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"
مرید نے عرض کیا۔ "آپ نے اپنے خادم کی بڑی دل جوئی فرمائی تھی اور اس کی حاجتیں بھی پوری کر دی تھیں۔"
آپ نے فرمایا۔ "تجھے جو کہنا ہے کہہ دے۔"
مرید نے درخواست کی۔ "حضرتؒ! میں ایک پریشان حال شخص ہوں۔ عسرت اور تنگی نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ میں تو کبھی کبھی موت کی خواہش کرنے لگتا ہوں۔ زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔"
آپؒ نے دریافت کیا۔ "عسرت اور تنگی کے علاوہ بھی تجھ پر کوئی افتاد آ پڑی ہے؟"
مرید نے جواب دیا۔ "نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں لیکن عسرت اور تنگی ہی وہ سب سے بڑی افتاد ہیں جنہوں نے مجھ سے زندگی کا مزہ چھین لیا ہے، میں ان سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"
آپؒ کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے اور پھر چند ثانیوں کے بعد فرمایا۔ "کون سی دولت درکار ہے، دینی یا دنیاوی؟"
مرید نے جواب دیا۔ "مجھ کو دونوں ہی درکار ہیں۔ دینی بھی اور دنیاوی بھی۔"
آپؒ نے مسکرا کر ارشاد فرمایا۔ "عجیب بے تکا ارمان پیدا کیا ہے تو نے اپنے دل میں، دنیا بھی اور دین بھی۔ یعنی تو دو گھوڑوں کی سواری کرنا چاہتا ہے۔ تو بیک وقت دو کشتیوں میں بیٹھنا چاہتا ہے۔ لیکن سوچ تو سہی کہ کیا ایسا ممکن ہے یا ایسا محال ہے؟"
مرید نے جواب دیا۔ "حضرت! میں نہیں جانتا کہ کیا محال ہے اور کیا آسان لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ آپؒ کے لیے کوئی بات بھی محال نہیں۔ ہر بات آسان اور ممکن ہے میں دین اور دنیا کی دولتیں ایک ساتھ چاہتا ہوں۔"
آپؒ ایک بار پھر مراقبے میں چلے گئے اور کچھ دیر بعد ہوش میں آ کر ارشاد فرمایا۔ "جا تجھ کو دولت دنیا بھی عطا ہوئی اور دولت دین بھی لیکن ذرا احتیاط اور انصاف سے کام لینا۔"
مرید خوشی خوشی چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ہی لوگوں نے اس مرید کو تونگروں میں دیکھا اور دوسری طرف اس کا شمار اہل اللہ میں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

آپؒ کی کرامات کا چرچا ہر طرف ہو رہا تھا۔ ناکاموں اور مایوسوں نے آپؒ کو گھیرنا شروع کر دیا۔ آپ کا در ہر ایک پر کھلا تھا۔ جو چاہتا آتا اور امیدیں پوری کر کے واپس جاتا۔ اس دوران آپ کا ایک دوسرا مرید آشوب چشم میں مبتلا ہو گیا۔ وہ راتوں کو چیختا چلاتا رہتا۔ آپؒ نے اس سے فرمایا:
"بھائی! تو اپنا علاج کیوں نہیں کراتا؟"
مرید نے جواب دیا۔ "میں اپنا علاج کرانا تو چاہتا ہوں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سے کراؤں اپنا علاج؟"
آپ نے ایک طبیب کا نام لے کر حکم دیا۔ "تو اس سے اپنی آنکھوں کا علاج کرا۔ اللہ نے چاہا تو شفا ضرور ہو گی۔"
مرید سیدھا اس طبیب کے پاس پہنچا جس کا آپ نے نام لیا تھا۔ اس نے مرید کی آنکھیں نہایت توجہ سے دیکھیں اور کہا۔
"میں جو کچھ تجھے دوں گا۔ اس سے تجھے یقیناً فائدہ پہنچے گا اور تیری آنکھیں بالکل درست ہو جائیں گی۔"
مرید نے معالج کا سامان سمیٹا اور سیدھا آپ کی خدمت میں پہنچا۔ پہلے تو اس نے طبیب کی بڑی تعریف کی، اس کی دوا کی تعریفیں کرنے لگا۔ اس نے کہا۔ "پیرو مرشد یہ دوا جو میں لایا ہوں، حکیم صاحب کے بقول یہ ایسی دوا ہے کہ اس کی پہلی خوراک ہی اتنا کام کر جائے گی کہ تم اس کے فائدے کا تصور تک نہ کر سکو گے۔"

آپ نے مرید سے دریافت فرمایا۔ "اے خدا کے بندے! ذرا یہ تو بتا کہ طبیب نے تجھے دوا دی ہے یا خدا نے"
مرید کے لیے یہ عجیب و غریب سوال تھا، بولا۔ "حضرت! یہ کیا سوال کر دیا آپ نے؟ مجھ کو دوا تو طبیب نے دی ہے، بھلا خدا کس طرح دوا دے گا۔"
آپ نے فرمایا۔ "تو دوا کی جو تعریفیں کر رہا ہے اس سے مجھ کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ یہ دوا شاید تو خدا سے لایا ہے جو تجھے اس کے مفید اثرات پر اتنا زبردست یقین ہے۔"
مرید کو آپ کی بات ناگوار گزری، بولا۔ "حضرت! آپ ہی نے تو مجھ کو اس طبیب کے پاس بھیجا تھا اور اب آپ دوا کی مخالفت کر رہے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ نہیں آ رہی۔"
آپؒ نے فرمایا۔ "اچھا پہلے تو دوا استعمال کر، اس کے بعد میری ہر بات تیری سمجھ میں آ جائے گی۔"
مرید نے دوا کی سلائیاں دونوں آنکھوں میں پھیر لیں۔ دوا اتنی تیز تھی جیسے آنکھوں میں نمک مرچ بھر دیا گیا ہو۔ رونے اور چیخنے چلانے لگا۔
آپؒ نے اسے تسلی دی۔ "صبر کر صبر، پریشان نہ ہو۔"
مرید کا حال بہت برا تھا۔ کئی گھنٹے بعد اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کی دونوں آنکھیں بینائی سے محروم ہو چکی ہیں، ٹٹول کر ادھر ادھر آنے جانے لگا۔
آپؒ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، یہ تجھ کو کیا ہو گیا؟"
مرید نے رو کر عرض کیا۔ "حضرت! مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میں اندھا ہو چکا ہوں۔"
آپ نے پوچھا۔ "کیوں؟ کیا تیری دوا نے اپنا اثر نہیں دکھایا؟"
مرید نے جواب دیا۔ "حضرت! خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجئے اور میرا مذاق نہ اڑائیے۔"
آپ نے فرمایا۔ "میں تیرا مذاق نہیں اڑا رہا۔ میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جس مفید دوا کے اثرات پر تو استعمال سے پہلے ہی ایمان لے آیا تھا اس نے یہ الٹا اثر کیوں دکھایا؟"
مرید ٹٹولتا ہوا آپؒ کی طرف بڑھا اور آپ کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا، بولا۔ "یہ پاؤں اس وقت تک میرے ہاتھوں میں رہیں گے جب تک آپ میری بینائی واپس نہیں کر دیں گے۔"
آپؒ کو اس پر رحم آ گیا۔ فرمایا۔ "دوا کی تاثیر پر مجھے کوئی شبہ نہیں، اور نہ کر سکتا ہوں۔ مگر تجھ کو یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ دوا میں تاثیر کون پیدا کرتا ہے، اللہ اور صرف اللہ۔ چنانچہ تو نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ جس اللہ نے دوا کو تاثیر بخشی تھی۔ اس نے اس تاثیر کو چھین کر اس میں زہر کا اثر پیدا کر دیا۔ اب اس کا ایک ہی علاج ہے۔"
مرید نے تلملا کر پوچھا۔ "کون سا علاج؟ میں اس علاج کے لیے تیار ہوں۔"
آپؒ نے مرید کے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا کی۔ "الٰہ العالمین! ہم سب تیرے عاجز و گناہگار بندے ہیں۔ تو جس بندے سے جو کام چاہے لے لے اور آئندہ لے سکتا ہے......"
مرید نے آہستہ سے کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کا میری آنکھوں سے کیا تعلق ہے؟"
آپؒ نے جواب دیا۔ "او بے صبرے انسان صبر سے کام لے، درمیان میں دخل نہ دے۔"
مرید خاموش ہو گیا۔
آپ پھر گویا ہوئے۔ "اے میرے مالک! مجھے تجھ پر بڑا ناز ہے میں خوب جانتا ہوں کہ تو جو چاہے کر دے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں میں لوہے کو نرم کر دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو جلا دیا کرتے تھے۔ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکالا، تو جو چاہے کرے اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ اب اس تمہید کے بعد میں عاجزی اور انکسار سے مناجات کر رہا ہوں کہ تو میرے اس مرید کی دونوں آنکھیں بینا کر دے۔"
آپؒ یہ فرما رہے تھے کہ اچانک آپؒ کے دل پر القا ہوا۔ "خواجہ معصومؒ! اس کی دونوں آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگا دیں۔ اس سے مرید کی دونوں آنکھیں دوبارہ بینا ہو جائیں گی۔"
آپؒ نے اپنے مرید کی دونوں آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگا دیا جس سے کچھ ہی دیر بعد اس کی بصارت واپس آ گئی۔ اور وہ ہکا بکا اپنے گرد و پیش کی ایک ایک چیز کو دیکھنے لگا اور آخر میں بے اختیار سجدے میں گر کر خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

☆☆☆

آپؒ کو بتایا گیا کہ ایک ہندو جوگی آگ کو باندھ دیتا ہے جس سے آگ غیر مؤثر ہو جاتی ہے اور لوگ آگ میں گھس بھی جائیں تو وہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتی۔ اس ہندو جوگی نے اپنے اس شعبدے سے بہتوں کو اپنا معتقد بنالیا ہے۔

آپؒ نے اطلاع دینے والے شخص سے کہا۔ ''کیا تم مجھے اس جگہ پہنچا سکتے ہو جہاں ہندو جوگی یہ شعبدہ دکھاتا ہے؟''

جواب ملا۔ ''کیوں نہیں جب آپ فرمائیں۔''

دو دن بعد آپ اپنے مریدوں کو ساتھ لے کر اس جگہ پہنچ گئے آپؒ نے ہندو جوگی کو دیکھا اور پوچھا۔ ''تو لوگوں کو کیوں گمراہ کر رہا ہے؟''

جوگی نے جواب دیا۔ ''اگر میں لوگوں کو گمراہ کر رہا ہوں تو مسلمانوں میں کوئی بھی ایسا ہے جو آگ کے جلانے کے اثرات کو زائل کر دے اور چھونے والا اس کے گزند سے محفوظ رہے۔''

آپؒ نے فرمایا۔ ''یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آگ سے اس کی حدت اور شدت کو زائل کر دینے سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ تو ایک معمولی سا کام ہے۔''

جوگی نے کہا۔ ''آپ اس کو معمولی سمجھتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو آپ کر کے دکھایئے۔''

آپؒ نے فرمایا۔ ''تو تو آگ کو باندھ دینے کے بعد محض چھو کر ہی دکھاتا ہے۔ میں تجھے اس سے زیادہ ہی کچھ دکھادوں گا۔''

اس کے بعد آپؒ نے حکم دیا۔ ''یہاں بہت بڑا الاؤ روشن کیا جائے۔''

آپؒ کے مریدوں نے لکڑیاں جمع کرنا شروع کر دیں اور جب لکڑیوں کا انبار لگ گیا تو آپ نے اس میں آگ لگوادی۔ ذرا سی دیر میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ آپؒ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا۔ ''میں اس پر آیت کریمہ سے دم کرتا ہوں، تو اس میں قرآن پاک لے کر داخل ہو جائے گا اور وہاں بیٹھ کر تلاوت کرے گا۔ اس وقت تک جب تک کہ میں باہر نکلنے کا حکم نہ دوں۔''

جوگی، اس کے پرستار، ہندو اور مسلمان سبھی جمع ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

آپؒ نے آہستہ آہستہ آیت کریمہ کا ورد کیا اور آگ پر دم کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد آپؒ نے اپنے مرید کو حکم دیا۔ ''جا، اس آتش کدے میں داخل ہو جا، اللہ تیرے لیے اسے بے ضرور کر چکا ہے۔''

مرید نے قرآن پاک کو اپنے سر پر رکھا اور اللہ اکبر کا ورد کرتا ہوا آگ کی طرف بڑھا، حاضرین کی سانسیں رک گئیں، لوگ پلکیں جھپکانا بھول گئے، کمزور دل ہول میں مبتلا ہو گئے۔ بعضوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔

جوگی نے اپنے پرستاروں سے کہا۔ ''افسوس کہ یہ مسلمان جوگی اپنے اس چیلے کو خواہ مخواہ آگ میں جھونک رہا ہے۔ یہ داخل ہوتے ہی بھسم ہو جائے گا۔''

مرید نے اپنا پہلا قدم جیسے ہی آگ میں رکھا لوگوں کی چیخیں نکل گئیں، جوگی چلایا۔ ''مہاتما جی! اپنے چیلے کو واپس بلالو، میں تو اپنے چیلے کے جسم پر ایسی دوائیں مل دیتا تھا جس پر آگ اثر نہیں کرتی تھی۔ لیکن آپؒ یہ کیا کر رہے ہیں، جو یوں ہی اس کو آگ میں چلے جانے کا حکم دے رہے ہیں۔''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''تو فکر نہ کر، میرے مرید کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

اتنی دیر میں مرید آگ میں داخل ہو چکا تھا۔ اور آگ اس کو نقصان پہنچانے میں ناکام رہی تھی۔

مرید نے آگ میں کچھ دور چل کر اس کے مرکز میں قیام کیا۔ دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ یہ منظر اتنا اثر انگیز اور ہوش ربا تھا کہ دیکھنے والوں پر رقت طاری ہو گئی۔ بعض کی چیخیں نکل گئیں۔ جوگی اپنی جگہ پریشان تھا اور جو کچھ دیکھ رہا تھا اس کے لیے ناقابل فہم تھا، وہ آہستہ آہستہ آپؒ کے پاس پہنچا اور کہا۔

''مہاتما! آپ مہاپرش ہیں۔ آپ نے آگ کو بے بس کس طرح کر دیا؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''آگ کو میں نے کہاں، خدا کے کلام نے خدا کے حکم سے بے اثر کر دیا ہے، اس میں میرا اپنا کوئی کمال نہیں۔''

جوگی نے فرط جذبات میں کہا۔ ''مہاتما جی! میں آپ کے چیلوں میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔''

آپ نے جواب دیا۔ "تو پھر آدمی اسلام کا چیلا بن جاؤ۔"
جوگی اپنے عقیدت مندوں سمیت مسلمان ہوگیا۔

☆☆☆

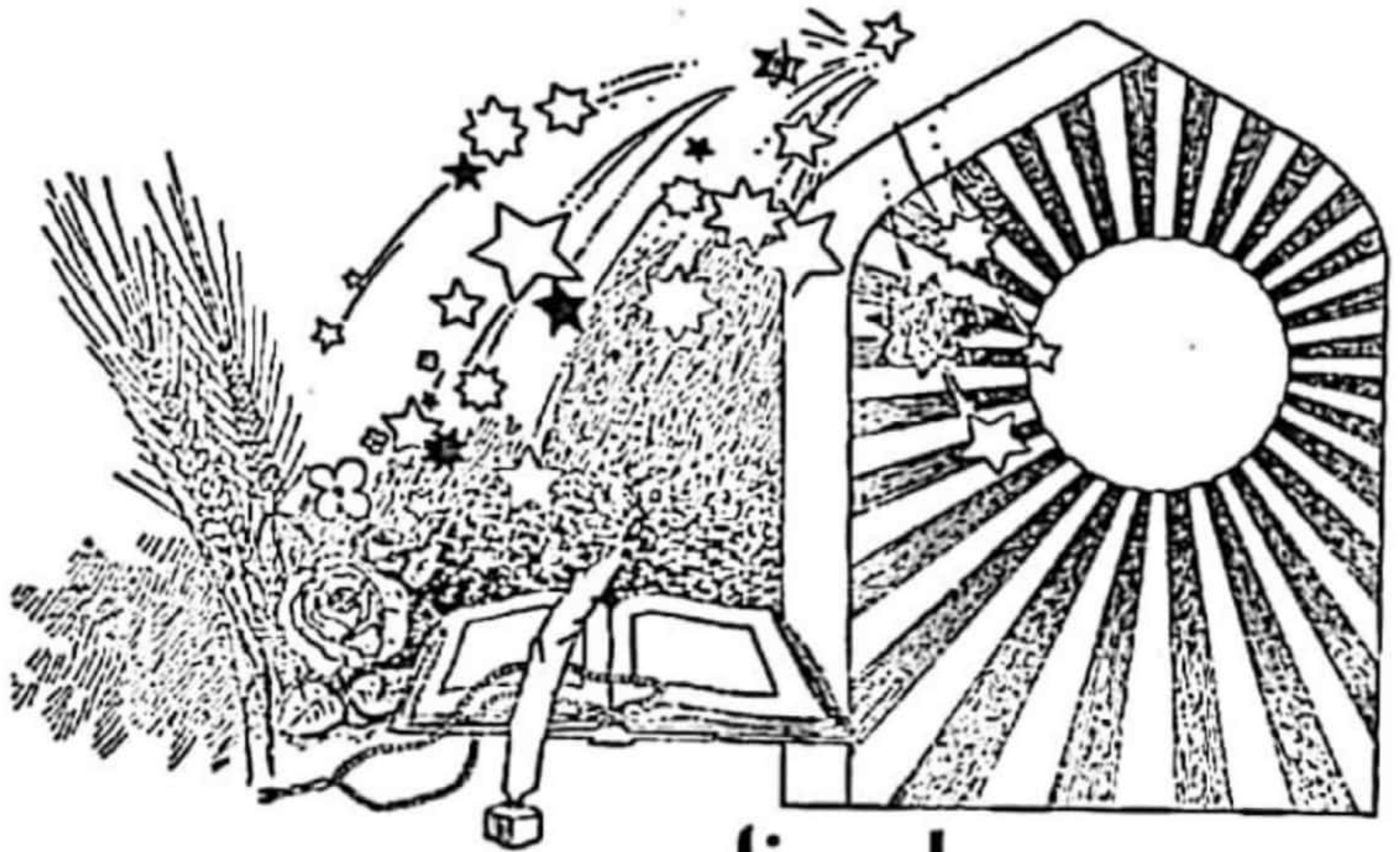
لاہور کا گورنر نواب مکرم خان آپ کا بے حد معتقد تھا۔ وہ آپ کے قریب رہنے کی خواہش میں ملازمت سے الگ ہو گیا
اور سرہند پہنچ کر آپ کے پاس رہنے لگا۔ چار سال بعد اس کی اورنگ زیب سے ملاقات ہوگئی۔ اورنگ زیب نے ان سے
بہت سی باتیں کیں اور آخر میں دریافت کیا۔
"تم نے سرکاری ملازمت کیوں ترک کردی؟"
نواب مکرم خان نے جواب دیا۔ "میں اپنے پیرومرشد کے قریب رہنا چاہتا تھا اور ملازمت پر رہ کر میں اس سعادت
سے محروم رہتا۔"
اورنگ زیب نے حیرت سے دہرایا۔ "نواب مکرم! اس وقت تمہاری کیا عمر ہوگی؟"
نواب نے جواب دیا۔ "چار سال"
اورنگ زیب نے حیرت سے جواب دہرایا۔ "چار سال، کیا مطلب؟"
نواب نے جواب دیا۔ "جی ہاں، چار سال۔ کیونکہ چار سال سے پیرومرشد کی صحبت میں رہ رہا ہوں۔ میری اصل
عمر وہی ہے جو میں نے اپنے شیخ کی خدمت میں گزاری ہے۔ جو کچھ باقی ہے وہاں آخرت ہے۔"
اورنگ زیب اس جواب سے بہت متاثر ہوا۔

☆☆☆

آپ کے دسترخوان سے ہزاروں آدمی پیٹ بھر کر کھانا کھاتے تھے۔ لنگر صبح سے شام تک جاری رہتا۔ اعداد و شمار سے
معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم پانچ ہزار آدمی ہر روز کھانا کھاتے تھے۔ کھانے میں گیہوں کی روٹی، چاول اور گوشت پکتا تھا۔
آپ کو ایک بار وجع المفاصل نے پریشان کیا تھا۔ آخر عمر میں اس مرض نے عود کیا اور اس نے بری طرح غلبہ پالیا۔
علاج جاری رہا لیکن اطباء عاجز آگئے۔ آپ کے مریدوں کو بڑی تشویش تھی۔ کسی مرید نے آپ سے پوچھا۔
"پیرومرشد! اطبا مرض پر قابو کیوں نہیں پا رہے۔ آخر دوائیں فائدہ کیوں نہیں پہنچا رہیں؟"
آپ نے جواب دیا۔ "اب دوا کی کوئی ضرورت نہیں، میں اس لیے علاج کر رہا ہوں کہ سنت کا تقاضا پورا ہو جائے۔"
پھر آپ نے مریدوں سے فرمایا۔ "میں تم سب کو کتاب و سنت پر چلنے اور قائم رہنے کی وصیت کرتا ہوں۔"
مرید رونے لگے۔ آپ نے انہیں صبر کی تلقین فرمائی۔
9 ربیع الاول 1079ھ بروز پیر آپ نے سورۂ یٰسین پڑھنا شروع کی، یکایک آپ نے فرمایا۔ "السلام علیک یا رسول
اللہ ﷺ۔"
اور آپ کی روح پرواز کرگئی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ اس وقت آپ کے چہرے سے مسکراہٹ ہویدا تھی۔ اورنگ زیب
آپ کی وفات سے بہت ملول ہوا اور تاریخ وفات کہی۔
عالم تاریک باشد 1079ھ
جس وقت آپ کا جنازہ اٹھایا گیا، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور ہزاروں آدمیوں کے کاندھوں سے گزر کر قصر معصومی
سے شمال کی طرف نماز جنازہ ادا کی گئی۔ آپ کے صاحبزادے شیخ عبداللہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور قصر معصومی سے جنوب کی
طرف تدفین عمل میں آئی۔
روشن آرا نے اپنے صرف خاص سے روضۂ مقدسہ کی تعمیر کرائی جو آج تک مرجع خاص و عام ہے۔

ماخذات

خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ تذکرۃ الاولیا، شیخ فرید الدین عطار۔
سکینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔
ریاض الریاحین، ابی جعفر۔ سفینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ



ابنِ خلدون

ضیا تسنیم بلگرامی

ایک ایسی تاریخی شخصیت... جو اپنے علمی اور تاریخی کارناموں کی وجہ سے مشہور ہے... اور جسے تاریخی دنیا میں "بابائے تاریخ" کا خطاب دیا گیا... جس کا خاندان نہ صرف برسرِ اقتدار رہا بلکہ علم وفضل کے میدان میں بھی شہرت کا حامل تھا۔ ابن خلدون نے طوائف الملوکی کے دور میں آنکھ کھولی، جب اندلس میں مسلم اقتدار آپس کی نااتفاقیوں کی بدولت روبۂ زوال تھا۔ ان تمام محرکات نے ابن خلدون کے ذہن کو وہ تحریک دی کہ اس کی نظروں نے نہ صرف تاریخ بلکہ دیگر علوم کا بھی گہرائی سے مطالعہ اور احاطہ کیا۔ اگرچہ ایک عرصہ تک اس کے دل میں حکومت کرنے کی خواہش بھی جاگزیں رہی مگر رفتہ رفتہ حالات کے نشیب وفراز نے اسے صحیح سمت دکھادی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اسے اندلس میں وزارت مل گئی لیکن یہ مرتبہ بھی اسے راس نہ آیا۔ عجیب وغریب حالاتِ زندگی کا شکار ابن خلدون نے بالآخر حکومت اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی اور تاریخ کی تدوین کا کام شروع کر دیا۔ مقدمہ ابن خلدون تاریخ کی گویا پہلی جلد ہے جس نے ایسی شہرت دوام پائی کہ آج تک دنیا بھر میں ابن خلدون کا نام نسل در نسل منتقل ہوتا آرہا ہے۔

بابائے تاریخ کے کارناموں اور حالاتِ زندگی کا احوال

رسول اکرم ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابی حضرت وائل بن حضرمیؓ تھے ان کو رسول اکرم ﷺ نے یمن میں تبلیغ اسلام اور تعلیم قرآن کی خدمت پر مامور کیا تھا اور ان کا خاندان مدتوں یہ دینی فریضہ انجام دیتا رہا اور انہیں تاریخ اسلام میں بڑی عزت و عظمت حاصل رہی۔

بعد میں دین اسلام عرب سے نکل کر عراق، فلسطین وشام میں داخل ہو گیا اور دوسری طرف افریقا میں بھی اس نے جگہ بنائی۔ خلافت راشدہ کا دور ختم ہوا اور بنو امیہ کے خلفا

اسلامی حدودِ سلطنت میں اضافے کرتے رہے۔ انہی کے دور میں اسلام چین کی سرحدوں میں داخل ہوا، پورے ایران پر قابض ہوگیا، مشرقی ترکستان بھی ان کے تسلط میں آگیا اور سندھ میں ملتان تک اسلام پہنچ گیا۔ افریقا میں مصر سے گزر کر قیروان سے آگے بڑھتا چلا گیا اور آخری مغربی شہر طنجہ تک پہنچ کر فاتح عقبہ بن نافع نے اپنا گھوڑا بحرِ ظلمات میں اتار دیا اور انتہائی عاجزی اور انکساری سے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا۔ ''الٰہ العالمین! میں نے خشکی کے معلوم حصے تک تیرے دین کو پہنچا دیا آگے سمندر ہے۔''

اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

جب بنوامیہ کا دمشق میں اقتدار ختم ہوا اور بنوعباس نے ان کی جگہ سنبھالی تو بنوامیہ کے ایک شہزادے عبدالرحمٰن نے جان بچا کے افریقا سے گزر کر اس کے مغربی شمالی شہر سبتہ کو عبور کیا اور اندلس میں داخل ہوگیا۔ یہاں طارق بن زیاد پہلے ہی اسلامی حکومت کی بنیاد ڈال چکا تھا اور یہ خطہ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور میں فتح ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن نے اندلس میں اشبیلیہ پہنچ کے اقتدار سنبھالا۔

عباسی خلیفہ ابوالسفاح نے اندلس سے بھی بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دینا چاہا مگر شہزادہ عبدالرحمٰن نے ابوالسفاح کے فوجی سپہ سالار کو شکست دی اور اس کا سر کاٹ کے ابوالسفاح کے پاس بھیج دیا۔

اب اندلس عربوں اور اسلامی مغربی علاقوں کا مستقر بننے لگا اور اندلس میں عرب قبائل پہنچنے لگے۔ عربوں کے علاوہ افریقا کے بربری قبائل بھی اندلس پہنچے۔

تیسری صدی ہجری میں رسول اکرم ﷺ کے صحابی حضرت وائل حضرمیؓ کے پوتے خالد بن عثمان نے ایک لشکر کے ساتھ اندلس کا سفر کیا اور وہاں اشبیلیہ سے پچیس میل مشرق میں واقع قرمونیہ میں سکونت اختیار کی۔ رومانیوں کے دور حکومت میں اسی جگہ شہر کارمو آباد تھا۔ یہ ایک بلند مقام پر واقع تھا۔ اسی وجہ سے اس شہر کو دشمنوں کا خوف بہت کم رہتا تھا۔

اندلس میں یہی خالد بن عثمان کا نام خلدون میں تبدیل ہوگیا اور اس کی وجہ مشہور مورخ ڈوزی یہ بتاتا ہے کہ اندلس میں نام کے ساتھ ''و'' اور ''ن'' کا اضافہ کر کے ایک قسم کا امتیاز پیدا کر دیتے تھے تاکہ وہاں آباد دوسرے خاندانوں میں اپنی پہچان اور شناخت کو آسان کیا جا سکے۔ کہتے ہیں کہ ایسا کرتے وقت وہ اپنے خاندان اور اجداد میں سے نسبتاً معروف شخص کو چن لیتے تھے اور اسی کو اپنے خاندان کی شناخت قرار دیتے تھے۔

چنانچہ خالد بن عثمان بعد میں خلدون قرار پایا اور مشہور مورخ اور بابائے تاریخ ابن خلدون کا تعلق اسی خاندان سے ہے، ان کے والد کا نام محمد تھا۔

ان کا پورا نام ابوزید ولی الدین، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، محمد بن ابی عبداللہ محمد، ابن محمد ابن الحسن، بن محمد بن جعفر، بن محمد بن ابراہیم، بن عبدالرحمٰن، بن خلدون تھا۔ یہ پہلی رمضان 732 ہجری (1336 عیسوی) افریقا کے شہر تیونس میں پیدا ہوئے۔

ان کا خاندان اشبیلیہ میں صدیوں رہا اور وہاں کے حکومتی معاملات میں حصہ لیتا رہا۔ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اس خاندان نے اندلس کے بنوامیہ خلفا کے خلاف بغاوتوں میں حصہ لیا لیکن بعد میں بنوامیہ کا ساتھ دیا اور بلند درجوں پر فائز ہوئے۔

ایک اندلسی مورخ ابن حیان نے لکھا ہے۔ ''بنو خلدون اب تک (پانچویں صدی ہجری تک) اشبیلیہ میں بڑی شہرت کے مالک ہیں اور حکمرانی اور علم دانی میں سرآمد روزگار ہیں۔ اس خاندان میں بن خلدون پہلے شخص ہیں جو خلفائے بنوامیہ کے خلاف باغیوں کے سرگروہ تھے اور کچھ مدت بعد یہ اشبیلیہ میں خودمختار حکمران بن بیٹھے، بعد میں ان کے خلاف شورش ہوئی اور اس شورش میں وہ مارے گئے۔

جب اندلس کے عیسائی حکمران الفانسو نے اشبیلیہ پر قبضہ کرلیا تو مسلمانوں کو یہاں سے دستبردار ہونا پڑا۔ انہی میں ابن خلدون کا خاندان بھی افریقا میں منتقل ہوگیا۔ پہلے یہ لوگ افریقا کے مغربی شمالی ساحلی شہر سبتہ میں اقامت گزیں ہوئے پھر انہیں سبتہ سے تیونس کا سفر اختیار کرنا پڑا اور پھر یہاں مستقل آباد ہوگئے۔ ابن خلدون کی پیدائش اسی شہر میں ہوئی تھی۔

اس خاندان کے افریقی سلاطین سے دیرینہ روابط اور تعلقات تھے اور انہی تعلقات کی وجہ سے بنوخلدون عزت وشان کی زندگی بسر کرنے لگے۔

یہاں حفصیہ خاندان حکومت کر رہا تھا جو پہلے اشبیلیہ میں بھی حکومت کر چکا تھا اور وہیں سے بنوخلدون کے تعلقات اس حکمران خاندان سے قائم تھے۔ ان دونوں خاندانوں میں صدیوں سے مراسم اور روابط چلے آرہے تھے۔ تیونس میں بھی بنوخلدون علم وسلطنت کے میدان میں مشہور ہوئے۔ کئی بار بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے، جنگوں میں بھی

حصہ لیا مگر علم وادب سے بھی اپنا رشتہ برقرار رکھا اور اس میں نمایاں شہرت حاصل کرتے رہے۔

مشہور مورخ ابن خلدون کے پردادا نے تیونس میں وزارت کا عہدہ بھی سنبھالا اور بغاوت میں مارے گئے۔ ان کے دادا بھی کئی بار وزیر بنے اور جب سلطان تیونس سے باہر جاتا تو یہ اس کی جانشینی کرتے اور بادشاہ کے نائب سمجھے جاتے۔ لیکن ابن خلدون کے والد نے علم وکمال کو ترجیح دی اور سیف وسنان کو نظر انداز کیا علم وادب ان کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ابن خلدون اپنے بچپن میں یہ مناظر بارہا دیکھ چکے تھے کہ اس عہد کے بڑے بڑے شاعر اور مصنف اپنی تخلیقات ابن خلدون کے والد کے پاس لاتے اور یہاں یہ بحث چھڑ جاتی کہ کون کس پر سبقت رکھتا ہے اور کسے کس پر ترجیح دی جائے۔ ابن خلدون کے باپ کو اختیار دیا جاتا اور وہ شعرا کے کلام کو پرکھتے اور جس کے حق میں فیصلہ کردیتے وہ فیصلہ قطعی قرار دیا جاتا۔

ابن خلدون کا بچپن اور لڑکپن اسی ماحول میں گزرا لہٰذا انہیں اپنے خاندان کی علمی برتری کا شدت سے احساس ہوتا رہا۔

انہوں نے اپنے زمانے کے مجوزہ نصاب پر پورا عبور حاصل کرلیا تھا۔ پہلے قرآن حفظ کیا پھر مختلف علوم وفنون کی طرف متوجہ ہوئے۔ احادیث میں معطا اور صحیح مسلم کی تکمیل کی لیکن صحیح بخاری کے بعض اجزا تک ہی رسائی ہوسکی۔ لغت ونحو کی کتابوں پر بھی دسترس حاصل کرنے کا پتا چلتا ہے۔

خود ابن خلدون نے مختلف ذرائع سے خاندان کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں یا اپنے خاندان والوں سے سنیں اور دوسروں سے معلوم ہوئیں اس سے ابن خلدون کو اپنے خاندان کی عسکری اور علمی برتری کا شدید احساس پیدا ہوا۔

ایک طرف تو ابن خلدون کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے بزرگوں نے اعلیٰ جاہ ومنصب حاصل کیا اور انہیں بڑی سربلندی حاصل رہی اور دوسری یہ حقیقت علم میں آئی کہ ان کا خاندان علم وفن میں بھی ممتاز اور برتر رہا۔ لہٰذا یہ دونوں رجحانات ان کے مزاج میں پرورش پاتے رہے، وہ جاہ ومنصب کے بھی خواہش مند رہے اور علمی میدان میں بھی برتری حاصل کرنے کی زبردست خواہش محسوس کرتے رہے۔

ان کے دادا کا انتقال ان کی عمر کے پانچویں سال ہی میں ہوگیا تھا۔ جب یہ اپنی عمر کے سترہ سال میں داخل ہوگئے تو تیونس میں طاعون کی وبا پھیلی اور لوگوں نے نقل مکانی اختیار کی۔ یہ ابھی نقل مکانی کا فیصلہ نہیں کرپائے تھے کہ ان کے والدین مرض طاعون میں مبتلا ہوئے اور انتقال کرگئے۔

اس وبا میں بڑے بڑے مشائخ چل بسے تھے مگر بہتوں نے طاعون زدہ علاقے کو چھوڑ دیا اور دوسرے علاقوں میں منتقل ہوگئے۔ طاعون کی وبا سے پہلے یہاں کے سلطان کے دربار سے بڑے بڑے عالم اور ادیب وابستہ تھے۔ ابن خلدون نے بھی اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ وہ فی الحال اس وبا زدہ علاقے کو چھوڑ کر کہیں اور پناہ لیں۔ ان کے بڑے بھائی محمد نے ابن خلدون کی مخالفت کی کہ وہ وبا کی وجہ سے اپنے وطن کو نہ چھوڑیں۔ جب وبا سے اس شہر کو نجات ملی تو اس دور کے سلطان ابواسحاق حفصی کی طرف سے تیونس میں وزیر ابن تافراکین خودمختاری کے مزے لوٹ رہا تھا۔

ابن خلدون کو اپنے بزرگوں کے دوستوں کی سفارش پر ابواسحاق حفصی کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کا موقع مل گیا اور سلطان نے ابن خلدون کو اپنے پاس کاتب علامت کی حیثیت سے رکھ لیا۔ یہ کام اتنا سادہ اور کم درجے کا تھا کہ ابن خلدون کی طبع ترقی پسند اس پر قناعت نہ کرسکی۔ کاتب علامت کا کام یہ تھا کہ سلطان کی طرف سے جو خطوط لکھوائے جاتے تھے ان پر بسم اللہ اور نفس مضمون کے درمیان کاتب علامت الحمدللہ والشکر للہ جلی قلم سے لکھ دیتا تھا یہ معمولی عہدہ بیس سالہ ابن خلدون کے لائق نہیں تھا لیکن ابن خلدون نے اسے اس لیے قبول کرلیا تھا کہ وہ اس طرح سلطان کے قریب پہنچ گئے تھے۔

کچھ ہی عرصہ بعد ابن خلدون کو یہ اندازہ ہوگیا کہ تیونس کی حکومت بہت کمزور ہے۔ انہیں یہ خطرہ بھی محسوس ہوتا رہا کہ مراکش والے اس پر حملہ آور ہوکر کہیں ختم نہ کردیں۔ مراکش کا حکمران امیر ابوزید تیونس پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا اور ابواسحاق حفصی کو تیونس سے نکال دینے کا ارادہ کرچکا تھا۔

ابواسحاق حفصی نے حملہ آور امیر ابوزید کے مقابلے کے لیے تیاری کی اور ایک شاندار لشکر ترتیب دیا۔ گوکہ ابن خلدون کاتب علامت کو فوج میں شمولیت کی دعوت نہیں دی گئی تھی لیکن انہوں نے حفصی سلطان سے درخواست کی کہ ان کو بھی سلطانی فوج میں شامل کرلیا جائے۔

تیونس کے قریب ہی قسنطینہ نامی شہر تھا اور یہیں سے ابواسحاق حفصی پر حملہ ہونے والا تھا۔ ابن خلدون نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ ابواسحاق حفصی کو کامیابی حاصل ہوجائے گی اور وہ اپنی حدود سلطنت مراکش تک بڑھالے گا۔ لیکن اس وقت تک ابن خلدون کو غالباً افریقی علاقوں میں طاقت کے توازن کے گھٹنے بڑھنے کے راز کا علم حاصل نہیں تھا کہ وہاں کے کثیر بربری قبائل جس کا ساتھ دیتے تھے، اسے

کامیابی حاصل ہو جاتی تھی۔ یہی بربری قبائل طارق ابن زیاد کو صدیوں پہلے اندلس میں کامیابی بخش چکے تھے۔ امیر قسنطینیہ کو بربری قبائل کی اکثریت کا اعتماد حاصل تھا اور وہ ابواسحاق حفصی کے مقابل آگئے تھے۔

دونوں فوجوں میں زبردست تصادم ہوا اور ایک خوفناک معرکے کے بعد ابواسحاق حفصی کو شکست ہوگئی۔ اس کی فوج یا تو ہلاک ہوئی یا بچ جانے والے ادھر ادھر فرار ہوگئے۔ ان فرار ہونے والوں میں ابن خلدون بھی شامل تھے۔ فاتح فوج کے لوگ مفروروں کو تلاش کر کے قتل کر رہے تھے اور ابن خلدون اپنی جان بچانے کے لیے جگہیں بدلتے رہے۔ راہِ فرار اختیار کرتے وقت ابن خلدون نے جو کچھ اپنے ساتھ لے لیا تھا وہ سب راستے میں چھن گیا اور ابن خلدون کو اپنے جسم کے کپڑے تک بچانے میں ناکامی ہوئی۔

یہ بھوکا پیاسا عالم پورے لباس سے محروم ابد نامی گاؤں میں پہنچا تو وہاں کے مقامی لوگوں نے انہیں پناہ دی، ان کے خاندان سے ابد کے لوگ واقف تھے اور اسی خاندان کی فضیلت نے اس دربدر نوجوان عالم کو محفوظ رکھا لیکن یہ ابد نامی گاؤں بھی انہیں زیادہ عرصے تک پناہ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ مفتوح اور شکست خوردہ ابواسحاق حفصی کے باقی ماندہ لوگوں کی تلاش جاری تھی اور ابد کے لوگ جانتے تھے کہ اگر ابن خلدون کو ان کے گاؤں سے پکڑا گیا تو گاؤں والوں کو بھی ابن خلدون کے ساتھ سزا بھگتنا ہوگی۔

ابن خلدون بھی اس حقیقت سے واقف تھے اور انہیں اپنے میزبان گاؤں پر بھی اعتبار نہیں تھا بلکہ انہیں شبہ تھا کہ یہ گاؤں والے خود ہی ان کو گرفتار کر کے فاتح فوج کے حوالے کر دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے خاموشی سے ابد نامی گاؤں کو چھوڑ دیا۔ یہ ابد نامی گاؤں تیونس سے تین دن کی مسافت پر تھا چنانچہ ابن خلدون خاموشی سے ایک دوسرے گاؤں میں چلے گئے۔ یہاں بھی ان کی خاندانی فضیلت کام آئی اور لوگوں نے انہیں جوش و خروش سے اپنا مہمان بنالیا۔

ابن خلدون ہر جگہ اپنا یہی تعارف کرواتے رہے کہ انہیں حفصی سلطان ابواسحاق کے دربار میں ایک معمولی منصب کاتب علامت حاصل تھا اور ان کا سلطان کی فوج سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا پھر پتا نہیں کیوں فاتح فوج ان کا پیچھا کر رہی ہے۔

اس گاؤں میں بھی وہ چند دن رہے اور یہاں بھی انہیں یہی خوف محسوس ہوا کہ یہ لوگ بھی ان کو گرفتار کر کے پیچھا کرنے والی فوج کے حوالے کر دیں گے۔ لہٰذا انہوں نے یہ دوسرا گاؤں بھی چھوڑ دیا اور اس بار دور دراز کے ایک ایسے گاؤں میں پناہ لی جو مراکش سے قریب تھا اور پیچھا کرنے والے یہاں تک اس لیے نہیں آسکتے تھے کہ ان کے خیال میں ہزیمت خوردہ لوگ مراکش کے قریب کسی گاؤں میں پناہ نہیں لے سکتے کیونکہ یہ فاتح کا پایۂ تخت تھا۔

یہاں کا حکمران ابوعنان ابن خلدون کے خاندان کا مداح تھا اور اس نے ابن خلدون کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ حفصی سلطان ابواسحاق نے ابن خلدون کو کاتبِ علامت بنا کے اس کی قدر نہیں کی تھی کیونکہ یہ بیس سالہ انتہائی لائق و فائق نوجوان کسی بڑے منصب کا مستحق تھا۔

اس گاؤں کے لوگ بھی ابن خلدون کو پناہ دینے کے باوجود خوفزدہ رہتے تھے کہ کہیں وہ اپنے اس معزز مہمان کی وجہ سے کسی مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔ یہ شریف لوگ ابن خلدون سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ حضرت ہماری مہمان نوازی کے بڑے مزے لوٹ لیے اب کہیں اور کا قصد فرمائیں مگر ابن خلدون کی مجبوری یہ تھی کہ اب وہ کہیں اور نہیں جاسکتے تھے کیونکہ اب مزید سفر کا مطلب یہ تھا کہ وہ خود کو اپنے دشمنوں کے حوالے کر دیں۔ اس گاؤں کے کچھ لوگوں نے خاموشی سے فیصلہ کیا کہ ابن خلدون کو سلطانِ مراکش کے حوالے کر دیا جائے۔

ان کے کچھ لوگ سلطانِ مراکش سے بہ مشکل ملے اور اسے بتایا کہ بنو خلدون کا بیس سالہ عبدالرحمن ابن خلدون ان کے گاؤں میں کئی ماہ سے روپوش ہے اس لیے اب اسے گاؤں کے لوگ سلطانِ مراکش کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں۔ سلطان مراکش کو اس خبر سے بے حد خوشی ہوئی اور اس نے گاؤں والوں کا شکریہ ادا کیا۔ علما کا ایک وفد ابن خلدون کے پاس بھیجا کہ وہ اسے عزت آبرو کے ساتھ ابوعنان کے دربار میں لے آئیں۔

ابن خلدون یہاں سے بھی فرار ہونے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ اپنا سامان باندھ کے رات کے پچھلے پہر نکل جانے کی تیاری کر چکے تھے مگر انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ گاؤں کے لوگ ان کی نگرانی کر رہے ہیں اور انہیں عنقریب سلطان ابوعنان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ صبح تک گاؤں والوں نے ابن خلدون کو روکے رکھا پھر اچانک سلطان کا بھیجا ہوا علما کا وفد ابن خلدون سے ملا اور بتایا کہ انہیں سلطان نے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔

ابھی تک ابن خلدون کو اس حقیقت کا علم نہیں ہوا تھا کہ مراکش کے سلطان ابوعنان نے اپنے باپ کے خلاف

بغاوت کر دی ہے اور اب ابوعنان کا باپ تو تیونس کا حکمران تھا اور بیٹے ابوعنان نے مراکش کی سلطانی پر قبضہ کر لیا تھا اور خود کو اپنے باپ سے الگ حکمران قرار دے رہا تھا۔

ابن خلدون کو ابوعنان کے دربار میں پیش کیا گیا تو انہیں اپنے آس پاس علما کو دیکھ کر حیرانی بھی ہوئی اور پریشانی بھی، ان کو تو سلطان مراکش کے سپاہیوں کے نرغے میں ہونا چاہیے تھا۔

ابن خلدون نے ابوعنان کے سامنے بھی یہی عذر پیش کیا کہ ان کا ابواسحاق حفصی کی فوج سے کوئی تعلق نہیں تھا اور ابن خلدون تیونس کے دربار میں محض کاتب علامت کے معمولی عہدے پر فائز تھے۔ ابوعنان نے سمجھ لیا تھا کہ ابن خلدون خوفزدہ ہیں اور ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ انہیں گرفتار کر کے مراکش کے سلطان کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔

ابوعنان نے کہا۔ ''اے ابن خلدون! میں تیری بے حد عزت کرتا ہوں اور یہاں تجھے درباری علما کے گروہ میں شریک کر لیا گیا ہے۔''

ابن خلدون کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر جب انہوں نے واقعی خود کو علما کے درمیان دیکھا تو انہیں بڑی خوشی حاصل ہوئی اور انہوں نے ابوعنان کا بہت شکریہ ادا کیا لیکن اس دربار میں بھی درباری علما کی جماعت میں شریک کیے جانے کا اعزاز ابن خلدون کو پسند نہیں آیا اور وہ اب یہی سوچ رہے تھے کہ جیسے دوسرے بہت سے علما دربار سے وابستہ ہیں اسی طرح وہ بھی درباری علما میں شامل رہیں گے اور انہیں علیحدہ، علما سے الگ تھلگ کوئی اعزازی مقام حاصل نہیں ہوگا۔

انہوں نے اس کی کسی سے شکایت تو نہیں کی لیکن علما کی جماعت میں شرکت کو جس سرد مہری سے نبھایا جا رہا تھا، ابوعنان اس کا مطلب بخوبی سمجھ چکا تھا۔ آخرکار ابوعنان نے ابن خلدون کو اپنا ذاتی معتمد بنا لیا، یہ منصب امیر اسرار کہلاتا تھا اور آج کل کے حکومتی عہدے سیکریٹری کے برابر سمجھا جاتا تھا۔

لیکن ابوعنان نے ابن خلدون کو اس نئے منصب سے بھی مطمئن محسوس نہیں کیا اور ابن خلدون بھی اس منصب کو اپنے لیے معمولی اور کمتر سمجھتے رہے۔

انہیں مراکش میں قیام کے دوران ادھر ادھر کی خبریں ملتی رہیں اور یہیں انہیں یہ بات معلوم ہوئی کہ الجزائر کے ساحلی شہر بجایہ کا حاکم ان دنوں سلطان کی قید میں ہے۔ اس حاکم کا نام ابوعبداللہ تھا۔ فاس میں قید کر دیا گیا اور یہ شخص قید سے رہائی اور بجایہ کی حکومت کی امید میں قید خانے کے عملے سے جوڑ توڑ میں مشغول ہے۔

ابن خلدون کو ان تفصیلی خبروں سے یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ اگر بجایہ کا حکمران ابوعبداللہ فاس کے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا تو ابن خلدون کو بھی اس کے دربار میں کوئی اعلیٰ منصب مل سکتا ہے۔

ابوعنان کو خبر بھی نہ ہوئی اور ابن خلدون نے اپنے منصب امیر اسرار سے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے ابوعبداللہ بجایہ کے قیدی حکمران سے خفیہ رابطہ قائم کر لیا اور اسے امید دلائی کہ وہ اس کے فرار ہو جانے میں غیر معمولی مدد دیں گے اور ابوعبداللہ کو بجایہ کا دوبارہ حکمران بنوا دیں گے مگر اس خدمت کے صلے میں ابوعبداللہ کو ابن خلدون کو وزارت کا منصب دینا ہوگا۔

فاس کے قیدی ابوعبداللہ کو بھی بنو خلدون کے اثرات اور علم و فضل کا خاصا اندازہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس خاندان کے لوگ حکومت بھی کر چکے ہیں اور وزارت بھی ابن خلدون امیر اسرار ہیں۔ اگر چاہیں گے تو بجایہ کا یہ قیدی حکمران فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔ قید خانے سے نکلنے کے بعد وہ فوج بھی اکٹھا کر سکتا تھا اور دوبارہ بجایہ کا حکمران بھی بن سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے ابن خلدون سے وعدہ کر لیا کہ اگر اسے دوبارہ بجایہ کی حکومت مل گئی تو وہ ابن خلدون کو اپنا وزیر بنا لے گا۔

ابن خلدون کو صبر و تحمل سے کام لینا پڑا، وہ ابوعنان کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرنے کی کوششوں میں لگے رہے اور ان کا زیادہ تر وقت ابوعنان کے ساتھ گزرنے لگا۔ ابوعنان جہاں بھی جاتا ابن خلدون کو اپنے ساتھ رکھتا یہاں تک کہ سلطان ابوعنان نے ابن خلدون کو پابند کر دیا کہ ہر نماز میں وہ ابوعنان کے ساتھ رہیں۔ اس سے ابن خلدون کو یہ فائدہ پہنچا کہ انہیں ابوعنان کا اعتماد بہت زیادہ حاصل ہو گیا۔

ابوعنان جانتا تھا کہ بجایہ کا حکمران امیر محمد بن عبداللہ حفصی خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور حفصی خاندان کے بنو خلدون سے خصوصی تعلقات رہے ہیں اس لیے ابن خلدون پر بجایہ کے حفصی قیدی حکمران کے معاملے میں بھروسا نہیں کرنا چاہیے مگر ابوعنان یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ابن خلدون نے تقریباً آٹھ سال اس سلطان کی خدمت گزاری میں گزار دیے اور کبھی کسی قسم کی شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔

چنانچہ اس اعتماد کی وجہ سے ابن خلدون کو یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ وہ ابوعنان کے بغیر ہی جہاں جانا چاہتے چلے جاتے انہیں کسی قسم کی روک ٹوک کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا چنانچہ ابن خلدون نے زیادہ ہمت سے کام لیا اور سلطان کی اجازت کے بغیر ہی حفصی قیدی محمد بن عبداللہ کے قید خانے

میں پہنچ گئے۔

بجایہ کے قیدی حکمران نے ابن خلدون کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور کہا۔ ''اے ابن خلدون! تجھے خدا نے میرے دشمن کا امیر اسرار بنا دیا ہے اور تو نے اس ملاقات سے پہلے مجھے یہ امید دلائی تھی کہ تو مجھے اس قید خانے سے نکلوا دے گا مگر اس وعدے کو بھی مدت گزر گئی اور میں ابھی تک اس قید خانے میں سڑ رہا ہوں۔ اب مجھے کتنا اور انتظار کرنا پڑے گا؟''

ابن خلدون نے اپنے گرد و پیش کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد جواب دیا۔ ''مت پریشان ہو۔ یہ کام انتہائی خطرناک ہے یہ سمجھ لے کہ میں نے ابوعنان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اس کی آٹھ سال رفاقت کی ہے اور اب مجھے اتنا اختیار مل گیا ہے کہ میں تیرے پاس آزادی سے آنے جانے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔''

قیدی حکمران نے ابن خلدون کو یاد دلایا کہ اس کے حفصی خاندان سے کتنے دیرینہ مراسم ہیں۔

ابن خلدون نے جواب دیا۔ ''مجھے اس وقت ان مراسم سے زیادہ تیری بے بسی پر رحم آ رہا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تجھے دوبارہ بجایہ کی حکومت مل جائے مگر مجھے زمانے کی ناقدری اور احسان فراموشی کا بھی اندازہ ہے، یہ بھی سوچتا ہوں کہ میں تو تجھے بجایہ کا حکمران بنا دوں مگر تو میرے اس احسان کو بھلا دے اور کسی اور کو منصب وزارت بخش دے۔ تو اے محمد بن عبداللہ! تجھے اس وقت مجھے یہ یقین دلانا ہوگا کہ تو مجھے میری خدمت اور احسان کے صلے میں منصب وزارت دیدے گا اور کسی قسم کی حیل و حجت کو درمیان میں نہیں لائے گا۔''

محمد بن عبداللہ نے روزانہ زیر تلاوت رہنے والے قرآن کو سر پر رکھ کے وعدہ کیا۔ ''اے ابن خلدون! میں خدا کے کلام کو گواہ بنا کے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے تیری کوششوں سے بجایہ کی حکومت مل گئی تو میں تجھ کو اپنا وزیر بنا لوں گا۔''

جب ان دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں تو ایک دوسرے امیر عمر بن عبداللہ کو اس گفتگو کا علم ہو گیا۔ یہ شخص قیدیوں کی نگرانی پر مامور تھا۔ اس نے ابن خلدون اور محمد بن عبداللہ کو رازداری سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا چنانچہ ابن خلدون، حفصی قیدی سے باتیں کر کے جیسے ہی قید خانے سے نکلے عمر بن عبداللہ نے ابن خلدون کو روک کر پوچھا۔

''قیدی سے کس قسم کی رازدارانہ باتیں ہو رہی تھیں؟''

ابن خلدون نے عمر بن عبداللہ کو ٹالنا چاہا مگر اس شخص نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ اس ہونے والی سازش سے اچھی طرح واقف ہے اور یہ بھی بتایا کہ ابن خلدون اور قیدی حفصی امیر کے درمیان اب تک جو باتیں ہو چکی ہیں، وہ ان سے بھی واقف ہے کیونکہ وہ خود بھی بجایہ کے اس قیدی حکمران کو چھوڑ دینے کی فکر میں ہے۔

ابن خلدون کو پہلے تو عمر بن عبداللہ کی باتوں پر یقین نہیں آیا لیکن جب اس نے ابن خلدون کی اب تک کی ساری کوششوں کا ذکر کیا تو اسے یقین آ گیا کہ یہ شخص بھی بجایہ کے قیدی کا رازدار ہے۔ اب ان دونوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مناسب موقع ملتے ہی حفصی قیدی کو رہا کر دیا جائے گا۔

سلطان ابوعنان بیمار پڑ گیا اور بیماری نے شدت اختیار کی تو ابن خلدون نے طبیبوں سے رازداری سے پوچھا۔ ''سلطان کی بیماری خطرناک تو نہیں ہے؟''

طبیب صاف صاف باتیں کرتے ہوئے گھبراتے تھے، اس لیے انہوں نے ابن خلدون کو یقین دلایا کہ بیماری خطرناک نہیں ہے لیکن صحت یابی میں دو تین سال لگ سکتے ہیں۔

یہ خبر ابن خلدون اور بجایہ کے حفصی قیدی کے لیے اچھی تھی۔ ابن خلدون سلطان کی بیماری کا فائدہ اٹھا کے اپنے حفصی قیدی کو رہا کر دینا چاہتا تھا۔

عمر بن عبداللہ نے بھی ابن خلدون کو بتایا کہ سلطان کی صحت یابی کے آثار نہیں ہیں اس لیے میں کسی دن قید خانوں سے چشم پوشی اختیار کر لوں گا، آپ اس سے فائدہ اٹھا کے امیر بجایہ کو فاس سے رخصت کر دیں گے۔

ابن خلدون کو بھی ایک طبیب نے یہ بتا دیا تھا کہ سلطان دو تین سال بستر پر ہی رہے گا۔

ابن خلدون نے اپنے دوست حفصی قیدی کو تیار رہنے کی ہدایت کر دی، بتایا کہ پہلے تو اسے قید خانے سے نکال کر ساحلی حصے میں پہنچا دیا جائے گا اور پھر وہاں سے ایک بڑی کشتی کے ذریعے بجایہ رخصت کر دیا جائے گا۔

ابن خلدون نے جیسے ہی یہ دیکھا کہ بادشاہ کی طبیعت بہت خراب ہو چکی ہے تو خاموشی سے قید خانے میں پہنچے۔ قید خانے کے باہر قیدی کے لیے گھوڑا تیار تھا، رات کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ابن خلدون نے قیدی کو باہر نکالا اور گھوڑے کے پاس پہنچ کے حکم دیا۔ ''تو اس کے ذریعے ساحل پر پہنچ جا وہاں ایک جہاز نما کشتی تیرا انتظار کر رہی ہے۔''

قیدی گھوڑے کی طرف بڑھا کہ اچانک دوستوں سے کئی طاقت ور آدمی قیدی پر ٹوٹ پڑے اور کسی ایک نے خالی گھوڑے کو وہاں سے ہٹا دیا۔ ابن خلدون اس صورت حال سے گھبرا گئے، وہ موقع واردات سے فرار ہونا چاہتے تھے مگر .....اپنے قریب ہی سلطان ابوعنان کو کھڑے ہوئے دیکھا۔

ابن خلدون کو یقین نہیں آرہا تھا کہ بیمار سلطان ان کے قریب صحت مند اور توانا موجود ہے۔

ابوعنان نے ابن خلدون کو بہت برا بھلا کہا اور طعنہ دیا۔ ''تو نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی، میں تیری کوششوں سے واقف ہو چکا تھا۔ آخر کار تو عین واردات کے وقت پکڑا گیا۔''

حفصی قیدی کو دوبارہ قید خانے میں ڈال دیا گیا اور ابن خلدون پر سلطان کا عتاب نازل ہوا۔ مقدمہ چلا اور ابن خلدون کو بھی غیر معینہ مدت تک کے لیے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

ابن خلدون کو حیرت تھی کہ عمر بن عبداللہ کا نام کسی نے بھی نہیں لیا اور ابن خلدون نے بھی اپنی زبان بند رکھی اور اپنی اس زباں بندی کا یہ فائدہ پہنچا کہ عمر بن عبداللہ نے ان کا بڑا خیال رکھا۔

اب اگر عمر بن عبداللہ ابن خلدون سے ملتا تھا تو ماضی کی کوئی بات دونوں نہیں کرتے تھے۔ ابن خلدون دو سال قید کی مصیبت جھیلتے رہے پھر انہیں عمر بن عبداللہ نے یہ خاص خبر پہنچائی کہ سلطان ابوعنان بستر مرگ پر ہے اور کسی وقت بھی مر جائے گا۔

دو سالہ قید کی مدت کے دوران سلطان ابوعنان کا وزیر الحسن ان سے قید خانے میں اچانک ملا اور کہا۔ ''اے ابن خلدون! میں تیری لیاقت اور قابلیت کا مداح ہوں اور چاہتا ہوں کہ تجھے قید خانے سے رہائی مل جائے۔''

ابن خلدون وزیر کی ان خلش آمیز باتوں پر حیران ہوئے کہا۔ ''وزیر! تو ذرا احتیاط سے بات کر کہیں ہم دونوں کی یہ ملاقات اور باتیں سلطان ابوعنان کے گوش گزار نہ کر دی جائیں اور میرے ساتھ تجھ کو بھی قید خانے کی ہوا کھانا پڑے۔''

وزیر الحسن نے جواب دیا۔ ''سلطان ابوعنان تو بے ہوش پڑا ہوا ہے اور اطبا کہتے ہیں کہ اب وہ کبھی ہوش میں نہیں آئے گا، میں نے اس کے خورد سال بیٹے سعید کو سلطان بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس کی طرف سے حکومت کی ساری ذمے داریاں میں سنبھال لوں گا۔''

ابن خلدون کو قید خانے کے باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا اس لیے وہ وزیر الحسن کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے سکے۔

سلطان کا انتقال ہو گیا اور وزیر الحسن نے منصوبے کے مطابق سلطان کے خورد سال بیٹے سعید کو سلطان بنا کر تخت شاہی پر بٹھا دیا اور خود اس کی نیابت کرنے لگا۔

ابن خلدون کو رہائی مل گئی اور انہیں ان کی سابقہ خدمت امیر اسرار عطا کر دی گئی گویا ابن خلدون جیسے قید خانے میں دو سال رہے ہی نہ ہوں۔ ان کی عزت اور تکریم میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو گیا۔

لوگوں کو وزیر الحسن کا کوئی فیصلہ پسند نہیں آیا اور اسی دوران شاہی خاندان کے کئی امیدوار میدان میں کود پڑے۔ ان میں منصور نامی امیدوار زیادہ طاقت ور تھا اور وہ ابوعنان کی زندگی میں قیدی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ وزیر الحسن نے جب منصور کو ایک بڑی فوج کے ساتھ اپنی طرف آتے دیکھا تو ابن خلدون سے مشورہ کیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟

ابن خلدون نے کوئی صائب مشورہ دینے کے بجائے روپوشی اختیار کر لی۔ انہوں نے وزیر الحسن کا ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ منصور کے ساتھ بڑی فوج ہے اور وزیر الحسن اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اسی دوران یہ سننے میں آیا کہ ابو سالم نامی ایک اور امیدوار بہت بڑی فوج لے کر فاس کی طرف بڑھ رہا ہے، اسے بھی مرحوم سلطان ابوعنان نے قید خانے میں ڈال رکھا تھا اور سلطان کے مرتے ہی ابو سالم کے حامیوں نے اسے قید خانے سے نکالا اور اس کے لیے بہت بڑی فوج مہیا کر دی۔ ابن خلدون نے جس طرح المنصور کے مقابلے میں وزیر الحسن کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، اب منصور کے مقابل اس سے بھی طاقت ور امیدوار ابو سالم کو دیکھا تو ابن خلدون نے ابو سالم کی رفاقت اور حمایت اختیار کی اور خاموشی سے ابو سالم کے پاس پہنچ گئے۔

ایک خونریز معرکے کے بعد ابو سالم کو فتح مندی حاصل ہوئی اور اب ابن خلدون ابو سالم کے پاس نظر آرہے تھے۔ انہیں سابقہ خدمت سونپی گئی تو سالم نے مزید انعام واکرام سے بھی نوازا۔ ابن خلدون نے شادی کر لی اور کچھ زمانہ امن چین اور سکون سے گزارا۔

فاس میں انہوں نے جو کچھ دیکھا اور جن حالات سے گزرے۔ اس میں ابن خلدون کو یہ بھی نظر آیا کہ اگر وہ زیادہ ہمت، حوصلے، تدابیر اور حکمت عملیوں سے کام لیتے تو انہیں فاس کی حکومت بھی مل سکتی تھی۔ انہوں نے اب تک جن لوگوں کا بھی ساتھ دیا ان سے ابن خلدون کو حسب دلخواہ صلہ نہیں ملا جبکہ ابو سالم کے ساتھ جو لوگ آئے تھے انہوں نے ابن خلدون کے مقابلے میں زیادہ فائدے اٹھائے۔

ابو سالم کے ساتھ آنے والوں کو بھی ابن خلدون پسند نہیں آئے اور انہوں نے ان کے خلاف سلطان ابو سالم کو ورغلانا اور بہکانا شروع کر دیا۔ یہ لوگ سلطان ابو سالم کو ابن

خلدون کے بارے میں بتا رہے تھے کہ یہ عالم اور مدبر وفادار نہیں ہے اور جسے طاقت ور دیکھتا ہے اسی کا ساتھ دیتا ہے۔ سلطان ابوسالم نے بھی ابن خلدون کے ماضی پر نظر کی تو اسے بھی شکایت کرنے والوں کی باتوں میں صداقت نظر آئی۔

لہٰذا سلطان ابوسالم کے رویے میں فرق آ گیا۔

اسی دوران اندلس کا ایک حکمران ابوعبداللہ اپنی حکومت کھو دینے کے بعد افریقا پہنچا اور فاس میں پناہ لی۔

ابن خلدون اپنے آباؤاجداد کی سابقہ تاریخ سے واقف تھے کہ یہ لوگ اندلس کے علاقے اشبیلیہ میں حکومت کر چکے ہیں، اس لیے ابن خلدون کو بھی اندلس پہنچ کے قسمت آزمائی کرنا چاہیے۔ اب جو اندلسی جلاوطن حکمران ابوعبداللہ کو فاس میں پناہ لیے ہوئے دیکھا تو اس سے تعلقات پیدا کر لیے۔

ابوعبداللہ نے اپنے وزیر الخطیب کے محل میں پناہ لی تھی اور یہ الخطیب کا وطن بھی تھا اور موروثی ٹھکانا بھی۔ ابن خلدون نے الخطیب سے بھی تعلقات پیدا کر لیے اور دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ ابن خلدون نے ان دونوں کو بتایا کہ اب وہ افریقا کو چھوڑ کے اندلس میں سکونت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ابوعبداللہ نے وعدہ کر لیا کہ اگر اسے اندلس میں دوبارہ حکومت مل گئی تو وہ ابن خلدون کو اپنے ساتھ اندلس لے جائے گا۔ یہی وعدہ الخطیب نے بھی کیا کیونکہ الخطیب ابوعبداللہ کا وزیر رہ چکا تھا لہٰذا دوسری بار اگر ابوعبداللہ کو حکومت ملے گی تو الخطیب ہی اس کا وزیر ہوگا۔

ابن خلدون کو ابوسالم کی حکومت سے شکایتیں کیوں پیدا ہو گئیں، ابوعبداللہ یہ جاننا چاہتا تھا۔ ابن خلدون راز کی کچھ خاص باتیں ابوعبداللہ کو نہیں بتانا چاہتے تھے مگر جب یہی سوال الخطیب نے کیا تو ابن خلدون نے رازداری سے بتایا کہ ابوعنان کی حکومت کے دوران قیدخانوں کے نگراں عمر بن عبداللہ نے بجایہ کے قیدی حفصی امیر کو رہا کرنا چاہا تھا۔ اس سازش میں عمر بن عبداللہ بھی شریک تھا لیکن وہ اپنی چالاکی کی وجہ سے بچ گیا اور ابن خلدون کو دو سال قیدخانے میں گزارنا پڑے اور ابن خلدون نے عمر بن عبداللہ کو بچائے رکھا۔ اس چالاک آدمی نے ابوسالم کی حکومت میں ایسی ہوشیاری سے کام لیا کہ ابوسالم نے اسے اپنا وزیر بنا لیا اور اب عمر بن عبداللہ کی نظروں میں ابن خلدون کی کوئی خاص حیثیت نہیں رہ گئی لہٰذا وہ سلطان ابوسالم کو ابن خلدون کے خلاف ورغلاتا رہتا ہے۔

الخطیب نے بھی یہی مشورہ دیا کہ ابن خلدون کو افریقا چھوڑ دینا چاہیے مگر ابن خلدون نے ابوعبداللہ اور الخطیب کو کوئی خاص باتیں نہیں بتائیں اور ان دونوں نے اچانک یہ بھی دیکھا کہ ابن خلدون کے تعلقات وزیر عمر بن عبداللہ سے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ عمر بن عبداللہ نے سلطان ابوسالم کو ابن خلدون کے خلاف ورغلایا تو تھا مگر اسے ابن خلدون کی لیاقت، فراست اور تدبر کا تجربہ بھی تھا اور غیرمعمولی اعتماد بھی۔ عمر بن عبداللہ، ابن خلدون کی اس کمزوری کو بھی سمجھ چکا تھا کہ یہ شخص اب تک جن عہدوں پر فائز رہا ہے، ان سے مطمئن بھی نہیں رہا۔ ابن خلدون وزارت چاہتا تھا یا پھر حکمرانی۔ عمر بن عبداللہ نے ابن خلدون کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور اچانک اس سے مراسم بڑھا لیے۔ لیکن ابن خلدون کو اب اپنے دوست پر بھروسا نہیں رہا تھا جبکہ عمر بن عبداللہ اسے بار بار یقین دلاتا رہا کہ وہ وزارت ابن خلدون کے حوالے کر دینا چاہتا ہے مگر سلطان ابوسالم معلوم نہیں کیوں ابن خلدون سے بدگمان ہے۔

اسی دوران ابوعبداللہ اور الخطیب اندلس واپس چلے گئے۔ اب ابوعبداللہ کو اندلس میں حکومت دوبارہ مل گئی اور الخطیب اس کا وزیر مقرر ہوا۔ ابن خلدون کے لیے اندلس کی فضا سازگار تھی مگر اس کے دوست سلطان ابوسالم کے وزیر عمر بن عبداللہ نے ابن خلدون کو یقین دلایا کہ وہ بہت جلد ابن خلدون کو وزیر بنوا دے گا کیونکہ وہ خود سلطان ابوسالم سے تنگ آ چکا ہے اور وزارت میں اس کے لیے دلکشی باقی نہیں رہی۔

ابن خلدون یہ جاننا چاہتا تھا کہ اگر وزارت ابن خلدون کو مل گئی تو عمر بن عبداللہ اپنے لیے کون سا منصب پسند کر چکا ہے۔

دونوں میں رازداری سے منصوبہ بندیاں ہوتی رہیں اور بالآخر وزیر عمر بن عبداللہ نے اپنا منصوبہ ابن خلدون کے سامنے رکھ دیا۔ ''دوست! تم نے مجھ سے کئی بار یہ پوچھا ہے کہ اگر میں تم کو وزیر بنوا دوں گا تو میں نے اپنے لیے کون سا منصب منتخب کر رکھا ہے تو اے دوست! آج میں تم کو وزارت سے بھی بڑا مقام اور منصب دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ سلطان ابوسالم دو سالہ حکمرانی کے دور میں نااہل اور نالائق ثابت ہوا، اس لیے اب میں اس کو راستے سے ہٹا دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں، میں تم کو ابوسالم کی جگہ سلطان بنا دوں گا میرے لیے وزارت ہی کافی ہے۔''

ابن خلدون نے پوچھا۔ ''یہ خطرناک منصوبہ کس طرح کامیاب ہوگا اور اس میں مجھے کیا کرنا پڑے گا؟''

عمر بن عبداللہ نے جواب دیا۔ ''میں وزیر ہوں اور مجھے سلطان ابوسالم کا اعتماد حاصل ہے حالانکہ میں نے تیرے خلاف سلطان سے بہت باتیں کیں کہ تیری ذاتی قابلیت، تیری خاندانی وجاہت ہمیشہ تیری سپر بنی رہی ہے، تجھے ایک

شب سلطان کو باتوں میں لگائے رکھتا ہوگا اور جب میری طرف سے تجھ کو ہٹ جانے کا اشارہ ملے تو، تو سلطان کے پاس سے چلا آئے گا اور اس دوران سلطان کے محافظوں کو بھی ہٹا دیا جائے گا، اس کے بعد سلطان اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا اور میں اس کے بیٹے کو وقتی طور پر سلطان بنا دوں گا اور اسے تیری سرپرستی میں دے دوں گا تو اس بچے کی سلطانی میں خود سلطانی کے مزے لوٹے گا اور میں اس حکومت کو بیرونی خطرات سے بچانے کی تدبیریں کروں گا۔"

اب ابن خلدون کو حکومت اپنے بہت قریب نظر آ رہی تھی مگر ابھی اس سوال کا جواب نہیں ملا تھا کہ عمر بن عبداللہ، ابن خلدون کی سلطانی پر کیوں آمادہ ہو گیا اور وہ بیرونی خطرات کا سدباب اپنے ذمے کیوں لے رہا ہے؟ کہیں اس طرح وہ فاس والوں کے سامنے ابن خلدون کو قاتل قرار دے کر حکومت پر خود قبضہ کرنے کا خواہش مند تو نہیں ہے۔

یہ بہت خطرناک کھیل تھا۔ اگر اس سازش کا سلطان ابو سالم کو وقت سے پہلے پتا چل گیا تو ابن خلدون تو ناحق مارا جائے گا اور اس بار بھی عمر بن عبداللہ خود کو بچا لے گا۔

ابن خلدون نے اس سازش سے علیحدگی تو نہیں اختیار کی کیونکہ انہیں فاس کی سلطنت بہت قریب نظر آ رہی تھی اور انہوں نے عمر بن عبداللہ کے منصوبے میں اس کی پوری پوری مدد کی تھی اور یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ سلطان ابو سالم کے قتل کیے جانے کے بعد اپنے حامیوں کی مدد سے سلطان بن جائیں گے اور عمر بن عبداللہ کو حراست میں لے لیا جائے گا اور بعد میں عمر بن عبداللہ کو سلطان ابو سالم کا قاتل قرار دے کر اسے کیفر کردار کو پہنچا دیا جائے گا۔

عمر بن عبداللہ نے اپنی سازش پر اتنی تیزی اور عقل مندی سے عمل کیا کہ سلطان ابو سالم کو قتل کر دیا گیا اور انتہائی ڈرامائی انداز میں عمر بن عبداللہ نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور سارے حکومتی ارکان عمر بن عبداللہ کے حامی بن گئے۔ ابن خلدون کو اپنے دوست کی دغابازی سے بہت دکھ پہنچا مگر وہ اس نئے سلطان سے کوئی شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے۔

عمر بن عبداللہ نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "دوست! اگر میں خود سلطان نہ بن جاتا تو کوئی دوسرا ہم دونوں کی جگہ اقتدار پر قبضہ کر لیتا۔ میں نے اے ابن خلدون! تجھ کو اس وقت اس لیے نظرانداز کر دیا کہ اگر میں تجھے اندر بلواتا تو کئی لوگ تیرا راستے ہی میں کام تمام کر دیتے، اس کے بعد میری باری آجاتی، اب تو مجھ سے وزارت کا منصب لے سکتا ہے۔"

جس شخص کو سلطانی ملنے والی تھی، اب اس کو وزارت کی پیشکش کر دی گئی تھی۔ مگر ابن خلدون کا فاس کی سیاست سے دل بھر گیا تھا لہٰذا انہوں نے اندلس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اب ابن خلدون کو یہ دشواری پیش آئی کہ وہ اپنے دوست عمر بن عبداللہ کی اجازت کے بغیر فاس کو نہیں چھوڑ سکتے تھے اور پتا نہیں تھا کہ ابن خلدون اپنے دوست سے اندلس جانے کی اجازت چاہے تو اسے اجازت دی بھی جائے گی یا نہیں۔ عمر بن عبداللہ نے ابن خلدون کو راضی رکھنے کے لیے مال و زر سے نواز دیا اور ہر طرح ابن خلدون کی دلجوئی کرتا رہا۔

ابن خلدون کو اندلس جانے سے پہلے ابو عبداللہ اور الخطیب سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی اور یہ مشکل کام دو چار مہینے کا نہیں تھا۔ انہوں نے خفیہ طور پر اندلس کے ابو عبداللہ سے رابطہ قائم کر لیا اور الخطیب سے بھی سلسلۂ خط و کتابت شروع کر دیا۔

ابن خلدون نے افریقا سے نکلنے کی یہ تدبیر سوچی کہ وہ عمر بن عبداللہ کو یہ نہیں بتائیں کہ وہ اندلس جانا چاہتے ہیں۔ ارادہ یہ ظاہر کریں کہ اب وہ اپنے وطن تیونس میں رہنا چاہتے ہیں اور حکومتی بکھیڑوں سے دوری اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

کافی عرصہ پرسکون اور خاموش رہنے کے بعد ابن خلدون نے اپنے دوست عمر بن عبداللہ سے اپنے وطن جانے کی اجازت چاہی۔ عمر بن عبداللہ کو اندیشہ تھا کہ اگر ابن خلدون کو تیونس جانے کی اجازت دے دی گئی تو یہ شخص تلمسان پہنچ کر بربری قبائل کو اپنے اعتماد میں لے کر فاس پر حملہ آور ہو جائے گا، کیونکہ اسے ابن خلدون کی ذہانت کا خوب اندازہ تھا۔ عمر بن عبداللہ نے ابن خلدون کو اپنے پاس بٹھا کے بہت باتیں کیں، بہت سے سوالات کیے اور یہ بھی پوچھا کہ جب ابن خلدون کے آبائی وطن تیونس میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تو وہاں جا کے کیا کرے گا؟ ابن خلدون نے بتایا۔ "میری بیوی اور میرے بچے تیونس کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہاں اب بھی میرے بہت سے رشتے دار موجود ہیں، میں بھی ان سب سے اپنے بیوی بچوں کو ملوانا چاہتا ہوں۔"

عمر بن عبداللہ نے کہا۔ "اے ابن خلدون! تیری شادی قسنطینیہ کے ایک خاندان میں ہوئی ہے اور تیرے بچوں کا ماموں اور تیری بیوی کا بھائی قائد محمد بن الحکیم خود ان دنوں قسنطینیہ میں سکونت پذیر ہے، تجھے تو اصولاً قسنطینیہ جانا چاہیے۔"

ابن خلدون نے جواب دیا۔ "میں وہاں بھی جاؤں گا اور اپنی بیوی کے رشتے داروں میں بھی کچھ وقت گزاروں گا، اس کے بعد تیونس چلا جاؤں گا۔"

عمر بن عبداللہ نے پوچھا۔ "کہیں تلمسان جانے کی

نیت تو نہیں ہے؟"

ابن خلدون نے جواب دیا۔ "اے عمر بن عبداللہ! میرا حکومت اور کاروبارِ حکومت سے دل بھر گیا ہے۔ اب میں علمی کاموں میں مشغول ہونا چاہتا ہوں اور اس کام کے لیے تیونس بڑی اچھی جگہ ہے۔"

عمر بن عبداللہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "اے ابن خلدون! مجھے تیری ذہانت اور طبیعت کا خوب اندازہ ہے، تو جانتا ہے کہ تلمسان کے بربری قبائل جن کا ساتھ دیتے ہیں اس کی حکومت بن جاتی ہے۔ اس لیے میں تجھ کو تلمسان جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میرے آدمی تجھ کو گرفتار کرلیں گے۔ تلمسان کے علاوہ تجھے کہیں بھی جانے کی اجازت ہے۔"

ابن خلدون کو عمر بن عبداللہ کا تحکمانہ لہجہ بہت برا لگا۔ وہ اگر افریقا میں رہنے کا ارادہ رکھتے تو عمر بن عبداللہ کی سخت نگرانیوں کے باوجود بربری قبائل کو اپنی مدد پر آمادہ کرلیتے اور عمر بن عبداللہ کی حکومت کو اکھاڑ پھینکتے لیکن انہوں نے تو اندلس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اب وہ وہیں قسمت آزمائی کرنا چاہتے تھے۔

عمر بن عبداللہ کی ہدایت کے مطابق ابن خلدون نے تلمسان نہ جانے کا وعدہ کیا اور اپنے بیوی بچوں کو تیونس لے جانے کے بجائے قسطنطنیہ میں اپنے برادر نسبتی قائد محمد بن الحکیم کے پاس چھوڑا اور خود سبتہ کی راہ لی۔ کچھ دن سبتہ میں قیام کے بعد اندلس کا سفر بحری جہاز کے ذریعے کیا اور جبل الطارق پر اتر کر غرناطہ کی راہ لی۔

سلطان ابوعبداللہ اور وزیر الخطیب کو ان کی آمد کی خبر ہوچکی تھی۔ ان دونوں نے ابن خلدون کا شاندار استقبال کیا۔ سلطان نے ان کی ضرورت سے زیادہ پذیرائی کی، اپنے قریب بٹھایا اور بعد میں اپنے ہی محل کا۔ ایک حصہ۔۔۔ ابن خلدون کو رہائش کے لیے دے دیا۔

وزیر الخطیب، ابن خلدون سے بے حد متاثر تھا۔ چنانچہ ان دونوں میں گہری دوستی ہوگئی جبکہ سلطان ابوعبداللہ بھی ابن خلدون پر بے حد مہربان تھا۔ درباریوں نے سلطان کو ابن خلدون پر اتنا زیادہ مہربان دیکھا کہ وہ درباری اوقات بھی اکثر و بیشتر سرگوشیوں میں باتیں شروع کردیتا تھا۔

غرناطہ کے سلطان کا قشتالہ کے عیسائی حکمران سے کچھ تنازعے چلے آرہے تھے، ان دنوں عیسائی حکمران نے اشبیلیہ کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا اور یہ اشبیلیہ ابن خلدون کے جدِ اعلیٰ خالد بن عثمان کی موروثی جگہ تھی اور یہاں ابن خلدون کے آبا۔اجداد نے کچھ عرصہ حکومت بھی کی تھی اور اپنے ایسے آثار چھوڑے تھے کہ اس وقت بھی موجود تھے۔

سلطان ابوعبداللہ نے اپنے تنازعہ کی وجوہ بتائیں اور ابن خلدون کو اپنا نمائندہ بنا کے اشبیلیہ عیسائی حکمران کے پاس روانہ کردیا اور ہدایت کی کہ مناسب اور معقول شرائط کے مطابق معاہدہ کرلیا جائے۔ اشبیلیہ کا عیسائی حکمران بھی ابن خلدون کے نام اور کام سے اچھی طرح واقف تھا۔ ان کی لیاقت اور قابلیت کا شہرہ عیسائیوں میں بھی پہنچ چکا تھا۔ عیسائی حکمران نے بھی ان کا شاندار استقبال کیا۔ دوستانہ فضا میں دونوں میں بہت باتیں ہوگئیں۔ عیسائی حکمران جانتا تھا کہ ابن خلدون کے آباؤاجداد اشبیلیہ میں حکومت کرچکے ہیں چنانچہ اس نے پیشکش کی کہ وہ ابن خلدون کو اپنے دربار میں رکھنے کے لیے تیار ہے، وہ اپنے لیے جو منصب پسند کریں، بتادیں۔

ابن خلدون نے عیسائی بادشاہ کی پیشکش کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "میں غرناطہ کے سلطان ابوعبداللہ سے بے وفائی نہیں کرسکتا۔ اگر آپ مجھے اپنے آباؤاجداد کے آثار کو دیکھنے کی اجازت دے دیں تو میں آپ کا شکرگزار ہوں گا۔"

ابن خلدون کو ان کے آباؤاجداد کے آثار دیکھنے کی اجازت مل گئی اور بادشاہ کے معزز عملے نے ابن خلدون کو پورے اشبیلیہ کی سیر کرادی۔ چند روزہ قیام کے دوران ابن خلدون نے نہایت معقول اور مناسب شرائط کے ساتھ ایک معاہدہ کرلیا اور جب یہ معاہدہ سلطان ابوعبداللہ کے سامنے رکھا گیا تو وہ بہت خوش ہوا اور اب ابن خلدون کی عزت اور وقعت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ درباری ابن خلدون کی بادشاہ سے غیر معمولی قربت اور تعلق دیکھتے اور حسد کرتے رہے۔ ان سب کو یہ تکلیف تھی کہ تیونس کا رہنے والا ایک شخص اچانک غرناطہ میں داخل ہوا اور سلطان کے مزاج میں اتنا رسوخ حاصل کرلیا کہ بادشاہ اس سے سرگوشیوں میں باتیں کرتا ہے، اس کے ساتھ کھانا کھاتا ہے اور اپنے محل ہی کے ایک حصے میں رہنے کے لیے جگہ بھی دے دی ہے، یہ درباری اس جوڑ توڑ میں لگ گئے ہیں کہ اس پردیسی غیر اندلسی کے اثرات کو کس طرح کم کیا جائے۔

ابن خلدون نے اپنے لیے عافیت دیکھی اور ماحول کو بہت زیادہ سازگار پایا تو اپنی بیوی اور اولاد کو بھی غرناطہ میں بلوالیا۔ ابوعبداللہ نے ابن خلدون کو جاگیر بھی دے دی اور ایک بہترین چراگاہ بھی بخش دی۔

سلطان کی یہ نوازشیں درباریوں کو گراں گزرتی رہیں اور اب انہوں نے ابن خلدون کے قریب ترین دوست وزیر

الخطیب کو اپنا آلۂ کار بنانے کا منصوبہ بنالیا۔

کئی بااثر درباریوں نے وزیر الخطیب کو آگاہ کیا۔ ”حضرت! آپ تو ابن خلدون سے مخلصانہ تعلقات رکھتے ہیں جبکہ ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ابن خلدون سلطان ابو عبداللہ کے دل و دماغ پر کسی منصوبے کے تحت قبضہ کرتا چلا جا رہا ہے۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو آپ کو وزارت سے ہاتھ دھونا پڑے گا اس لیے آپ بے وفا ابن خلدون سے ہوشیار رہیں۔“

الخطیب کو درباریوں کی باتوں پر یقین نہیں آیا مگر انہی درباریوں میں سے ایک نے یہ انکشاف کیا۔ ”حضرت! میں ابن خلدون کے ساتھ اشبیلیہ گیا تھا، وہاں اشبیلیہ کے بادشاہ پیڑو نے اس شخص کی حد درجہ پذیرائی کی۔ اسے اس کے آباؤ اجداد کے آثار دکھائے اور پیشکش کی کہ اگر ابن خلدون اشبیلیہ میں رہ جائے تو اس کے آباؤ اجداد کی جائدادیں اور جاگیریں اسے دے دی جائیں گی لیکن جناب میں نے پیڑو کے کئی قریبی آدمیوں سے سنا کہ ابن خلدون نے بادشاہ پیڑو کی پیشکش حقارت سے ٹھکرا دی اور کہا کہ میں غرناطہ کے بادشاہ ابو عبداللہ کا وزیر بننے والا ہوں اس لیے میں اشبیلیہ میں نہیں رہ سکتا۔“

الخطیب نے آہستہ سے کہا۔ ”تو میرا دوست میری پشت میں چھرا گھونپنے کی فکر میں ہے، مجھے اس سے ہوشیار رہنا چاہیے۔“

اس واقعے کے بعد دونوں دوستوں کے تعلقات میں فرق آگیا۔ الخطیب نے سرد مہری اور بے رخی اختیار کی۔ پہلے وہ ابن خلدون کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر بے تکلفانہ باتیں کرتا تھا لیکن اب الخطیب اکھڑی اکھڑی باتیں کرتے کرتے اچانک اٹھ کر چلا جاتا۔

ابن خلدون کو اندلس میں آئے ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ اب جو انہوں نے وزیر الخطیب کے رویوں اور مزاج میں نمایاں تبدیلی محسوس کی تو بیوی بچوں کو اپنے برادر نسبتی ابن الحکیم کے پاس واپس بھیج دیا۔

وزیر الخطیب نے ابن خلدون کے اس فعل کو بھی شک و شبے کی نظر سے دیکھا اور یہ سمجھا کہ اب ابن خلدون وزیر الخطیب سے جو معرکہ آرائی کرنے والا ہے، اس کے برے اثرات سے بیوی بچوں کو بچانے کے لیے افریقہ بھیج دیا ہے۔

ان دونوں کی باہمی کشیدگی کا علم سلطان ابو عبداللہ کو نہیں ہوسکا۔ ابن خلدون اپنے دوست کی سرد مہری کا ذکر سلطان سے کر سکتے تھے مگر وہ یہاں کوئی نیا محاذ کھولنے کے

اسپرٹ

کھیل کے مختصر وقفے کے بعد طویل لنچ شروع ہوا۔ جس میں بعض شادی شدہ افسروں نے چھک کے بیئر پی اور اونگھنے لگے۔ جنہوں نے نہیں پی، وہ ان کی بیویوں سے بدتمیزیاں کرنے لگے۔ جب چائے کے وقت میں کل دس منٹ باقی رہ گئے اور بیرے جھپاک جھپاک پیالیاں لگانے لگے تو مجبوراً کھیل شروع کرنا پڑا۔ دو کھلاڑی امپائر کو سہارا دے کر پچ تک لے گئے اور مرزا نے بولنگ سنبھالی۔ پتا چلا کہ وہ بولنگ کی اس نایاب صنف میں ید طولیٰ رکھتے ہیں جسے ان کے بدخواہ ”وائڈ بال“ کہنے پر مصر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹ لگے بغیر بھی دھڑا دھڑ رن بننے لگے۔ تین اوور کے بعد یہ حال ہوگیا کہ مرزا ہر گیند پر گالی دینے لگے۔ (شکار میں بھی ان کا سدا سے یہی دستور رہا کہ فیر کرنے سے پہلے دانت پیس کر تیتر کو کوستے ہیں اور فیر کرنے کے بعد بندوق بنانے والے کارخانے کو گالیاں دیتے ہیں) ہم بولنگ کی مختلف قسموں اور باریکیوں سے واقف نہیں۔ تاہم اتنا ضرور دیکھا کہ جس رفتار سے مرزا وکٹ کی طرف گیند پھینکتے، اس سے چوگنی رفتار سے واپس کر دی جاتی۔ وہ تھوڑی دیر کج رفتار گیند کو حیرت اور حسرت سے دیکھتے۔ بار بار اس پر اپنا دایاں کف افسوس ملتے۔ پھر بھدر بھدر دوڑتے اور جب اور جہاں سانس بھر جاتی وہیں اور اسی لمحے لپے ہاتھ سے گیند پھینک دیتے۔ منہ پھیر کر ادھر کو، ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

ابتدا میں تو مخالف ٹیم ان کی بولنگ کے معیار سے نہایت مطمئن و محظوظ ہوئی لیکن جب اس کے پہلے ہی کھلاڑی نے پندرہ منٹ میں تیس رن بنا ڈالے تو کپتان نے اصرار کیا کہ ہمارے دوسرے بیٹسمین رہے جاتے ہیں۔ ان کو بھی موقع ملنا چاہیے۔ اس لیے آپ اپنا بولر بدلیے۔ مرزا بولنگ چھوڑ کر پویلین میں آگئے۔ مارے خوشی کے کانوں تک باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ جب وہ اپنی جگہ پر واپس آگئے تو منہ ہمارے کان سے بھڑا کر بولے۔ ”کہو، پسند آئی؟“

”کون؟ کدھر؟“ ہم نے پوچھا۔

ہمارا ہاتھ جھٹک کر بولے۔ ”نرے گاؤدی ہو تم بھی! میں کرکٹ کی اسپرٹ کی بات کر رہا ہوں۔“

(مشتاق احمد یوسفی کی کتاب چراغ تلے سے اقتباس)

لیے تیار نہیں تھے۔

وزیر الخطیب کسی ایسے موقعے کی تلاش میں رہا جب وہ سلطان ابوعبداللہ کو ابن خلدون کی طرف سے اس حد تک بدگمان کردے کہ سلطان ابن خلدون کو غرناطہ سے نکال باہر کرے۔

ایک شخص اچانک افریقا سے غرناطہ پہنچا۔ یہ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ بجایہ سے آیا تھا۔

اسے بجایہ کے نئے حکمران امیر محمد ابن عبداللہ نے بھیجا تھا۔ اسی امیر کو ابوعنان کے قید خانے سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں ابن خلدون کو دو سال کی قید بھگتنا پڑی تھی اور اب وہ خوش قسمتی سے بجایہ کا حکمران بن چکا تھا اور ابن خلدون کو اپنا وزیر بنانا چاہتا تھا۔ اس نے ابن خلدون کو انتہائی مخلصانہ خط لکھا، تاکید کی کہ وہ فوراً بجایہ پہنچے۔

اب ابن خلدون نے اس طلبی کو اپنی خوش قسمتی سمجھا کیونکہ وہ غرناطہ کو اپنے لیے مفید اور مناسب نہیں سمجھ رہے تھے۔ وہ الخطیب سے بھی ناراض نہیں تھے صرف بدگمان تھے اور یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ آئندہ اس شخص سے ابن خلدون کا نباہ نہیں ہوگا اور وہ الخطیب کی سلطان ابوعبداللہ سے شکایت بھی نہیں کرسکتے تھے۔

ابن خلدون نے بجایہ کے حکمران امیر محمد بن عبداللہ کا خط سلطان کے سامنے رکھ دیا اور خاموشی سے ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے ہوگئے۔

سلطان ابوعبداللہ اس خط کو بغور پڑھتا رہا اور کئی بار پڑھنے کے بعد پوچھا۔ "اے ابن خلدون! یہ کیا ہے؟"

ابن خلدون نے بتایا۔ "بجایہ کا یہ حکمران میرا پرانا دوست ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے اقتدار کو میں تقویت بخشوں اس لیے آپ سے بجایہ جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

سلطان ابوعبداللہ نے کہا۔ "تو یہاں اپنی مرضی سے آیا اور میں نے تیری بہت پذیرائی کی۔ اب اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ تیری خدمات کی بجایہ کو ضرورت ہے تو میں تجھے نہیں روکوں گا۔ اگر اندلس چھوڑنے میں کوئی اور مجبوری نہ ہو تو میری طرف سے تجھ کو بجایہ جانے کی اجازت ہے۔"

سلطان سے اجازت لینے کے بعد وہ اپنے دوست الخطیب سے ملا اور اسے بتایا۔ "دوست! خوش ہوجا کہ میں نے اندلس چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اب میں بجایہ جارہا ہوں۔ سلطان نے بھی مجھے جانے کی اجازت دے دی ہے۔"

وزیر الخطیب، ابن خلدون کے اس فیصلے سے بہت حیران ہوا کیونکہ اس کو تو یہ بتایا گیا تھا کہ یہ شخص الخطیب کی جگہ وزیر بننے کی فکر میں ہے۔

وزیر الخطیب نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں بہت گہرے دوست رہے ہیں اور اب میں اپنے مخلص دوست سے معلوم نہیں کتنے عرصے تک محروم ملاقات رہوں گا۔"

ابن خلدون نے کہا۔ "میں بجایہ پہنچ کے بھی تجھ سے تعلق برقرار رکھوں گا اور اس وقت مجھے اندلس چھوڑتے ہوئے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ میں اپنی دوستی کو عزت آبرو سے برقرار رکھ سکا۔ حالانکہ سازشی درباریوں کی بھرپور کوشش تھی کہ ہم دونوں دوست آپس میں لڑ جائیں۔"

ابن الخطیب نے اپنی طرف سے ایسی کوئی بات نہیں کہی جس سے ابن خلدون کو یہ شبہ بھی ہوتا کہ الخطیب کا دل ابن خلدون کی طرف سے صاف نہیں۔

جس طرح ابن خلدون اچانک اندلس میں داخل ہوئے تھے، اسی طرح اچانک انہوں نے اندلس کو چھوڑ دیا۔

☆☆☆

بجایہ میں سلطان محمد بن عبداللہ نے ابن خلدون کا مثالی استقبال کیا اور ان کے اعزاز میں ایک شاندار جلسے کا اہتمام کیا۔ لوگوں کا یہاں یہ حال تھا کہ وہ ابن خلدون کے ہاتھوں کو عقیدت سے چومتے رہے۔ امیر محمد بن عبداللہ نے ابن خلدون کے علم و فضل اور ان کی دوستی کی بہت تعریفیں کیں اور بتایا کہ اس شخص نے سلطان کی خاطر دو سال کی سزا بھی بھگتی ہے۔

اسی جلسہ گاہ میں ابن خلدون کو حاجب کا عہدہ دیا گیا یہ منصب بظاہر تو وزیر کا تھا مگر ابن خلدون کے بقول حاجب کو سلطان کے بعد سب سے زیادہ اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ ابن خلدون نے یہاں شب و روز محنت سے کام کیا۔ یہاں ایک جامعہ قصبہ تھی، ابن خلدون نے اس جامعہ میں پہنچ کے کچھ وقت درس و تدریس کے لیے بھی وقف کردیا۔ یہ اپنی خدمات بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ اب انہیں احساس ہوا کہ انہیں جس اطمینان اور فراغت کی ضرورت تھی وہ انہیں بجایہ میں حاصل ہوگئی تھی۔ لیکن ابن خلدون کو مستقل سکون اور اطمینان حاصل نہ ہوسکا۔ ایک سال کے بعد ہی سلطان بجایہ کے چچا زاد بھائی سلطان ابوالعباس کی نیت خراب ہوگئی۔ وہ قسطنطنیہ کا حکمران تھا اور چاہتا تھا کہ بجایہ پر بھی قبضہ کرلے۔

امیر محمد بن عبداللہ کو اپنے چچا زاد بھائی ابوالعباس کے ارادوں کی خبر ہوئی تو اس نے بھی جنگی تیاریاں شروع کردیں لیکن ابوالعباس کئی سالوں سے بجایہ کو ہتھیانے کی فکر میں تھا۔ دونوں میں سخت مقابلہ ہوا اور اس خونناک معرکے میں امیر محمد ابن عبداللہ قتل ہوگیا، فوج کو شکست ہوئی لیکن بجایہ کی طرف

سے مزاحمت جاری رہی۔

علما اس فکر میں تھے کہ امیر بجایہ کے بیٹے کو سلطان بنا دیا جائے اور ابوالعباس کا مقابلہ کیا جائے۔ کچھ کی رائے تھی کہ ابوالعباس کو صلح پر آمادہ کیا جائے جبکہ ابن خلدون سے علما کو بڑی امیدیں تھیں کہ یہ شخص حملہ آور ابوالعباس کو قائل کر کے واپس بھیج سکتا ہے لیکن ابن خلدون نے بجایہ کی حکومت کی نمائندگی کا فریضہ اس طرح انجام دیا کہ وہ ابوالعباس کو بجایہ میں لے آئے اور اسے بجایہ کی حکومت سونپ دی۔

بجایہ والوں نے ابن خلدون کے اس رویے کو غداری قرار دیا اور یہاں ان کے خلاف نفرتیں پیدا ہو گئیں۔

بجایہ والوں کو حیرت اس بات پر تھی کہ انہیں ابوالعباس کے پاس بات چیت کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا مگر ابن خلدون بات چیت کرنے کے بجائے ابوالعباس اور اس کے لشکر کے ساتھ بجایہ میں داخل ہو گئے اور بہت آسانی سے ابوالعباس کا بجایہ پر قبضہ کروا دیا اور لوگوں کو سمجھایا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کشت وخون بہت زیادہ ہوتا اور بجایہ میں ایسی کوئی طاقت موجود نہیں تھی جو ابوالعباس کا مقابلہ کرتی۔

ابوالعباس نے ابن خلدون کی خدمات سے فائدہ اٹھانا چاہا مگر ابوالعباس کے ساتھیوں نے اپنے آقا کو سمجھایا کہ یہ شخص بالکل ناقابل اعتبار ہے اور اس نے کبھی اپنے محسن کا ساتھ نہیں دیا۔

ابوالعباس نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ یہ شخص کسی ایک جگہ ٹک کے نہیں رہتا، اب تک کتنے ہی دربار بدل چکا ہے، اس کے مزاج میں تلون بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ ابوالعباس نے بے رخی اختیار کی اور ابن خلدون نے بھی سمجھ لیا کہ اب ان کا بجایہ میں رہنا ان کے حق میں نہیں ہے اور چغل خور انہیں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔

کچھ عرصہ بعد ابن خلدون نے ابوالعباس سے کہا کہ وہ اب کچھ دن آرام کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اس لیے ان کو بجایہ سے کہیں اور چلے جانے کی اجازت دی جائے۔

ابوالعباس بھی ان سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اس لیے انہیں بجایہ چھوڑ دینے کی اجازت مل گئی۔ اب ابن خلدون کی کوئی منزل نہیں تھی۔ یہ تھے اور افریقی قبائل تھے۔ ان کی شہرت تو ہر قبیلے میں پہنچی ہوئی تھی۔ یہ جس قبیلے میں بھی جاتے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا، بڑی خاطر مدارات ہوتیں۔ اب ابن خلدون ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں اور دوسرے سے تیسرے میں پہنچ جاتے۔ یہاں تک کہ وہ بیس کراہ نامی ایک بستی میں پہنچے اور یہیں ٹھہر گئے۔

بیس کراہ والوں نے ان کو اس لیے عزت اور آبرو سے مہمان بنا لیا کہ ان کے اس علاقے سے دیرینہ تعلقات تھے۔ یہاں کا حاکم بھی ان کے خاندان سے روابط رکھتا تھا۔ ابن خلدون نے اپنے گھر والوں کو بھی یہیں بلوا لیا اور یہاں انہوں نے چھ ماہ خاموشی سے گزار دیے لیکن خاموشی سے بیٹھے رہنا ابن خلدون کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے یہ کسی بھی جانب سے ملنے والے کسی اچانک پیغام کے منتظر رہے۔

اکثر و بیشتر ملنے جلنے والوں سے کہتے تھے کہ انہیں حکمرانوں کی صحبت راس نہیں آتی اور ان کے حاسدان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے، اس لیے وہ حکومت اور اقتدار سے دور رہ کے صرف علمی کاموں میں مشغول ہو جانا چاہتے ہیں۔

ان کے دوست مشورہ دیتے کہ وہ افریقا کی کئی حکومتوں سے اب بھی رابطہ قائم کر سکتے ہیں جو انہیں بہت عزت اور آبرو سے اپنے دربار میں لے لیں گے لیکن ابن خلدون کے تجربات بتا رہے تھے کہ اگر ان پر کوئی بادشاہ مہربان ہو جاتا ہے تو اس کا وزیر ان کے خلاف ہو جاتا ہے۔ اگر وزیر دوست بنتا ہے تو درباری حسد کرتے ہیں اور سازشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ان کی چغلیاں کھائی جاتی ہیں اور ایسا ماحول پیدا کر دیا جاتا ہے کہ ابن خلدون کو خود ہی پیچھے ہٹ جانا پڑتا ہے۔

ابھی وہ انہی خیالوں میں گم تھے کہ تلمسان کے حکمران ابوحمو کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ یہ حکمران تلمسان کے سارے قبائل کو متحد کر چکا تھا مگر ایک قبیلہ ابھی تک ابوحمو کی مخالفت کر رہا تھا۔

ابن خلدون کو سلطان ابوحمو کے پاس جانا پڑا اور یہ دونوں سر جوڑ کے بیٹھے۔ ابوحمو نے اپنی پریشانیاں بیان کیں اور کہا۔ ''میں آپ کو منصب حجابت دینا چاہتا ہوں۔''

ابن خلدون نے پوری بات سنے بغیر ہی جواب دیا۔ ''اب میں حکومت اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتا ہوں اس لیے میں حجابت کا منصب نہیں قبول کروں گا۔''

امیر تلمسان ابوحمو نے جب زیادہ دباؤ ڈالا تو انہوں نے کہا۔ ''میں تیری خاطر دور رہ کے تیری خدمت کرتا رہوں گا اور اب میں کسی دربار سے وابستہ رہنے کو پسند نہیں کرتا۔''

ابوحمو سلطان نے کہا۔ ''میرے لیے یہ بھی غنیمت ہے کہ تو دربار سے دور رہتے ہوئے حکومتی فرائض انجام دیتا رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو یہاں کے قبائلیوں کو میرے حق میں ہموار رکھے، میں ان کی متحدہ مخالفت سے خوفزدہ رہتا ہوں۔''

اب ابن خلدون کا طریقہ کار بدل گیا تھا۔ یہ قبائل میں

دورے کرتے رہتے اور ان کو ابوحمود کی حمایت میں لینے کے لیے موثر تقریریں کرتے، عمدہ دلیلیں دیتے، فائدے بتاتے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی پیش گوئی کرتے۔

اس طریقۂ کار سے خود ابن خلدون کو یہ فائدہ پہنچا کہ ان کے اثرات قبائل میں بہت زیادہ بڑھ گئے اور افریقا کے دوسرے سلاطین بھی ان کی خدمات حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے۔

☆☆☆

اب ابن خلدون سلاطینِ وقت سے دلبرداشتہ تھے اور انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی زندگی علمی مشاغل میں گزاریں گے۔ جب ابوحمود کو یہ معلوم ہوا کہ ابن خلدون اس کی خدمات انجام نہیں دے رہے ہیں تو اس نے ان کے پیچھے اپنے فوجی لگا دیے کہ وہ ابن خلدون کو گرفتار کر کے ابوحمود کے پاس پہنچا دیں۔

جو قبائلی ان کا ساتھ دے رہے تھے انہوں نے مشورہ دیا کہ اب ابن خلدون کو عریف نامی قبیلے میں پناہ لینی چاہیے۔ یہ قبیلہ ابن سلامہ قلعے میں آباد ہے اور یہ بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے محفوظ بھی تھا۔ راستے میں ابن خلدون کو بہت پریشانیاں اٹھانا پڑیں۔ ابوحمود کے آدمیوں نے ان کا پیچھا کیا۔ ان کا ساتھ دینے والوں نے بھی بے رخی اختیار کی۔ ابوحمود کے آدمیوں سے بچے تو رہزنوں نے لوٹ لیا اور ان کا گھوڑا بھی چھن گیا اور جسم کے کپڑے بھی رہزنوں کے قبضے میں چلے گئے۔ یہ پیادہ پا سفر کرتے ہوئے ایک اجنبی قبیلے میں پہنچے۔ جب انہیں ابن خلدون کے بارے میں معلوم ہوا تو ان لوگوں نے انہیں بہت آسائشیں پہنچائیں اور ابن خلدون ان کی مدد سے بنوعریف میں پہنچ گئے۔

بلندی پر واقع قلعے میں ان کی اتنی عزت کی گئی اور انہیں اتنے آرام سے رکھا گیا کہ ابن خلدون کو شاید زندگی میں اس سے پہلے اتنا سکون نہیں ملا تھا۔

ان لوگوں نے ابن خلدون کے خاندان والوں کو بھی یہیں بلوالیا۔ اس وقت ابن خلدون کی عمر 42 سال کی تھی، انہوں نے یہیں اپنی مشہور تصنیف مقدمۂ ابن خلدون لکھی اور اس کام میں انہیں چار سال لگے۔ اب وہ اپنی تاریخ کا کام شروع کرنے والے تھے مگر اس کے لیے انہیں دوسری بہت سی لکھی ہوئی تاریخوں کی ضرورت پیش آئی اور یہ کام ابن سلامہ کے قلعے میں بیٹھ کر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ انہیں ایک بار پھر تیونس جانے کی ضرورت پیش آئی۔ وہاں اس وقت بھی ابوالعباس کی حکومت تھی اور وہ ابوالعباس سے اس لیے خوفزدہ تھے کہ تیونس پہنچتے ہی ان کو دوبارہ حکومتی مشاغل میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ جبکہ اب یہ اپنی تاریخ کو مکمل کرنا چاہتے تھے لیکن تیونس جائے بغیر چارہ بھی نہ تھا انہوں نے تیونس کے سلطان ابوالعباس کو ایک خط لکھا کہ وہ اپنی تاریخ کی تکمیل کے لیے تیونس میں رہنا چاہتے ہیں کیونکہ وہاں انہیں تاریخی ماخذ مل جائیں گے۔

ابوالعباس نے ان کو تیونس بلوالیا اور بہت اچھی طرح پیش آیا ان کے وظائف مقرر کیے اور بہت کچھ دے کر ان کی دلجوئی کی۔ ابن خلدون نے سلطان ابوالعباس کو بھی آگاہ کیا کہ اب وہ صرف علمی مشاغل میں دلچسپی رکھتے ہیں اس لیے حکومت کا کوئی عہدہ قبول نہیں کریں گے۔ انہیں اس کی بھی اجازت مل گئی اور یہ اپنے تاریخی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ تیونس کا مفتی ابن عرفہ ابن خلدون کی موجودگی میں اپنے لیے خطرات محسوس کر رہا تھا، اس نے ان کے خلاف ایسی مہم چلائی کہ کچھ لوگ بھی ابن خلدون کے خلاف ہو گئے اور ابوالعباس کے مزاج میں بھی تغیر پیدا ہوا، انہوں نے بگڑے ہوئے حالات دیکھ کر سلطان ابوالعباس سے حج پر جانے کی اجازت طلب کی۔

ابن خلدون کا خاندان ابھی تیونس نہیں پہنچا تھا اور انہیں اپنا یہ سفر سمندری راستے سے طے کرنا تھا چنانچہ ابن خلدون کو اب اپنے خاندان کا بھی انتظار تھا کہ اچانک انہیں یہ منحوس خبر ملی کہ جس جہاز سے ان کا خاندان آرہا تھا وہ سمندر میں ڈوب گیا اور اس کے سارے مسافر سمندر کی مچھلیوں کی غذا بن گئے۔

اس سانحے نے ابن خلدون کو دنیا سے بالکل بے زار کر دیا اور ابن خلدون کی زبان سے صرف ایک جملہ نکلا۔
"اس حادثے سے میں مال، خوش بختی اور اولاد سب سے محروم ہو گیا ہوں۔"

انہیں حج پر جانے کی اجازت تو مل چکی تھی اس لیے وہ سعودی عرب چلے گئے اور یہ کچھ عرصہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں رہ کے سکون کے متلاشی رہے پھر انہیں مصر میں طلب کیا گیا۔ سلطان الظاہر انہیں اپنے دربار سے وابستہ کرلینا چاہتا تھا مگر انہیں درس و تدریس کا مشغلہ پسند آیا۔ انہیں جامعہ ازہر میں فقہ مالکی کے درس پر مامور کیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر 50 سال ہو چکی تھی۔ یہ درس و تدریس کے فرائض کے ساتھ اپنی تاریخ بھی مکمل کرتے رہے۔

اسی دوران میں سلطان الظاہر کو خبر ملی کہ تیمور تاتاری نے حلب پر قبضہ کرلیا ہے اور اب وہ دمشق کی طرف بڑھ رہا ہے۔

سلطان الظاہر نے فوج ترتیب دی، اپنے ساتھ کئی علما کو

بھی لیا۔ قاضی بھی اس کے ساتھ تھے اور ابن خلدون بھی سلطان الظاہر کے ہم سفر رہے۔ دمشق کے لوگ تیمور لنگ سے بہت زیادہ خوفزدہ تھے اور انہیں معلوم تھا کہ اگر تیمور لنگ کا مقابلہ کیا گیا تو یہ تاتاری سیلاب دمشق کو تباہ و برباد کر دے گا۔

مصری فوج کی آمد کی خبریں دمشق والوں کے لیے وجۂ سکون بن گئیں لیکن سلطان الظاہر کو راستے میں قاہرہ کی طرف سے یہ خبر ملی کہ سلطان کی عدم موجودگی میں قاہرہ میں بغاوت ہونے والی ہے اور حکومت کے نکل جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ سلطان الظاہر کو اپنی فوج کے ساتھ قاہرہ واپس جانا پڑا مگر اس کے ساتھ آئے ہوئے علما، قاضی اور ابن خلدون کو دمشق اس غرض سے بھیج دیا گیا کہ یہ لوگ تیمور کو اپنی باتوں سے قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ دمشق کو تباہ و برباد نہ کرے۔ ابن خلدون سے لوگوں کو بڑی امیدیں تھیں کہ یہ شخص تیمور لنگ کو اپنی سحر بیانی سے قائل کر سکتا تھا اور تیمور لنگ کو بہت کچھ دے کے دمشق کو بربادی سے بچا لیا جائے گا۔

یہ لوگ دمشق میں داخل ہوئے اور کچھ ہی دنوں بعد تیمور لنگ نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کے تمام دروازے بند کر لیے گئے اور قلعے کی فصیل پر تیر انداز بٹھا دیے گئے۔

اب کسی کا شہر سے نکل کے تیمور لنگ سے بات کرنا بھی ناممکن ہو گیا۔

ابن خلدون نے ایک ٹوکرے میں بیٹھ کے رسے کے ذریعے نیچے اتر کے تیمور سے ملاقات کی۔

اس وقت تک تیمور کو ابن خلدون کے بارے میں بتا دیا گیا۔ وہ ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ تیمور لنگ بھی ابن خلدون سے اچھی طرح واقف تھے، دونوں میں پر لطف باتیں ہوئیں، دونوں کے درمیان ترجمانی کے فرائض سمرقند کے فقیہ عبدالجبار بن نعمان انجام دیتے رہے۔

ابن خلدون ہی کی طرح کئی دوسرے علما بھی تیمور سے ملے اور ان سے تیمور لنگ کو بہت سے مال و زر کی پیشکش بھی ہوئی کہ وہ اس مال و زر کے عوض دمشق کو امان دیدے لیکن تیمور نے کسی عالم کی بات بھی نہیں مانی، دوسری طرف وہ ابن خلدون کی خاطر مدارات میں مشغول رہا۔ تیمور کو ابن خلدون کی بے باکی اور غیر معمولی علم نے بہت متاثر کیا اور اس نے ابن خلدون سے درخواست کی کہ وہ اس کے لیے افریقہ کی تاریخ مرتب کریں۔ اس کام کے لیے ابن خلدون کو ایک شاندار خیمہ دیا گیا اور وہاں ساری ضروری چیزیں بھی مہیا کر دی گئیں۔

ابن خلدون نے تیمور کی عزت افزائی، خاطر مدارات اور آسائشوں کے درمیان وہ کارِ ضروری بھلا دیا جس کے لیے انہیں تیمور لنگ سے ملاقات کرنا پڑی تھی۔

اب ابن خلدون تیمور لنگ کے لیے افریقہ کی تاریخ تیار کر رہے تھے۔ اس اہم کام میں ابن خلدون کو ایک ماہ بہت زیادہ مشغول رہنا پڑا اور دوسری طرف تیمور لنگ دمشق میں داخل ہو گیا اور پورے شہر کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا، ادھر ابن خلدون کو اس تباہی اور بربادی کی خبر تک نہ ہوئی۔

دمشق والوں کو ابن خلدون کے رویے سے بڑی تکلیف پہنچی۔

دمشق سے یہ دوبارہ قاہرہ واپس گئے اور اب انہوں نے اپنا سارا وقت جامعہ ازہر کے طلبا کی تدریس کے لیے وقف کر دیا تھا اور ساتھ ہی اپنی تاریخ بھی مکمل کرتے رہے۔ 807 ہجری (1405 عیسوی) تک علمی فرائض انجام دینے کے بعد وہ وفات پا گئے اور قاہرہ میں ان کی تدفین ہوئی۔ ان کے معاصرین نے بتایا ہے کہ انہیں مقبرۂ صوفیا میں دفن کیا گیا۔

ابن خلدون نے جس دور میں زندگی بسر کی وہ انتہائی زوال پذیر اور پر از تغیر زمانہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے حکمران آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اندلس میں بھی نااتفاقیاں عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ افریقہ میں بھی قرار نہیں تھا اور مسلمان حکمران آپس ہی میں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ ان حالات میں ابن خلدون کو جو کچھ کرنا پڑا اسے مورخین ابن خلدون کی سازشیں قرار دیتے ہیں جبکہ جن حالات میں ابن خلدون جیسا نابغۂ روزگار زندگی بسر کر رہا تھا، ان کی جگہ جو بھی ہوتا وہ ان سے زیادہ سازشیں کرتا اور سازشوں کا شکار ہوتا۔ انہیں ان کے حاسدوں نے بھی بہت پریشان کیا مگر ابن خلدون کو ان کے کچھ غلط فیصلوں نے بھی بہت نقصان پہنچایا لیکن آج ابن خلدون کو لوگ ان کے مقدمۂ ابن خلدون اور تاریخ کے حوالے سے جانتے ہیں اور انہیں ایک انتہائی بلند و بالا مقام بھی حاصل ہے جبکہ انہیں بابائے تاریخ کا خطاب بھی حاصل ہے۔

☆☆☆

مضمون کے ماخذ

مقدمہ ابن خلدون۔ الاحاطہ فی غرناطہ۔ افکار ابن خلدون۔ ابن خلدون۔ الخطیب۔ مولانا محمد حنیف ندوی۔ فلاسفۂ الاسلام۔ تاریخ ادب عربی۔ معجم البلدان۔ محمد لطفی جمعہ۔ ترجمہ عبدالرحمن سورتی۔ یاقوت حموی

اجودھن کا درویش

ضیا تسنیم بلگرامی

رات کی تاریکی میں سبھی خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ نصف شب گزر چکی تھی۔ ایک ہندو چور ہوشیاری سے مکان کے اندر داخل ہوگیا۔ دبے قدموں پنجوں کے بل چلتا ہوا، مختلف کمروں سے گزر کر جب وہ ایک کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ایک نوجوان حسین عورت کو مصلّے پر تہجّد کی نماز میں سربسجود دیکھا۔ چور ٹھٹھک کر کونے میں کھڑا ہوگیا۔ جب عورت نے سجدے سے سر اُٹھایا تو چور نے عورت کی نصف پیشانی اور دونوں کانوں کو دوپٹے میں چھپا ہوا دیکھا۔ سرِدست چوری کرنے کا موقع نہ تھا۔ چور نے سوچا کہ اس کمرے کو چھوڑ کر دوسرے کا رُخ کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر جب اُس نے دوسرے کمرے میں جانے کے لیے اپنے قدم اٹھائے تو اسے ایسا محسوس ہُوا جیسے اُس کی بینائی آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی ہے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملیں لیکن روشنی واپس نہ آئی اور آخر کمرے کی ہر شے تاریکی میں ڈوب گئی اور چور اندھا ہوگیا۔ وہ گھبرا گیا۔ کیونکہ اب وہ بھاگ بھی نہ سکتا تھا ایسا کیوں ہوا؟ چور کچھ دیر تک اس پر غور کرتا رہا پھر معلوم نہیں اُس کے جی میں کیا آئی کہ وہ آہستہ آہستہ تہجّد گزار عورت کے پاس پہنچا اور سرگوشی میں عرض کیا۔ "دیوی! تمھاری پوترتا میں کوئی شبہ نہیں میری گناہ گار نظروں نے تمھیں دیکھ کر، خود کو بینائی سے محروم کرلیا ہے۔ میں اس گھر میں چوری کی نیّت سے آیا تھا لیکن اب واپس جانا تک محال ہے' اپنے خُدا سے میرے حق میں دُعا کرو کہ میری بینائی مجھے واپس مل جائے' اب میں زندگی بھر چوری نہ کروں گا۔"

عورت نے سلام پھیرنے کے بعد نابینا چور کو دیکھا تیل ملے ہُوئے دھوتی بند سیاہ جسم چور گردن جھکائے اس کے داہنی جانب مؤدب کھڑا ہُوا تھا۔ معاملہ سمجھ میں آگیا۔ عورت ایک بار پھر سجدے میں چلی گئی اور اپنے رب سے گڑگڑا گڑگڑا کر چور کی بینائی کی دُعائیں مانگنے لگی اور پھر چور کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی بینائی واقعی واپس آرہی ہے اور جلد وہ ایک بار پھر دُنیا دیکھنے کے لائق ہوگیا۔

بینائی کے واپس آتے ہی چور وہاں سے چلا گیا لیکن دوسرے دن وہ ان بی بی کی خدمت میں پھر حاضر ہوا اور رات کا واقعہ بیان کرکے اسلام قبول کرلیا۔ عبداللہ نام اختیار کیا اور ان کی خدمت گزاری میں تیس سال گزار دیے۔

جن دنوں یہ واقعہ پیش آیا تھا اُن دنوں اُن خاتون کے شکم میں ایک بچّہ پرورش پا رہا تھا۔ اس بچّے کی نسل کے تینتیسویں واسطے میں حضرت عمر فاروقؓ کا نام آتا ہے جنھوں نے کبھی یہ فرمایا تھا کہ "آدمی اگر بُرا ہے تو وہ اپنی ماں کے پیٹ سے بُرا ہے اور اگر اچھّا ہے تو اپنی ماں کے پیٹ سے اچھا ہے۔" یعنی آنے والا اپنی فطری اچھّائیاں یا بُرائیاں والدین سے ورثے میں لے کر آتا ہے چنانچہ خاتون کے شکم میں پرورش پانے والا بچّہ بعد میں مادر زاد ولی ثابت ہُوا۔ یہ اُسی کی کرامت کا ہلکا سا ظہور تھا کہ چور نابینا بھی ہوا اور بینا بھی ہوگیا۔

چند ہی دنوں بعد اسی نوع کا ایک دوسرا واقعہ پیش آیا۔ پڑوس میں بیری کا پیڑ لگا ہوا تھا۔ بیر پک چکے تھے۔ ہوا کے جھونکے بیروں کو زمین پر بکھیر رہے تھے۔ خاتون نے ان سفیدی مائل زرد زرد بیروں کو اُٹھایا اور کھانا شروع کر دیا۔ اُن کا حلق سے اُترنا تھا کہ شکم میں بچّے نے حرکت کرنی شروع کر دی اور شدّتِ کرب سے خاتون بے چین ہو گئیں۔ طبیعت متلانے لگی اور پھر اس زور کی قے ہوئی کہ جو کچھ کھایا تھا سب نکل گیا۔ خاتون نے اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کیا لیکن بچّے کی پیدائش کے بعد جب وہ قدرے شعور کو پہنچا تو ماں نے کسی موقع پر اُس سے کہا "بیٹے! تو یقین کر، جب تو میرے شکم میں تھا تو میں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ کوئی مشتبہ چیز میرے پیٹ میں نہ جائے۔"

لڑکے نے ایک نظر ماں کو دیکھا اور عرض کیا "لیکن ماں! ایک بار آپ نے اپنی پڑوسن کی بیری کے چند بیر اس کی اجازت اور منظوری کے بغیر کھا لیے تھے اور اگر اُس وقت میں سُستی سے کام لیتا تو میرے جسم میں یقیناً مشتبہ خون گردش کر رہا ہوتا۔"

ماں بیٹے کی یہ بات سُن کر دنگ رہ گئی۔

یہ بچّہ آگے چل کر شیخ کبیر بابا فریدؒ گنج شکر کہلایا۔ نام فریدالدین مسعود تھا اور انھیں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی جانشینی کا شرف حاصل ہُوا۔ ان کے آباو اجداد چنگیزی حملوں کے دوران کابل سے ہجرت کر کے برصغیر میں داخل ہوئے اور ملتان کے قریب کھوتوال میں آباد ہو گئے۔ بابا فریدؒ یہیں ۵۸۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ سال تک ملتان میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یہیں مسجد میں خواجہ بختیار کاکیؒ سے ملاقات ہوئی اور اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُنھی کے ہو رہے۔

خواجہ بختیار کاکیؒ نے فرمایا "فرید! بے علم زاہد شیطان کے ہاتھوں مسخر ہو جاتا ہے۔ جا علم حاصل کر۔"

بابا فرید قندھار چلے گئے اور وہاں شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ بہاءالدینؒ ذکریا ملتانی اور شیخ فریدالدین عطارؒ نیشاپوری وغیرہ سے پانچ سال تک تحصیل علوم کرتے رہے۔ یہیں ایک موقع پر حضرت بہاءالدینؒ ذکریا ملتانی نے بابا فریدؒ سے فرمایا "اے فرزند! پردہ پوشی کا دوسرا نام درویشی ہے۔ خرقہ پوشی کو درویشی نہیں کہہ سکتے۔"

کہتے ہیں کہ ایک بار حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت بختیار کاکیؒ کی خانقاہ میں ٹھہرے تو وہاں انھیں تمام خلفا سے ملایا گیا۔ ان میں بابا فریدؒ نہیں تھے۔ وہ چلّہ کشی کے سلسلے میں گوشہ نشین تھے۔ سب سے ملنے کے بعد حضرت خواجہ چشتیؒ نے دریافت فرمایا "قطب الدین! کیا کوئی خلیفہ یا مُرید اور بھی ہے جو باقی رہ گیا ہے؟"

بختیار کاکیؒ نے جواب دیا "حضور! مسعود نامی فقیر چلّے میں بیٹھا ہُوا ہے اس لیے وہ حاضر نہیں ہو سکا۔"

خواجہ غریب نوازؒ بختیار کاکیؒ کو لے کر بابا فریدؒ کے پاس پہنچ گئے۔ بابا فریدؒ ضعف اور نقاہت کی وجہ سے احتراماً کھڑے بھی نہ ہو سکے۔ اُٹھنے کی کوشش کی۔ آنکھیں بھر آئیں۔ لڑکھڑا کر حضرت خواجہ کے قدموں میں گر گئے۔ انھوں نے ازراہِ شفقت اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بختیار کاکیؒ سے فرمایا "بختیار! تم اس جوان کو کب تک اس ریاضت اور چلّہ کشی میں مصروف رکھو گے۔ جو کچھ دینا ہے بخش دو۔"

بختیار کاکیؒ نے فرمایا "حضرت! میری کیا مجال ہے کہ آپ کی موجودگی میں کچھ دے سکوں۔ آپ کی نظرِ کرم ہی اس کے لیے کافی ہوگی۔"

حضرت خواجہ نے فرمایا "بختیار! اس کا تعلق تم سے ہے۔ یہ جو کچھ پائے گا تمھی سے پائے گا۔"

پھر آپ نے قبلہ رُو ہو کر بابا فریدؒ کے حق میں دُعائیں فرمائیں۔ یہ ان دُعاؤں ہی کا اثر تھا کہ آگے چل کر بابا فریدؒ نے قطب ابدال یا قطب اکبر کا مرتبہ حاصل کیا۔ تصوّف کی اصطلاح میں قطب اس کو کہتے ہیں جو کسی ولی کو ولایت سے معزول اور دوسرے کو اُس کی جگہ مقرر کر سکتا ہے، اور قطب ابدال یا قطب اکبر قطب کے اُوپر ہوتا ہے وہ اس قطب کو معزول کر سکتا ہے۔ بابا فریدؒ قطب اکبر تھے۔

بختیار کاکیؒ کی وفات کے بعد بابا فریدؒ اجودھن تشریف لے گئے۔ اجودھن کو آج کل پاک پٹن کہا جاتا ہے۔ اس جگہ کو آپ نے اس لیے پسند فرمایا تھا کہ یہاں کے لوگ بداخلاق، بدمزاج اور زاہدوں اور عالموں سے نفور رہتے تھے۔ جب آپ نے یہاں کی اقامت اختیار کی تو اس جگہ درختوں کے ہجوم میں کیڑے مکوڑوں کی بہتات تھی اور یہ زہریلے کیڑے تھے۔

آپ اربابِ ثروت اور متوسلینِ حکومت سے ہمیشہ دُور رہے۔ شاہانِ وقت اور لاتعداد اُمرا کی عقیدت حاصل ہونے کے باوجود آپ اُن سے لاتعلق رہے اور اشاعتِ اسلام میں جتنی کامیابی آپ نے حاصل کی

اتنی آپ کے مرشد خواجہ بختیار کاکیؒ کو بھی نہ حاصل ہوئی۔ مغربی پنجاب کے سیال راجپوت اور وٹو قبائل آپ ہی کے ہاتھ پر مسلمان ہوتے تھے۔

آپ کی کرامتیں بہت زیادہ ہیں۔ اجودھن کا قاضی آپ سے بلا وجہ مخاصمت اور عناد رکھتا تھا اور مختلف اوقات میں طرح طرح سے ستاتا رہتا۔ بابا فریدؒ کی عادت تھی کہ وہ دو دو گھنٹے سجدے میں پڑے رہتے تھے جب سردیوں میں آپ اس طرح طویل سجدے میں جاتے تو آس پاس جو مُرید بھی موجود ہوتا آپ پر پوستین ڈال دیتا تاکہ آپ سردی سے محفوظ رہیں۔ ایک دن شیخ نظام الدین اولیاؒ تنہا موجود تھے۔ انھوں نے بابا فریدؒ پر پوستین ڈال دی اور ایک طرف ادب سے بیٹھ گئے۔ اس عالم میں مسجد میں چمڑے کا لباس زیب تن کیے ایک قلندر داخل ہوا اور با آواز بلند بابا فرید کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

بابا فریدؒ نے سجدے سے سر اُٹھائے بغیر ہی دریافت فرمایا۔

"کوئی ہے ؟"

حضرت نظام الدینؒ نے جواب دیا "غلام نظام الدین حاضر ہے"

ارشاد ہوا "میرے قریب جو قلندر کھڑا ہے، اس کی کمر زنجیر سے جکڑی ہوئی ہے!"

حضرت نظام الدینؒ نے جواب دیا "بجا ارشاد فرمایا"

پھر ارشاد ہوا "اس کے کانوں میں ہاتھی دانت کے سفید حلقے پڑے ہوئے ہیں ؟"

محبوب الٰہی نے فرمایا "ہاں ہیں"

محبوب الٰہی نے اس قلندر کے چہرے کو بغور دیکھا تو وہ دھواں دھواں ہوتا محسوس ہوا۔

بابا فریدؒ نے اچانک فرمایا "نظام الدین! ذرا اس کی کمر تو دیکھ۔ وہاں ایک چھُری اڑسی ہوئی ہے۔ اس شخص سے کہو کہ یہاں سے دفع ہو جا ورنہ بلاوجہ فضیحت کا شکار ہوگا"

قلندر خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اجودھن کے قاضی نے لمبی رقم دے کر بابا فریدؒ کو شہید کر دینے کی غرض سے بھیجا تھا۔ قاضی کی حمایت میں شہر کے حاکم نے بھی بعد میں بابا فریدؒ کو ستانے کے طریقے اختیار کیے۔ وہ آپ کے صاحبزادوں کو ستاتا۔ ایک دن بابا فریدؒ کے بڑے صاحبزادے نے آزردہ ہو کر باپ سے عرض کیا "باوا جان! ہمیں آپ کی بزرگی سے یہ فائدہ پہنچا ہے کہ رات دن حاکم کی طرف سے خوفزدہ رہتے ہیں اور ہم سب اپنا چین و سکون کھو چکے ہیں!"

بابا فریدؒ آزردہ ہو گئے۔ ہاتھ میں جو عصا تھا اُسے زور سے زمین پر دے مارا۔ اُسی وقت حاکم کے پیٹ میں شدت کا درد اُٹھا۔ اُس نے اپنے خدام کو حکم دیا کہ اسی وقت مجھے بابا فریدؒ کی خدمت میں لے چلو۔ خدام لے چلے لیکن راستے ہی میں اُس کا انتقال ہو گیا۔

استغنا اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ سلطان ناصر الدین محمود نے اُدھر سے گزرتے ہوئے اپنے نائب سلطنت غیاث الدین بلبن کے ہاتھ زرِ نقد کی وافر مقدار اور چار دیہاتوں کا جاگیر نامہ روانہ کیا۔ غیاث الدین بلبن نے جب یہ چیزیں بابا فریدؒ کے سامنے رکھیں تو آپ نے دریافت کیا "کہ یہ سب کس لیے ؟"

بلبن نے عرض کیا "نقدی تو خانقاہ کے درویشوں کے لیے ہے اور جاگیر آپ کی اولاد کے لیے"

بابا فریدؒ نے نقدی تو اُسی وقت درویشوں میں تقسیم کر دی اور دیہاتوں کا جاگیر نامہ واپس فرماتے ہوئے کہا۔

"اسے واپس لے جاؤ کیونکہ اس کے دوسرے طالب بہت ہیں"

بابا فرید کا قول تھا کہ "بادشاہ، اُمرا اور مقربانِ بادشاہ کی صحبت فقرا کے لیے ہلاکت کا باعث ہوتی ہے"

غیاث الدین بلبن جب برسرِاقتدار آیا تو اس نے اپنی بیٹی کی شادی حضرت بابا فریدؒ سے کر دی۔

اجودھن کے قرب و جوار کے کسی موضع میں ایک روغن فروش مسلمان رہتا تھا۔ علاقے کے داروغہ نے کسی سبب سے اس موضع کو تاراج کر دیا اور اہالیانِ موضع کے بیوی بچوں کو اسیر کر لیا۔ ان میں روغن فروش کی عورت بھی شامل تھی۔ یہ عورت بہت خوبصورت تھی اور روغن فروش کا خیال تھا کہ عورت کا حُسن شاید اسے واپس نہ آنے دے۔ روغن فروش کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اُس کی عورت ہے کس کے قبضے میں۔ پریشان حال اور حواس باختہ وہ بابا فرید کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اُس کی روداد سُن کر سکوت فرمایا اور کچھ دیر بعد کہا۔

"تو تین دن یہاں رہ کر دیکھ کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے"

دوسرے دن کسی علاقے کے محرّر کو داروغہ کے سپاہی گرفتار کر کے لائے، محرّر نے سپاہیوں کی خوشامد درآمد کی کہ وہ کسی طرح بابا فریدؒ

ملاقات کرادیں۔ سپاہیوں نے ملا دیا۔ محرّر نے بابا فریدؒ سے اپنے حق میں دُعا کرنے کی استدعا کی۔ آپ نے فرمایا کہ "میں ایک شرط پر دُعا کر سکتا ہوں"

محرّر نے جواب دیا۔ "مجھے منظور ہے۔"

آپ نے کہا۔ "وہ شرط تو سن لے بغیر سنے کس طرح منظور کر سکتا ہے"

محرّر سراپا سوال اور تصویرِ انکسار بن گیا۔ عرض کیا۔ "ارشاد۔"

آپ نے فرمایا۔ "داروغہ نہ صرف تجھے بے گناہ قرار دے کر چھوڑ دے گا بلکہ خلعت اور ایک کنیز بھی عطا کرے گا۔ تو اس کنیز کو اپنے لیے حرام جانے گا اور اُسے اس روغن فروش کے حوالے کر دے گا۔"

محرّر نے وعدہ کر لیا۔

روغن فروش آگے بڑھا اور عرض کیا۔ "حضرت! مجھے اتنی مقدرت حاصل ہے کہ میں دس لونڈیاں خرید سکتا ہوں۔ اس ایک لونڈی کا ذکر کیا۔ خادم تو اپنی بیوی چاہتا ہے۔ داروغہ کی عطا کردہ کنیز نہیں۔"

بابا فرید نے تبسم فرمایا۔ "تو بیکار فکروں میں نہ پھنس اس محرّر کے ساتھ جا اور دیکھ کہ خدا کیا کرتا ہے۔"

جب یہ دونوں داروغہ کی ڈیوڑھی پر پہنچے تو روغن فروش ڈیوڑھی کے باہر ہی رہ گیا اور محرّر اندر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد جب وہ اندر سے برآمد ہوا تو بہت خوش تھا۔ داروغہ نے اُسے رہا کر دیا تھا۔ داروغہ کی عطا کردہ قیمتی خلعت محرّر کے جسم پر تھی اور ایک کنیز برقع پوش ساتھ ساتھ۔ محرّر نے روغن فروش کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔ "دوست! میں نے بابا فرید سے جو وعدہ کیا ہے اُسے پُورا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کنیز حاضر ہے اسے اپنے ساتھ لے جا۔"

اس عورت کی نظر جیسے ہی روغن فروش پر پڑی اُس نے نقاب اُلٹ دی، روغن فروش نے دیکھتے ہی پہچان لیا یہ اُس کی بیوی تھی۔ دونوں اسی وقت بابا فریدؒ کی خدمت میں پہنچے اور خود کو بابا کے قدموں میں گرا دیا اور دیر تک قدموں میں پڑے سسکتے رہے۔

کہتے ہیں آپ کو شیرینی بہت پسند تھی۔ ایک بار شکر کے بیوپاری گدھوں پر شکر کے بورے لادے ہوئے اُدھر سے گزرے آپ نے ان سے تھوڑی سی شکر طلب کی۔ بیوپاری نے جھوٹ بول دیا۔ کہنے لگا۔ "حضرت ان بوروں میں شکر نہیں نمک ہے!"

آپ نے لاپرواہی سے فرمایا۔ "خیر شکر نہیں تو نمک ہی ہوگا۔"

بیوپاری نے منزلِ مقصود پر پہنچ کر جب بوروں کو کھولا تو ان میں واقعی شکر کی جگہ نمک بھرا ہوا تھا۔ وہ پریشان، اُفتاں و خیزاں بابا فرید کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے جھوٹ کی معافی مانگی۔ آپ نے معاف کر دیا اور دُعا فرمائی کہ "نمک پھر شکر ہو جائے۔" دُعا قبول ہوئی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ کی والدہ نماز پڑھنے سے قبل مصری کی ڈلیاں مصلے کے نیچے رکھ دیا کرتی تھیں اور نماز پڑھ چکنے کے بعد اشارے سے بابا فرید کو بتا دیتی تھیں کہ مصری کی ڈلیاں مصلے کے نیچے سے نکال کر کھالو، یہ کھا لیا کرتے تھے۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ آپ کی والدہ مصری رکھنا بھولنے لگیں اور مصری کی ڈلیاں بدستور ملتی رہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اگر مٹی بھی آپ کی زبان سے چھو جاتی تھی تو شکر ہو جاتی تھی۔ اِسی وجہ سے آپ گنجِ شکر کہلائے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ "فقیر وہ ہے جسے دولتِ قناعت میسر ہو۔ ایسی قناعت کہ اگر اسے میسر ہو تو اُس کی بے پایاں خوشی نہ کرے اور اگر محروم ہو تو اُس کا غم نہ کرے۔" اس سلسلے میں آپ نے ایک واقعہ بیان کیا۔ فرمایا۔ "مالک بن دینار کسی درویش کی ملاقات کو گئے۔ اس درویش نے جَو کی دو روٹیاں سامنے رکھ دیں۔ کھانے پر پتہ چلا کہ ان میں نمک نہیں

ایک بدو نے

کسی کی زین چُرالی اور اُسے اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کے نیچے کمر سے باندھ لیا۔ اسی عالم میں نماز پڑھنے کے لیے وہ مسجد میں داخل ہُوا۔ اتفاق کی بات کہ امام نے سُورۃ الحمد کے بعد یہ آیت شروع کی۔

هَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ ۝ (لوگو! کیا تمہیں غاشیہ کا واقعہ معلوم ہے) یہ آیت اُس وقت نازل ہُوئی تھی۔ جب غاشیہ نامی مقام پر مسلمانوں کی وہاں کے مقامی قبائل سے جنگ ہوئی تھی اور اس جنگ میں مسلمانوں کی فتح نے غاشیہ والوں کو شرمندہ و نادم ہو جانے کے بعد مسلمان ہو جانے پر آمادہ کر دیا تھا۔ لیکن غاشیہ کے دوسرے معنی 'زین' کے بھی ہیں۔ جب امام نے غاشیہ کی آیت پڑھی تو بدّو چونکا اور آہستہ سے نیت توڑ کر کہا :

"امام تمہیں میرے معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔"

امام نے اسی آیت کا اگلا حصہ پڑھا۔ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ (اور اس کی وجہ سے کچھ کی گردنیں جھکنے والی ہیں) بدّو گھبرا کر صف سے باہر نکل گیا اور کہنے لگا "بخدا یہ امام تو غیب داں معلوم ہوتا ہے۔"

ہے۔ مالک بن دینار نے کہا "اگر ذرا سا نمک ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔"
درویش کی لڑکی مالک بن دینار کی یہ بات سن رہی تھی۔ اُس نے کہا "ذرا ٹھہرو، میں نمک لے کر ابھی حاضر ہوتی ہوں۔"

لڑکی نے گھر کا لوٹا بقال کی دکان پر گروی رکھ کر نمک حاصل کیا اور نمک مالک بن دینار کے آگے رکھ دیا۔ مالک بن دینار نے نمک کے ساتھ روٹی کھاتے ہوئے کہا "بس جناب! درویش کے لیے یہی کافی ہے۔ اسے اتنے ہی پر قناعت کرنی چاہیے۔"

لڑکی چپ نہ رہ سکی۔ مالک بن دینار کے قدموں میں جھک گئی اور عرض کیا "اے خواجہ! اگر آپ میں قناعت ہوتی تو ہمارا لوٹا بقال کی دکان پر گروی نہ ہوتا۔ اے مالک! آج ہمیں سترہ برس گزر چکے ہیں کہ نمک سے محروم ہیں لیکن تم ایک وقت بھی بغیر نمک کے نہ گزار سکے۔ قناعت وہ نہیں جو تم بیان کرتے ہو قناعت یہ ہے جو میں نے بیان کی۔"

بابا فرید نے محرم کی پانچ تاریخ کو عشا کے بعد ۶۵۹ھ میں دوشنبے کے دن وفات پائی۔ آپ نے مختلف مجلسوں میں فرمایا۔

"عقل مند وہ ہے جو کسی شے پر مغرور نہ ہو۔"

"غنی وہ ہے جو قانع ہو۔"

"ٹھنڈے آدمیوں میں گرم باتیں نہ بیان کرو۔"

"خود ہی اپنا پردہ کھول دے تاکہ دوسرے تیری پردہ دری نہ کر سکیں۔"

"اللہ تعالیٰ سے معاملات درست رکھو۔ وہ جو کچھ دے دیتا ہے اُسے کوئی لے نہیں سکتا اور جس سے وہ لے لیتا ہے اُسے کوئی دے نہیں سکتا۔ اُس کے ہاں نہ رشوت چلتی ہے نہ سفارش۔"

"جو بات کہو سوچ سمجھ کر کہو۔ دنیا کو بازیچہ دیوانہ نہ بناؤ۔"

"نہ اتنے تلخ بنو کہ لوگ تم سے بھاگنے لگیں۔ نہ اتنے میٹھے بنو کہ لوگ نوش کر جائیں۔ بین بین رہو۔"

"دشمن پر کبھی اعتماد نہ کرو۔"

"سب سے بڑا دشمن نفس شیطانی ہے جس نے اُس کا کہا کیا وہ دونوں جہان سے گیا۔"

"جو خود سے ڈرے اُس سے ڈرتے رہنا چاہیے۔"

آپ کی زندگی ہی میں خلافت کے لیے کئی بزرگوں کے نام لیے جاتے تھے۔ ان میں سے دو کے نام یقینی طور پر زبان پر آتے تھے۔
ایک تو سید علاء الدین علی احمد صابر کلیری تھے جو بابا فرید کے حقیقی بھانجے تھے اور بہن بڑی طرح سر رہتی تھیں کہ انھیں خلیفہ بنایا جائے۔ بابا فرید جب کسی کو کسی منصب کا پروانہ عطا فرماتے تھے تو اُسے ہانسی کے قطب جمال الدین کے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور جب جمال الدین ہانسوی اس پر اپنی مہر لگا دیتے تھے تو گویا وہ شخص اپنے منصب پر فائز جانا جاتا تھا۔ چنانچہ جب بابا فرید نے پروانہ قطبیت دے کر اپنے بھانجے صابر کلیری کو جمال الدین ہانسوی کے پاس بھیجا تو انھوں نے ناگواری سے صابر کلیری کا استقبال کیا۔ رات ہو چکی تھی۔ جمال الدین ہانسوی نے کہا کہ "چراغ موجود نہیں ہے، صبح مہر لگا دوں گا۔"

صابر کلیری صاحب مُصر ہوئے اور اسی وقت چراغ منگوایا جو آتے آتے ہوا کے جھونکے سے بجھ گیا۔ صابر کلیری نے کچھ پڑھ کر اپنی انگشتِ شہادت پر دم کیا جو چراغ کی طرح روشن ہو گئی۔

جمال الدین ہانسوی نے غصے میں فرمایا "دہلی کے لوگ تمہارے اس جلال، عجلت اور آتش مزاجی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ تم تو انھیں کسی وقت بھی جلا کر خاک کر سکتے ہو!" یہ کہہ کر فرمانِ قطبیت چاک کر دیا۔

صابر کلیری جوش میں آ گئے اور جلال میں فرمایا "اگر آپ نے فرمانِ قطبیت چاک کر ڈالا تو کوئی پروا نہیں۔ میں نے بھی آپ کی قطبیت کے سلسلے کو چاک کر دیا۔ آپ اپنے خاندان میں آخری قطب ہیں۔"

جس وقت یہ جنگ ہو رہی تھی بابا فرید وضو فرما رہے تھے۔ آپ نے اپنے مریدوں سے فرمایا "خدا خیر کرے دو زبردست پہلوان نبرد آزما ہیں۔ دیکھو جیت کس کی ہوتی ہے۔"

جب صابر کلیری واپس پہنچے اور بابا فرید کے روبرو ساری روداد بیان کی اور شکایتاً کہا کہ "جمال الدین ہانسوی نے فرمانِ قطبیت چاک کر دیا ہے اب کیا صورت رہے گی؟"

بابا فرید نے افسوس سے فرمایا "احمد علی افسوس کہ جس فرمان کو جمال نے پھاڑ دیا، فرید اُسے نہیں سی سکتا۔ اب تو وہ پھٹا ہی رہے گا" اور بعد میں یہ فرمانِ قطبیت حضرت نظام الدین اولیا کے نام جاری ہوا اور جمال الدین ہانسوی نے فرمانِ قطبیت کے نیچے یہ شعر لکھ کر اپنی مہر ثبت کر دی۔

ہزاراں درود و ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردی بہ گوہر شناس

اسحاق اخرس

ضیاء تسنیم بلگرامی

عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے عہد کا فتنہ، جو برسوں اصفہان، مسقط وعمان اور بصرہ کو اپنی لپیٹ میں لیے رہا۔ اس کے منصوبہ ساز دماغ نے ایک نادر منصوبہ بندی کی ۔۔۔ وہ اس پر بھرپور دس سال تک عمل پیرا رہا اور اپنے عہد کے بڑے بڑوں کو شکار کر لیا۔ اس کو انسانی ذہنوں اور بشری نفسیات کا گہرا ادراک وشعور حاصل تھا اور اس نے کچھ اس طرح دام تزویر بچھایا کہ ہزاروں عوام اور خواص اس کے پیروکار اور مبلغ ہوگئے۔ اس نے اسلامی بنیادی عقائد میں دراڑیں ڈال دیں۔ بہتوں کے پائے اثبات میں لرزش پیدا ہوگئی۔

اسحاق اخرس نے نبی بننے کے لیے جو تدابیر اور طریقے اختیار کیے، ان میں ایک بات نظرانداز کر گیا اور یہی وہ بات ہے جس کو اس قسم کے لوگ اکثر نظرانداز کرتے رہے ہیں۔ یہ جھوٹے نبی لامرکزیت کا شکار رہے۔ ان کے پیروؤں کو کبھی کوئی مرکز نہیں مل سکا اور یہ رفتہ رفتہ فنا ہوتے چلے گئے۔ اسحاق اخرس بھی اس کا شکار ہوا اور فنا ہو گیا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ دنیا میں آج بھی کہیں کہیں اس کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

ایک عجیب وغریب شخص کی روداد، ایک گمراہ کا تذکرہ

یہ شخص ۱۳۵ھ میں افریقہ کے شمالی حصے میں پیدا ہوا۔ خلافت بنوامیہ ختم ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ خلافت بنوعباس کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اور سلسلہ بنوعباس کا پہلا حکمران ابوالسفاح برسراقتدار تھا۔

بنوامیہ کے لوگ چھپتے پھر رہے تھے۔ اور بنوعباس ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کو قتل کر رہے تھے۔

چونکہ بنوعباس نے یہ اقتدار حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے ماننے والوں کے تعاون سے حاصل کیا تھا اور بنوعباس کی تحریک میں ایرانیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس لیے ان کا بھی بڑا زور تھا۔ لیکن اقتدار سنبھالنے میں عباسیوں نے بہت عجلت سے کام لیا اور عباسی نے حضرت علیؓ کی اولاد کو اپنے اقتدار کے قریب بھی نہ آنے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب عباسی حکومت سے لڑنے والوں میں ایرانی بھی شامل ہوگئے اور ہر طرف موت کی گرم بازاری ہوگئی۔

ان حالات اور اس ماحول میں اسحاق نے ہوش سنبھالا تھا۔ اس شخص نے قرآن پاک حفظ کیا اور دوسری الہامی کتابوں کے مطالعے میں مشغول ہوگیا۔ اس نے قرآن، توریت، زبور اور انجیل کو پڑھنے اور سمجھنے میں بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا تھا۔

پھر یہ شخص افریقہ کے مختلف شہروں میں گھومتا پھرتا رہا اور وہاں لوگوں میں گھل مل گیا۔ یہیں اس نے جھوٹے مدعیان نبوت اور دعویداران مہدویت کا بھی گہری نظروں میں مطالعہ کیا اور اس لائق ہوگیا کہ وہ کسی بھی عقیدے پر لوگوں سے باتیں کرسکتا تھا اور انہیں مرعوب ومتاثر کرسکتا تھا۔ اسے باتیں کرنے کا ہنر آتا تھا اور بہت جلد لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیتا تھا۔

اسحاق نے اپنی ابتدائی زندگی اور طالب علمی کا زمانہ شمالی افریقہ کے شہروں میں گزارا تھا۔ ان دنوں شمالی افریقہ کے شہر مراکش، الجزائر اور تیونس ملک مغرب کہلاتے تھے اور یہاں سے تعلق رکھنے والوں کو مغربی کہتے تھے۔

اسحاق نے پڑھنے لکھنے کے بعد کوشش کی کہ کسی دربار سے وابستہ ہوجائے اور امن وآسودگی سے زندگی بسر کرے۔

یہ شخص حضرت علیؓ کے ماننے والوں میں شامل تھا۔ اس لیے خلافت عباسیہ اس کی دشمن ہوگئی تھی۔

اس شخص نے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے ایران کا رخ کیا اور اصفہان میں قیام کیا۔ ایرانیوں نے خلافتِ عباسیہ کے خلاف جدوجہد شروع کردی تھی اور ایران کے شہر خلافتِ عباسیہ کے مخالفوں کی پناہ گاہ بن گئے تھے۔ حکومت عباسیوں کی

تھی۔ شہروں کے حاکم بھی عباسی تھے۔ مگر یہاں کے عوام عباسیوں کے مخالف تھے۔ اسی لیے خلافت عباسیہ کی موجودگی میں اس کے مخالف ایران کے شہروں میں پناہ لیتے تھے اور اپنے کام جاری رکھتے تھے۔ یہ شخص بھی اصفہان پہنچ کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔
اب وہ سنجیدگی سے اپنے مستقبل کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اب اسے کسی دربار سے واسطہ نہیں رکھنا ہے۔
اس چالاک انسان نے کچھ کرنے سے پہلے یہ ضرور سمجھ لیا تھا کہ خلافتِ عباسیہ اس کی دشمن ہو جائے گی اور اس کا جینا دو بھر کردے گی۔ اس نے ان تمام نشیب و فراز پر غور کرنے کے بعد اپنے قیام کے لیے اصفہان کی ایک عربی درس گاہ کو پسند کیا۔ یہاں لوگ عربی پڑھنے آیا کرتے تھے اور یہ درس گاہ شہر کے باہر جس گلی میں واقع تھی وہ عام گزر گاہ سے ہٹ کر تھی۔ اس نے اس مدرسے کے جن استادوں کو نہایت لگن اور محبت سے پڑھاتے دیکھا تھا۔ وہاں کے لوگوں اور اساتذہ سے اشاروں کنایوں میں باتیں شروع کردیں۔ اور یہ باتیں گونگے کی زبان والوں کی طرح ہوتی تھیں۔ چنانچہ اسے ایک گونگے کی حیثیت سے مدرسے نے قبول کرلیا اور ایک کوٹھڑی بھی رہنے کے لیے دے دی۔ یہ تنگ و تاریک کوٹھڑی دس سال تک اسحاق کی جائے قیام بنی رہی۔ لوگ اس پر رحم کھاتے تھے اور جملہ ضروریات زندگی اس کو مفت میں حاصل ہوتے رہے۔ لوگ اس کی ضرورت کی تمام چیزیں اس کی کوٹھڑی میں پہنچا دیا کرتے تھے۔ کبھی کسی نے اس پر وہ توجہ نہیں دی جو کسی پڑھے لکھے شخص کو دی جاتی ہے۔ یہ دوسروں کی ہمدردیوں کا مستحق قرار پا گیا تھا کیونکہ سب کی نظروں میں وہ ایک گونگا تھا۔
کبھی کوٹھڑی سے نکلتا تو اساتذہ کے پاس چلا جاتا۔ ان کی تدریس میں شریک ہو جاتا۔ بظاہر وہ گونگا بہرا تھا مگر جو کچھ اساتذہ پڑھاتے تھے اسے اپنے حافظہ اور ذہن میں محفوظ رکھتا تھا۔
اس نے اپنی قوت گویائی کو بالکل فراموش کردیا تھا اور لوگ اسے اُخرس کہنے لگے تھے۔ عربی زبان میں اُخرس گونگے کو کہتے ہیں۔ طلباء اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ وہ اسے تفریح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اساتذہ بھی کبھی کبھی اس سے تفریح حاصل کرتے تھے اور اپنے فرصت کے اوقات ہنسی مذاق میں گزار دیتے تھے۔
دس سال تک وہ گونگا اور بہرا بنا رہا۔
اس نے افریقہ میں کسی سے ایک خاص تیل بنانے کی ترکیب اور نسخہ حاصل کرلیا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اگر اسے چہرے پر مل لیا جاتا تو چند گھنٹوں بعد چہرے کی عجیب حالت ہو جاتی تھی۔ اور یہ چہرہ دوسرے لوگوں کے چہرے سے بالکل مختلف ہو جاتا تھا۔ یعنی چہرہ دمکنے لگتا تھا۔
اس روغن کے علاوہ اس نے دو اور روغن بھی تیار کیے۔ اور یہ روغن جب رات کی سیاہی کو دور کرنے کے لیے کوٹھڑی میں جلائے جاتے تو ماحول آسیب زدہ سا ہو جاتا تھا۔ اس مخصوص چراغ کی روشنی میں مخصوص روغن زدہ چہرہ کچھ عجیب سا بھیانک لگتا تھا اور آدمی غیر معمولی ہو جاتا تھا۔ جب اس کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اب اسے کچھ کرنا چاہیے تو ایک رات اس نے اپنے چہرے پر یہ روغن خوب ملا اور چراغ جلا کر بیٹھ گیا۔ آئینے میں اپنا نظارہ کیا کچھ جھرجھری سی آگئی۔ اب وہ ایک غیر معمولی انسان بن چکا تھا۔
اسحاق نے باہر نکل کر ماحول کا جائزہ لیا تو لوگ آسودۂ خواب محسوس ہوئے۔ چاروں طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ کوٹھڑی کے ساتھ صحن تھا۔ اور صحن کی دوسری طرف مدرسے کے اساتذہ کی رہائش گاہ تھی۔ ان رہائش گاہوں کے درمیان سے ایک راستہ مسجد کے اندر جاتا تھا۔
اسحاق اخرس کچھ دیر صحن میں ٹہلتا رہا۔ اس وقت وہ بہت بے چین تھا۔ کیونکہ اس نے اپنے سلسلے میں جو عظیم الشان منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے عمل اور اظہار کا وقت قریب تھا۔ اس نے جس استقلال اور پامردی سے دس سال گزارے تھے کچھ وہی جانتا تھا۔
کچھ دیر ٹہلنے کے بعد اس نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔ اس شور نے لوگوں کی نیندیں حرام کردیں۔ لوگ گھروں سے نکل آئے۔ اتنی دیر میں اسحاق مسجد میں داخل ہو چکا تھا اور مسجد میں داخل ہوتے ہی وہ نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔
اس نے بہ آوازِ بلند قرآن پاک کی سورتیں پڑھنی شروع کردیں اور یہ سورتیں نہایت فصاحت کے ساتھ پڑھی جا رہی تھیں۔ ان میں فن قرأت اور تجوید کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ مسجد میں جو شمعیں روشن تھیں ان میں وہی مخصوص اسحاق کا تیار کردہ تیل ڈالا گیا تھا اور اب اس روشنی میں اسحاق کا چہرہ دمک رہا تھا۔
اساتذہ اور مدرسے کے دوسرے لوگ چیخوں کی آواز پر بیدار ہو گئے تھے اور وہ ادھر اُدھر چیخنے والے کو تلاش کرتے پھر

رہے تھے اور جب یہ لوگ تلاش کرتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے تو دور ہی سے انہیں مسجد میں روشنی دکھائی دی، اس میں انہیں اسحاق اُخرس نماز پڑھتا دکھائی دیا۔ یہاں انہیں دلکش آواز بھی سنائی دی۔ اب سب لوگ اس کے آس پاس جمع ہو چکے تھے۔

اسحاق نے ان سب کی آمد کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ سب یہ دیکھ کر اور زیادہ حیرت زدہ اور پریشان تھے کہ اسحاق نہایت روانی سے قرآنی سورتیں پڑھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک دمک پائی جاتی تھی۔

ان جمع ہونے والوں میں صدر مدرس سب سے آگے تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں سے پوچھ رہا تھا۔ "لوگو! بتاؤ کہ یہ کیا ہے؟"

ایک مدرس نے اپنے دونوں کان پکڑے اور کہا۔ "توبہ ہے۔ خدا کی قدرت! لوگو! کبھی تم نے یہ سنا ہے کہ ایک گونگا بہرا اس طرح باکمال قاری ہو گیا ہو اور اسے فنِ قرات اور علمِ تجوید پر پورا پورا عبور حاصل ہو۔"

صدر مدرس کی عقل ہی جاتی رہی تھی۔ وہ سادہ لوحی سے دوسروں سے کہہ رہا تھا۔ "تاریخ انسانی میں ایسا عجیب و غریب واقعہ پہلے کبھی نہیں پیش آیا ہو گا۔ یہ تو مجھے عجوبۂ روزگار انسان معلوم ہوتا ہے۔"

یہ لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے اور منتظر تھے کہ اسحاق سلام پھیرے تو وہ اس سے سوالات کی بوچھاڑ کریں۔

صدر مدرس نے اساتذہ سے پوچھا۔ "تم میں کوئی ایسا شخص ہے جو اسی وقت حاکم شہر کے پاس جائے اور اس کو یہاں بلا لائے تاکہ وہ یہ محیرا لعقول منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔"

صدر مدرس کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے کئی لوگ سامنے آ گئے اور کہا۔ "اگر آپ حکم دیں گے تو ہم حاکمِ شہر کو اسی وقت لے آئیں گے اور یہ منظر اس کو بھی دکھلا دیں گے۔"

صدر مدرس نے دو تیز رفتار آدمیوں کو اسی وقت حاکم شہر کے پاس روانہ کر دیا۔ یہ لوگ دربانوں کی پُرسش میں پڑ گئے ایک دربان ان کو دروازے پر روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ گہری نیند سے حاکم کو کیوں بیدار کیا جائے؟

دونوں آدمیوں نے اس عجیب و غریب گونگے، اس کی قوت گویائی کی بحالی اور کمالات کا ذکر کیا اور کہا۔ "تم لوگ بھی مدرسے کے اسحاق گونگے سے اچھی طرح واقف ہو گے کیونکہ وہ پچھلے دس سال سے مدرسے کی ایک کوٹھڑی میں رہ رہا ہے۔ ہم نے آج اس کو جس حال اور کیفیت میں دیکھا ہے۔ جب تم لوگ اسے دیکھو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔"

دربان ان دونوں کو پاگل سمجھ رہا تھا۔ ایک نے کہا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہے تو وہ دن میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس لیے ہم حاکم شہر کو نہیں جگائیں گے۔"

دونوں دربانوں کے پیچھے پڑ گئے اور کہا۔ "نہیں، ہمیں حاکم شہر کے پاس صدر مدرس نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ ہم حاکم شہر کو اسی وقت لے کر مسجد پہنچیں۔"

رات کے سناٹے میں ان کی بحث و تکرار نے شدت اختیار کر لی۔ مدرسے کے دونوں آدمی چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ "ہم حاکم شہر کے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔"

اور دربان کہہ رہے تھے کہ "ہم اس وقت حاکم شہر کو نہیں جگائیں گے۔"

یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ حاکم شہر کے بیوی بچے اور نوکر سبھی جاگ گئے۔ خود حاکم شہر بھی بیدار ہو گیا اور پوچھنے لگا۔ "یہ شور و غل کیسا ہے؟"

غلاموں نے بتایا۔ "مدرسے کے کچھ لوگ عجیب و غریب خبریں لے کر آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ جائیں اور وہ عجیب و غریب نظارہ آپ بھی کریں۔"

حاکم شہر نے کہا۔ "مدرسے کے لوگوں سے کہو کہ وہ واپس جائیں۔ میں خود ہی مدرسے پہنچ جاؤں گا۔"

لیکن مدرسے کے دونوں آدمی اڑ گئے اور کہا۔ "ہم دونوں حاکم شہر کا انتظار کرتے ہیں۔ اس کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

یہ مدرسہ، مسجد اور حاکم شہر کا محل شہری فصیل سے ملحق اس طرح واقع تھے کہ یہ لوگ جب چاہتے شہر کے باہر ہو جاتے اور بوقت ضرورت اندر ہی اندر شہر میں داخل ہو جاتے۔

مسجد کے دونوں آدمیوں کی واپسی میں دیر ہوئی تو صدر مدرس صبر نہ کر سکا اور کہا۔ "لوگو! چلو شہریوں کو دعوت عام دیں کہ وہ بھی قدرت کا یہ ناقابل یقین نظارہ اپنی آنکھوں سے کر لیں۔"

صدر مدرس پر اسحاق کا جادو ایسا اثر کر گیا تھا کہ اس نے حاکم شہر کا انتظار بھی نہیں کیا اور فصیل کے اندر آباد شہریوں اور اعلیٰ منصب داروں کے پاس ایک ہجوم کے ساتھ چل پڑا۔ مسجد اور مدرسے سے متعلق لوگ اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ چلتے چلتے شہر کے پھاٹک پر پہنچے وہ مقفل تھا اور اسے اندر سے دربانوں نے بند کر رکھا تھا کیونکہ شہر پناہوں اور فصیلوں کے بارے میں یہ قانون عام تھا کہ شام کے بعد اس کو بند کردیا جاتا تھا اور صبح فجر کی نماز کے بعد کھول دیا جاتا تھا۔

شہر کے صدر دروازے پر جب یہ ہجوم اکٹھا ہوا تو سوئے ہوئے دربان جاگ گئے اور پھاٹک کے سوراخوں سے جھانک جھانک کر تجسس آمیز نظروں سے اس ہجوم کو دیکھنے لگے لیکن دروازہ نہیں کھولا۔

صدر مدرس نے پھاٹک کو پیٹنا شروع کردیا اور کڑک دار آواز میں حکم دیا۔ "پھاٹک کھولو۔"

اندر سے کسی دربان نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ یہ پھاٹک آدھی رات کو نہیں کھلتا۔"

صدر مدرس نے دربانوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کردیا اور دھمکی دی۔ "پھاٹک کھول دو میں مدرسے کا صدر مدرس ہوں۔"

اندر سے جواب ملا۔ "پھاٹک نہیں کھلے گا۔ خواہ کوئی بھی ہو۔"

صدر مدرس نے خوف ناک لب و لہجے میں کہا۔ "دیکھ حاکمِ شہر میرا شاگرد ہے اور قاضیِ شہر سے میری دوستی ہے۔ میں تم سب کو نوکریوں سے نکلوا دوں گا۔"

اب دربانوں میں پھوٹ پڑ گئی کیونکہ ان میں سے کئی صدر مدرس کی حیثیت سے اچھی طرح آگاہ تھے اور وہ یہ جانتے تھے کہ صدر مدرس کی یہ محض دھمکی نہیں ہے بلکہ اس کے سبھی سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ دربان آپس میں مشورے کرنے لگے کہ اس نازک و خطرناک مسئلے سے کس طرح نمٹا جائے۔

ایک نے سبھی دربانوں سے کہا۔ "ہم رات کو کسی طور بھی یہ پھاٹک نہیں کھول سکتے۔ اب اگر صدر مدرس دباؤ ڈال رہا ہے اور ہم اس کا حکم بھی نہیں مانتے تو یہ ہمارے خلاف ایک مصیبت کھڑی کردے گا۔ اس لیے یہ سمجھ لو کہ پھاٹک بھی نہیں کھولنا ہے اور صدر مدرس کو ناراض بھی نہیں کرنا ہے۔ میرے نزدیک یہ بہتر ہے کہ ہم ایک معمولی سے جھوٹ کا سہارا لیں۔"

ساتھیوں نے پوچھا۔ "ہم اپنے بچاؤ کے لیے کیا کریں گے۔ کس قسم کا جھوٹ بولیں گے۔"

دربان نے جواب دیا۔ "ہم سب صدر مدرس سے کہیں گے کہ اندر سے قفل پڑا ہوا ہے اور اس کی چابی گھبراہٹ میں مل نہیں رہی ہے۔"

چنانچہ یہی عُذر بیان کردیا گیا۔

صدر مدرس نے باہر سے ڈانٹا۔ "چابی بہت جلد تلاش کرو ورنہ میری ایک شکایت پر تم سب کی نوکریاں چلی جائیں گی۔"

ایک دربان نے پوچھا۔ "اگر ہمیں چابیاں نہیں مل رہی ہیں تو ہم انہیں کہاں سے پیدا کریں۔"

صدر مدرس نے کہا۔ "تالا توڑ دو۔"

ایک دربان نے باہر صدر مدرس کے ساتھ جو ہجوم تھا اس کے بارے میں سوال کیا۔ "جناب صدر مدرس صاحب! آپ کے ساتھ یہ بھیڑ بھاڑ کیسی ہے؟"

صدر مدرس نے کہا۔ "یہ لوگ ایک ایسی چیز دیکھ کر آرہے ہیں کہ پورے شہر کا اس کو دیکھنا واجب اور فرض ہے۔ میں وہ نادر شے تم لوگوں کو بھی دکھلانا چاہتا ہوں۔"

صدر مدرس نے اسحاق کا تفصیلی ذکر کیا اور کہا۔ "میں اس گونگے کو دس سال سے دیکھ رہا ہوں، یہ گونگا بھی ہے اور بہرا بھی مگر آج اللہ کی مہربانی سے اسے قوت گویائی حاصل ہوگئی اور اب وہ نہایت عالمانہ انداز میں باتیں کرتا ہے۔ وہ فن تجوید سے بھی واقف ہے۔ وہ اس وقت مسجد میں موجود ہے۔ دروازہ کھولو تاکہ میں پورے شہر کو اس شخص کے سامنے لے جاکر کھڑا کردوں۔"

لیکن دربانوں کو نہ تو چابیاں ملیں اور نہ انہوں نے دروازہ کھولا۔

صدر مدرس نے دربانوں پر غیر معمولی دباؤ ڈالا اور حکماً کہا۔ "دروازہ کھول دو ورنہ یہ ہجوم دروازے کو آگ لگا دے گا۔"

دربانوں نے صاف صاف انکار کردیا۔ "ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔"

صدر مدرس نے ہجوم کو حکم دیا کہ "تم لوگ چاروں فصیلوں کا جائزہ لو۔ جہاں کمزور حصہ نظر آئے اسی جگہ سے فصیل کو ڈھا دو اور سب ایک ساتھ شہر میں داخل ہو جاؤ۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

لوگوں نے کدالیں اور بیلچے سنبھالے اور فصیل پر ضربات لگنے لگیں۔
لیکن اپنے ساتھیوں سے دور چند شاگردوں کے ساتھ صدر مدرس نے پھاٹک کا پورا محاصرہ کرلیا اور پھاٹک کو آگ لگا دی۔ جس سے شعلے بلند ہوئے۔ دربانوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور خود راہ فرار اختیار کرلی۔ اس طرح شہر کا پھاٹک بھی صدر مدرس کے قبضے میں آگیا اور یہ لوگ شہر میں داخل ہوگئے۔
یہ لوگ شہر میں داخل تو ہوگئے مگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ وہ رات میں لوگوں کو کس طرح بیدار کریں گے کیونکہ شہر کے ہر گھر میں لوگ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔
اب رات کا سناٹا رخصت ہو چکا تھا اور چہاروں طرف بھاگم بھاگ شروع ہوگئی تھی۔
صدر مدرس ابھی شہر میں زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ حاکم شہر بھی اس سے ملا اور پوچھا۔ "یہ کیا شور و غل مچا رکھا ہے، تم لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس جاؤ جو مدرسے میں سوتا ہے وہ مدرسے میں جاکر سورہے اور اب تم لوگ شہریوں کی نیند نہ خراب کرو۔"
صدر مدرس نے حاکم کی عقل کا ماتم کیا اور کہا۔ "میں جس معجزے کو تجھے دکھانا چاہتا ہوں۔ جب تو دیکھے گا تو عش عش کر اٹھے گا۔" اب صدر مدرس نے اسحاق گونگے کے بارے میں بالتفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "میں اس کو دس سال سے گونگا اور بہرا دیکھ رہا ہوں لیکن آج وہ اللہ کی مہربانی سے قوت گویائی رکھتا ہے۔ کانوں کو قوت سماعت مل گئی ہے اور اس کے بھیجے میں معلوم نہیں کتنی عقل اور علمی قوت سماگئی ہے۔ جب وہ بات کرتا ہے تو علم کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ جب وہ قرات کرتا ہے تو لحن داؤدی بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک ایسا نور پایا جاتا ہے جس کی کہیں اور مثال نہیں ملے گی۔" حاکم نے کہا تم چلو میں آرہا ہوں۔
یہاں سے قاضی شہر کا گھر قریب تھا۔ صدر مدرس الٹے سیدھے نعرے لگاتا ہوا قاضی شہر کی حویلی کے در پر پہنچ گیا اور بے اختیار اور بے تحاشا قاضی کو آوازیں دینے لگا۔
کچھ دیر بعد چھت پر چند سائے نظر آئے جنہیں تاروں کی روشنی میں پہچاننا ناممکن تھا۔ غالباً کسی خطرے کے پیش نظر قاضی حویلی کے دروازے پر آنے کے بجائے چھت پر چلا گیا اور اپنے غلام کو حکم دیا۔ "تو ذرا اونچی آواز میں پوچھ کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"
غلام نے چیخ کر دریافت کیا۔ "قاضی صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ تم لوگ کون ہو اور اس رات کے اندھیرے میں یہاں کیا لینے آئے ہو؟"
صدر مدرس نے اپنے کسی شاگرد کے ذریعے جواب دیا۔ "ہم صدر مدرس کے ساتھ یہاں آئے ہیں اور آپ کو اپنے ساتھ مدرسے تک لے جانا چاہتے ہیں۔ وہاں ایک ایسا شخص موجود ہے جسے ہم دس سال سے گونگا اور بہرا دیکھ رہے تھے مگر ابھی کچھ دیر پہلے وہ باتیں کرنے کے لائق ہوگیا اور اس کی علمیت کا یہ حال ہے کہ اس سے جس موضوع پر چاہو بات کرلو۔ وہ شخص اپنے اس عہد کا چلتا پھرتا معجزہ ہے۔"
قاضی شہر نے اپنے غلام کے ذریعے جواب میں کہلوایا۔ "جناب صدر مدرس! آپ نے جو کچھ فرمایا وہ درست لیکن یہ رات کے اندھیرے میں ہجوم کو ساتھ لیے جو دورہ فرما رہے ہیں، سوچئے وہ کہاں تک مناسب ہے۔ بہتر ہے آپ لوگ اپنے مدرسے اور مسجد واپس جائیں۔ ہم خود صبح وہیں پہنچ جائیں گے۔"
لیکن صدر مدرس نے قاضی کو حکم دیا "آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیں حاکم شہر بھی اس وقت وہاں پہنچ رہا ہے۔"
قاضی شہر نے صدر مدرس کو بتایا۔ "آپ کو نہیں معلوم کہ وزیر موصوف بھی اصفہان میں تشریف رکھتے ہیں۔ آپ ان کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کریں۔ میں خود پہنچ جاؤں گا۔"
صدر مدرس کو وزیر کی اصفہان میں موجودگی سے بڑی خوشی ہوئی اور کہا۔ "ٹھیک ہے، میں وزیر کے پاس پہنچتا ہوں۔ اس کو بھی اسی وقت اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"
اسی وقت چند لوگ فریاد کرتے ہوئے آئے اور قاضی شہر سے کہا۔ "جناب والا! ہم لوگ شہر کے صدر پھاٹک اور فصیلوں کے دربان ہیں۔ یہ صدر مدرس ہجوم کے ساتھ آیا۔ صدر دروازے کو آگ لگا دی۔ اور کئی جگہ سے فصیلوں میں شگاف ڈال دیئے اور اس کو توڑ کر یہ لوگ اندر داخل ہوگئے۔ اب یہ مجرم آپ کے سامنے موجود ہیں آپ ان کو گرفتار کروائیں اور ان پر مقدمے چلوائیں۔"

صدر مدرس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "ان دربانوں کو پکڑو اور گرفتار کر کے مدرسے بھجوا دو۔"

دربانوں نے جو ہجوم کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو گھبرا کر قاضی کی حویلی میں داخل ہو گئے۔

قاضی نے معاملے کی نزاکت کا اندازہ لگایا اور صدر مدرس سے کہا۔ "اب یہ دربان میری حویلی میں قید ہیں' میں ان پر مقدمے چلاؤں گا۔"

ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد صدر مدرس نے وزیر کے محل کا رخ کیا لیکن راستے میں اتنا شور مچایا کہ سوئے ہوئے لوگ بیدار ہو گئے اور اپنے اپنے گھروں سے نکل کر پوچھنے لگے کہ "اتنی رات گئے یہ کیا ہو رہا ہے؟"

صدر مدرس نے شہریوں کو اسحاق گونگے بہرے کے بارے میں بتایا۔ "آپ لوگ ہمارے ساتھ چلیں اور پھر ہم آپ کو دکھائیں گے کہ خدا کی قدرت کیا ہوتی ہے۔"

کچھ شہری ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ صدر مدرس نے وزیر کے محل کا رخ کیا اور محل کے چاروں طرف اس طرح کھڑے ہو گئے۔ گویا وزیر کے محل کا محاصرہ کر لیا ہو۔ وزیر بھی گھبرا گیا اور اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ تیار ہو کر ان فسادیوں کو پیچھے دھکیل دیں۔

لیکن اسی دوران صدر مدرس نے تعارف کروایا اور تنبیہاً کہا۔ "میں مدرسہ کا صدر مدرس ہوں۔ میرے شاگرد ہر طرف موجود ہیں۔ آج اگر میں چاہوں تو ان سے تیری معزولی کا فرمان لا کر کسی اور کو وزیر بنوا دوں۔ خلافتِ عباسیہ میری بے حد قدردان ہے۔"

وزیر بھی گھبرایا کہ یہ کیسی مصیبت رات کے سناٹے میں محل کو چاروں طرف سے گھیر کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے صدر مدرس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "جناب استاد محترم! آپ جس عجیب و غریب شخص کا ذکر فرما رہے ہیں میں اس کو اسی وقت چل کر دیکھنا بلکہ اس کی زیارت کرتا مگر مجبوری یہ ہے کہ میں جس مقصد سے یہاں آیا ہوں۔ جب تک اسے پورا نہ کر لوں میں کہیں اور نہیں جا سکتا۔ ویسے میرا وعدہ ہے کہ کل میں دن کے اجالے میں اس شخص سے ضرور ملوں گا۔ اور اس شخص کی اور آپ کی جو خدمت بھی کر سکا کروں گا۔ اور ضرور کروں گا۔"

یہ بات صدر مدرس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے وزیر سے دوسرے دن آنے کا حلفیہ وعدہ لیا اور اپنے ہجوم کے ساتھ پورے شہر کو بیدار کرنے کا عزم لیے ہوئے در در دستک دینا شروع کر دی۔ عجوبہ پسند لوگ صدر مدرس کے گرویدہ ہو گئے اور بہتوں نے اسی وقت ساتھ چلنے کی ہامی بھری بلکہ تیار ہو کر ساتھ ہو لیے۔

اپنی ان کوششوں میں صدر مدرس کو کئی گھنٹے لگ گئے اور جب صبح فجر کے قریب وہ مسجد میں پہنچا تو مسجد میں اسحاق اخرس موجود نہیں تھا۔ چند آدمی جو مسجد میں نظر آئے ان سے اسحاق کی بابت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اسحاق اپنے حجرے میں موجود ہے اور کلام پاک کی تلاوت کر رہا ہے۔

صدر مدرس نے اپنے ساتھ آنے والے ہجوم کو مسجد کے اندر اور باہر ٹھہرایا اور کہا۔ "آپ لوگ اس عجیب الخلقت جوان کو دیکھنے آئے ہیں جو دس سال سے گونگا بہرا تھا۔ اب وہ مزے مزے کی پرلطف باتیں کرتا ہے اور دنیا بھر کی معلومات رکھتا ہے۔ آج آپ لوگ فجر کی نماز اسی کی امامت میں ادا فرمائیں گے۔"

ہجوم نے وضو کرنا شروع کر دیا۔ اور صدر مدرس اسحاق اخرس کے پاس گیا اور پوچھا۔ "حضرت! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "جناب والا! میں ابھی تک اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا ہوں۔ لوگ مجھ سے جس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ میں ان کا عادی نہیں ہوں۔ میرے پیرو مرشد کہتے ہیں کہ "اے اسحاق! تجھے اپنے آپ پر نازاں نہیں ہونا چاہیے۔ غرور کے خول سے باہر نکل آ۔ ورنہ تیری زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ تو ابھی دنیا اور دنیا والوں سے واقف نہیں ہے حالانکہ تو خود اس لائق ہے کہ دربار سرکار سے تجھ کو کوئی اعلیٰ عہدہ دلوا دیا جائے۔"

صدر مدرس حیرت اور سوالیہ نظروں سے اسحاق کو دیکھنے لگا۔ پوچھا۔ "تو دس سال سے ہم میں رہ رہا ہے اور ہم سب تجھ سے اچھی طرح واقف ہیں مگر میں نے آج تک کسی شخص کو تجھ سے بے تکلف اور ہمکلام نہیں دیکھا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں یہاں تیرا استاد کون ہے جو تجھ کو مشورے دیتا رہتا ہے۔ اگر یہ کوئی پیرو مرشد ہیں تو ان سے ہمیں بھی ملوا۔"

اسحاق ہنسنے لگا اور کہا۔ "میں جس استاد یا پیرو مرشد کی بات کر رہا ہوں۔ اس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں یعنی ہر شخص کا اپنا ضمیر۔ کیوں کہ محمدؐ عربی سے کسی نے ایک بار یہ سوال کیا تھا۔ کہ ہر جگہ ہمیں عالم' فقیہہ یا قاضی میسر نہیں ہو سکتا۔ لیکن

اگر ہمیں کسی سلسلے میں مشورہ درکار ہو اور یہ معلوم کرنا ہو کہ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا ہے تو اس سوال کا جواب محمدؐ عربی نے یہ دیا تھا کہ اپنے ضمیر سے معلوم کرلیا کرو 'کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے۔"

اس جواب نے صدر مدرس کو خوش کردیا اور کہا۔ "میں حیران ہوں کہ یہ ساری باتیں تجھ کو کس طرح معلوم ہوگئیں؟"

اب صدر مدرس نے اسحاق سے درخواست کی۔ "جناب! شہر کی بیشتر آبادی' حاکم اور محکوم' قاضی اور اس کے ماننے والے یہ سب یہاں آچکے ہیں یا آنے والے ہیں۔ وہ تیری اقتدا میں نماز فجر ادا کرنی چاہتے ہیں۔ اس لیے تو ہمارے ساتھ چل اور فجر کی نماز کی امامت کر۔"

اسحاق نے وضو کیا' عمامہ سر پر رکھا اور صدر مدرس کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دونوں مسجد میں داخل ہوگئے۔

ہجوم نے اس گونگے بہرے کو باتیں کرتے دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ شہر کے بہت زیادہ لوگ اسحاق سے واقف تھے اسی لیے وہ اس کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اور انہیں اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔

صدر مدرس نے ہجوم کے سامنے ایک مختصر سی تعارفی تقریر کی اور کہا۔ "آج وہ نادر روزگار ہستی نماز کی امامت کرے گی۔ میں اگر چاہتا تو یہ شرف و فضیلت خود حاصل کرلیتا۔ لیکن میں نے اس میں آپ کو بھی شریک کرلیا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ آج میں نے کیسی کیسی خواریاں اٹھائی ہیں۔"

اس کے بعد اس نے اس ہجوم میں وزیر' حاکم شہر اور قاضی کو تلاش کیا۔ وہ اس ہجوم میں کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ اس نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "افسوس! اس سعادت سے وزیر' حاکم اور قاضی محروم رہ گئے۔ کیوں کہ انہیں توفیق ایزدی حاصل نہیں تھی۔ اب ہم لوگ اس بزرگ ہستی کے پیچھے نماز فجر ادا کریں گے۔"

امام کی جگہ اسحاق کو دے دی گئی اور بالکل اس کے پیچھے صدر مدرس کھڑا ہوگیا۔ اس نے آہستہ آہستہ اقامت کہی اور اسحاق نے نیت باندھی۔ اس کی اقتدا میں دوسروں نے بھی نیت باندھ لی۔

اب امام نے قرائت شروع کی تو تجوید اور مخارج سے لوگ انتہائی حیرت زدہ ہوئے۔ ایسی قرائت انہوں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس نماز میں لوگوں کو بے انتہا مزہ آیا۔

نماز کے بعد لوگوں نے اسحاق کو گھیرے میں لے لیا۔ کوئی اس کا ہاتھ چومتا تھا۔ کوئی پیشانی پر بوسے دیتا تھا' کوئی قدموں میں گرا جارہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جملہ حقوق بحق صدر مدرسہ محفوظ ہیں۔ صدر مدرس کی کوشش یہی تھی کہ کسی اور کو اسحاق کی قربت حاصل نہ ہو۔

اچانک قاضی آتا ہوا دکھائی دیا۔ قاضی نے پہلے بھی اس گونگے بہرے انسان کو دیکھا تھا اب جو باتیں کرتے دیکھا تو اسے بھی بڑی حیرت ہوئی۔

صدر مدرس نے قاضی کو آگے آنے کا راستہ دیا۔ جب قاضی بھی اسحاق کے قریب پہنچ گیا تو اسحاق نے رعونت کا انداز اختیار کیا۔ اس نے قاضی کو دیکھا تک نہیں۔ جب صدر مدرس نے قاضی کا تعارف کروایا تو اسحاق نے کہا۔ "اس شخص کو تو رات کو بلایا گیا تھا مگر یہ اب آیا ہے۔ کیا یہ کوئی بہت بڑا آدمی ہے۔"

قاضی نے شرمندگی سے کہا۔ "جناب! مجھے افسوس ہے کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں فوری حاضری نہ دے سکا مگر اب آگیا ہوں تو آپ کچھ خیال نہ فرمائیں۔"

صدر مدرس نے قاضی کی سفارش کی۔ "حضرت! آپ ان کا کوئی خیال نہ فرمائیں۔"

قاضی نے بھی مزید معذرت خواہی کی۔ "حضرت! جن کے جتنے رتبے ہوتے ہیں۔ اتنی ہی ان کی مشکلات بھی ہوتی ہیں۔"

اسحاق نے بے نیازی سے کہا۔ "بے شک! اللہ تیری مشکلوں میں اضافہ فرمائے۔"

سامنے جو نظر اٹھائی تو دیکھا حاکم شہر چلا آرہا تھا۔

صدر مدرس نے بے اختیار کہا۔ "لو حاکم شہر بھی آگیا۔"

حاکم شہر نے اپنی صفائی پیش کی۔ "میں تو آنا چاہتا تھا مگر یہاں پہنچنے سے پہلے میرے لیے ضروری تھا کہ میں وزیر سے ملوں اور اس سے اجازت چاہوں۔ چنانچہ اس کی اجازت کے بعد میں یہاں آیا ہوں۔"

صدر مدرس نے وزیر کے بارے میں پوچھا۔ "کیا بات ہے وہ ابھی تک نہیں آیا جب کہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔"

حاکم شہر نے کہا۔ "اس نے مجھ سے کہا کہ پہلے تم وہاں پہنچو بعد میں، میں بھی پہنچوں گا۔"

اسحاق کو معلوم نہیں کیا سوجھی کہ وہ چپ چاپ اٹھا اور مسجد کے حجرے میں چلا گیا۔ اندر سے قفل لگا لیا اور کہا۔ "لوگو! میں نے قفل لگا لیا ہے۔ اب یہ اس وقت تک لگا رہے گا جب تک خدا چاہے گا۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے نہیں کھولوں گا بلکہ دور ہی سے قفل کو حکم دوں گا کہ یہ کھل جائے اور جب یہ کھل کر خود بخود زمین پر گر جائے گا تب میں باہر نکلوں گا۔"

اب باہر سے اسحاق کی خوشامدیں ہونے لگیں۔ صدر مدرس خوشامد کرنے والوں میں سب سے آگے تھا۔ وہ اس طرح خوشامد کر رہا تھا جیسے کوئی ادنیٰ حقیر انسان اپنے ملجا و ماوا سے کرتا ہے۔

قاضی شہر بھی صدر مدرس سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس نے بہ آواز بلند کہا۔ "حضرت والا! آپ کو اسی خدائے ذوالجلال کی قسم جس نے آپ کو اس کرامت اور منصب جلیل سے نوازا ہے۔ ذرا دروازہ کھولیے اور مشتاقان جمال کو شرف دیدار سے مشرف فرمایئے۔"

اب اسحاق نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "اے قفل کھل جا۔"

اور باہر لوگوں نے قفل کے زمین پر گرنے کی آواز سنی۔ دروازہ خود بخود کھل گیا اور لوگوں نے دیکھا کہ اسحاق دروازے سے کسی قدر فاصلے پر سر جھکائے بیٹھا ہوا ہے۔

لوگوں بے تحاشہ اندر داخل ہو گئے اور اسحاق سے کسی قدر فاصلے پر ادب سے بیٹھ گئے۔

قاضی صاحب نے نہایت نیاز مندانہ لہجے میں درخواست کی۔ "حضور والا! سارا شہر اس قدرتِ خداوندی پر متحیر ہے اگر حقیقت حال کا چہرہ کسی قدر بے نقاب فرمایا جائے تو بڑی نوازش ہو گی۔"

اسحاق جو اس وقت کا پہلے سے منتظر تھا۔ ریاکارانہ لہجے میں بولا۔ "چالیس روز پیشتر ہی فیضان کے کچھ آثار نظر آنے لگے تھے۔ آخر دن بدن القاء ربانی کا سرچشمہ دل میں موجیں مارنے لگا حتیٰ کہ آج رات خدائے قدوس نے اپنے فضل مخصوص سے اس عاجز پر علم و عمل کی وہ راہیں کھول دیں کہ مجھ سے پہلے لاکھوں رہروان منزل اس کے خیال اور تصور سے بھی محروم رہے تھے۔ اور مجھ پر وہ اسرار و رموز اور حقائق منکشف فرمائے کہ جن کا زبان پر لانا بھی مذہب طریقت میں ممنوع ہے۔ البتہ مختصراً اتنا کہنے کا مجاز ہوں کہ آج رات دو فرشتے حوض کوثر کا پانی لے کر میرے پاس آئے۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے غسل دیا اور کہنے لگے۔ "السلام و علیکم یا نبی اللہ۔ مجھے جواب میں تامل ہوا اور گھبرایا کہ واللہ اعلم یہ کیا ابتلاء ہے ــــــ ایک فرشتہ بہ زبان فصیح یوں گویا ہوا۔ "**یانبی اللہ افتح فاک بسم اللہ الازلی**" (اے نبی بسم اللہ کہہ کر ذرا منہ تو کھولیے) میں نے منہ کھول دیا اور دل میں بسم اللہ الازلی کا ورد کرتا رہا۔ فرشتے نے ایک سفید سی چیز میرے منہ میں رکھ دی۔"

قاضی شہر نے پوچھا۔ "یہ سفید سی چیز کیا تھی؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا کہ وہ کیا چیز تھی البتہ اتنا جانتا ہوں کہ وہ شہد سے زیادہ شیریں اور مشک سے زیادہ خوشبودار اور برف سے زیادہ ٹھنڈی تھی۔ اس نعمت خداوندی کا حلق سے نیچے اترنا تھا کہ میری زبان گویا ہو گئی اور میرے منہ سے بے اختیار یہ کلمہ نکلا۔ **اشھدان لا الہ الا اللہ واشھدو ان محمد رسول اللہ**۔ یہ سن کر فرشتوں نے کہا۔ "محمد صلی اللہ علیہ و سلم کی طرح تم بھی رسول اللہ ہو۔"

میں نے کہا۔ "میرے دوستو! تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو مجھے اس سے سخت حیرت ہے بلکہ میں تو عرق خجالت میں ڈوبا جاتا ہوں۔"

فرشتے کہنے لگے۔ "خدائے قدوس نے تمہیں اس قوم کے لیے نبی مبعوث فرمایا ہے۔"

میں نے فرشتوں سے کہا۔ "تم یہ کس قسم کی باتیں کرتے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد علیہ الصلوۃ والسلام روحی فداہ کو خاتم الانبیاء قرار دیا ہے اور آپ کی ذات اقدس پر نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے تو اب میری نبوت کیا معنی رکھتی ہے؟"

فرشتے کہنے لگے۔ "یہ درست ہے مگر محمد صلی اللہ علیہ و سلم کی نبوت مستقل حیثیت رکھتی ہے اور تمہاری نبوت بالتبع اور ظلی و بروزی ہے۔ بالکل ہارون علیہ السلام کی طرح جو ایک غیر شرعی اور تابع نبی تھے۔"

اسحاق کی عالمانہ، عاجزانہ اور مدلل اور مختصر سی روداد نے سبھی کو متاثر کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے لوگ خود کوئی اعتراض کرنے کے قابل نہیں رہے اور انہیں اسحاق کی ہر بات کا یقین تھا۔ قاضی شہر، حاکم اور صدر مدرس اسحاق کے ادنیٰ خادم نظر آ رہے تھے۔

ہجوم نے اپنے بڑوں کو اتنا گرویدہ اور فدوی دیکھا تو تقریباً سبھی اسحاق کی نبوت پر ایمان لے آئے۔
لیکن قاضی شہر نے ہجوم کو اسحاق کی نبوت پر ایمان لانے سے روکا اور کہا۔ "لوگو! ابھی بات جاری ہے جب تک اسحاق کو خود اپنی نبوت کا یقین اور اعتبار نہ ہو۔ ہم کس طرح اسے نبی مانیں گے۔"
صدر مدرس نے اسحاق سے پوچھا۔ "ہاں تو پھر ملائکہ نے آپ کو ظلی و بروزی نبوت کا منصب تفویض فرمایا ہے تو کیا آپ نے اسے قبول کرلیا؟"
اسحاق نے جواب دیا۔ "نہیں۔ میں نے معذوری ظاہر کی اور کہا۔ "دوستو! میرے لیے تو نبوت کا دعویٰ بہت سی مشکلات سے لبریز ہے کیونکہ میں غیر شرعی اور تابع نبی ہونے کی وجہ سے کوئی معجزہ تو دکھا نہیں سکتا اس لیے لوگ میری نبوت پر ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر میں کس طرح نبوت کا دعویٰ کروں گا۔"
فرشتوں نے کہا۔ "تو کس معجزے کی بات کرتا ہے۔ ذرا غور کر اللہ نے تجھے بہرا اور گونگا پیدا فرمایا تھا اور لوگوں میں تجھے حقیر کر رکھا تھا۔ پھر تجھے قوت سماعت عطا ہوئی اور اس علم سے نوازا جسے تونے مروجہ طریقوں سے حاصل نہیں کیا اور آج تو جس عالمانہ لب و لہجے میں لوگوں سے بات کرے گا۔ کیا یہ کسی معجزے سے کم ہے۔ تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج تو بہترین متکلم اور فصیح و بلیغ شخص ہے۔ جو سالہا سال سے تجھے گونگا اور بہرا دیکھتے چلے آئے ہیں وہ جب تجھے باتیں کرتے دیکھیں گے اور انہیں تیری نبوت کا علم ہوگا تو وہ آنکھیں بند کر کے تیری نبوت پر ایمان لے آئیں گے۔" اب ہر بات شک و شبہ سے بالا تر ہو چکی تھی لیکن میں اپنی نبوت پر خود ایمان لانے سے قاصر تھا۔ میں نے پھر اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور کہا۔ "جس نبوت پر میں خود شک و شبہ کا اظہار کر رہا ہوں لوگ اس پر کس طرح ایمان لائیں گے۔"
شاید فرشتوں کو میری بے قراری کا صحیح علم نہیں تھا۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "اچھا میں نبوت کا اعلان کرتا ہوں۔ کیا تم سے کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ میری نبوت پر سب سے پہلے کون ایمان لائے گا؟"
ایک فرشتے نے جواب دیا۔ "تو اپنی نبوت کا اعلان کر تو سہی پھر دیکھ زمین و آسمان کس طرح تیری تصدیق کرتے ہیں۔"
میں نے فرشتوں سے صاف صاف کہہ دیا۔ "میں ایسی خشک نبوت کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں جو کسی معجزے سے محروم ہو۔ میں معجزے چاہتا ہوں کیونکہ انسانوں کی اکثریت مجھ سے معجزے طلب کرے گی۔ اس وقت میں انہیں کیا جواب دوں گا۔"
فرشتوں نے کہا۔ "ہم تیری یہ درخواست اللہ کے سامنے پیش کردیں گے۔ پھر وہاں سے جو جواب ملے گا تجھ تک پہنچا دیں گے۔"
مجھے کچھ دیر جواب کا انتظار کرنا پڑا۔ آخر مجھے بتایا گیا کہ "اللہ نے مجھے جملہ آسمانی کتابوں کا علم ودیعت فرما دیا ہے۔ تمہیں لکھنے کا ہنر بھی دیا گیا اور اب تم کئی زبانوں کے ماہر مانے جاؤ گے اور اب تمہیں کسی اور معجزے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔"
مجھے اب بھی شبہ تھا کہ فرشتوں نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ کس حد تک درست ہے۔ میں نے فرشتوں سے پوچھا۔ "تم نے جو کچھ کہا وہ کس حد تک درست ہے۔ میں اس پر کس طرح یقین کروں۔"
فرشتے نے مجھ سے کہا۔ "ہم نے جو کچھ کہا اس کا امتحان بہت آسان ہے۔ تم کو قرآن کا علم دیا گیا ہے۔ اب تم قرآن کی آیات کو اس ترتیب سے پڑھ کر سناؤ جس ترتیب سے ان کا نزول ہوا ہے۔"
میں نے قرآن پاک کو دیکھے بغیر اسی ترتیب سے پڑھنا شروع کردیا اور میری ترتیب اتنی درست تھی کہ فرشتے اس کی گواہی دے رہے تھے۔
اس کے بعد ایک فرشتے نے کہا۔ "اب تم توریت کو پڑھ کر سناؤ۔"
اور میں نے کتاب پیدائش سے پڑھنا شروع کردی۔ یہاں تک کہ بات کافی آگے بڑھ گئی تو فرشتوں نے میرے سامنے زبور رکھ دی۔ میں نے اسے بھی پڑھنا شروع کردیا اور دیر تک زبور پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ فرشتے عاجز آ گئے۔
مجھے خود حیرت تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے "کیا یہ سارے علوم جو مجھے بخشے گئے ہیں۔ میرے سینے میں ہمیشہ محفوظ رہیں گے؟
فرشتے نے جواب دیا۔ "ہاں! یہ سارے علوم اس وقت تک تیرے سینے میں محفوظ رہیں گے جب تک تو زندہ ہے۔ اس کے بعد تیری نبوت کے ساتھ ساتھ یہ بھی تیرے ساتھ چلے جائیں گے اور تیری نبوت کا چرچا قیامت تک ہوتا رہے گا۔"

فرشتے دیر تک مجھے نبوت پر آمادہ کرتے رہے اور آخر میں مجھ سے کہا۔ کہ "چاروں آسمانی کتابوں کے علاوہ جو آسمانی صحیفے اترے ہیں انہیں پڑھ کر سناؤ۔"

جب میں نے آسمانی صحیفوں کو پڑھنا شروع کیا تو بالکل اسی طرح جس طرح ان کی تنزیل ہوئی تھی اس میں کسی تحریف تصحیف اور اختلاف قرأت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

فرشتے اس کی تصدیق کرتے جاتے تھے۔ آخر میں فرشتوں نے کہا۔ **"قم فانذر الناس"** (کہ اب کمر ہمت باندھ لے اور لوگوں کو غضب الٰہی سے ڈرا۔)

یہ کہہ کر فرشتے رخصت ہوگئے اور میں نماز اور ذکر الٰہی میں مشغول ہوگیا۔ "آج رات سے جن انوار و تجلیات کا میرے دل پر ہجوم ہے زبان اس کی شرح سے قاصر ہے۔"

اب اسحاق نے سر اٹھا کر لوگوں کی طرف دیکھا۔ ہر شخص گم اور کھویا کھویا نظر آرہا تھا۔ قاضی شہر، حاکم شہر اور صدر مدرس مجسمہ حیرت بنے ہوئے تھے۔ انہیں افسوس تھا کہ وزیر ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ جو کچھ اسحاق نے بیان کیا تھا اگر وزیر بھی سن لیتا تو بہتر ہوتا کیونکہ اس کے ایمان لانے سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا۔

اسحاق امید لگائے بیٹھا تھا کہ اس کی نبوت پر کون ایمان لاتا ہے اور کسے اب بھی تامل ہے؟

آخر صدر مدرس نے غصے میں کہا۔ "یہ بدبخت وزیر کہاں رہ گیا۔ کیا اللہ نے اس کے دل پر مہر لگادی ہے۔"

قاضی شہر نے کہا۔ "وزیر کے پاس کچھ آدمی بھیجے جائیں جو اس کو کسی بھی طرح یہاں تک لے آئیں۔"

حاکم شہر نے اجازت چاہی۔ "اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں وزیر کو یہاں تک لانے کی کوشش کروں گا۔"

اسحاق نے حاکم سے پوچھا۔ "کہیں جانے سے پہلے تو مجھے بتا کہ تو میری نبوت پر ایمان لایا یا نہیں؟"

حاکم شہر نے اعلان کیا۔ "یوں تو میں آپ کی نبوت پر ایمان لے آیا مگر میں وزیر کے سامنے اپنے ایمان کا اعلان کروں گا اس لیے مجھے وقت دیا جائے کہ وزیر کو بھی یہیں لے آؤں اور اس کے سامنے اپنے ایمان لانے کا اعلان کروں اور پھر ہم سب مل کر اس پر دباؤ ڈالیں گے اور اسے آپ پر ایمان لانے پر مجبور کردیں۔"

صدر مدرس اور قاضی شہر ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ حاکم شہر اسحاق کی نبوت پر ایمان لائے بغیر ہی چلا جائے۔

قاضی شہر نے کہا۔ "وزیر کا کچھ پتا نہیں کہ وہ ایمان لائے گا بھی یا نہیں۔ اس لیے ہم سب کو یہ چاہیے کہ اس کے آنے سے پہلے ہی ایمان لے آئیں۔"

حاکم شہر کو معلوم نہیں کیوں کچھ تامل تھا جبکہ دوسروں کے دلِ اعلان و اقرارِ نبوت کے لیے بے چین و بے قرار ہو رہے تھے۔

اچانک اسحاق نے حاضرین سے پوچھا۔ "کیا تم لوگ میرے چہرے پر انوار و تجلیات کے آثار محسوس نہیں کر رہے؟"

لوگوں نے متفقہ طور پر اقرار کیا۔ "بے شک آپ کا چہرہ منور اور پُر از تجلی ہے۔"

اسحاق نے تحکمانہ لہجہ اختیار کیا اور کہا۔ "لوگو! جو کچھ میں نے بیان کیا وہ میری سرگزشت تھی۔ اس سرگزشت کو سننے کے بعد میں تم کو متنبہ کرتا ہوں کہ جو شخص خدا پر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور مجھ پر ایمان لایا۔ اس نے فلاح و رستگاری پائی اور جس نے میری نبوت سے انکار کیا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو بے کار کردیا۔ ایسا منکر ابد الآباد جہنم کا ایندھن بنا رہے گا۔"

صدر مدرس نے سب سے پہلے اس کی نبوت کا اقرار کیا۔ جب کہ قاضیِ شہر اس سے بھی پہلے ایمان لانا چاہتا تھا لیکن چالاک صدر مدرس نے اسے اس کا موقع نہیں دیا تھا۔

حاکم شہر بدستور پابہ رکاب تھا وہ وزیر سے پہلے اس طرف کوئی قدم اٹھاتے ہوئے ڈرتا تھا۔

جب صدر مدرس اور قاضی شہر نے اس پر دباؤ ڈالا کہ پہلے وہ ایمان لے آئے اس کے بعد وزیر کے پاس جائے تو حاکم شہر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں نے وزیر کے منشا کے خلاف ایمان قبول کرلیا تو وہ مجھے معزول کردے گا۔ جب کہ میں نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ وزیر کے سامنے ایمان لاؤں گا اور اسے بھی ایمان لانے پر مجبور کردوں گا۔ جب ہم دونوں اس نئے دین میں داخل ہو جائیں گے تو پورے شہر کو ایمان لانے پر مجبور کیا جائے گا اور امید ہے کہ اس کا خاطر خواہ اثر پڑے گا۔"

قاضی شہر اور صدر مدرس نے بے حد دباؤ ڈالا مگر حاکم شہر نے اپنی ضد نہیں چھوڑی اور ایمان لائے بغیر ہی وزیر کے پاس پہنچ گیا۔

حاکم شہر، وزیر سے ملا اور اس کو ان تمام واقعات کی خبر دی اور کہا۔ "آپ کا وہاں چلنا بے حد ضروری ہے۔"

وزیر نے کہا۔ "رات مجھے بھی چند آدمیوں نے جگا دیا تھا اور وہ مجھے اس شخص کے پاس لے جانا چاہتے تھے۔"

حاکم شہر نے پوچھا۔ "پھر آپ وہاں پہنچے کیوں نہیں؟"

وزیر نے جواب دیا۔ "میں جب تک دوسروں سے یہ تصدیق نہ کرلوں کہ یہ شخص آخر کہتا کیا ہے اس سے نہیں ملوں گا۔"

حاکم شہر نے جو کچھ سنا تھا یا جو کچھ معلوم تھا سب کچھ وزیر کے سامنے بیان کردیا اور کہا۔ "اب آپ ہی بتائیں کہ میں کسی ذیلی اور ظلی نبی پر کس طرح ایمان لا سکتا ہوں جبکہ قرآن اور احادیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا اللہ نے ایسے کسی نبی کی بشارت دے رکھی ہو۔ مجھ کو تو یہ شخص بہت ہی چالاک معلوم ہوتا ہے۔"

وزیر نے پوچھا۔ "یہ شخص اصفہان میں کہاں سے اور کب آیا؟"

حاکم شہر نے جواب دیا۔ "کہتے ہیں کہ دس سال پہلے یہ شخص ملک مغرب سے اصفہان آیا تھا۔ اس وقت یہ بہرا اور گونگا تھا لیکن یہاں آنے سے پہلے وہ کیا تھا کوئی نہیں جانتا۔"

وزیر نے کہا۔ "یہ تیری ذمہ داری ہے کہ تو کسی بھی طرح یہ معلوم کر کہ یہ شخص افریقہ کے کس شہر سے یہاں آیا تھا تاکہ اس کی پچھلی زندگی کے حالات معلوم کیے جاسکیں۔"

حاکم شہر نے اپنی بے بسی اور مجبوری کا اظہار کیا۔ "جناب! اب اگر میں اس کے سامنے گیا تو وہاں جتنے لوگ بھی موجود ہوں گے وہ مجھ پر دباؤ ڈالیں گے کہ میں پہلے تو ایمان لاؤں اس کے بعد کوئی بات کروں۔"

وزیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو پھر تو بھی یہیں رہ، میں اس کو یہیں بلوا لیتا ہوں۔"

حاکم شہر، وزیر کے پاس رک گیا، وزیر کے پیادے اسحاق کے پاس پہنچے اور بتایا کہ وزیر نے اس عجیب و غریب شخص کو اپنے محل میں طلب کیا ہے۔

صدر مدرس کو غصہ آیا کہ وزیر کی یہ ہمت کہ وہ اسحاق کو اپنے دربار میں طلب کرے۔ اس نے بار بار زمین پر پاؤں مارے اور غصے میں کہا۔ "وزیر کی یہ ہمت کہ وہ ایک نبی کو اپنے محل میں طلب کرے۔"

اسحاق نے نرم دلی کا مظاہرہ کیا۔ "یہ کوئی ایسی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ ایک وزیر نبی کو دربار میں طلب کرسکتا ہے۔ کیونکہ واقعات شاہد ہیں کہ ہمیشہ موسیٰؑ فرعون کے دربار میں جایا کرتے تھے۔ جب کہ فرعون ایک بار بھی موسیٰؑ کے گھر نہیں گیا۔" اس کے بعد اس نے وزیر کے پیادوں سے کہا۔ "تم لوگ واپس جاسکتے ہو اور وزیر سے کہہ دو کہ مجھے جب بھی فرصت میسر آئی اس سے ملنے آؤں گا۔"

پیادوں نے اصرار کیا کہ وہ ان کے ساتھ ہی وزیر کے دربار تک چلیں لیکن ان کی یہ درخواست مسترد کردی گئی۔

آخر پیادوں نے دھمکی دی۔ "اگر تم ہمارے ساتھ نہیں گئے تو وزیر کی طرف سے تمہاری گرفتاری کا فرمان بھی جاری ہوسکتا ہے۔"

صدر مدرس نے دھمکی دی۔ "اپنے وزیر سے کہہ دو کہ وہ اللہ کے ایک سچے نبی کو حقیر نہ جانے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس نبی کی بددعاؤں سے وہ برباد ہو جائے۔"

پیادے کسی ڈر یا خوف کے بغیر اپنی بات پر اڑے رہے اور کہا۔ "تم لوگ بلاوجہ اس جھوٹے نبی کی طرف سے وکالت کرتے ہو اگر یہ سچا ہے تو ہمارے ساتھ چلے۔"

صدر مدرس نے اسحاق کی طرف سے جواب دیا۔ "تم لوگ وزیر سے جاکر کہہ دو کہ وہ خود یہاں آجائے۔ ہم اللہ کے نبی پر دباؤ نہیں ڈال سکتے۔"

پیادوں کی تعداد کم تھی اور اسحاق کو نبی مان لینے والوں کی تعداد بہت زیادہ۔ اس لیے پیادوں نے دھمکی تو دی لیکن عملاً کچھ نہیں کیا۔

قاضی شہر ابھی تک خاموش تھا جب اس نے یہ دیکھا کہ پیادے مرعوب ہوچکے ہیں تو کہنے لگا۔ "تم لوگ وزیر کے ملازم ہو، کیوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔ تم اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے اللہ کے اس نبی کے مقام سے ناواقف ہو۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم واپس جاؤ اور وزیر سے کہہ دو کہ وہ خود یہاں آجائے اور جو کچھ پوچھنا ہو خود آکر پوچھ لے۔"



پیادے واپس چلے گئے اور جو کچھ وہاں دیکھا اور سنا تھا بے کم و کاست وزیر کے سامنے بیان کردیا۔
وزیر نے پوچھا۔ "جب وہ آنے پر آمادہ نہیں تھا تو تم اسے زبردستی لے آتے۔"
ایک پیادے نے کہا۔ "جناب والا! ہم کل سات آدمی تھے جبکہ نبوت کے دعویدار کے حامی صدر مدرس اور قاضی شہر کے علاوہ سیکڑوں وہاں موجود تھے اور ایسا لگتا تھا کہ اگر ہم زبردستی کرتے تو وہ لوگ ہمیں قتل کردیتے۔"
وزیر نے پیادوں کو ہٹا کر حاکم شہر سے مشورہ کیا۔ "آخر اس شخص میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ اچانک اس کے سیکڑوں حامی پیدا ہوگئے؟"
حاکم شہر نے جواب دیا۔ "جہاں تک میں جانتا ہوں یہ شخص دس سال پہلے یہاں بہرا گونگا آیا تھا اور اب اچانک وہ باتیں کرنے لگا ہے اور اس کو کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ وہ چاروں الہامی کتابوں اور صحیفوں کو پڑھنے اور سمجھنے اور ان کے مفاہم کو بیان کرنے پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہے۔ اسی لیے لوگ اس کے گرویدہ ہوگئے ہیں۔"
وزیر نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا یہ جو کچھ تو نے بتایا درست ہے؟"
حاکم شہر نے جواب دیا۔ "میں نے جو کچھ دوسروں سے سنا ہے وہ بیان کردیا ہے۔ بہتر ہوگا اس کو کسی بھی طرح یہاں آنے پر مجبور کردیا جائے اور آپ خود اس کا امتحان کرلیں۔"
وزیر نے فکر مند لہجے میں کہا۔ "میں نے اس کو بلوایا تھا لیکن وہ یہاں نہیں آیا۔ سوچتا ہوں ایک فوجی دستہ بھیج کر اس کو اٹھوالوں۔"
حاکم شہر ہر حال میں اپنا ایمان بچانا چاہتا تھا کیونکہ اس کا ایمان تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اس لیے یہ شخص جھوٹا ہے۔ اس نے وزیر کو مشورہ دیا کہ اسحاق کو کسی بھی طرح محل میں بلوالیا جائے اور اس سے باتیں کرکے معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔
ابھی وزیر نے فوجی دستہ بھیجنے کا سوچا ہی تھا کہ اسحاق، قاضی شہر، صدر مدرس اپنے سیکڑوں ارادتمندوں کے ساتھ وزیر کے پاس خود پہنچ گیا۔
وزیر نے اسے عزت و احترام سے بٹھایا اور پوچھا۔ "اے اسحاق! یہ تو نے کیسا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔"
اسحاق نے جواب دیا۔ "میں نے کوئی ہنگامہ برپا نہیں کیا۔ اللہ نے مجھ پر مہربانی کی کہ مجھ گونگے بہرے کو اپنی رحمتوں سے نوازدیا اب اگر اس سے کوئی ہنگامہ کھڑا ہوتا ہے تو میں کس حد تک خطاکار یا گناہگار ٹھہروں گا۔"
وزیر نے صدر مدرس سے پوچھا۔ "تم اس شخص کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"
صدر مدرس نے جواب دیا۔ "دس سال پہلے جب یہ ہمارے مدرسے میں آیا تو بہرا اور گونگا تھا۔"
وزیر نے سوال کیا۔ "پھر اس گونگے بہرے کو تو نے رہنے کے لیے حجرہ کیوں دے دیا؟"
صدر مدرس نے جواب دیا۔ "ازراہ ہمدردی اور یہ سوچ کر کہ اس شہر میں اس بے کار آدمی کو کون رکھے گا۔"
وزیر نے طنزیہ سوال کیا۔ "اصفہان شہر میں تم کس کس سے ہمدردی کرتے رہے ہو اور کتنوں کو رہنے کے لیے حجرے دیتے رہے ہو؟"
صدر مدرس نے جواب دیا۔ "صرف اسحاق کو اور کسی کو نہیں۔"
وزیر نے پوچھا۔ "ان دس سالوں میں اس کی گزربسر کس طرح ہوتی رہی؟"
صدر مدرس نے جواب دیا۔ "فی سبیل اللہ۔ ہم نے اس سے کبھی کوئی رقم نہیں لی۔"
اب وزیر قاضی شہر سے مخاطب ہوا اور پوچھا۔ "ہاں تو جناب قاضی صاحب! سننے میں آیا ہے کہ آپ بھی اس کی نبوت کا اقرار کرچکے ہیں۔ کیا آپ کو یہ نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔"
قاضی شہر نے جواب دیا۔ "مجھے اس کا یقین ہے لیکن یہ اپنی نبوت کے سلسلے میں جو کچھ کہتا ہے اس کو آپ بھی غور سے سنیں۔ اس کے بعد آپ یہ فیصلہ کریں کہ اس کی نبوت شک و شبہے سے بالاتر ہے۔"
وزیر کو غصہ آرہا تھا بگڑ کر کہا۔ "تو قاضی شہر ہونے کے باوجود کیسی گمراہی کی باتیں کررہا ہے۔"
قاضی نے بھی غصہ دکھایا اور کہا۔ "اتنی بین نشانیوں کے بعد بھی اگر آپ اس کی نبوت کا اقرار نہیں کریں گے تو اپنے ساتھ ظلم کریں گے۔"
وزیر کو بھی طیش آیا اور اس نے قاضی کے رخسار پر طمانچہ رسید کیا۔ "جب ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا یہ عقیدہ

ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو، تو فضول باتیں کیوں کر رہا ہے؟"
قاضی شہر نے گال سہلاتے ہوئے کہا۔ "جب کسی کے پاس دلیلیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ مار پیٹ کرنے لگ جاتا ہے، آپ اسحاق کی پوری بات تو سنیں اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں۔"
اب اسحاق نے مداخلت کی اور کہا۔ "میری نبوت ہارون جیسی ہے۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کی موجودگی میں ہارون بھی نبی تھے۔ اسی طرح ملت اسلامیہ میں، میں بھی نبی ہوں۔ ذیلی اور ظلی اور بروزی نبی، موقتی نبی۔ جس کی اپنی کوئی شریعت نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ نبی ہوں کیونکہ جب فرشتوں نے مجھ سے کہا کہ تو نبی ہے تو میں خوفزدہ ہو گیا تھا اور فرشتوں سے کہا تھا کہ یہ میرا ایمان ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو میں کس طرح نبی ہو سکتا ہوں۔ جس کا فرشتوں نے یہ جواب دیا کہ میں ذیلی اور ظلی نبی ہوں میری اپنی کوئی شریعت نہیں ہے۔"
وزیر نے پوچھا۔ "تو دس سال پہلے کہاں رہتا تھا یعنی یہاں اصفہان میں آنے سے پہلے؟"
اسحاق نے جواب دیا۔ "چونکہ میں بہرا اور گونگا تھا اس لیے میں کچھ نہیں جانتا کہ جہاں میں رہتا تھا اس کا کیا نام تھا۔"
وزیر نے مزید استفسار کیا۔ "کیا تو اپنے خاندان اور بزرگوں کے بارے میں کچھ بتا سکے گا؟"
اسحاق نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ تو دیا کہ جب میں بہرا اور گونگا تھا تو اس زمانے کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں شکلوں سے انہیں پہچان سکتا ہوں لیکن ان شکلوں سے میرا کیا رشتہ تھا، میں نہیں جانتا۔"
وزیر نے اس کو منع کیا۔ "میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تو اپنی نبوت کے دعوے سے باز رہ۔ اس وقت تک جب تک میں تیرے ماضی سے اچھی طرح واقف نہ ہو جاؤں۔ تیرے وطن اور آباؤ اجداد کا پتا نہ چلا لوں۔ مجھ کو تیرے دعوے میں گڑبڑ نظر آتی ہے۔"
صدر مدرس نے اسحاق کی حمایت کی اور کہا۔ "جب اسحاق کے دس سال ہمارے سامنے ہیں تو سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ یہ پیدائشی گونگا اور بہرا شخص ایک دم کس طرح گویا ہو گیا اور اسے کس طرح کئی زبانوں پر عبور حاصل ہوا اور اسے کس طرح الہامی کتابوں اور صحیفوں کا مکمل اور غیر معمولی علم حاصل ہوا۔"

وزیر نے ان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا اور کہا۔ "بہرحال میں اس شخص کو منع کرتا ہوں کہ یہ اپنی نبوت کے دعوے سے باز رہے ورنہ میں سختی پر مجبور ہو جاؤں گا۔"
اسحاق نے درشت لہجہ اختیار کیا۔ "مجھے اللہ کے فرشتوں نے جو حکم دیا ہے۔ میں اسے پورا کروں گا۔"
وزیر نے بھی سختی ظاہر کی اور کہا۔ "اگر تو باز نہ آیا تو میں طاقت کا استعمال کروں گا اور تجھ کو قید خانے میں ڈلوا دوں گا۔ جہاں سے تو مر کر ہی نکل سکے گا۔"
اسحاق اپنے ارادتمندوں پر اکڑ رہا تھا جو سیکڑوں کی تعداد میں محل کے باہر موجود تھے اور اسے یقین تھا کہ یہ سیکڑوں چند دنوں میں ہزاروں ہو جائیں گے اور پھر یہ ہزاروں لاکھوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔
وزیر نے صدر مدرس سے کہا۔ "مجھ کو ایسا لگتا ہے کہ اس فتنہ کا روح رواں تو ہے۔ تیرے خلاف ایک مقدمہ بھی زیر سماعت ہے کہ تو آدھی رات کو شہر کا صدر دروازہ زبردستی کھلوا کر اندر داخل ہو گیا اور تیرے پیچھے چلنے والوں نے فصیل کو کئی جگہ سے نقصان پہنچایا۔"
صدر مدرس نے اسحاق کی حمایت جاری رکھی۔ "جناب! میں اس شخص پر ایمان لا چکا ہوں اگر کوئی اور میری جگہ ہوتا تو وہ بھی ایمان لے آتا۔ میرے سامنے اسحاق کا دس سالہ ماضی ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کو کس طرح قائل کروں۔ بس اللہ سے دعا کر سکتا ہوں کہ وہ آپ کو توفیق دے اور آپ کے دل و دماغ پر وہ سب منکشف ہو جائے جو مجھ پر منکشف ہو چکا ہے۔"
وزیر نے صدر مدرس کو بھی پابند کر دیا۔ "تو بھی اپنی زبان بند رکھے گا اور میری اجازت کے بغیر تو مدرسہ چھوڑ کر کہیں اور نہیں جائے گا۔"
اب وزیر، قاضی شہر سے مخاطب ہوا۔ "تو قاضی ہے اور قاضی کو اتنا ضعیف الاعتقاد نہیں ہونا چاہیے۔"
قاضی شہر نے جواب دیا۔ "جناب! اسحاق کے پاس آیات بیّنات ہیں۔ ان کی موجودگی میں کسی اور بات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے مجھے آپ گمراہی کا طعنہ نہ دیں۔"

وزیر نے قاضی کو بھی حکم دیا۔ "اب تو بھی خود کو اپنے گھر میں قیدی سمجھ، اپنی زبان بند رکھ اس دوران میں اس جھوٹے نبی کے بارے میں تیری زبان سے کچھ نہ سنا جائے۔ یہاں تک کہ نہ تو تجھ سے یہ جھوٹا نبی ملے گا اور نہ تو اس سے ملاقات کرے گا۔"

وزیر نے اسحاق کے سوا سبھی کو جانے کی اجازت دے دی اور اسحاق سے کہا۔ "تو ہمارا اس وقت تک مہمان ہے جب تک میں تیرے ماضی کی اچھی طرح چھان بین نہ کرلوں۔"

وزیر کے اس اعلان سے ہر کوئی ناخوش ہوا اور صدر مدرس نے کہا۔ "آپ ایسا حکم نہیں دے سکتے۔ آپ اس شخص کو قید کرنا چاہتے ہیں تو یہ آپ کے حق میں بہت بُرا ہوگا کیا آپ کو یہ نہیں معلوم کہ محل کے باہر اسحاق کے سیکڑوں حامی موجود ہیں اور جب وہ یہ سنیں گے کہ اسحاق کو آپ نے قید کردیا ہے تو وہ بارہا ہنگامہ کردیں گے۔"

وزیر نے غصے میں حکم دیا۔ "اسحاق کے ساتھ قاضی شہر اور صدر مدرس کو بھی قید کردیا جائے اور باہر جو اصفہانی موجود ہیں انہیں حکم دیا جائے کہ وہ یہاں سے چپ چاپ چلے جائیں اور اگر وہ میرا حکم نہ مانیں تو انہیں فوجی دستے کے حوالے کردیا جائے۔"

اسحاق، صدر مدرس اور قاضی شہر کو محل کے ایک حصے میں قید کردیا گیا اور محل کے باہر ہجوم کو ڈنڈوں سے منتشر کردیا گیا۔ لیکن ان منتشر ہونے والوں نے اپنا کام شروع کردیا اور افواہوں کی شکل میں اسحاق کی عجیب و غریب شخصیت کی تبلیغ ہونے لگی۔ اصفہان کے بہت سے لوگ بہرے اور گونگے اسحاق سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے اس کی نبوت کے سلسلے میں کسی کو زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑی اور اسحاق کی نبوت اصفہانیوں میں مقبول ہونے لگی اور یہ ہوا ایسی چلی کہ حاکم شہر اور وزیر کئی ہفتے اس سے بالکل بے خبر رہے۔

ابتدا میں شہر کے کئی چوراہوں پر یہ صدا بلند ہوئی کہ اللہ کے نبی کو چھوڑا جائے۔

اور پھر یہی نعرہ اصفہان کے گلی کوچوں سے بلند ہونے لگا۔

آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ حاکم شہر نے وزیر سے کہا۔ "اگر ہم نے اس مسئلہ پر فوری توجہ نہ دی تو پھر یہ مسئلہ خطرناک صورت بھی اختیار کرسکتا ہے۔"

وزیر نے کہا۔ "تو اس کی تو فکر ہی نہ کر۔ میں ان بلوائیوں پر قابو رکھوں گا۔ تو کسی بھی طرح اسحاق کے خاندان اور وطن کا پتا لگا۔ بس ہم اسی طرح اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔"

حاکم شہر نے کہا۔ "گو کہ کام دشوار ہے مگر اللہ اور اس کے نبی نے چاہا تو میں اسحاق کے وطن اور خاندان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور آپ یہ سمجھ لیں کہ کام کا آغاز ہو گیا۔"

حاکم شہر مہینوں کی جستجو کے بعد اسحاق کے بارے میں صرف اتنا پتا چلا سکا کہ یہ شخص مراکش، تیونس اور الجزائر میں سے کسی ایک جگہ کا رہنے والا ہے۔ ان تینوں جگہوں میں سے خاص اس جگہ کا پتا چلانا جہاں سے اسحاق کا تعلق ہو سکتا تھا بہت مشکل کام تھا۔ اسحاق نے دس سال تک بہرے گونگے کی اداکاری کرکے اپنے آبائی وطن پر ایسا دبیز پردہ ڈالا تھا کہ اب اس کا پتا چلانا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ بس ایک صورت ایسی تھی جس سے اسحاق کی وطنیت کا کچھ پتا چل سکتا تھا۔ وہ یہ کہ اصفہان میں ہر سال دور دراز ملکوں سے لوگ آیا کرتے تھے۔ اور ان میں اتفاق سے کوئی ایسا آدمی آجائے جو اسحاق کو اس کے ماضی سے جانتا ہو۔

اب اصفہان کی سرائے کے چکر لگنے لگے۔ وہ ہر روز صبح، دوپہر، شام سرائے پہنچ جاتا اور شمالی مغربی افریقہ کے مسافروں کی جستجو میں رہتا لیکن وہ کئی ماہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد بھی کسی ایسے شخص کو پانے میں ناکام رہا جس کا تعلق مراکش، تیونس یا الجزائر سے ہوتا۔ جب اس کوشش میں بھی ناکامی ہوئی تو حاکم شہر نے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اس کا اپنے وزیر سے مسلسل رابطہ قائم تھا۔

اصفہان میں اسحاق کے ماننے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نئے نبی کے ماننے والوں پر سختیاں ہونے لگیں۔

اصفہان کے راسخ العقیدہ اور دین دار مسلم بہت پریشان تھے انہیں خوف تھا کہ کہیں پورا اصفہان اس جھوٹے نبی کے چکر میں نہ آجائے۔

یہ خبریں سامرہ بھی پہنچ رہی تھیں اور سامرہ میں پہلے عباسی خلیفہ ابوالسفاح کا انتقال ہو چکا تھا اس کی جگہ اس کے بھائی

ابو جعفر منصور نے مسند خلافت سنبھالی تھی۔ خلیفہ بنتے ہی اس نے اپنے لیے پایہ تخت کی حیثیت سے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا اس کا نام سرمَن رائے رکھا تھا۔ سرمن رائے کا مطلب تھا وہ جگہ جسے میں نے پسند کیا۔ بعد میں سرمن رائے مختصر ہو کر سامرہ ہو گیا۔ یہ اب بھی بغداد کے محاذی کسی قدر فاصلے پر موجود ہے۔

ابو جعفر منصور کو اس کے واقعہ نویس نے خبر دی کہ اصفہان میں ایک جھوٹا نبی پیدا ہو گیا ہے اور یہ جھوٹا نبی تقریباً پورے اصفہان کو گمراہ کر چکا ہے۔ اگر اس فتنے پر جلد قابو نہ پایا گیا تو یہ اصفہان سے نکل کر قرب و جوار کے دوسرے شہروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

اس نے اصفہان میں جس وزیر کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا اس کو حکم دیا گیا۔ "جھوٹے نبی کو گرفتار کر کے سامرہ روانہ کر دیا جائے۔"

وزیر نے حاکم شہر سے مشورہ کیا اور پوچھا۔ "اب تو بتا کہ اسحاق کو خلیفہ ابو جعفر کے حوالے کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ کیونکہ خلیفہ تو اس کو فوراً قتل کروا دے گا اور اس قتل سے اسحاق کے رازوں پر ایسا پردہ پڑے گا کہ پھر کبھی اٹھانا ناممکن ہو جائے گا۔"

لیکن ابو جعفر منصور کے غیظ و غضب سے ہر کوئی واقف تھا۔ یہ خلیفہ اپنے علم و فضل میں کوئی ثانی نہ رکھتا تھا۔ بڑے بڑے فقیہہ اور علما بھی اس کے علم و فضل کے قائل تھے۔ وزیر بھی خوب جانتا تھا کہ ابو جعفر منصور کو باتوں سے نہیں بہلایا جا سکتا۔ کچھ دن تو حاکم ٹال مٹول سے کام لیتا رہا مگر جب دوسرا فرمان پہنچا کہ اس جھوٹے نبی کو فوراً سامرہ روانہ کیا جائے تو وزیر گھبرا گیا۔ اور اس کو حاکم شہر کی نگرانی میں سامرہ روانہ کر دیا۔ ابھی وہ اصفہان سے نکلا بھی نہیں تھا کہ اس پر اسحاق کے ماننے والوں نے حملہ کر دیا اور معمولی سی جدوجہد کے بعد اسحاق کو آزاد کرا لیا۔ اور اس کو شہر کے باہر کسی ایسی جگہ چھپا دیا جہاں وزیر یا خلیفہ کی پہنچ ممکن نہ تھی۔

اسحاق اپنے پرستاروں کا شکر گزار تھا۔ اور اس کو یہاں بھی صدر مدرس اور قاضی شہر کا بڑا خیال تھا جو ابھی تک وزیر کی قید میں تھے۔ اور ان دونوں کی رہائی بھی اسحاق کی رہائی کی طرح بہت ضروری تھی۔

جس شخص نے اسحاق کو رہائی دلوائی تھی۔ اس کا نام ابو حنف تھا اور اس کے دو خاص ساتھی اسعدی اور بکیر تھے۔ ابو حنف کا خیال تھا کہ اسحاق ایک ایسا قیمتی شخص اس کے ہاتھ آگیا تھا جس کے ذریعے ایک حکومت قائم کی جا سکتی تھی لیکن وہ اتنا بڑا کام اسحاق کی منظوری اور اجازت کے بغیر نہیں انجام دے سکتا تھا۔ وہ اسحاق کے سامنے دو زانو بیٹھ گیا اور عرض کیا۔

"حضرت! میں نے آپ کو وزیر کی قید سے رہائی دلوائی اب آپ حکم دیں کہ مجھے اور کیا کرنا چاہیے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "وہی سب کچھ جو ایک نبی کے پیرو ماضی میں اپنے نبی کے لیے کرتے رہے ہیں۔ یعنی اپنے دین کی ترویج و اشاعت۔"

ابو حنف نے کہا۔ "یہ کام اتنا آسان نہیں ہے بہت دشوار ہے۔ کیوں کہ ہمارے پاس فی الحال کوئی فوج بھی نہیں ہے۔"

اس مسئلہ پر دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور یہ طے پایا کہ فی الحال جنگ و جدل سے گریز کیا جائے اور پرامن طریقے سے اپنے دین کی اشاعت کی جائے اور ساتھ ہی اپنے ارادتمندوں کو فوجی تربیت بھی دی جائے۔ جب یہ فوج اس لائق ہو جائے کہ عباسی فوجیوں کا مقابلہ کر سکے تو جنگ و جدل کی راہ اختیار کی جائے۔ یہ کام طویل اور صبر آزما ضرور ہے مگر اس کے نتائج بہت اچھے نکلیں گے۔

یہ بات کسی کو بھی معلوم نہیں تھی کہ بکیر، وزیر اور حاکم شہر کا آدمی ہے اور اسحاق کی حقیقت جاننے کے لیے اسحاق کے قریب پہنچایا گیا ہے کہ کسی بھی طرح اسحاق کے ماضی کو کرید کر اس کے وطن تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

اب ابو حنف بکیر اور اسعدی میں مشورے ہوتے رہتے۔ بکیر نے اسحاق کا بہت زیادہ قرب حاصل کر لیا وہ اپنی باتوں سے اسحاق کا سب سے بڑا جاں نثار نظر آتا تھا۔

وہ اکثر و بیشتر اسحاق سے کہتا رہتا تھا "نبیوں کی اپنی شہروں میں عزت نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ غیروں میں عزت پاتے ہیں۔ لیکن ہر نبی کا وطن اس کی وجہ سے مقدس حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ میری بھی یہ خواہش ہے کہ آپ کے وطن کو وہ مقام حاصل ہو جو یروشلم کو حضرت عیسیٰ کی وجہ سے حاصل ہوا اور مکے کو محمدؐ ابن عبداللہ کی وجہ سے ملا۔"

اسحاق نے اس مسئلہ پر سکوت اختیار کیا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ اس نے جس دن بھی اپنے وطن کا ذکر کر دیا۔ اس کے سارے منصوبے کو زوال آنا شروع ہو جائے گا۔

اسحاق کے سامرہ نہ پہنچنے کی وجہ سے خلیفہ ابو جعفر منصور بہت برہم تھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ اسحاق کے ماننے والے جنگ و جدل کی تیاریاں کر رہے ہیں تو اس نے سختی سے اپنے نمائندہ وزیر کو لکھا۔ "کیا بات ہے کہ تو اب تک اس معمولی آدمی پر قابو نہیں پا سکا۔ کیا میں تیری جگہ کسی اور کو بھیج دوں۔ میں صرف دو ماہ انتظار کروں گا۔ اس کے بعد تیرا کوئی عذر یا حیلہ مجھے مطمئن نہ کر سکے گا۔"

وزیر نے حاکم شہر سے کہا۔ "اگر تو اسحاق کو دوبارہ گرفتار نہ کر سکا تو میں تجھ کو ملازمت سے نکال دوں گا اور تیری جگہ اس شخص کو حاکم شہر بناؤں گا جو اسحاق کو گرفتار کر کے مجھے سرخرو کرے گا۔"

حاکم شہر نے کہا۔ "آپ امیر المومنین کو لکھ دیں کہ اسحاق کی گرفتاری کوئی مسئلہ نہیں ہے اگر اس کو گرفتار کر کے سامرہ روانہ کر دیا گیا اور وہاں اسے قتل کر دیا گیا تو اس طرح یہ مظلوم ہو جائے گا اور ہمیں زندگی بھر اس کے حامیوں سے جنگ کرنی پڑے گی اور یہ حامی اپنی تعداد میں اضافہ کرتے چلے جائیں گے۔ جب تک میں اسحاق کے وطن کا پتا نہیں چلا لیتا اس وقت تک میں جنگ سے باز رہنا چاہتا ہوں اور اللہ نے چاہا تو اب میں بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

ابو جعفر منصور کو لکھ دیا گیا۔ "امیر المومنین! اک ذرا صبر سے کام لیں۔ میں اور حاکم شہر اس جھوٹے نبی اسحاق کی سات پشتوں تک پہنچنا چاہتے ہیں کیونکہ اس جھوٹے نبی کی جان اس کی پشتوں میں ہے۔"

خلیفہ کی طرف سے کچھ وقت اور مل گیا اور اب حاکم شہر بکیر کے پیچھے پڑ گیا اور خفیہ طریقوں سے بکیر کو حکم دیا "دور دراز علاقوں سے آنے والوں پر گہری نظر رکھی جائے ان کی باتیں سنی جائیں اور افریقہ کے شمال مغرب سے آنے والوں پر خاص توجہ دی جائے۔"

آخر چھ ماہ کی جدوجہد کے بعد ایک بوڑھا مل گیا۔ یہ شخص الجزائر سے آیا تھا اور اسے اسحاق کی جستجو تھی۔ یہ بالکل اتفاق کی بات تھی کہ عبدالرحمٰن نامی اس بوڑھے نے سرائے میں قیام کیا اور وہاں لوگوں سے یہ پوچھا کہ مجھے وہ شخص کہاں ملے گا جس کا نام اسحاق ہے اور جو دس سال تک بہرا اور گونگا رہا اور اس کے بعد اچانک نبی بن گیا۔

حاکم شہر تو عرصے سے ایسے شخص کی تلاش میں تھا۔ وہ جیسے ہی عبدالرحمٰن سے ملا، عبدالرحمٰن کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

عبدالرحمٰن کی نگرانی اس طرح کی جانے لگی کہ عبدالرحمٰن اسے محسوس نہ کر سکے۔ اس نے عبدالرحمٰن سے اسحاق کی بڑی تعریفیں کیں اور کہا۔ "افسوس کہ میں خود بھی اس کی لیاقت اور قابلیت کا بے حد قائل ہوں۔ پہلے وہ ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔ مگر میرے حاکم شہر ہونے کی وجہ سے اس نے مجھ پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا اور اپنے ماننے والوں کے ساتھ کہیں روپوش ہو گیا۔ اب ہم اس کو آسانی سے نہیں پا سکتے۔"

بوڑھے عبدالرحمٰن نے کہا۔ "میں اپنے جس اسحاق کو تلاش کر رہا ہوں اس کے گلے میں ایک بڑا سا مسّا ہے اور اس کی آنکھیں ہمیشہ سوئی سوئی سی رہتی ہیں یعنی مخمور اور خوابیدہ آنکھیں۔"

حاکم شہر کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ اسحاق میں یہ ساری چیزیں موجود تھیں۔ اس نے کہا۔ "بے شک یہ وہی انسان ہے جس کی تلاش میں تو یہاں آیا ہے۔ میں تجھ کو اس سے ملوا دوں گا۔ مگر اس سے پہلے تو مجھے یہ بتا کہ "تو کہاں سے آیا ہے؟"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ "میں الجزائر سے آیا ہوں اسحاق کا تعلق بھی الجزائر سے ہے۔"

اب حاکم شہر کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ایسا لگتا تھا جیسے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

عبدالرحمٰن نے اس کو بتایا۔ "اسحاق کا بہت بڑا خاندان ہے۔ اس کے کئی بھائی ہیں کئی بہنیں ہیں۔ اس کے والدین ابھی زندہ ہیں اور اپنے گمشدہ بیٹے کا انتظار کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ لائق ان کا یہی بیٹا تھا اور اسی سے انہوں نے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں لیکن اسحاق کی اچانک گم شدگی نے والدین کو اتنا پریشان کیا جتنا حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کی گمشدگی نے کیا ہو گا۔"

حاکم شہر نے کہا۔ "لیکن بڑے میاں آپ نے اپنے اسحاق کی جو علامتیں اور نشانیاں بیان کی ہیں وہ اس اسحاق میں بھی پائی جاتی ہیں مگر سب سے بڑی نشانی آپ بتانا بھول گئے۔"

عبدالرحمٰن نے پوچھا۔ کون سی بڑی نشانی کیا یہ کہ اس کا سر غیر معمولی بڑا ہے؟"

حاکم شہر نے کہا۔ "ہاں! اس کا سر بھی بہت بڑا ہے مگر آپ ذرا سوچیں ایک ایسی علامت جو کم لوگوں میں ملے گی اور اسی علامت کی وجہ سے وہ دس سال تک لوگوں کے رحم و کرم پر رہا۔"

عبدالرحمٰن نے اپنے حافظہ پر زور دیا اور کہا۔ "میرے خیال میں اس میں کوئی ایسا نقص یا خرابی نہیں تھی جس سے وہ دوسروں کی ہمدردی کا مستحق قرار پاتا۔"

حاکم شہر نے بتایا۔ "جب وہ اصفہان میں آیا تھا تو وہ بہرا اور گونگا تھا مگر دس سال بعد اس کی قوت گویائی اور اس کی علمیت ہم سب کی حیرت کا سبب بن گئی۔"

عبدالرحمٰن نے کہا۔ "میں جس اسحاق کی تلاش میں آیا ہوں وہ بہرا اور گونگا نہیں تھا اس نے تو الجزائر کے بڑے بڑے علماء سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بہترین محرر تھا اور بہترین مقرر بھی۔ میں اگر ایک نظر اس کو دیکھ لوں تو پہچان لوں گا۔"

حاکم شہر نے اس کو ڈرایا۔ "آپ جس اسحاق کی تلاش میں یہاں آئے ہیں؟ بے شک یہی وہ شخص ہے مگر میں آپ کی زندگی کو خطرے میں محسوس کرتا ہوں۔ اسحاق آپ کو قتل کروا دے گا۔ وہ کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کر سکتا جو اس کے ماضی سے واقف ہو۔ وہ بہت بڑا منصوبہ باز ہے اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں ایک عرصے سے جس شخص کی تلاش تھی وہ ہمیں آپ کی شکل میں مل گیا۔"

یہ ساری باتیں عبدالرحمٰن کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔

حاکم شہر نے کہا۔ "آپ بالکل پریشان نہ ہوں' میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ آپ کچھ دن ہمارے ساتھ رہیں اور بس۔"

حاکم شہر نے وزیر سے بوڑھے عبدالرحمٰن کا ذکر کیا اور بتایا۔ "ہمیں جس شخص کا انتظار تھا یا تلاش تھی وہ اتفاق سے ہمیں مل گیا ہے لیکن اس کی سخت نگرانی کی ضرورت ہے۔"

اور اس نے عبدالرحمٰن کو وزیر سے ملوا دیا۔ دونوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ الجزائر سے چل کر اصفہان تک آنے والے اسحاق کی کیا منصوبہ بندی تھی لیکن یہ بات قابل داد تھی کہ اسحاق دس سال تک بہرا اور گونگا بنا رہا۔

حاکم شہر نے بکیر کو بتایا۔ "ہمیں اتفاق سے الجزائر کا ایک بوڑھا مل گیا ہے جو اس جھوٹے نبی کی سات پشتوں سے واقف ہے لیکن ابھی میں اس بوڑھے کو اسحاق سے دور رکھنا چاہتا ہوں اور نفسیاتی طور پر اسحاق کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں یا اصفہان کے لوگ اسحاق کی حقیقت سے واقف ہو گئے ہیں۔"

بکیر نے کہا۔ "اسحاق بہت چالاک انسان ہے اس کا جادو لوگوں پر چل گیا ہے اسے کسی طرح اتارنا بہت مشکل ہے۔"

بکیر کو ابھی تک عبدالرحمٰن سے نہیں ملوایا گیا تھا۔ حاکم شہر اور وزیر کو بکیر پر بھی بھروسا نہیں تھا کیونکہ اسحاق کی صحبت میں رہنے والوں پر اس کا جادو کام کر رہا تھا۔

اسی دوران شہر میں اسحاق کا چرچا اس طرح ہونے لگا کہ اسحاق کا بوڑھا باپ رزاق اور دو بھائی یعقوب اور یوسف اصفہان آ چکے ہیں وہ ایک عرصے سے اسحاق کو تلاش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ الجزائر سے آئے ہیں۔

بکیر نے یہ خبر اسحاق کو پہنچا دی اور کہا "حضور والا! الجزائر سے تین اشخاص آپ کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ ایک بوڑھا رزاق جو خود کو آپ کا باپ کہتا ہے اور اس کے دونوں بیٹے یعقوب اور یوسف وہ آپ کو اپنا بھائی بتاتے ہیں۔"

اسحاق چراغ پا ہو گیا اور کہا۔ "تینوں جھوٹے ہیں کیونکہ میرا باپ بچپن میں ہی مر گیا تھا اور میں اپنے باپ کا تنہا بیٹا ہوں اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ الجزائر کہاں ہے؟ اور میرا تعلق الجزائر سے ہے بھی یا نہیں۔"

بکیر نے کہا۔ "حضرت! آپ تو نبی ہیں اپنے فرشتوں سے معلوم کریں کہ آپ کے باپ کا کیا نام تھا اور آپ کے کتنے بھائی تھے اور یہ کہ آپ کا الجزائر سے کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں؟"

اسحاق نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔ "کیا تجھ کو بھی مجھ پر کوئی شبہ ہے جو اس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔"

بکیر نے جواب دیا۔ "میری توبہ میں نے تو وہ سب آپ کو بتا دیا جو سنا تھا اور جس کا بازار میں چرچا ہے۔"

اسحاق نے رازداری سے پوچھا۔ "ان خبروں کو اپنے تک رکھ اور میرے ان تینوں رشتے داروں تک پہنچنے کی کوشش کر اور ان کا کام تمام کر دے۔"

لیکن اب اسحاق کسی قدر فکر مند ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے کئی جاں نثاروں کو نہایت خاموشی اور رازداری سے مذکورہ تینوں آدمیوں کی تلاش اور قتل پر مامور کر دیا مگر اسحاق کو یہ خبر دی گئی "شہر میں ایسے تین آدمیوں کا کچھ پتا نہیں چلتا لیکن صرف ایک شخص موجود ہے جو خود کو الجزائری کہتا ہے اس کا نام عبدالرحمٰن ہے اس کے علاوہ دوسرا کوئی شخص نہیں۔"

عبدالرحمٰن کے ذکر نے اسحاق کو واقعی پریشان کر دیا کیونکہ اس عبدالرحمٰن سے اسحاق نے کچھ تعلیم بھی حاصل کی تھی۔

اب اسحاق نے بکیر کو سخت سرزنش کی اور حکم دیا۔ "جس طرح بھی ممکن ہو اس عبدالرحمٰن نامی شخص کو میرے پاس لایا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اسے قتل کر دیا جائے۔"

اب اسحاق نے اپنے جاں نثاروں کی چھوٹی سی فوج بھی تیار کر لی تھی۔ تقریباً دس ہزار آدمی اس فوج میں موجود تھے اور یہ اپنے نبی کی حفاظت کے لیے سر سے کفن باندھ چکے تھے۔

دوسری طرف ابو جعفر منصور پھر دباؤ ڈالنے لگا تھا کہ اسحاق کو گرفتار کر کے سامرہ روانہ کر دیا جائے لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنا آسان ابو جعفر منصور سمجھ رہا تھا۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں شروع ہو گئیں اور ان جھڑپوں میں اسحاق کو کامیابی حاصل ہوئی۔

اب اسحاق کی خواہش تھی کہ پورا اصفہان اس کے قبضے میں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ جب تک پورا شہر اس کے قبضے میں نہ ہو وہ اپنے دین کی ترویج و اشاعت اچھی طرح نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے دس ہزار جاں نثاروں نے باقاعدہ جنگیں شروع کر دیں اور وزیر کے محل کو نشانہ بنایا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ الجزائری بوڑھا اسی محل میں روپوش ہو گا۔

وزیر بھی اس کے لیے تیار تھا اور اس کی محافظ فوج تجربہ کار ہونے کے ساتھ ساتھ جذبہ جہاد بھی رکھتی تھی۔ اس نے اسحاق کے کئی حملے پسپا کر دیے لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ اسحاق کی نبوت جاہل عوام کے دلوں میں گھر کرتی جا رہی تھی اور یہ جاہل لوگ ہر جگہ موجود تھے۔ وزیر اور حاکم شہر کے جاہل خدمت گار بھی اسحاق کی نبوت پر ایمان لا چکے تھے۔ یہ لوگ درپردہ عبدالرحمٰن کی تلاش میں تھے مگر عبدالرحمٰن کو اصفہان کے قلعے میں منتقل کر دیا گیا۔

وزیر کی درخواست پر سامرہ سے پندرہ ہزار فوجی اصفہان پہنچ گئے۔

اب وزیر کا پلڑا بھاری تھا لیکن سازش اور سیاست میں اسحاق، وزیر پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے کئی آدمی اس کام پر لگا دیے کہ جس طرح بھی ممکن ہو عبدالرحمٰن کو قلعے سے نکال کر اس کے پاس پہنچایا جائے۔

بکیر جو بظاہر اسحاق کا خاص معتمد علیہ تھا۔ اب اپنا اعتماد کھو چکا تھا۔ اسے حکم دیا گیا کہ وہ تائب ہو کر حاکم شہر کے پاس چلا جائے اور اس سے کہے کہ میں نے اسحاق کی نبوت سے توبہ کی اور اب اس کے پاس واپس نہیں جاؤں گا۔ اس طرح اس کی رسائی قلعہ تک ہو جائے گی۔ وہ قلعہ میں عبدالرحمٰن سے ملنے کی کوشش کرے گا اور جب عبدالرحمٰن سے ملاقات ہو جائے تو اس کو قلعے سے باہر لانے کی کوشش کرے۔ قلعے کے آس پاس اسحاق کے آدمی گلے بانوں کی شکل میں پہلے سے موجود رہیں گے۔

لیکن اسحاق کا اصل منصوبہ کچھ اور ہی تھا۔ اس طرح وہ یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بکیر کس حد تک اس کا آدمی ہے اور کس حد تک حاکم شہر کا۔

حاکم شہر نے بکیر سے کہا۔ "بظاہر تو منحرف ہو کر ہمارے پاس آ گیا مگر ہم تو تیری حیثیت سے آگاہ ہیں۔ تیرے سپرد اسحاق نے جو کام کیا ہے تو اسے کس طرح انجام دے گا۔ اگر تو اسحاق کے مجوزہ منصوبہ پر کام نہ کر سکا تو تیرا نام ہمیشہ کے لیے اس کے معتمدین کی فہرست سے خارج کر دیا جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ تجھے بھی قتل کر دیا جائے۔ اس لیے تجھے بہت محتاط رہنا چاہیے۔"

بکیر واقعی شش و پنج میں مبتلا تھا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

قلعے کے باہر جو سبزہ زار تھا وہاں مویشیوں کے کئی ریوڑ مستقل چرتے رہتے تھے اور بکیر قلعے کی بلندی سے ان چرواہوں اور مویشیوں کو دیکھا رہتا تھا جو اسے ننھے منے نظر آتے تھے۔

عبدالرحمٰن نے بھی ان مویشیوں اور چرواہوں کو دیکھا اور بکیر سے پوچھا۔ "بھائی! کیا بات ہے۔ کیا تو نے کبھی مویشی اور چرواہے نہیں دیکھے جو انہیں اتنے شوق سے دیکھتا رہتا ہے۔"

بکیر نے کہا۔ "بڑے میاں! بات کچھ اور ہے، تمہاری وجہ سے میری زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔"

عبدالرحمٰن نے کہا۔ "اسحاق نے بڑے ہنگامے کھڑے کر رکھے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ اسے سوجھی کیا ہے اور اس جھوٹی نبوت سے وہ حاصل کیا کرنا چاہتا ہے؟ کیا حکومت؟ کیا خلافت عباسیہ اتنی کمزور ہو گئی ہے جسے وہ اپنے دس پندرہ ہزار ماننے والوں کی مدد سے سر کر لے گا۔"

بکیر نے جواب دیا۔ "بڑے میاں آپ وہ عزت اور وقعت یہاں قلعے میں بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتے اور نہ محسوس کر سکتے ہیں جو

نبوت کا دعویٰ کر کے اسحاق کو حاصل ہو گئی ہے۔ اس کے لیے تو انسان اپنی جان تک دے سکتا ہے۔"
عبدالرحمٰن نے اس سے پوچھا "تیرا کیا کام ہے۔ تو کبھی نظر آتا ہے اور کبھی غائب ہو جاتا ہے اور اب تو مستقل قلعے میں آگیا ہے آخر تو ہے کیا؟"
بکیر نے کہا۔ "میں نے جو کام نیک نیتی سے حاکم شہر اور وزیر کے کہنے سے شروع کیا تھا اسے انجام نہیں دے سکا مگر اب وہ کام آپ کے ذریعے انجام پا گیا۔ اب میری وہاں ضرورت باقی نہیں رہی اور اب اگر میں اپنی اس جگہ سے ہٹنا چاہوں تو یہ بھی ممکن نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں' ہر وقت میری زندگی کو خطرہ لاحق رہتا ہے۔"
یہ سب کچھ بتا کر بکیر اداس ہو گیا۔
عبدالرحمٰن نے پوچھا۔ "اگر میں کسی طرح تیرے کام آسکتا ہوں تو حاضر ہوں۔"
بکیر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی اور غائب ہو گئی۔ پوچھا۔ "کیا آپ میرے لیے اپنی جان دے سکتے ہیں؟"
عبدالرحمٰن نے حیرت سے پوچھا۔ "میرے جان دے دینے سے تجھ کو کیا فائدہ پہنچے گا۔"
بکیر نے جواب دیا۔ "تو مر جائے گا تو میں زندہ رہوں گا اور اگر تو نہ مرا تو میں مارا جاؤں گا۔"
یہ ساری باتیں ایسی گول مول اور پیچ دار تھیں کہ عبدالرحمٰن کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ اس نے کہا "یہ وزیر اور حاکم شہر بھی عجیب لوگ ہیں۔ میں نے ان سے کئی بار کہا ہے کہ تم لوگ کسی طرح میری ملاقات اسحاق سے کرواؤ تاکہ میں اسحاق کو پہچان لوں اور اس کو منع کروں کہ وہ نبوت کے جھوٹے دعوے سے باز آجائے اور چپ چاپ الجزائر واپس چلا جائے۔"
بکیر نے بڑے میاں کا مذاق اڑایا اور کہا۔ "جناب! وہ اتنا آسان آدمی نہیں ہے کہ آپ اپنے سیدھے سادے لفظوں اور لہجوں سے اس کو راضی کر لیں گے۔ بلکہ وہ آپ کو دیکھتے ہی اپنے ارادتمندوں سے قتل کروا دے گا۔"
نیچے میدان میں مویشیوں کے کئی ریوڑ سبزہ زار چرنے میں مشغول تھے اور ان کے چرواہے الگ الگ درختوں کے سائے میں بیٹھے قلعے کی طرف دیکھ رہے تھے۔
بکیر نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "بڑے میاں! آپ ان درختوں کے سائے میں بیٹھے ہوئے چرواہوں کو دیکھ رہے ہیں' کچھ جانتے ہیں کہ یہ کون ہیں؟"
عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ "تو خود ہی تو بتا رہا ہے کہ یہ چرواہے ہیں اور مجھ سے پوچھتا ہے کہ وہ کون ہیں؟"
بکیر نے جواب دیا۔ "ہاں' بظاہر یہ چرواہے ہیں مگر حقیقتاً وہ ملک الموت ہیں جو تیری روح قبض کرنے کے لیے درختوں کے سائے میں بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔"
عبدالرحمٰن کے لیے یہ باتیں عجیب و غریب تھیں۔ پوچھا۔ "ملک الموت تو ایک ہوتا ہے' یہ کئی ملک الموت اتنی دور سے میری جان کس طرح قبض کر لیں گے۔"
بکیر نے کہا۔ "جناب! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں بہلا پھسلا کر آپ کو ان چرواہوں کے پاس لے جاؤں اور پھر چرواہے آپ کا کام تمام کر دیں۔"
ابھی یہ گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ قلعے کے ایک عام آدمی نے عبدالرحمٰن پر حملہ کر دیا۔ بکیر نے عبدالرحمٰن کو بچانے کی کوشش کی تو اسے بھی زخمی کر دیا۔ جب قاتل کے ہاتھ کا خنجر چھوٹ کر گر گیا تو وہ یہ کہتا ہوا بھاگا۔ "بکیر! اب پتا چلا کہ تو بھی حاکم شہر کا آدمی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس بوڑھے کو کبھی نہ بچاتا۔"
اس بھاگتے ہوئے حملہ آور کو قلعے کے پہرہ داروں نے پکڑ لیا اور اس کو باندھ کر ایک طرف ڈال دیا اور پوچھا۔ "ظالم! یہ تو نے کیا کیا؟"
ایک بار پھر سامرہ سے حکم موصول ہوا "کسی بھی مصلحت کے بغیر اسحاق کو گرفتار یا قتل کر دیا جائے۔"
اب وزیر اور حاکم شہر بے بس ہو چکے تھے۔ جھوٹا نبی زمین دوز تھا۔ وہاں تک پہنچنا کسی بھی حکومتی آدمی کے بس کی بات نہیں تھی اور اسحاق کے آدمی ہر جگہ موجود تھے اور ہر کسی کو بہ آسانی قتل کر سکتے تھے۔
صدر مدرس اور قاضی شہر بھی اسحاق کے ساتھ ہی روپوش ہو چکے تھے۔ بالکل اتفاقی طور پر قاضی شہر کو ایک جگہ سے گرفتار کر لیا گیا۔ قاضی شہر کو اسحاق کے آدمیوں کے لیے ہتھیاروں کی ضرورت تھی اور وہ ان ہتھیاروں کے لیے لوہاروں سے بات کرنے نکلا تھا ایک لوہار کی مخبری پر قاضی کو گرفتار کر لیا گیا۔

قاضی نے اسحاق کے باپ اور دونوں بھائیوں کا ذکر تو سنا تھا مگر وہ اس خبر کو افواہ سے زیادہ نہیں سمجھتا تھا جو اسحاق کے ماننے والوں کو گمراہ کرنے کے لیے وزیر اور حاکم شہر پھیلا رہے تھے۔

جب قاضی شہر کو وزیر کے سامنے پیش کیا گیا تو وزیر اس سے بہت اچھی طرح پیش آیا یہاں حاکم شہر بھی موجود تھا۔

حاکم شہر نے قاضی سے پوچھا۔ "حضرت! آپ تو بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں اور جتنا دینی علم آپ کے پاس ہے۔ کسی اور کے پاس نہیں پھر آپ اس جھوٹے نبی کے گرویدہ کیوں ہو گئے؟"

قاضی شہر نے پھر اسحاق کے بہرے گونگے ہونے کا ذکر کیا اور اس کے بعد اچانک قوت گویائی مل جانے کے معجزے کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "کیا اس علم کا کوئی مقابلہ کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے رات کے ذرا سے حصے میں اپنے نبی کے سینے میں اتار دیا۔"

حاکم شہر نے پوچھا۔ "محترم قاضی! اصفہان کے لوگ اسحاق کو صرف دس سال سے جانتے ہیں۔ اس کا نام اسحاق کس نے رکھا اور یہ یہاں اسحاق کی حیثیت سے کس طرح مشہور ہو گیا کوئی نہیں جانتا۔ یہ جہاں سے بھی آیا تھا اپنے ساتھ اپنا نام لے کر آیا تھا۔ آپ لوگوں نے اس کے دس سال پہلے کے واقعات جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہم لوگ بھی اس کی جھوٹی نبوت پر ایمان لا سکتے تھے مگر ہمارے ایمان راسخ ہیں۔ اس لیے ہم اس کے دس سال پہلے کے حالات جاننے کی کوشش کرتے رہے۔ جو یندہ یابندہ جو تلاش کرے گا وہ پائے گا۔ ہم نے اس کے دس سال پہلے کے عرصے کو تلاش کیا اور اسے پالیا۔ یہ الجزائر کا رہنے والا شخص رزاق نامی باپ کا بیٹا ہے۔ یعقوب اور یوسف اس کے بھائی ہیں۔ یہ لوگ الجزائر میں موجود ہیں اور اس کی مفارقت میں بڑی پریشانیاں اٹھا چکے ہیں۔"

قاضی شہر نے پوچھا۔ "یہ ساری باتیں آپ کو کس طرح معلوم ہو گئیں؟"

حاکم شہر نے بتایا۔ "بالکل اتفاق کہ ایک بوڑھا الجزائر سے آیا اس نے لوگوں سے یہاں یہ سنا کہ یہاں ایک جھوٹا نبی پیدا ہو گیا ہے۔ یہ نبی دس سال پہلے بہرہ گونگا اصفہان آیا تھا اور اب خدا کی قدرت سے نبی بن گیا ہے۔ اس الجزائری بوڑھے نے اپنے ہم وطن اسحاق کی جو نشانیاں اور علامتیں بتائیں وہ ساری اسحاق میں موجود ہیں۔ اسحاق نے اس بوڑھے کو قتل کروا دینا چاہا مگر ناکام رہا۔ اب وہ الجزائری بوڑھا ہماری حفاظت میں ہے۔"

قاضی شہر کا ایمان ڈگمگایا پوچھا۔ "وہ بوڑھا کہاں ہے؟ کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

حاکم شہر نے کہا۔ "کیوں نہیں ہم نے اسے قلعے میں بحفاظت رکھا ہے۔"

یہ لوگ ڈانواں ڈول قاضی کو قلعے میں لے گئے اور الجزائری عبدالرحمٰن سے ملوا دیا۔

قاضی شہر کچھ دیر اس لمبے چوڑے بوڑھے الجزائری کو دیکھتا رہا اور الجزائری بوڑھا قاضی شہر کو اس کی مخصوص وضع قطع میں دیکھتا اور غور کرتا رہا۔ قاضی شہر نے پوچھا۔ "آپ الجزائر سے آئے ہیں؟"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ "ہاں۔ میں الجزائر سے آیا ہوں اور اس عیار اور مکار اسحاق کو تلاش کر رہا ہوں جو اپنے کنبے کو چھوڑ کر لاپتا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے خاندان کو برسوں سے پریشان کر رکھا ہے۔"

قاضی نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ آپ اسحاق کی بات کر رہے ہیں جس کو اصفہان والوں نے بہرا اور گونگا دیکھا ہے۔"

عبدالرحمٰن نے قاضی کو بتایا۔ "وہ بہت ہی عیار اور چالاک انسان ہے۔ اس نے الجزائر میں جو تعلیم حاصل کی تھی وہ قابل رشک تھی اس نے چاروں آسمانی الہامی کتابوں کے علاوہ آسمانی صحیفے بھی پڑھ رکھے ہیں۔ اس کو کون جاہل کہے گا!"

قاضی شہر یہ سب کچھ سن کر حیران ہو رہا تھا کہنے لگا۔ "یہ جو کچھ آپ نے بتایا کیا درست ہے اور واقعی ہم سے یہ بھول ہوئی کہ ہم نے اس کے دس سال پہلے کے عرصے پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔"

عبدالرحمٰن نے کہا۔ "یہ شخص بچپن ہی سے سخت محنتی اور قوت ارادی کا حامل ہے۔ یہ جب اپنے گھر والوں سے جھگڑتا تھا تو کئی کئی دن تک کھانا نہیں کھاتا تھا۔ باتیں نہیں کرتا تھا۔ بڑی مشکل سے قابو میں آتا تھا۔"

قاضی شہر کے لیے یہ بڑی خجالت کا مقام تھا اور اسے اپنی زود اعتقادی پر دکھ ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "میں صدر مدرس کے کہنے میں آ گیا وہ تو مجھ سے زیادہ بدحواس تھا۔ اب میں کسی طرح صدر مدرس کو بھی راہ راست پر لانے کی کوشش کروں گا۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی واپسی بہت مشکل ہے۔ لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

حاکم شہر نے قاضی کو بتایا۔ "اب تو اسحاق کے پاس جا بھی نہیں سکتا کیوں کہ تیرے بارے میں یہ ساری خبریں اسحاق تک پہنچ چکی ہوں گی۔"

قاضی نے جواب دیا۔ "اب تو میں یہ کام اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر انجام دوں گا کیونکہ اگر میں اس میں کامیاب ہوگیا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں میری بخشش ہوجائے گی۔" قاضی شہر رونے لگا۔ یہ رونا پشیمانی کا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک دم ابل پڑیں۔ داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی اور رخسار نم ہوگئے۔

حاکم شہر اس کو تسلی دے رہا تھا۔ "امید ہے، اللہ تجھ کو معاف کردے گا اور تجھ کو دوبارہ اسلام قبول کرنے کا اجر الگ عطا فرمائے گا۔"

قاضی شہر جب اسحاق کے پاس واپس گیا تو اس کی پہلے سے زیادہ پذیرائی ہوئی۔ اسحاق نے قاضی سے پوچھا۔ "تجھ کو حاکم شہر نے چھوڑ کس طرح دیا؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ اب حاکم شہر اور اس کے آدمی کسی قدر سنجیدگی سے آپ کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔ بس کسی قدر ان کے سامنے بالواسطہ تبلیغ کی ضرورت ہے۔ میں نے ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ تمہارا دین تمہارے ساتھ اور ہمارا دین ہمارے ساتھ۔"

اسحاق نے وزیر کے بارے میں سوال کیا۔ "اس وقت اصفہان میں اصل حکومت تو وزیر کے ہاتھ میں ہے وہ ہمارے بارے میں کیا کہتا ہے؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "وہ بھی خلیفہ ابو جعفر منصور کے احکام کی تکمیل پر مجبور ہے کیونکہ سامرہ سے مسلسل یہ احکام موصول ہو رہے ہیں کہ اسحاق کو گرفتار کرکے سامرہ بھیج دو۔"

اسحاق کچھ دیر خاموش سوچتا رہا اور آخر میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "تو نے الجزائر کے عبدالرحمٰن نامی بوڑھے سے ملاقات کی جس کا دعویٰ ہے کہ وہ مجھ سے اور میرے خاندان سے اچھی طرح واقف ہے۔ جب کہ میرا الجزائر سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے بچپن میں ہی اپنا وطن چھوڑ دیا تھا۔ میں اپنے وطن کا نام تک نہیں جانتا لیکن یہ معلوم ہے کہ میرا گاؤں ایک دریا کے کنارے آباد تھا اور دریا کے دوسری طرف ریگستانی سلسلہ حد نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ میں اپنے گاؤں سے نکلنے کے بعد کہاں کہاں گھومتا پھرا کچھ یاد نہیں اب اگر میں انہی راستوں سے وطن جانا چاہوں تو یہ بات تقریباً ناممکن ہوگئی ہے۔"

قاضی شہر نے عبدالرحمٰن کا مذاق اڑایا اور کہا۔ "معلوم نہیں یہ مخبوط الحواس بوڑھا ان لوگوں کو کہاں سے مل گیا کہ اسے یہ لوگ اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔"

اسحاق نے پوچھا۔ "تیری اس سے ملاقات ہوئی؟"

قاضی شہر نے جواب دیا۔ "ملاقات ہوئی اور کچھ باتیں بھی۔ وہ کچھ اس قدر پریشان تھا کہ اگر وہ کسی طرح یہاں آجائے تو خود بھی آپ پر ایمان لے آئے گا۔"

اسحاق کو اس پر حیرت ہوئی مگر اب وہ اصفہان کو چھوڑ رہا تھا اس کے داعیوں نے عمّان میں کامیاب تبلیغ کرکے تقریباً مسخر کرلیا تھا اور اسحاق کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ عمان کو اپنا مستقر بنائے اور یہاں سے دوسرے شہروں اور علاقوں میں اپنے داعی بھیجے۔

اصفہان کے آس پاس یہ لوگ خطرے میں تھے۔

قاضی شہر کے لیے یہ بُری خبر تھی وہ کسی نہ کسی طرح صدرمدرس کو یہاں سے نکال لے جانا چاہتا تھا لیکن صدرمدرس کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید وہ بھی کہیں داعی کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

اسحاق نے ہزاروں سواروں کے ساتھ عمان کا رخ کیا۔ جب وزیر اور حاکم شہر کو یہ خبریں پہنچیں تو وہ شرمندہ ہوگئے۔ اب انہیں ابو جعفر منصور کو یہ اطلاع دینی پڑی کہ اسحاق اور اس کے پیرو یہاں سے فرار ہوگئے ہیں اور اب عمان کو اپنا مستقر بنالیا ہے۔

وزیر نے اسحاق کا پیچھا کیا۔ اب وہ طاقت کے ذریعے گھیر گھار کر اسحاق کو ختم کردینا چاہتا تھا لیکن اسحاق کے پیروکاروں نے اسلامی فوج کو سخت نقصان پہنچایا اور دھمکی دی کہ وہ اصفہان پر زبردستی قبضہ کرلیں گے۔

قاضی شہر کو کئی دنوں بعد احساس ہوا کہ اب وہ اسحاق کی حراست میں ہے کیونکہ اسحاق کو یہ معلوم ہوچکا تھا کہ قاضی شہر اس سے منحرف ہوگیا ہے۔

صدرمدرس حیران تھا کہ قاضی شہر منحرف کیوں ہوگیا۔ اس نے قاضی شہر سے ملاقات کرنی چاہی تو اسے ملنے نہیں دیا گیا۔ عمان سے تیاریوں کے بعد اسحاق نے بصرہ پر حملہ کردیا اور سخت معرکہ آرائی کے بعد بصرہ پر قابض ہوگیا۔

ابو جعفر منصور نے اسحاق کو حکم دیا۔ "وہ اپنے عقائد سے توبہ کرلے اور سامرہ میں حاضر ہوجائے پھر دربار خلافت سے باقاعدہ معافی نامہ حاصل کرے۔"

اسحاق نے ابو جعفر منصور کے فرمان کو چاک کردیا اور قاصد سے کہا۔ "خلیفہ سے کہہ دے کہ میں بہت جلد سامرہ پہنچنے والا ہوں کیوں کہ حق آچکا ہے اور باطل کو ہر حال میں جانا پڑے گا۔ ہاں اگر ابو جعفر منصور بھی میرے دین میں آجائے تو میں اس کو کوئی علاقہ حکومت کے لیے دے دوں گا۔"

ابو جعفر منصور کے لیے اسحاق کا یہ لہجہ تازیانہ ثابت ہوا۔ بصرہ میں سخت معرکہ آرائی ہوئی لیکن اسحاق اس پر قابض ہوا تو کچھ عرصہ قابض ہی رہا۔

اسی دوران قاضی شہر کی ملاقات صدر مدرس سے ہوگئی۔ صدر مدرس کا خیال تھا کہ قاضی شہر اصفہان میں ہی رہ گیا لیکن جب ملاقات ہوئی تو صدر مدرس نے حیرت سے پوچھا۔ "تو بھی ہم میں موجود ہے اور ہمیں اس کا پتا بھی نہیں۔"

قاضی شہر نے صدر مدرس کو سب کچھ بتادیا اور کہا۔ "جناب! آپ ایک بار عبدالرحمٰن نامی بوڑھے سے مل تو لیں۔"

اب صدر مدرس کا ایمان بھی ڈانواں ڈول تھا۔ وہ بار بار قاضی شہر سے یہی پوچھ رہا تھا۔ "اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو میں اس بوڑھے سے ضرور ملوں گا۔"

صدر مدرس کو داعی بناکر واسطہ بھیجا گیا۔ تو وہ راستے سے فرار ہوکر اصفہان پہنچا اور وہاں عبدالرحمٰن بوڑھے سے ملاقات کی اور اسی طرح دونوں میں باتیں ہوئیں۔ صدر مدرس کو عبدالرحمٰن کی باتوں پر یقین کرنا پڑا۔ لیکن اب بات اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہاں سے ہزاروں آدمیوں کی واپسی تقریباً ناممکن ہوگئی تھی۔

اب صدر مدرس بھی حاکم شہر کے ساتھ قاضی شہر کی فکر میں تھا جو اسحاق کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔

عبدالرحمٰن کی اب بھی حفاظت کی جارہی تھی کیونکہ یہ بوڑھا شخص اسحاق کی سات پشتوں سے واقف تھا۔

آخر کار قاضی شہر بھی کسی نہ کسی طرح اصفہان پہنچ گیا۔ لیکن اب یہ قاضی بالکل بدلا ہوا اسلام کا پرجوش مبلغ تھا کیونکہ اسے اپنی سابقہ گمراہی کا شدید احساس تھا۔ وہ ہروقت اس صدمے سے دوچار رہتا تھا اور بار بار یہی سوچتا تھا کہ اس کی توبہ قبول ہوگی یا نہیں۔ صدر مدرس بھی شرمندہ تھا کہ وہ بلاوجہ اسحاق کے بہکاوے میں آگیا اور اسحاق کے دس سالہ دور سے پہلے کے زمانے پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔ ان دونوں نے عبدالرحمٰن کے ساتھ الجزائر جانے کا منصوبہ بنایا کیونکہ وہ مزید تصدیق کے بعد ہنگامی بنیادوں پر اسحاق کے خلاف کام کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔

چنانچہ یہ دونوں الجزائر پہنچے اور اسحاق کے والدین سے ملاقات کی۔ اسحاق کی ماں بیمار تھی جب ان کو اسحاق کے کرتوتوں کا علم ہوا تو دونوں بے حد شرمندہ ہوئے۔

اسحاق کے باپ نے کہا۔ "وہ بچپن ہی سے فطین ہے۔ طرح طرح کے منصوبے بنایا کرتا تھا اور اس کے منصوبوں میں طبعاً خامیاں کم ہوتی تھیں۔ اسحاق اپنے معاملات میں سفاک اور بے رحم واقع ہوا تھا۔"

اسحاق کے باپ نے اس پر افسوس کیا کہ اس کا بیٹا دنیاوی دولت اور عزت کے لیے خود بھی گمراہ ہوا اور تمام آدمیوں کو بھی گمراہ کیا۔

دور دور تک اسحاق کی خبریں پھیل گئیں اور لوگ حقیقت حال جاننے کے لیے قرب و جوار سے اسحاق کے گھر پہنچ رہے تھے۔ انہیں حیرت تھی کہ ایک شخص جو کبھی یہاں رہتا تھا۔ اب وہ تخت خلافت کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ انہیں خوشی تھی کہ ان کے علاقے میں ایک اتنا بڑا آدمی پیدا ہوا کہ اس کا ہر طرف نام ہے اور خلافت عباسیہ اس سے خوفزدہ ہے۔

ان دونوں نے اسحاق کے والدین سے پوچھا۔ "ہم دونوں اصفہان واپس جائیں گے۔ آپ اپنے بیٹے کو کوئی پیغام دینا چاہیں تو دے دیں۔"

اسحاق کے باپ نے کہا۔ "اس سے ہماری طرف سے کہہ دینا کہ تو نے بہرے گونگے ہونے کا جو ڈھونگ رچایا تھا تو تو اب بھی گونگا اور بہرا ہی ہے۔ بلکہ میری نظر میں تو اندھا بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ہی لیے یہ فرمایا ہے۔ "صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ۔"

دونوں الجزائر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں دو ہفتے رہ کر اصفہان واپس چلے گئے۔ اب انہیں ندامت کی وجہ سے اپنی زندگی دوبھر محسوس ہورہی تھی۔ انہیں یہ دکھ ہروقت پریشان رکھتا تھا کہ اگر ان دونوں نے اسحاق کی مدد نہ کی ہوتی تو وہ اتنا کامیاب کبھی نہ ہوتا۔ دونوں دن رات نمازیں پڑھتے اور توبہ استغفار کرتے رہتے۔

اسی دوران صدر مدرس نے ایک بدو کے ذریعے اسحاق کو اس کے باپ کا پیغام پہنچایا اور لکھ بھیجا "تو اب بھی گونگا اور بہرا ہی ہے تو نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سب دنیا میں رہ جائے گا اور تو جب اپنے اعمال کا بوجھ لادے ہوئے اللہ کے سامنے پیش ہو گا تو شیطان لعین تیرے پاس کھڑا ہوا خوشی سے اللہ تعالیٰ کو بتا رہا ہو گا کہ تو شیطان لعین کا سب سے زیادہ فرمانبردار بندہ ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ توبہ کر لے اور اللہ سے معافی مانگ لے کہ اللہ کی ذات غفور الرحیم بھی ہے اور ستار العیوب بھی۔"

بدو نے صدر مدرس کا یہ پیغام بصرہ میں پہنچایا۔ ان دنوں وہ خلافت عباسیہ کی فوجوں سے جنگ میں مشغول تھا اور اس کی طبیعت میں غصہ اور جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔ اس عالم میں جب صدر مدرس کا نصیحت نامہ ملا تو اس نے بدو کو اسی وقت قتل کروا دیا اور صدر مدرس کا نصیحت نامہ پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دیا۔

اسی دوران ابو جعفر منصور نے ان دونوں کو سامرہ طلب کر لیا کیونکہ یہ باتیں مشہور ہو چکی تھیں کہ قاضی شہر اور صدر مدرس الجزائر میں اسحاق کے خاندان سے مل کر واپس آ گئے ہیں۔ اور گمراہوں کو اسحاق کی اصلیت اور حقیقت بتاتے پھر رہے ہیں۔

جب ان دونوں کو خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا تو خلیفہ نے ان کے علم و فضل کے حوالے سے باتیں کیں اور پوچھا۔

"جب تم دونوں مذہبی معاملات میں نہایت عالم و فاضل تھے تب پھر تم اس جھوٹے مکار کی باتوں میں کیوں آ گئے۔ کیا تمہارے لیے صرف یہی جاننا کافی نہیں تھا کہ میرے چچا کے بیٹے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ تم دونوں پھر بھی گمراہ ہو گئے؟"

صدر مدرس نے عرض کیا۔ "ہم پر اس مکار کی دس سالہ مکاری اثر کر گئی اور شیطان لعین ہمیں ورغلانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر اللہ کو شاید ہماری یہ ادا پسند آ جائے کہ ہم نے ہی اسحاق کی مکاری کا پردہ چاک کیا۔ آج ہم دونوں دنیا کو یہ بتانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ اسحاق جھوٹا ہے اس کی نبوت مکر و ریا پر قائم ہے۔ ہم ہی اصفہان اور گرد و پیش اس کے بڑھتے چڑھتے نبوت کے دھارے کو روکنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔"

ابو جعفر منصور نے دونوں کو مشورہ دیا۔ "تم دونوں مدینہ منورہ جاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اقدس پر حاضری دو اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔"

دونوں مدینہ منورہ چلے گئے اور شب و روز نوافل پڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اقدس پر حاضریاں دیتے رہے اور معافی مانگتے رہے۔

ابو جعفر منصور نے غضب ناک ہو کر بصرہ پر لشکر کشی کی اور اسحاق کو بصرہ سے بے دخل کردیا۔ اسحاق نے بھاگ کر عمان میں پناہ لی۔ ابو جعفر کی فوجیں اس کا پیچھا کرتی ہوئی عمان پہنچ گئیں۔ وہ یہاں بھی نہ ٹھہر سکا اور بھاگ کر اصفہان میں پناہ لینے کا ارادہ کیا لیکن پکڑا گیا۔ اس کو گرفتار کرکے سامرہ لے جایا گیا۔ جہاں ابو جعفر منصور اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

جب اس کو پابجولاں خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا تو ابو جعفر منصور نے اس سے پوچھا۔ "تیری نبوت کہاں گئی؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "نبوت جو مجھ میں ودیعت کی گئی ہے وہ ہر حال میں میری ذات میں رہے گی۔ میں پہلے بھی نبی تھا اور اب بھی نبی ہوں۔"

خلیفہ نے کہا۔ "جس شیطان نے تجھ کو نبی بننے کا مشورہ دیا تھا اس نے تیری کوئی مدد نہیں کی۔"

اسحاق نے جواب دیا۔ "شیطان نے تو مجھے پابجولاں کردیا ہے اور نبیوں کو اس قسم کی مصیبتیں کئی بار جھیلنا پڑی ہیں۔"

ابو جعفر نے پوچھا۔ "کیا تجھ کو اپنے والدین کی بھی کچھ خبر ہے وہ بھی تیرے حق میں دعائے خیر کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کی آیت صُمٌّ بُکْمٌ تیرے ہی لیے نازل ہوئی تھی۔"

اسحاق نے بے باکی سے جواب دیا۔ "میں نے کبھی بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار نہیں کیا۔ اللہ کی وحدانیت کا میں قائل ہوں۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ اللہ کے فرشتوں نے مجھے یہ بتایا ہے کہ میں ذیلی اور ظلی نبی ہوں۔ میں صاحب شریعت نہیں ہوں اس لیے جو مجھ پر ایمان نہیں لائے گا۔ قرآن کی اس آیت کا اس پر اطلاق ہوگا۔"

ابو جعفر منصور نے اسحاق کو شرم دلائی۔ "میرا خیال تھا کہ اپنی اس ناکامی اور پابہ زنجیر ہونے پر تجھے شرم آئے گی جو نہیں آئی۔ میں تجھ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں کہ اب بھی وقت ہے اپنے عقائد سے توبہ کر اور دوبارہ مسلمان ہوجا۔ میں بھی اللہ سے دعا کروں گا کہ وہ تجھے معاف کردے۔ اگر تجھ کو جاہ و اقتدار مطلوب ہے تو میں تجھے کسی جند کا والی بنادوں گا۔ ورنہ گمراہی میں تیری موت بہتوں کے لیے نمونہ عبرت بن جائے گی۔"

اسحاق نے نہایت دلیری سے جواب دیا۔ "میں نے اللہ کے فرشتوں کی ہدایت پر جس نبوت کا اعلان کیا تھا اب تیرے کہنے سے اپنے طور پر اس سے منکر نہیں ہو سکتا۔"

ابو جعفر منصور نے اس کو قید کردیا اور سوچنے کے لیے ایک ماہ کی مدت دی۔ ایک ماہ کے بعد بھی وہ اپنے عقیدے پر قائم رہا اور خلیفہ کے حکم سے قتل کردیا گیا۔

اس کے مرنے کے بعد عمان اور بصرہ میں بار بار یہ اعلان کروایا گیا کہ اسحاق جھوٹا تھا وہ پیدائشی بہرا اور گونگا نہیں تھا۔ اس نے کئی اساتذہ سے باقاعدہ پڑھا تھا اور تحصیل علم میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا تھا۔ اس کے ماں باپ اور دوسرے رشتہ دار الجزائر کے ایک گاؤں میں آج بھی موجود ہیں اور وہ سب اسحاق پر لعنتیں بھیجتے ہیں۔ اس لیے اسحاق کو نبی ماننے والوں کو اپنے اعتقادات سے توبہ کرلینی چاہیے اگر وہ اب بھی اپنے عقیدے پر قائم رہے تو اپنے جھوٹی نبی کی طرح وہ بھی جہنم میں جھونکے جائیں گے۔

کچھ لوگوں نے توبہ کرلی اور دوبارہ مسلمان ہوگئے لیکن اکثریت اسحاق کی نبوت کی قائل رہی کیونکہ ان کے لیے یہ بات کافی تھی کہ خود اسحاق مرتے مرگیا مگر اپنی نبوت سے منکر نہیں ہوا۔ ان کے خیال میں اسحاق ذیلی اور ظلی نبی تھا اور قیامت تک نبی رہے گا۔

اس بات کو صدیاں گزر گئیں اور اسحاق کو ذیلی اور ظلی نبی کہنے اور ماننے والوں کی تعداد میں کمی ہوتی چلی گئی کیونکہ اسحاق کے دین کی تجدید کے لیے دوسری کوئی آواز بلند نہیں ہوئی اور یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ اس جھوٹ کا اثر آج بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے اور مشہور محقق ابوالقاسم رفیق دلاوری کے بقول آج بھی عمان میں اسحاق کے ماننے والے پائے جاتے ہیں۔

مضمون کے مآخذ

کتاب الازکیا	کتاب المختار وکشف الاسرار	ائمہ تلبیس
شیخ ابن الجوزی	علامہ عبدالرحمن ابی بکر دمشقی	ابوالقاسم رفیق دلاوری



★ ضیا تسنیم بلگرامی

فارس کے شہر بیضا کو یہ فخر حاصل ہے کہ ۲۲۴ھ میں وہاں ایک ایسی حق گو اور بے باک ذات پیدا ہوئی جس کا تاریخِ انسانی میں کوئی جواب نہیں ملتا۔ افکار اور کردار میں اتنی تندی اور تیزی کہ بڑے بڑے ہم عصر خوف زدہ ہو کے ان سے دُور ہو گئے اور ان کی ہم خیالی اور ہم مشربی سے برأت کا اظہار کرنے لگے۔ کئی صوفی ان کے ہم عقیدہ تھے لیکن جب سزا جھیلنے کا وقت آیا تو یہ اکیلے رہ گئے لوگ ان پر افسوس بھی کرتے تھے اور ہنستے بھی تھے لیکن لوگوں کی ہنسی یا افسوس کا خود ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

نوعمری ہی میں یہ عراق کے شہر واسط چلے آئے اور یہیں رہنے لگے۔ واسط کے لوگوں نے دیکھا، ایک نوعمر خاموش طبع انسان نظریں جھکائے، دنیا و مافیہا سے غافل کسی فکر میں غلطاں و پیچاں اِدھر اُدھر آتا جاتا رہتا ہے، اپنی ذات میں گم، جیسے کسی شے کی جستجو اسے اِدھر اُدھر بھگائے پھر رہی ہو۔ اس کے چہرے اور چال میں غیر معمولی مشابہت پائی جاتی تھی۔ چال کا اضطراب چہرے پر بے چینی اور تجسس بن کر ہویدا رہتا۔ لوگ اس خاموش طبع لیکن بے چین انسان کو دلچسپی سے دیکھتے اور کبھی کبھی کوئی پھبتی بھی کس دیتے لیکن اس کا اس شخص پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

دکان میں رُوئی بھری ہوئی تھی اور دکان دار تنہا کسی کا منتظر تھا۔ اس کی نظر جیسے ہی اس خاموش طبع شخص پر پڑی، اس نے آواز دی: "اے بھائی حسین! ذرا یہاں تو تشریف لائیے گا!"

گم سُم، اپنے حال میں مگن نوجوان نے چونک کر دکان دار کی طرف دیکھا اور پوچھا: "آپ نے کچھ مجھ سے فرمایا؟"

"ہاں بھائی! میں نے آپ ہی کو آواز دی تھی۔ ذرا ادھر آجائیے میری دکان میں، میرے پاس۔"

یہ نوجوان، اس رُوئی والے کی دُکان میں داخل ہو گیا اور کہا "فرمائیں، مجھ سے کیا کام ہے؟"

دکان دار نے کہا: "بھائی حسین! مجھے ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے، کیا تھوڑی دیر کے لیے آپ میری دُکان میں بیٹھنا گوارا کریں گے؟"

"بالکل بیٹھ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر نوجوان دکان میں ایک طرف بیٹھ گیا۔

دکان دار نے کہا: "میں ابھی واپس آجاؤں گا، آپ گھبرائیے نہیں۔" اس کے بعد جاتے جاتے کہا: "بھائی حسین! میں یہ رُوئی دھنک کر جانا چاہتا تھا تاکہ بعد میں گاہکوں سے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے لیکن دیر اتنی ہو گئی ہے کہ یہ دھنکنے کا کام واپس آکر انجام دینا پڑے گا۔"

دکان دار اپنی روئی کی دکان حسین پر چھوڑ کے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ حسین رُوئی کی گانٹھوں کے سامنے کھڑے ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہے تھے: "رُوئی الگ، بنولے الگ!"

یہ منظر کتنا دلکش اور اثر انگیز ہو گا کہ حسین کے حکم پر رُوئی خود بخود دھنک کر ایک طرف جمع ہونے لگی اور اس کے بنولے اُڑ اُڑ کر ایک کونے میں ڈھیر ہونے لگے۔

دُکان دار نے خوف زدہ ہو کر پوچھا: "حسین! تم یہ کیا کر رہے ہو؟"

حسین نے مسکرا کر جواب دیا: "وہی کام جو تم نہیں کر سکے تھے۔ میں نے سوچا تمھاری واپسی تک میں خود کیوں نہ کر دوں۔"

دکاندار نے خوف زدہ ہو کر کہا: "تم نے تو ایک طرح سے

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے
تذکرۃ الاولیا (فرید الدین عطار) ★ خزینۃ الاصفیا (مفتی غلام سرور) ★ تذکرۂ اولیا (رئیس احمد جعفری) ★ سفینۂ اولیا (دارا شکوہ) ★ طبقات الاولیا (علامہ شعرانی) ★ جنید بغداد (ترجمہ (مصری) سے)

جادو کر دیا۔"

"نہیں، اسے جادو نہیں کہتے، میں تو اسی کوشش میں ہوں کہ اپنی ذات سے بنولے اور رُوئی کی طرح دُوئی نکال باہر کروں۔"

دُکان دار ان کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا لیکن اپنی ذہنی استطاعت بھر ان کی عزت افزائی مزدوری اور ان سے ہنس کر کہا "بھائی حسین! اگر تم بُرا نہ مانو تو ایک گزارش کروں؟"

"کرو گزارش!" حسین نے جواب دیا۔

دُکان دار نے کہا۔ "حضرت! آپ نے چونکہ میری رُوئی دُھنک دی ہے اس لیے میں آپ کو حسین بن منصور حلاج کہا کروں گا، حلاج اس لیے کہ آپ نے میری رُوئی دھنک دی ہے!"

نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اُٹھا اور دُکان سے اُٹھ کر چلا گیا۔

یہ رُوئی والا واقعہ آناً فاناً پورے شہر میں مشہور ہوگیا اور لوگوں کی توجہ اس خاموش طبع اور بے چین فطرت نوجوان پر مرکوز ہوگئی۔ وہ اس سے کسی اور کرامت کی امید کر رہے تھے لیکن نوجوان حسین کسی اور ہی کرب و اذیت میں مبتلا تھا، وہی دُوئی مٹانے کی فکر۔ ذاتِ احدیت میں گم ہوجانے کی کوشش۔ اس فکر اور کوشش میں اہواز کے شہر تستر کا رُخ کیا کیونکہ تستر میں سہل بن عبداللہ نامی ایک نہایت مشہور و معروف صاحبِ عرفان ذات موجود تھی۔ یہ شب و روز ان کی صحبت میں رہنے لگے۔ اندر شوریدگی تھی کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

عمر کے ساتھ ساتھ اس میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سہل بن عبداللہ نے حسین کو اپنی قربت کا شرف بخشا تو ضرور تھا لیکن انھیں جلد ہی اس خطرے کا احساس ہوگیا جو یہ نوجوان اپنی ذات میں چھپائے پھر رہا تھا۔ انھوں نے دورانِ گفتگو کئی بار یہ محسوس کیا کہ حسین ان کی صحبت سے مطمئن نہیں ہے اور اندرونی جوش اور جذبے سے مغلوب ہو کر ایسی باتیں کہہ گزرتا ہے جو برسرِ عام کہنے کی نہیں ہوتیں۔ ایسے بھید جن کا دِل میں القا تو ہوتا ہے لیکن ان کے اظہار اور انکشاف کی اجازت نہیں ہوتی۔ سہل بن عبداللہ نے حسین کو خلوت میں بلا کر سوال کیا۔ "حسین! ہمیں خوشی ہے کہ تم جیسا صاحبِ حال مرید خدا نے ہمیں عطا فرمایا، لیکن تمھاری کچھ باتیں ایسی ہیں جن سے ہمیں ڈر لگنے لگتا ہے۔"

حسین نے پوچھا۔ "مثلاً؟ کون سی باتیں؟"

سہل بن عبداللہ نے جواب دیا۔ "ہر وہ راز جو خدا اپنے راز دان بندوں کے دلوں پر منکشف فرماتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا برملا اظہار کیا جائے یہ تو نری جذباتیت ہے اور ایک طرح سے کم ہمتی بھی کہ ہم تو اپنے کسی مرید کو خصوصی توجہ کا مستحق سمجھ کر اپنا ہمراز بنالیں اور وہ مرید ہمارے رازوں کا چرچا کرتا پھرے۔ خدا اور تصوّف کے معاملے میں تمھارا طرزِ عمل ایسا ہی ہے۔"

حسین نے تلخی سے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں جو کچھ کرتا ہوں اس میں میرے اختیار اور ارادوں کا دخل ہوتا ہے؟"

سہل بن عبداللہ نے جواب دیا۔ "حسین! تم اس بحث میں مت پڑو کیونکہ زیرِ بحث موضوع خود بخود مسئلۂ جبر و قدر کی طرف منتقل ہوتا نظر آرہا ہے، معلوم نہیں تم ذہنی طور پر جبریہ سلسلے سے تعلق رکھتے ہو یا قدریہ مسلک سے لیکن باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم جبریہ ہو۔"

حسین نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ "میں اپنی وارداتِ قلبی اور انکشافاتِ رُوحانی چھپا نہیں سکتا اور انھیں اس لیے نہیں چھپا سکتا کہ وہ ذات جس کے یہ راز ہیں وہ خود نہیں چاہتی کہ میں انھیں راز رکھوں۔"

سہل بن عبداللہ نے پوچھا۔ "یہ تمھیں کس طرح معلوم ہوا کہ خدا خود نہیں چاہتا کہ تم اس کا راز، راز نہ رکھو۔"

حسین نے جواب دیا۔ "اگر وہ چاہتا کہ اس کا راز، راز رہے تو مجھے اس کے راز رکھنے کا حوصلہ بھی عطا فرماتا اور پھر یہ کہ ایک طرف تو وہ عالم الغیب ہے، چھپی ہوئی باتوں کا جاننے والا اور دوسری طرف اس کی لاعلمی کا یہ عالم ہے کہ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ اپنے جن رازوں کا میرے دل پر القا فرما رہا ہے انھیں میں فاش کر دُوں گا۔"

سہل بن عبداللہ اس گستاخ لب و لہجے پر کانپ گئے، بولے "حسین بس کرو، اب زیادہ کچھ سُننے کی ہم میں تاب نہیں ہے؟"

اس گفتگو نے دونوں کو ایک دوسرے سے دل برداشتہ کر دیا۔ حسین نے سہل بن عبداللہ کا ساتھ چھوڑ دیا اور بصرے چلے گئے۔ بصرے میں عمر بن عثمان مکی کا بڑا شہرہ تھا اور اس عہد کی نہایت برگزیدہ شخصیتیں آپ کی مریدی کا شرف رکھتی تھیں۔ جب حسین بن منصور نے ان کی خدمت میں باریاب ہو کر اپنی حاضری کا مقصد بیان کیا تو عمر بن عثمان نے دریافت کیا۔ "کہاں سے آرہے ہو؟"

حسین نے جواب دیا۔ "سہل بن عبداللہ کے پاس سے۔"

عمر بن عثمان نے سوال کیا۔ "ان کا دامن کیوں چھوڑ دیا؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "وہ مصلحت اندیش تھے میں مصلحت فراموش ہوں، وہ صاف گو ہوں، وہ خاموش طبع، وہ سست رو تھے اور میں تیز رو، ہم دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا، پھر دونوں یک جا کس طرح رہ سکتے تھے؟"

عمر بن عثمان نے اس تیز و طرار نوجوان کو نظر بھر کے دیکھا اور کہا۔ "اچھا تو یہ بات ہے لیکن تم ٹکتے یہاں بھی نہیں نظر آتے، ایسا لگتا ہے کہ تم اپنی آگ میں خود ہی جل مرو گے۔" پھر پوچھا۔ "ذرا ہمارے ایک سوال کا سوچ سمجھ کے جواب تو دینا۔"

حسین نے کہا۔ "کیجیے سوال!"

عمر بن عثمان نے کہا۔ "اگر حاکمِ وقت یا امیر المومنین تمھیں اپنے اعتماد میں لے کر اپنے چند راز تم پر منکشف فرمادیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیں کہ خبردار جو انھیں کسی اور پر ظاہر کیا، اگر سہواً بھی اس خطا کے مجرم ٹھیرے تو تمھیں قتل کر دیا جائے گا، ایسی صورت میں تم کیا کرو گے؟"

حسین نے بے باکی سے جواب دیا۔ "میں ان رازوں کو ہر ایک پر ظاہر کر دوں گا۔"

عمر بن عثمان نے غصے اور کراہیت سے پوچھا۔ "کیا مطلب؟ یعنی تم ان رازوں کو اپنے سینے میں نہیں رکھو گے؟"

حسین نے اطمینان سے جواب دیا۔ "جناب یہ سوچنے کی بات ہے کہ جو راز حاکمِ وقت یا امیر المومنین خود اپنے سینے میں نہ رکھ سکیں، وہ دوسروں سے اخفائے راز کی کس طرح توقع کریں گے، رہا سزائے موت کا مسئلہ تو میں ہر وقت اپنا سر دینے کو تیار رہوں اور اس یقین کے ساتھ اپنی جان دوں گا کہ میں بے گناہ مارا جا رہا ہوں کیونکہ میں ایک ایسے جرم کا مرتکب ٹھیرایا گیا ہوں جس جرم کا ارتکاب حاکمِ وقت یا امیر المومنین پہلے ہی کر چکے ہیں۔"

"گستاخ! تیری باتوں میں موت کی بو پائی جاتی ہے۔" عمر بن عثمان نے کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ تو کیا ہے اور تیرے دامن سے کتنے فتنے چمٹے ہوئے ہیں، سب کچھ جاننے کے باوجود ہم تجھے اپنی صحبت میں رکھیں گے اور کوشش کریں گے کہ تیری جان بچ جائے۔"

حسین نے ان کا شکریہ تک نہیں ادا کیا، چپ چاپ ان کی خدمت میں رہنے لگے۔

چند ہی دنوں میں عمر بن عثمان کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ مرید ضرورت سے زیادہ تلخ ہے اور اس کی جرأت و جسارت میں تلوار کی کاٹ پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کئی بار سرزنش کی کہ حسین اپنی حد میں رہو اور اپنی زبان قابو میں رکھو لیکن اس حکم کی تعمیل حسین کے بس میں نہیں تھی۔

عمر بن عثمان کے پاس تصوف کی کچھ ایسی کتابیں بھی موجود تھیں جن کی بابت یہ کہا جاتا تھا کہ ان میں تصوف کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کیا گیا ہے۔ حسین ان مسودات کی جستجو میں تھے۔ خود مرشد کو بھی یہ بات معلوم تھی اور وہ اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ ہوشیاری سے کام لیتے تھے۔

حسین کو جب یہ پکا یقین ہو گیا کہ ان گراں مایہ مسودات تک ان کی رسائی ناممکن ہے تو انھوں نے اپنے پیر و مرشد سے درخواست کی۔ "جنابِ والا! میں چاہتا ہوں کہ ان مسودات کا میں خود بھی مطالعہ کر لوں، براہِ کرم انھیں چند دنوں کے لیے مرحمت فرمائیں۔"

مرشد نے خفگی کا اظہار کیا۔ کہا۔ "حسین! ابھی تم مبتدی ہو اور اس منزل میں نہیں داخل ہوئے جہاں ان مسودات کا مطالعہ ضروری قرار دیا گیا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ تم پہلے ہماری ضبط و آزمائش پر پورے اترو، اس کے بعد تمھیں یہ مسودات پڑھنے کے لیے دیے جائیں۔"

حسین نے بھی برہمی کا اظہار کیا، بولے۔ "خیر! اگر آپ مجھے اس کا اہل نہیں سمجھتے تو نہ سمجھیں، میں خود بھی زیادہ اصرار نہیں کروں گا۔"

یکایک عمر بن عثمان نے یہ محسوس کیا کہ حسین کی بے چینی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ وہ سجدے میں گر کے دعا مانگ رہے تھے۔

"اے الٰہ العالمین! تیرے بندے یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ میں کرتا ہوں، اس میں میرے ارادے شامل ہوتے ہیں لیکن تو عالم الغیب ہے اور انسانوں کے دلوں کا حال جانتا ہے۔ کیا میں تیرا آلۂ کار نہیں ہوں، کیا تو نے مجھے مجبورِ محض نہیں بنایا، کیا وہ تو نہیں ہے جس نے مجھے ہمیشہ اس بات پر مجبور کیا ہے کہ تو نے میرے دل میں جو باتیں القا کی ہیں انھیں فاش کر دوں، اگر تو ایسا نہیں چاہتا تو مجھے یہ بتا کہ مجھ جیسا کمزور اور مجبور انسان تیری مرضی اور حکم کے خلاف اتنا بڑا قدم کیونکر اٹھا رہا ہے۔"

عمر بن عثمان نے حسین کو سرزنش کی۔ تنبیہاً کہا۔ "ابنِ منصور! ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ تم گمراہ ہو چکے ہو۔ تم جو کچھ سوچتے یا کہتے ہو کبھی ان کے نتائج پر بھی غور کیا، تم یقیناً ایک عالم کو خراب کر کے رہو گے لیکن ہمیں یہ بات بھی معلوم ہے کہ اس سے پہلے کہ تم انسانوں کو گمراہ کرو، خدا تمھیں کوئی عبرت ناک سزا دے چکا ہوگا۔"

حسین کا دل عمر بن عثمان سے بھی اچاٹ ہوگیا۔ یہ اُس سیلاب کے گرد پشتے تعمیر کرنے کی فکر میں تھے جو حسین کے وجود کو ایک تنکے کی طرح اِدھر اُدھر متحرک کیے ہوئے تھا۔ اُس آگ کو بجھا دینے کی کوشش کر رہے تھے جس کی سوزش کے اہلِ طلب ایک عمر متمنی رہ کر ناکام رہتے ہیں، حسین، عمر بن عثمان کا ساتھ بھی چھوڑ دینا چاہتے تھے لیکن وہ یہ ضرور جاننا چاہتے تھے کہ وہ خود جس آتشِ سوزاں میں پھنک رہے ہیں اور ان کے دل میں جو ایک بھٹی سی سلگ رہی ہے، عمر بن عثمان کی وارداتِ قلبی اور القائے ذاتی سے اس کی کس حد تک تصدیق یا تردید ہوتی ہے کیونکہ ان کے عقیدے اور فکر کے مطابق صداقت اور حق مجردشے ہے یہ جہاں کہیں بھی ہوگی اس کی ایک ہی شکل ہوگی۔ عمر بن عثمان بھی اسی آگ میں جل رہے ہوں گے جس میں حسین ابنِ منصور پھنک رہے تھے پھر کیا وجہ تھی کہ عمر بن عثمان اس اضطراب اور بے چینی کے شکار نہیں تھے جس نے حسین ابن منصور کو آتش زیرِ پا کر رکھا تھا؟

یہ سوچ کر حسین ابن منصور نے پکّا ارادہ کرلیا کہ عمر بن عثمان کا وہ مسودہ ضرور چوری کرنا پڑے گا جس میں تصوّف کا ایک جہان قلمبند کر دیا گیا تھا۔ اور عمر بن عثمان اس مسودے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

عمر بن عثمان تلاوتِ قرآنِ پاک فرما رہے تھے۔ حسین ابن منصور ان کے قریب بیٹھے غور سے سُن رہے تھے۔ یکایک ان کے کان میں یہ آواز آئی۔ کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (میں ایک مخفی خزانہ تھا، میں نے دوست رکھا یہ ارادہ کہ پہچانا جاؤں پس میں نے خلق کو پیدا کیا)

حسین ابن منصور کی حالت غیر ہوگئی۔ حالتِ وجد میں، بے اختیار کہا " یہ کلام میرا ہے، ایسا کلام میں خود بھی کر سکتا ہوں "

عمر بن عثمان قرآنِ پاک کے احترام میں اپنی جگہ سے اُٹھ نہ لیکن حسین کی بات نے انھیں تڑپا دیا، وہ غصّے میں بے قابو سے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ تلاوت سے فارغ ہوگئے تو انھوں نے پاک کو جزدان میں رکھا اور اندر سے برہنہ شمشیر لیے نمودار ہوئے۔ کے مرید اپنے مرشد کو شمشیر بکف دیکھ کر گھبرا گئے اور حیرانی سے سوال "حضرت! آج ہم آپ کو اس حالت میں کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کس کے قتل کا ارادہ ہے؟"

عمر بن عثمان نے غصّے میں کہا " ابن منصور کہاں ہے؟ آج اسے قتل کر دیں گے "

مرید سناٹے میں آگئے۔ کسی ایک نے جرأت کی، پوچھا "حضر ابن منصور کی خطا؟"

عمر بن عثمان نے جواب دیا " وہ گمراہ ہوگیا ہے اور اپنی زبا سے کلماتِ کفر ادا کرنے لگا ہے "

حسین ابن منصور کا کہیں پتہ نہ تھا۔ عمر بن عثمان کے دُوسر مرید یہ تو جانتے تھے کہ ابن منصور صاف گو اور گستاخ ہیں لیکن انھ اس وقت یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ ابنِ منصور نے کون سے کلماتِ کفر ادا ہیں جن سے عمر بن عثمان اتنے برہم ہیں۔ حسین ابنِ منصور کہیں روپوش ہوگئے تھے۔ آخر تھک ہار کے عمر بن عثمان واپس آگئے اور مرید سے کہا " اگر میں کسی طرح ابن منصور کو پا جاتا تو اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے کی سعادت حاصل کرتا "

دُوسری طرف حسین ابن منصور وہاں سے رخصت ہوجانے کی کوشش میں تھے لیکن یہ روانگی اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک و اپنے پیر و مرشد کا مسوّدہ "گنج نامہ" نہیں حاصل کر لیتے تھے۔ یہ مسودہ جائے نما کے نیچے رکھا ہوا تھا اور وہاں تک پہنچنا اور پھر اسے حاصل کرنا بہت دشوار تھا۔ اس سلسلے میں ابن منصور نے اپنے ایک سادہ لوح پیر بھائی کا سہارا لیا اور یکایک اس کے سامنے ظاہر ہو کر پوچھا " اس وقت پیر و مرشد کہاں تشریف رکھتے ہیں؟"

سادہ لوح مرید انھیں دیکھتے ہی پریشان ہوگیا، بولا " ابن منصو تم خدا کے لیے یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ، پیر و مرشد تمھیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ برہنہ شمشیر ان کے ہاتھ میں ہے اور غصّے میں بار بار یہ فرما رہے ہیں کہ اگر میں کسی طرح ابنِ منصور کو پا جاؤں تو اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے کی سعادت حاصل کروں" پھر پوچھا " ابن منصور! آخر یہ

معاملہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تم گمراہ ہو گئے ہو؟"

ابنِ منصور نے افسوس سے جواب دیا۔ "میں کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو عقل و وجدان کے خلاف ہو اور میری یہ خطا نہیں ہے کہ میں غلط باتیں کرتا رہتا ہوں بلکہ خطا یہ ہے کہ میں ان اسرار کو کیوں فاش کر رہا ہوں جنھیں یہ صاحبانِ وجدان و دانش چھپاتے ہیں۔"

مرید نے کہا۔ "اچھا تب پھر تم فوراً میرے مشورے پر عمل کرو اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔"

ابنِ منصور نے کہا۔ "میں یہاں سے ایک شرط پر چلا جاؤں گا۔"

مرید نے کہا۔ "بتاؤ، وہ شرط کیا ہے؟"

ابنِ منصور نے کہا۔ "اچھا تم یہ بتاؤ، پیر و مرشد اس وقت کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟"

مُرید نے جواب دیا۔ "ظہر کی نماز کے لیے وضو کر رہے ہیں اور اس وقت غسل خانے میں تشریف رکھتے ہیں۔"

ابنِ منصور نے کہا۔ "اچھا، میں آخری بار پیر و مرشد کی جائے نماز کو بوسہ دینا چاہتا ہوں، اس کے بعد یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔"

مرید نے پہرے داری کا فریضہ انجام دیا۔ ابن منصور نے جائے نماز کے نیچے سے "گنج نامہ" نکالا اور اپنے پیر و مرشد عمر بن عثمان کا ساتھ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

عمر بن عثمان نے وضو کے دوران داہنے پیر کو دھوتے ہوئے باآوازِ بلند فرمایا۔ "لے گیا، بدبخت لے گیا۔ بہت بُرا کیا، اپنی دُنیا خراب کر لی، زندگی کا سودا کر لیا۔ افسوس افسوس۔"

کسی مرید نے ان ناقابلِ فہم کلمات کی وضاحت چاہی تو آپ نے جواب دیا۔ "وہ ابن منصور، گستاخ، اس نے یہ بہت بڑی حرکت کی کہ ہماری جائے نماز کے نیچے سے گنج نامہ چوری کر لیا، وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا اور ہمیں یقین کی حد تک یہ ڈر ہے کہ اس نوجوان کے ہاتھ پاؤں اور سر قلم کر دیے جائیں گے۔"

کسی مرید نے غیر معمولی جسارت سے کام لیا۔ کہا۔ "جب آپ اس راز سے واقف ہی ہو گئے تھے کہ ابن منصور آپ کا مسودہ گنج نامہ چوری کر کے لیے جا رہا ہے تو آپ مزاحمت کرتے اور اسے اس حرکت سے باز رکھتے۔"

عمر بن عثمان نے جواب دیا۔ "اس نے کلماتِ کفر ادا کیے ہیں، غیر معمولی اسرار فاش کیے ہیں، بے جا جسارتوں اور گستاخیوں کا مرتکب ہوتا جا رہا ہے آخر ان کی کوئی سزا تو ہوگی، اب گنج نامہ چرا لیا ہے یہ سب اُس ملنے والی عبرت ناک سزا کی فردِ جرم میں شامل ہیں۔"

ابنِ منصور نے بغداد کا رُخ کیا، اب وہ جنید بغدادی کی خدمت میں رہنا چاہتے تھے۔



گنج نامہ نظروں کے سامنے تھا۔ ابنِ منصور نہایت ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اس میں لکھا تھا۔ "ہم نے تخلیقِ آدم کے بعد جب فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا تو ابلیس کے سوا سبھی نے سجدہ کیا، فرشتے تخلیقِ آدم کے بھید سے ناواقف تھے اس لیے بے چون و چرا سجدہ کر لیا۔ ابلیس واقفِ اسرار تھا اس لیے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا پھر ہم نے کہا، زمین کے اندر ہم نے ایک ایسا خزانہ چھپا رکھا ہے کہ جو بھی اس سے واقفیت حاصل کرنا چاہے گا وہ ہلاک ہو گا لیکن ابلیس نے کہا کہ علم و آگہی کا جو خزانہ مجھ کو عطا کیا گیا ہے اس کے بعد کسی اور خزانے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ میں پھر بھی زمین کے پوشیدہ خزانے کا علم حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ ابلیس کو اجازت اور مہلت دے دی گئی۔"

ابنِ منصور نے زیرِ لب مسکرا کے کہا۔ "خوب! گنج نامہ عمر بن عثمان ایک انسان کی تصنیف ہے اور اس کا لہجہ یہ بتاتا ہے گویا کوئی انسان نہیں، خود خدا مخاطب ہے، اور جب یہی بات میں اپنی زبان سے کہتا ہوں تو مجھے کافر و زندیق گردانا جاتا ہے۔ میں اتنی منافقت تو نہیں کر سکتا کہ دل میں کچھ اور ہو اور زبان پر کچھ اور۔"

یہ جنیدِ بغدادی کی خدمت میں پہنچے اور ادب سے ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

جنیدِ بغدادی نے سوال کیا۔ "ابنِ منصور، تم ہمارے پاس کس لیے آئے ہو؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔ "شیخ کی صحبت اختیار کرنے کی غرض سے۔"

جنید بغدادی نے بے رُخی سے جواب دیا۔ "ابنِ منصور! افسوس کہ ہم دیوانوں کو اپنی صحبت میں نہیں رکھتے، تم کوئی اور در دیکھو۔"

ابنِ منصور نے مایوسی سے کہا۔ "آخر یہ کیوں؟ اس در سے کسی کو کبھی بھی مایوس نہیں کیا گیا، پھر مجھے کیوں مایوس رکھا جائے گا۔"

جنید بغدادی نے جواب دیا۔ "ابنِ منصور! حسنِ صحبت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان کسی حد تک اپنے ہوش و حواس میں ہو، اگر آدمی میں ہوش و حواس نہ ہوں تو اس کا طرزِ عمل بالکل معاندانہ ہو گا، تمھارے جیسا، تم نے سہل بن عبداللہ کی صحبت چھوڑی، عمر بن عثمان کی صحبت میں رہنے

لگے اور اب ان سے جُدا ہو کر ہمارے پاس چلے آئے، ایسے متلوّن مزاج انسان کا کیا بھروسا ؟ کل ہمارا ساتھ چھوڑ کے کسی اور کے پاس چلے جاؤ ؟"

ابنِ منصوُر نے جواب دیا "ہوش ہو یا مدہوشی، دونوں ہی انسانی صفات ہیں اور میں خدا سے دُعا مانگتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے سُرخرو کرے شیخ ! ایک بات آپ بھی جان لیں کہ جب تک کوئی انسان اپنی صفات بالکل نیست و نابود نہ کر دے، وہ اپنے مالک سے نہاں اور مستور ہی رہتا ہے۔"

جنید بغدادی نے ذرا طیش میں کہا "ابنِ منصوُر ! ہوش اور مدہوشی کے معاملے میں تم غلطی پر ہو اور تمھیں شاید یہ نہیں معلوم کہ ہوش اور مدہوشی انسان کی اختیاری حالت نہیں ہیں۔ انھیں محض اپنی کوشش سے نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ ابنِ منصوُر ! ذرا ہوش و حواس سے کام لو، کیونکہ تمھارے اقوال اور فکر میں یا تو دیوانگی کا وافر حصّہ ملتا ہے یا پھر حماقت کا۔"

ابنِ منصوُر نے جنید بغدادی سے زیادہ بحث نہیں کی، خاموشی اختیار کی اور خلوت و سکوت کی تربیت سے آراستہ ہونے کے بعد یہ حج کی غرض سے مکہ معظمہ چلے گئے۔ حج سے پھر بغداد واپس آ گئے، اور جنید بغدادی کی خدمت میں رہنے لگے۔ اسی دوران انھوں نے شادی بھی کر لی تھی۔

ایک دن جنید بغدادی سے سوال کیا "حضرت ! مجھ سے سرزد ہونے والے افعال کا ذمّے دار کون ہے ؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا "تم خود۔"

ابنِ منصوُر نے کہا "لیکن جناب، مجھے اس سے اختلاف ہے، اپنے سارے اعمال اور افعال کا ذمّے دار میں کیوں ٹھیرایا جاؤں، میں معلّم الملکوت نہیں ہوں کہ انکارِ سجدہ کا گناہ اپنی گردن پر رکھ لوں، میں جو کچھ کرتا ہوں یا آیندہ کروں گا وہ میرا فعل نہیں ہو گا بلکہ وہ من جانب اللہ ہو گا اور یہ ایک ایسا راز ہے جسے میں چھپا نہیں سکتا، چھپانا بھی چاہوں تو بھی نہ چھپا سکوں۔"

جنید بغدادی، ابنِ منصوُر کی باتیں نہایت غور سے سنتے رہے پھر فرمایا "ابنِ منصوُر ! ہماری پیش گوئی اپنی گرہ میں باندھ لے، تُو اپنی عُمر کے کسی نہ کسی حصّے میں لکڑی کا سر سُرخ کرے گا، ہماری یہ بات ہمیشہ ذہن اور حافظے میں محفوظ رکھ !"

ابنِ منصوُر نے جواب دیا "اپنے انجام سے میں خود بھی واقف ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب میری بابت سُولی دیے جانے کا حکم دیا جانے لگے گا تو خلیفۂ وقت کی طرف سے آپ کو حکم ملے گا کہ ابنِ منصوُر کے معاملے میں اپنے فیصلے سے مطلع کرو، اس وقت آپ مجبوراً

چند

دوست آپس میں مختلف موضوعات پر بات چیت کر رہے تھے۔ گفت گو کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور بات یہاں تک پہنچی کہ دُنیا کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی باتیں زیرِ بحث آنے لگیں۔

اسی سلسلے میں ایک دوست نے سوال کیا "دُنیا کا آسان ترین کام کیا ہے، اور مشکل ترین کام کیا ہے ؟"

بیوی کے ظلم و ستم جھیلا ہوا ایک دوست بولا "آسان ترین کام ہے شادی کرنا اور مشکل ترین کام ہے شادی کر کے نبھا دینا"

علمائے ظاہر کا لباس پہن کر میرے خلاف فتوا صادر فرمائیں گے۔"

جنید بغدادی نے ایک دم خاموشی اختیار کر لی۔

جنید بغدادی سے بھی نہ نبھ سکی اور یہ ناراض ہو کر تستر چلے گئے۔ یہاں ان کے گرد عقیدت مندوں کا ایک مجمع رہنے لگا۔ طبیعت کی بے باکی اور صاف گوئی کی وجہ سے اہلِ ظاہر آپ سے ناراض رہتے اور حسد کرتے۔ یہ بھی ان کی کوئی پروا نہ کرتے۔ عمر بن عثمان نے بھی معاندانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ حسین ابنِ منصوُر تستر میں مقیم ہیں تو انھوں نے ان کے خلاف، اپنے خطوط کے ذریعے لوگوں کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ ابنِ منصوُر کو اپنے مرشد کی اس روش سے بڑی اذیت پہنچی۔ ایک طرف علمائے ظاہر کی معاندانہ روش اور حسد، دوسری طرف عمر بن عثمان کے مخالفانہ خطوط کی یلغار، ابنِ منصوُر اتنے عاجز آ گئے کہ دنیا داروں جیسی روش اختیار کر لی لیکن اس پر زیادہ دن نہیں چل سکے۔ اس عرصے میں یہ کتابیں بھی تصنیف کرتے رہے۔ ان بلند پایہ تصانیف پر انھیں حلاج الاسرار کا خطاب دیا گیا۔

اس کے بعد ابنِ منصوُر نے سیاحت شروع کر دی، جہاں جاتے وہاں کے لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔ اہواز کے راستے برصغیر میں داخل ہوئے اور یہاں سے خراسان ہوتے ہوئے ماوراء النہر پہنچے اور ماوراء النہر سے مغربی چین چلے گئے جہاں بھی گئے وہاں کے لوگوں نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔

آپ عبادت و ریاضت میں سخت محنت سے کام لیتے اور بڑی اذیتیں برداشت کرتے۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ "جب آپ عظمت اور بزرگی کے اتنے بڑے منصب پر فائز ہیں تو اتنی مشقت اور اذیت کیوں جھیلتے ہیں ؟"

آپ نے جواب دیا "عشق اور دوستی کا مفہوم ہی یہی ہے کہ مصائب پر صبر کیا جائے اور اس راہ میں جو فنا ہو جاتے ہیں، انھیں خوشی

اور غم کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔"

اس زمانے میں آپ ایک ہی گدڑی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایک عرصے بعد آپ کے عقیدت مندوں نے مجبور کیا کہ وہ اس پھٹی پرانی بوسیدہ گدڑی کو علیحدہ کر دیں، یہ اس پر مُصر تھے کہ "میں اس گدڑی کو نہیں چھوڑوں گا۔" عقیدت مندوں نے از راہِ عقیدت جبراً یہ گدڑی ان سے چھین لی، اس چھین جھپٹ میں گدڑی کے اندر سے ایک بچھو زمین پر گر کر رینگنے لگا۔ کسی عقیدت مند نے اسے مارنے کے لیے پتھر اٹھایا تو ابنِ منصور نہایت کرب سے آگے بڑھے اور اس شخص کے ہاتھ سے پتھر چھین لیا اور اسے ایک طرف پھینکتے ہوئے فرمایا۔ "اسے مت مارو کیونکہ یہ بارہ برس سے اس گدڑی میں فرضِ رفاقت ادا کر رہا ہے۔"

اس بار آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ حج کا ارادہ کیا۔

آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ہجوم کے ساتھ حج کا سفر کیا۔ سفر طویل تھا اور زادِ راہ قلیل۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ بھوک سے پریشان ہونے لگے۔ ابنِ منصور نے بے نیازی اختیار کی تو لوگوں نے شکوہ کیا کہ "حضرت، آپ کے ساتھ سفر کیا اور بھوک کے شکار ہوئے۔ کچھ کھائے بغیر یہ سفر کیوں کر کٹے گا؟"

آپ نے پوچھا۔ "تم لوگ کیا کھانا چاہتے ہو؟"

کہاں تو خوراک نام کا ایک ذرّہ بھی کسی کے پاس نہ تھا اور کہاں ابنِ منصور کا یہ سوال کہ "تم لوگ کیا کھانا چاہتے ہو؟"

کسی عقیدت مند نے جواب دیا۔ "حضرت، اس وقت جو بھی مل جائے غنیمت ہے۔"

ابنِ منصور نے پھر سوال کیا۔ "تمھیں خواہش کس چیز کی ہے؟"

عقیدت مند نے جواب دیا۔ "سری اور روٹیاں۔"

آپ نے انھیں حکم دیا۔ "تم لوگ اپنی اپنی چادریں بچھا کر ایک صف میں بیٹھ جاؤ۔"

لوگوں نے حکم کی تعمیل کر دی۔ ابنِ منصور صف کے ایک کنارے کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ پشت پر لے گئے اور فوراً ہی واپس لے آئے۔ اس وقت ان کے دونوں ہاتھوں میں ایک بھنی ہوئی سری اور دو گرم گرم روٹیاں موجود تھیں۔ آپ نے صف کے پہلے شخص کے سامنے دونوں چیزیں رکھ دیں اور کہا۔ "ذرا صبر سے کام لو، جب یہی چیزیں بقیہ دوسروں کے سامنے بھی رکھ دی جائیں تو سب ایک ساتھ کھانا۔"

پھر عقیدت مندوں نے یہ دلچسپ تماشا دیکھا کہ ابنِ منصور کے ہاتھ بار بار پیچھے جاتے اور جب سامنے آتے تو ایک سری اور دو گرم گرم روٹیاں ہاتھوں میں موجود ہوتیں۔ جب یہ عمل تکمیل کو پہنچا تو آپ نے انھیں حکم دیا۔ "اچھا بسم اللہ!"

لوگوں نے کھانا شروع کر دیا اور خوب شکم سیر ہو کر دم لیا۔

لوگوں کے لیے یہ ایک دلچسپ کرامت تھی۔ وہ ابنِ منصور کی موجودگی میں احتیاجاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز ہو گئے۔ اس سفر میں ایک جگہ کچھ دیر کے لیے قیام کیا تو عقیدت مندوں نے خواہش کی کہ وہ خرمے کھانا چاہتے ہیں۔

آپ نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو دُور دُور تک خرمے کا کوئی درخت بھی نظر نہ آیا۔ آپ نے کہا۔ "خرمے کس طرح کھاؤ گے؟ نہ تو یہاں کوئی بازار ہے کہ خرمے خرید کر کھلائے جائیں، نہ خرمے کے درخت ہیں کہ انھیں توڑ لیا جائے۔"

عقیدت مندوں نے اصرار کیا۔ "ہم تو آپ کے سامنے اپنی احتیاج عرض کر کے خاموش ہو رہیں گے، وہ مطلوبہ شے کہاں سے اور کس طرح حاصل ہو گی، ہم مجبور اور گناہگار لوگ اس پر غور نہیں کرنا چاہتے۔"

آپ تن کر کھڑے ہو گئے اور لوگوں سے فرمایا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ مجھ سے کتنی عقیدت رکھتے ہو لیکن تم میں سے اکثر ان تماشائیوں اور لعن طعن کرنے والوں میں شامل ہوں گے جو مجھے کافر قرار دیں گے۔"

لوگوں نے بیک آواز کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا کبھی بھی نہ ہو گا۔"

ابنِ منصور نے کہا۔ "اچھا پھر تم لوگ باری باری میرے جسم کو اس طرح ہلاؤ جس طرح پھل والے درخت کو ہلایا جاتا ہے۔"

کئی آدمیوں نے باری باری آپ کو شانوں سے پکڑ کر ہلایا اور ہر بار جسم کے مختلف حصوں سے خرمے یوں گرنے لگے جس طرح درختوں سے گرتے ہیں۔ کچھ دیر بعد اتنے خرمے جمع ہو گئے کہ سبھوں کا اچھی طرح بھلا ہو گیا۔

ابھی یہ لوگ بغداد سے کافی دُور تھے۔ خرموں کے بعد کسی نے خواہش کی کہ "میں حلوہ کھانا چاہتا ہوں۔"

آپ نے قدرے توقف کے بعد حلوے کا طباق بھی ان کے سامنے رکھ دیا۔ لوگوں نے مزے لے لے کر حلوہ کھایا اور بیک زبان عرض کیا۔ "جناب! ایسا حلوہ تو بغداد کے سوا کہیں بھی نہ ملے گا، مزہ آ گیا۔"

ابنِ منصور خاموش رہے۔ رات کو جب لوگ آرام کر رہے تھے۔ ابنِ منصور نہایت دردناک آواز میں اپنے اشعار پڑھ رہے تھے۔ اس الحاح و زاری سے کئی کی نیندیں اُڑ گئیں اور وہ چھپ چھپ کر ابنِ منصور کا کلام سُننے لگے۔ ابنِ منصور خدا سے مخاطب تھے اور کہہ رہے تھے۔

"ہم دو روحیں ہیں جنھوں نے ایک بدن کی صورت اختیار کر لی ہے،

سب سہانگ

جب وہ مجھے دیکھتا ہے، میں اسے دیکھتا ہوں۔
جب میں اسے دیکھتا ہوں، وہ مجھے دیکھتا ہے۔
تو میرے رگ و پے اور قلب میں جاری و ساری ہے۔
بالکل اس طرح جس طرح آنسو میری آنکھوں سے جاری ہیں۔
ضمیر، قلب میں اس طرح حل ہو گیا ہے۔
جس طرح روح بدن میں جذب ہو جاتی ہے۔
اے اللہ! تیری روح میری روح میں اس طرح سما گئی ہے جس طرح آبِ زلال میں شراب۔
جب کوئی چیز تجھے مس ہوتی ہے تو مجھے بھی مس ہوتی ہے۔
کیونکہ تو اور میں ہر حال میں ایک ہیں۔"

چھپ کر سننے والوں میں سے بعض نے کہا "ارے یہ تو بہک رہا ہے اور کفر بک رہا ہے۔" لیکن کسی اور نے تردید کی۔ جواب دیا۔ "نہیں، ابنِ منصور کافر نہیں ہو سکتے۔ یہ مقام وصلت میں ہیں جہاں دُوئی کا جھگڑا مٹ جاتا ہے اور پھر کافر اور ملحد قرار دینا فقہا کا منصب ہے، ہم ایسی باتیں کیوں کریں۔"

ان آپس کے بحث مباحثوں میں کوئی ایک فریق بھی اپنے مخالف کو ہم خیال نہ بنا سکا اور وہ دو حصّوں میں بٹ گئے۔ جب یہ لوگ بغداد کے بابِ الطاق میں داخل ہوئے اور کھانا خریدنے بازار میں پہنچے تو ان میں سے کسی ایک کے پاس وہ طباق بھی تھا جس میں انھیں ابنِ منصور نے گرماگرم حلوہ پیش کیا تھا۔ ایک حلوائی اس طباق کو غور سے دیکھ رہا تھا، پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور طباق والے شخص کو پکڑ لیا اور پوچھا۔ "یہ طباق میرا ہے، تمھیں کہاں سے ملا؟"

یہ شخص گھبرا گیا۔ بولا۔ "تیرا ہی ہوگا، مجھے کیا پتہ؟" پھر اس نے ابنِ منصور کا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ "ہمیں تو یہ ان سے ملا تھا۔ یہ انھیں کس نے دیا اور ان کے پاس کس طرح پہنچا، انھی سے جا کر معلوم کر لو، ہم کیا جواب دے سکتے ہیں؟"

حلوائی نے کہا۔ "تم مجھے ابنِ منصور کے پاس لے چلو۔ میں اس عجیب و غریب شخص سے ملنا چاہتا ہوں۔"

حلوائی کو ابنِ منصور کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ لوگوں کا خیال تھا، یہ حلوائی ابنِ منصور سے اُلجھ جائے گا اور جھگڑا کرے گا لیکن وہ ابنِ منصور کے قدموں میں گر گیا اور رو رو کر عرض کیا۔ "حضرت! اِس ناچیز کو بھی اپنی ہم رکابی کا شرف عطا فرمائیں، ایسے برگزیدہ اور خدا رسیدہ لوگ آج کل ملتے کہاں ہیں۔"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔ "کیا تم خود کو اللہ کی راہ میں فنا کرنے کا عزم رکھتے ہو؟"

"بالکل، میں تو ہر اس بات کے لیے آمادہ و تیار ہوں جس کا آپ حکم فرمائیں گے۔"

ابنِ منصور نے پوچھا۔ "اپنے اہل و عیال کا کیا بندوبست کیا؟"

حلوائی نے جواب دیا۔ "انھیں خدا کے سپرد کیا۔"

"خوب!" ابنِ منصور نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو بسم اللہ۔"

حلوائی اسی وقت سے آپ کے ساتھ رہنے لگا۔

بغداد میں ابنِ منصور کے خلاف چرچے شروع ہو گئے۔ علمائے ظاہر انھیں گھیر کر بیٹھ گئے اور زچ کر دینے والے سوالات کرنے لگے۔ جنید بغدادی نے ناراضی کا اظہار کیا جب لوگوں نے ان سے ابنِ منصور کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ شہر کے علما اور فقیہہ ان پر سوالات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر رہے ہیں تو آپ نے افسوس اور دُکھ سے منہ پھیر لیا اور فرمایا۔ "ابنِ منصور اپنا دشمن آپ ہے، ہم کیا کر سکتے ہیں؟ آخر یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ جن پر ابتدائے آفرینش سے پردہ پڑا ہوا ہے تم ان اسرار سے پردہ اٹھا دو اور جو کوئی ایسا کرے گا اس کی سزا بھی بھگتے گا۔"

حاسد اور نادان علما نے ابنِ منصور کو طرح طرح کے سوالوں سے ہلکان کر دیا۔ کسی عالم نے سوال کیا۔ "جنابِ والا! ذرا یہ تو بتائیے کہ حضرت موسیٰؑ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔ "وہ پیغمبر تھے، پیغمبرِ حق۔ مبنی برحق۔"

اس عالم نے دُوسرا سوال کیا۔ "اور فرعون کی بابت کیا خیال ہے؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "وہ بھی سچّا تھا۔"

طنز و استہزا کا پُرشور قہقہہ بلند ہوا۔ "خوب، موسیٰ بھی حق پر تھے اور فرعون بھی حق پر۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔ "تم لوگ ہنستے کیوں ہو؟ کیا تم اتنی بات بھی نہیں جانتے کہ خدا نے دو طرح کے لوگ پیدا فرمائے ہیں، ایک عام اور دوسرے خاص ــ اور یہ دونوں ہی قسم کے لوگ اپنے حصے کا کام انجام دیتے رہتے ہیں۔"

کسی شخص نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ "یہ تو کیا بک رہا ہے؟"

ابنِ منصور نے تحمّل سے جواب دیا۔ "پہلے پوری بات سن لو، ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ خدا نے دو طرح کے انسان پیدا فرمائے ہیں۔ عام اور خاص ــ اور دونوں ہی کے ذمے جو کام لگائے گئے ہیں، یہ انھیں انجام دیتے رہتے ہیں۔ دونوں کو راستہ دکھانے والا خدا

ہے۔ حکمت ایک تیر ہے، خدا تیر انداز اور مخلوق اس کا نشانہ۔ خدا اور اس کی یاد میں دُنیا اور آخرت بھلا دینے والا واصل الی اللہ ہوتا ہے اور فقر یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا کی عبادت میں ہر شے سے مستغنی ہو جائے۔"

لوگ ان کی باتوں سے سخت برہم و بیزار تھے۔ کسی نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔" ابنِ منصور! تم وہی ہو نا جسے لوگ حلاج کہتے ہیں کیا خدا تم جیسے معمولی خاندان کے حقیر انسان پر اپنی ذات منکشف کرسکتا؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔" تم لوگ کیسی جہالت کی باتیں کر رہے ہو، ذاتِ خداوندی جس پر منکشف ہونا چاہتی ہے تو وہ ادنا اعلا نہیں دیکھتی۔ وہ ادنا شے قبول کر کے منکشف ہو جاتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اعمالِ صالحہ بھی قبول نہیں کرتی۔"

ایک شخص نے سوال کیا۔" صبر کیا ہے؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔" صبر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر صبر کرنے والے کے ہاتھ پیر کاٹ کر سُولی پر چڑھا دیا جائے تو وہ اُف نہ کرے۔ شکایت کرنے والا صابر نہیں کہلائے گا۔"

کسی شخص نے آہستہ سے کہا۔" مت گھبراؤ ابنِ منصور! تمھیں بھی صبر کی اس کسوٹی پر کس کر دیکھ لیا جائے گا۔"

کسی عالم نے سوال کیا۔" آخر انبیائے کرام بہکتے کیوں نہیں؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔" انبیائے کرام اعمال پر غالب رہتے ہیں، اسی وجہ سے اعمال انھیں گردش دینے میں بے بس رہتے تھے اور انبیائے کرام خود اعمال کو گردش دیا کرتے تھے۔"

لوگوں نے جدا ہونے سے پہلے انھیں تنبیہ کی۔" ابنِ منصور! اگر تم یہ چاہتے ہو کہ کچھ دن اور زندہ رہو تو اپنے افکار اور خیالات کے اظہار میں ہوش مندی اور میانہ روی سے کام لو، ورنہ فی الحال تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم کافر قرار دے دیے جاؤ اور اس جرم کی جو سزا تمھیں مل سکتی ہے فقیہانِ شہر سے معلوم کر لینا۔"

ابنِ منصور نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔" جو کچھ میں کہتا ہوں، میں خود نہیں کہتا بلکہ خدا کہتا ہے، میری زبان سے خدا خود کلام فرماتا ہے، آخر یہ بات تم لوگ کیوں نہیں سمجھتے۔"

کسی نرم دل عالم نے ازراہِ ہمدردی کہا۔" ارحم الراحمین تم پر رحم فرمائے ابنِ منصور!"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔" ارحم الراحمین خود میری ذات میں موجود ہے کیا وہ خود اپنی ذات پر رحم فرما سکتا ہے تم فقیہانِ شہر اور علمائے ظاہر ان باطنی اور حقیقی رموز کو کیا سمجھو، اب جاؤ اور مجھے زیادہ پریشان نہ کرو۔"

لوگوں نے ان پر لعن طعن شروع کر دی اور کنکر پتھر برسانے لگے۔ وہ بیک آواز چیخ رہے تھے۔" دیوانہ ہے دیوانہ، کافر ہے مشرک ہے، اسے مارو، سنگسار کر دو، یہاں تک کہ مرجائے۔"

لیکن کسی فقیہہ نے انھیں ایسا کرنے سے روکا۔ کہا۔" لوگو! تم قانون کو اپنے ہاتھ میں کیوں لیتے ہو جبکہ فقہائے عصر اور علمائے عہد کے رُوبرو پیش کیا جائے اور پھر شرع جیسا حکم دے گی اس پر عمل کیا جائے گا۔"

لوگ وہاں سے ہٹ گئے اور ابنِ منصور نے بغداد چھوڑ دیا۔ حج کے لیے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔



حسین ابنِ منصور نے اپنے چار ہزار ہمراہیوں کے ساتھ حج کیا لیکن انھیں لوگوں سے جیسی اذیتیں پہنچ رہی تھیں اس کا بڑا اثر تھا انھیں اس ہجوم میں اکثر کی منافقت پر غصہ بھی تھا اور افسوس بھی۔ وہ لوگ جو ابنِ منصور کو سمجھ نہیں سکتے انھیں کافر کیوں قرار دیتے ہیں۔ اس بات پر وہ بہت برہم تھے۔ انھوں نے میدانِ عرفات میں ہزاروں آدمیوں کے سامنے باآوازِ بلند دُعا مانگی۔" اے اللہ! تو سرگرداں لوگوں کو راہ دکھانے والا ہے۔ اگر میں تیرے نزدیک بھی کافر ہوں تو میرے کفر میں اضافہ فرما دے۔"

لوگ توبہ استغفار کرتے ہوئے ان سے علیحدہ ہو گئے کیونکہ اب ان سب کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ ابنِ منصور مسلمان نہیں رہے، کافر ہو چکے ہیں۔ ابنِ منصور نے تنہائی میں خدا کے سامنے گریہ وزاری کی۔ روتے ہوئے دل جلے لہجے میں کہا۔" اے خدا! تو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ میں تجھے واحد سمجھتا ہوں اور تیری ہی عبادت کرتا ہوں، کسی اور کی عبادت نہیں کرتا، اپنے عجز کی وجہ سے تیرے انعامات کا شکریہ بھی نہیں ادا کر سکتا لہٰذا اگر تو میری خواہش جاننا چاہتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اپنا شکر تو خود ادا کر لے اس لیے کہ بندوں سے تیرا شکر کسی طرح بھی ادا نہیں ہو سکتا۔"

اب ابنِ منصور کے افکار اور اعمال میں زیادہ شدت پیدا ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور مریدوں کو جو خطوط لکھے، ان کا لب و لہجہ انتہائی آزادانہ اور ہوش رُبا ہوتا تھا۔ آپ نے ایک مرید کو خط لکھا۔

" من جانب ارحم الراحمین، بنام بندۂ خدا ـــ تم نے پوچھا تھا کہ ابلیس نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا۔ ہر چند کہ یہ راز ایسا نہیں تھا جسے چھپایا جاتا لیکن لوگوں نے چھپایا۔ اس کا جواب میں دیتا ہوں، ابلیس بہت بڑا موحد تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنے

رب کا بھی وہ حکم نہیں مانا جس میں شرک کی بُو پائی جاتی تھی۔"

اس نوع کے خطوط خلیفہ کے ملاحظے میں بھیج دیے گئے اور اس سے درخواست کی گئی کہ "ابنِ منصور جیسی باتیں کر رہا ہے اس سے ایک عالَم گمراہ ہو جائے گا اور فتنوں کا ایسا در کھلے گا کہ اسے بند کرنا ناممکن ہو جائے گا۔"

قمری سن کے اعتبار سے ۵۳ سال کی عمر میں (۲۹۷ھ) ابن داؤد اصفہانی کے فتوے کی بنیاد پر ابنِ منصور گرفتار کر لیے گئے لیکن ایک سال بعد قید خانے سے فرار ہو کر سوس چلے گئے اور وہاں پوشیدہ طور پر رہنے لگے لیکن کب تک خاموش رہتے؟ یہاں سے انھوں نے جو خطوط لکھے وہ بھی بڑے تند و تیز تھے۔ اب انھوں نے "انا الحق" کا نعرہ لگایا۔

'انا الحق' یعنی 'میں ہی وجودِ خداوندی ہوں'۔ یہ ایسا نعرہ تھا جس نے دُور دُور تک زلزلہ برپا کر دیا۔ بڑے بڑے کانپ گئے۔ ذی فہم اور واقفِ اسرار کسی متوقع ہنگامے کی فکر میں گُنگ ہو گئے نادان اور نااہل مشتعل ہو گئے اور ابنِ منصور پر سنگ باری کرنے لگے۔

انھوں نے ایک بار پھر اپنے مریدوں کو جو خطوط لکھے اور ان میں جن افکار اور خیالات کا اظہار فرمایا وہ علما اور فقہا کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے لکھا۔

"من جانب الرحمٰن الرحیم بنام بندۂ خدا ـــ تم نے ادیانِ عالم کی بابت جاننا چاہا ہے تو لو سنو اور غور کرو، تمام دین حقیقت میں ایک ہیں ان کا اختلاف فروعات میں ہے۔ تمام ادیان کا مرکز اور منبع خدا ہے اور یہ دین خدا کے لیے ہیں، ہر دین سے کوئی نہ کوئی گروہ وابستہ ہے اور یہ وابستگی انسانوں کی اپنی مرضی سے نہیں ہے بلکہ اس میں کسی بالادست قوت کی مرضی کارفرما ہے۔ وہ صرف اللہ ہے جو اپنے بندوں پر اپنی مشیت نافذ کرتا ہے اور یہ صرف خدا ہے جو اپنے بندوں کے بارے میں یہ فیصلے کرتا ہے کہ فلاں شخص یہودی ہو، فلاں عیسائی بنے اور فلاں کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہو۔ لہٰذا اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ کسی کو کسی کے دین پر معترض نہیں ہونا چاہیے اور نہ دین کے اختلاف پر کسی سے نفرت کرنی چاہیے۔ سارے دین خدا کے لیے ہیں اور جو شخص جو دین بھی اختیار کرتا ہے وہ حقیقتہً خدا کی مشیت پوری کرتا ہے۔"

سن ۳۰۱ھ میں وہ دوبارہ گرفتار کر لیے گئے اور انھیں بغداد کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ بغداد اور اس کے آس پاس دُور دُور تک ابنِ منصور کی گرفتاری کی خبر پھیل گئی اور لوگ قید خانے میں ملاقات کے لیے پہنچنے لگے۔ انھی میں جنید بغدادی کے مشہور مُرید اور صاحبِ حال بزرگ ابوبکر شبلی بھی شامل تھے۔ شبلی بھی کچھ کم بے باک نہیں تھے۔ ان کا انداز بھی نہایت جارحانہ رہتا تھا۔ شبلی نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ ابنِ منصور کو اس کے جرم میں وہ خود قتل کر دیں۔ جب یہ اس نیت سے قید خانے میں داخل ہوئے تو ابنِ منصور نے دیکھتے ہی سوال کیا "شبلی! کیا تم مجھے واقعی قتل کر دینا چاہتے ہو؟"

شبلی نے جواب دیا "تیرا جُرم ناقابلِ معافی ہے۔"

ابنِ منصور نے حیرت اور افسوس سے کہا "شبلی! تم بھی مجھے مجرم کہہ رہے ہو اور میرے مسلک کو جُرم قرار دے رہے ہو؟"

شبلی نے جواب دیا "تُو نے اسرارِ خداوندی کو عامیوں پر کھول دیا ہے۔ تجھے ضبط اور احتیاط سے کام کرنا تھا۔"

ابنِ منصور نے افسوس سے کہا "جب تک میں برداشت کر سکا برابر برداشت کرتا رہا لیکن اب معاملہ ضبط اور احتیاط کی دسترس سے نکل چکا تھا۔"

شبلی نے کہا "پھر بھی تمھیں 'انا الحق' اور 'من جانب الرحمٰن الرحیم' جیسے کلمات سے بچنا چاہیے تھا۔"

ابنِ منصور نے پوچھا "کیا یہ واقعی اتنے بڑے جرم ہیں کہ مجھے معاف نہیں کیا جا سکتا؟"

شبلی نے جواب دیا "یہ بات فقیہانِ شہر ہی سمجھ سکتے ہیں یعنی وہ چاہیں تو معاف کر دیں اور نہ چاہیں تو مقدمہ چلاتے رہیں۔"

ابنِ منصور نے کہا "شبلی! ایک بات میری بھی سُن لو، تم دیکھ رہے ہو کہ مجھ پر دیوانگی طاری ہو چکی ہے اور میں خود ہی اپنی موت کو دعوت دے رہا ہوں۔ ان حالات میں مجھے تم قتل نہ کرو، یہ گناہ کسی اور کو کرنے دو۔"

لوگوں نے جنید بغدادی سے دریافت کیا "حضرت! حسین ابنِ منصور جو کچھ کہتے ہیں اس میں کوئی تاویل ممکن ہے یا نہیں کیونکہ اس کے بغیر وہ رہا نہیں کیے جائیں گے اور انھیں قتل کر دیا جائے گا۔"

جنید بغدادی نے جواب دیا "اب تم لوگ خاموش ہو جاؤ کیونکہ تاویل کا وقت نکل چکا ہے، جو ہو رہا ہے اسے ہو جانے دو۔" ان لوگوں نے قید خانے میں ابنِ منصور سے ملاقات کی اور کہا۔

"ابنِ منصور! خلیفۂ وقت تم سے بہت ناراض ہیں لیکن اب بھی اتنا وقت باقی ہے کہ اگر تم انا الحق نہ کہو اور اپنے خطوط کا لب و لہجہ بدل دو تو تمھیں رہا کرایا جا سکتا ہے۔"

ابنِ منصور نے جواب دیا "میں مجبور ہوں، تم اپنا کام کرو میں اپنا کام انجام دے رہا ہوں کیونکہ ہم دونوں اپنے اپنے ذمے سونپی ہوئی خدمات انجام دینے پر مجبور ہیں۔"

چند عقیدت مند ان سے رات میں ملنے گئے لیکن ابنِ منصور قید خانے میں موجود نہ تھے۔ پہرے دار گھبرا گئے اور پوری رات تلاش

اورجستجو میں گزار دی لیکن صبح یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ابنِ منصورؒ اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ دُوسری شب اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ ابنِ منصورؒ کے معتقد پوری رات قید خانہ تلاش کرتے رہے۔ نہ قید خانہ مِلا' نہ ابنِ منصورؒ سے ملاقات ہوئی لیکن تیسری شب دونوں ہی مل گئے ۔ ابنِ منصورؒ بھی اور قید خانہ بھی۔ لوگوں نے ابنِ منصورؒ سے اس کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا "ہاں' پہلی شب میں قید خانے میں موجود نہیں تھا، رسُول اللہؐ کی خدمت میں چلا گیا تھا"

کسی معتقد نے پوچھا "اور دُوسری شب ـــــ ؟ ہم ساری رات قید خانہ تلاش کرتے رہے لیکن یہ نظروں سے اوجھل ہی رہا' آخر یہ کیا تھا؟"

ابنِ منصورؒ نے جواب دیا "ہاں' دوسری شب رسُول اللہؐ خود تشریف لے آئے تھے اس لیے آپ کی موجودگی میں قید خانہ اپنی حیثیت کھو بیٹھا تھا"

کسی مرید نے کہا "اگر آپ چاہیں تو یہاں سے فرار ہو سکتے ہیں"

"ہاں" ابنِ منصورؒ نے کہا "لیکن میں تحفظِ شریعت کی خاطر یہاں رہنے پر مجبور ہوں"

قید خانے میں پوری پوری رات نماز میں گزر جاتی تھی۔ کسی نے ازراہِ مذاق سوال کیا "جب آپ نے 'انا الحق' کا نعرہ بلند کر دیا ہے یعنی وجودِ خداوندی آپ خود ہیں تو پھر یہ نماز کس کی پڑھتے ہیں ؟"

انھوں نے جواب دیا "ہم اپنا مرتبہ خود سمجھتے ہیں"

جس قید خانے میں ابنِ منصورؒ قید تھے' وہاں تین سو قیدی اور موجود تھے۔ انھوں نے ایک دن قیدیوں سے کہا "اگر تم لوگ خواہش کرو تو میں تمھیں رِہا کرا سکتا ہوں"

قیدی انھیں دیوانہ سمجھتے تھے۔ ان میں سے کئی نے جواب دیا۔ "اگر تم میں اتنی ہی طاقت ہے تو تم خود کیوں رِہا نہیں ہو جاتے ؟"

ابنِ منصورؒ نے کوئی جواب تو دیا نہیں' ایک ہلکا سا اشارہ کیا جس سے پیروں میں پڑی ہوئی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ قیدی حیرت سے ان کی صورت تکنے لگے۔ آپ نے قیدیوں سے کہا "تم میری صورت مت دیکھو بلکہ یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے تیار ہو جاؤ"

قیدیوں نے کہا "قید خانے کے کئی دروازے ہیں اور یہ سبھی مقفل ہیں۔ پیروں کی زنجیریں ٹوٹ جانے سے رِہائی کا مسئلہ کہاں حل ہوتا ہے؟"

آپ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے انگلی سے کھل جانے کا اشارہ کیا۔ دروازہ خود بخود کھُل گیا۔ آپ نے قیدیوں سے کہا "تم لوگ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ جس طرح یہ دروازہ کھلا ہے' اسی طرح بقیہ دروازے بھی کھلے ہوئے ملیں گے، تمھارا کام یہاں سے نکل جانا ہے۔

اب مزید دیر نہ کرو۔"

قیدی ابنِ منصورؒ کے بغیر جانے پر آمادہ نہ تھے۔ انھوں نے کہا۔ "ہمارے ساتھ آپ بھی چلیے۔"

ابنِ منصورؒ نے جواب دیا۔ "میں یہیں ٹھیرے رہنے پر پابند کر دیا گیا ہوں۔ تم ان چکروں میں مت پڑو، میں جو کہہ رہا ہوں، اس پر عمل کرو۔"

مجبوراً سارے قیدی فرار ہو گئے۔

اس واقعے نے ایک تہلکا مچا دیا۔ آپ سے بہت سارے سوالات کیے گئے لیکن آپ نے انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ "مجھ سے جو پوچھنا ہے، صاف صاف پوچھو۔ میں نے سارے قیدیوں کو رہا کر دیا ہے۔ خود میں بھی فرار ہو سکتا تھا لیکن محض اس لیے رُک گیا ہوں کہ رسُول اللہؐ کا حکم ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے یا جو کچھ لکھا ہے تحفظِ شریعت کی خاطر میں اس کی سزا بھی بھگت لوں۔"

لوگوں نے اس عجیب و غریب واقعے کی اطلاع خلیفہ کو دی اور درخواست کی کہ ابنِ منصورؒ کے لیے جو فیصلہ مناسب ہو فی الفور سنا دیا جائے کیونکہ یہ عجیب و غریب شخص کسی وقت بھی قید خانے سے فرار ہو سکتا ہے۔"

خلافت کی طرف سے حکم ملا کہ ابنِ منصورؒ سے آخری بار ان کے افکار و اعمال پر جرح کی جائے، اگر وہ اس سے تائب ہو جائیں تو انھیں چھوڑ دیا جائے اور دوسری صورت میں علمائے عصر اور فقہائے عہد سے ان کے واجب القتل ہونے کا فتوا طلب کیا جائے اور فتوے کے حصُول کے بعد انھیں قتل کر دیا جائے۔"

فقیہانِ شہر اور علمائے عصر قید خانے میں ابنِ منصورؒ سے ملے اور ان سے سوال کیا۔ "ابنِ منصورؒ! تم 'انا الحق' کا نعرہ لگا کے اپنی خدائی کا اعلان کر رہے ہو، کیا یہ کفر نہیں ہے؟"

ابنِ منصورؒ نے کہا۔ "تم لوگ اپنے سارے الزامات گنا دو، میں ان سب کا ایک ساتھ جواب دوں گا۔"

ان لوگوں نے ابنِ منصورؒ کے وہ خطوط پیش کیے جو "من جانب الرحمٰن الرحیم" سے شروع کیے گئے تھے۔ انھوں نے کہا۔ "کچھ عرصے پہلے تک تو ہم سب کا یہ خیال تھا کہ تم پیغمبری کا دعوا کرنے والے ہو لیکن تمھارے خطوط اور نعرۂ 'انا الحق' سے یہ انکشاف ہوا کہ تم خدا ہو، آخر یہ سب کیا ہے؟"

ابنِ منصورؒ نے جواب دیا۔ "میں نے اپنی خدائی کا دعوا کب کیا ہے، بلکہ یہ تو وہ چیز ہے جسے ہم صوفی عین الجمع (ارادۂ خداوندی کے ساتھ اتصالِ کامل) کہتے ہیں۔ میں نے اپنے خطوں میں 'من جانب الرحمٰن الرحیم' لکھا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کاتب ہے اور خود میں آلۂ کتابت۔"

جب خلیفہ کے سامنے یہ تاویل پیش کی گئی تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔

جب یہ قتل کیے جانے کی غرض سے باہر لائے گئے تو لاکھوں تماشائی انھیں دیکھنے کی غرض سے جمع ہو گئے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی لوگوں نے پتھر مارنے شروع کر دیے۔ اس مجمع میں ابوبکر شبلی بھی تھے، انھوں نے مٹی کا چھوٹا سا ڈھیلا اٹھا کر ابنِ منصورؒ کے مارا تو یہ پتھروں کی مار پر اُف نہ کرنے والا "آہ" کر بیٹھا۔ کسی نے پوچھا۔ "جناب پتھروں کی مار تو ہنسی خوشی جھیل گئے لیکن ذرا سے مٹی کے ڈھیلے کی چوٹ سے کراہنے لگے، یہ کیا بات ہے؟"

ابنِ منصورؒ نے جواب دیا۔ "یہ ڈھیلا شبلی نے مارا تھا جو میرا محرمِ راز ہے، نادانوں کے مارنے سے اذیت نہیں پہنچتی لیکن واقفِ حال کی مار برداشت نہیں ہوتی۔"

پہلے ان کے تین سو کوڑے لگائے گئے۔ کوڑے کی ہر ضرب پر کوڑے لگانے والے نے ایک پُراسرار آواز سُنی جو ابنِ منصورؒ سے مخاطب تھی، وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔ "یا ابنِ منصورؒ لاتخف۔ یا ابنِ منصورؒ لاتخف۔" (اے ابنِ منصورؒ خوف زدہ مت ہو، اے ابنِ منصورؒ خوف زدہ نہ ہو)

تین سو کوڑے کی ضربات اس طرح جھیل گئے کہ منہ سے اُف تک نہ کی۔ اس وقت آپ نے عربی کے یہ شعر پڑھے۔

ندیمی غیر منسوب الی شئ من الحیف — سقانی مثل ما یشرب کفعل الضیف بالضیف

فلما دارت الکاس دعی بالنطع والسیف — کذا من یشرب الراح مع التنین بالصیف

(میرا ندیم ذرا سا بھی ظالم نہیں ہے۔ اس نے مجھ کو ایسی شراب عطا کی ہے جو میزبان مہمان کو دیا کرتا ہے اور جب جام کے کئی دور چل چکے تو اس نے تلوار اور چمڑے کی بساط طلب کی اور کہا کہ اس شخص کی یہی سزا ہے کیونکہ اس نے اژدہے کے سامنے سخت گرمی میں شراب پینے کی جسارت کی ہے۔)

قتل کیے جانے سے کچھ دیر پہلے کسی نے پوچھا۔ "عشق کیا ہے؟" جواب دیا۔ "آج، کل اور پرسوں میں اس کا جواب موجود ہے۔"

ابوبکر شبلی نے سوال کیا۔ "تصوّف کسے کہتے ہیں؟"

ابنِ منصورؒ نے جواب دیا۔ "تم جو کچھ دیکھ رہے ہو، یہ تصوّف کا ادنا درجہ ہے اور اس کے اعلا درجے سے کوئی بھی واقف نہیں۔"

انھیں قید خانے کے باہر سیڑھی پر کھڑا کر دیا گیا، جلاد آگے بڑھا اور آپ کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے۔ آپ نے اُف کیے بغیر فرمایا۔ "گو میرے ظاہری ہاتھ کاٹ دیے گئے ہیں لیکن باطنی ہاتھ محفوظ ہیں،

انھیں کون کاٹ سکتا ہے' اور یہی وہ ہاتھ ہیں جنھوں نے ہمت کا تاج عرش کے سر سے اُتار لیا ہے۔"

جلّاد کوئی پروا کیے بغیر پیروں کی طرف رجوع ہو گیا اور دونوں پیر کاٹ ڈالے۔ آپ نے فرمایا "تم نے میرے ظاہری پاؤں کاٹ دیے' کوئی پروا نہیں کیونکہ ابھی باطنی پاؤں موجود ہیں اور تم انھیں نہیں کاٹ سکتے اور یہی وہ پاؤں ہیں جن سے میں اب بھی دونوں عالم کا سفر کر سکتا ہوں۔"

اس کے بعد آپ نے خون کے فوّارے چھوڑتے ہوئے ہاتھ چہرے سے لگا لیے اور کہا "لوگو! میری جواں مردی تم بھی دیکھ لو' میں سُرخ رو ہوں کیونکہ خون جواں مردوں کا اُبٹن ہوتا ہے۔"

پھر ہتھیلیوں اور انگلیوں سے محروم ہاتھوں کو کہنیوں سے لگا لیا اور بہتے ہوئے خون کو کہنیوں پر پھیرتے ہوئے کہا "لوگو! میں نمازِ عشق کے لیے وضو کر رہا ہوں کیونکہ عشق کی نماز خون کے وضو کے بغیر ادا نہیں کی جا سکتی۔"

اس کے بعد آنکھوں کی باری آ گئی اور دونوں آنکھیں بھی نکال لی گئیں۔ آنکھوں کے بعد زبان کا نمبر آ گیا۔ آپ نے کہا "بس ذرا توقف کرو اور مجھے ایک بات کہہ لینے دو۔" اس کے بعد اُوپر دیکھتے ہوئے کہا "اے اللہ! میرے ہاتھ پَیر تیرے راستے میں کاٹ دیے گئے، آنکھیں تیرے لیے نکال لی گئیں۔ ذرا دیر بعد زبان بھی کاٹ دی جائے گی۔ میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے یہ حوصلہ بخشا کہ میں یہ ساری اذیتیں اُف کیے بغیر جھیل گیا۔ اب میری تجھ سے التجا ہے کہ تُو نے جس دولت سے مجھے سرفراز کیا ہے' اس سے ان سب کو بھی نواز دے۔"

پھر ایک ادائے خاص سے فرمایا "یکتا کی دوستی بھی یکتا کر دیتی ہے۔"

اس کے بعد زبان بھی کاٹ دی گئی اور سب سے آخر میں سر قلم کر دیا گیا۔ کہتے ہیں اس وقت ہر طرف سے "انا الحق"، "انا الحق" کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دوسرے دن لاش جلا دی گئی اور تیسرے دن ان کی راکھ دریائے دجلہ میں بہا دی گئی۔



ابوبکر شبلی کو اس سانحے سے بڑا دُکھ پہنچا۔ ابنِ منصوُر جس جگہ قتل کیے گئے تھے، شبلی وہاں رات بھر عبادت کرتے رہے۔ صبح کے وقت انھوں نے مناجات میں خدا سے سوال کیا "الٰہ العالمین! ابنِ منصوُر کی بابت جہاں تک میں جانتا ہوں وہ ایک مومن تھا اور ایک ایسا عارف اور محب جو وحدانیت پرست تھا' تو نے اسے اتنی اذیتوں سے قتل کرا دیا۔ یہ کیا بات ہے۔" اسی عالم میں شبلی پر غنودگی کا غلبہ ہوا۔

اپریل ۱۹۷۴ء

انھوں نے سُنا کوئی کہہ رہا تھا "ہم نے ابنِ منصوُر کے ساتھ یہ سلوک اس لیے کرایا کہ وہ ہمارے رازوں کو برملا ظاہر کرتا پھرتا تھا۔"

کچھ دنوں بعد شبلی نے ابنِ منصوُر کو خواب میں دیکھا۔ شبلی نے پوچھا "ابنِ منصوُر! کہو کیسے ہو؟ خدا نے تم سے کیسا سلوک کیا؟"

ابنِ منصوُر نے جواب دیا "مجھے یہاں مقامِ صدق عطا ہوا ہے۔"

شبلی نے پوچھا "ابنِ منصوُر! یہ تو بتاؤ' جب تک تم دُنیا میں رہے تمھارا دو گروہوں سے واسطہ رہا۔ ایک تو وہ جو تمھاری عزت کرتا تھا اور تمھیں حق پر سمجھتا تھا اور دوسرا وہ جو تمھیں بُرا کہتا تھا اور جس نے تمھیں قتل کرا دیا' اس کی بابت تمھاری کیا رائے ہے؟"

ابنِ منصوُر نے مسکرا کر جواب دیا "شبلی! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں جو کچھ دنیا میں کہتا تھا، اس سے منحرف ہو گیا ہوں ایسا نہیں ہے۔ پہلا گروہ جس نے مجھے پہچان لیا تھا میرے ساتھ اچھی طرح پیش آیا اور مجھ پر مہربانیاں کیں اس پر خدا نوازشیں فرمائے گا اور دوسرا گروہ جو مجھے پہچاننے سے قاصر رہا اور اس نے میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا۔ خدا اسے بھی اپنی مہربانیوں سے نوازے گا اور ان کی خطائیں معاف کر دی جائیں گی۔"

شبلی نے حیرت سے پوچھا "وہ کیوں؟"

ابنِ منصوُر نے جواب دیا "محض اس لیے کہ دوسرے گروہ نے جو کچھ کیا' خدا کے لیے کیا تھا' وہ حق پر حرف آتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ انسانی دعوائے خدائی پر خاموش نہ رہ سکتا تھا۔"

جس شخص نے قتل کیے جانے سے پہلے ابنِ منصوُر سے پوچھا تھا کہ عشق کیا ہے؟ اور آپ نے یہ جواب دیا تھا کہ "آج کل اور پرسوں میں اس کا جواب موجود ہے۔" ان تین دنوں میں جو کچھ ابنِ منصوُر پر بیت گیا تھا' اس سے سوال کرنے والا لرز گیا اور حالتِ سراسیمگی میں کہا "اگر یہی عشق ہے تو عشق کے کتنے دعوے دار اس راہ پر چلنے کا دعوا کر سکتے ہیں؛ شاید ایک بھی نہیں۔"

انسان کے گرد مختلف ناموں کی بہت ساری دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں اور یہ دیواریں خود انسان نے کھڑی کی ہیں' اپنے اقوال اور افعال کا پابند اور افکار کے اظہار میں مجبورِ محض اور شاید یہی وہ بوجھ ہے جس کو اٹھانے سے فرشتوں تک نے انکار کر دیا تھا' انسان نے اسے اُٹھا لیا اور اس کی سزا بھگت رہا ہے ورنہ ؎

مشکل ہے تو ایک ہماری' دار کا خطرہ رہتا ہے
ورنہ موجودات کا ذرّہ ذرّہ 'انا الحق' کہتا ہے!



بہاء الدین ولد

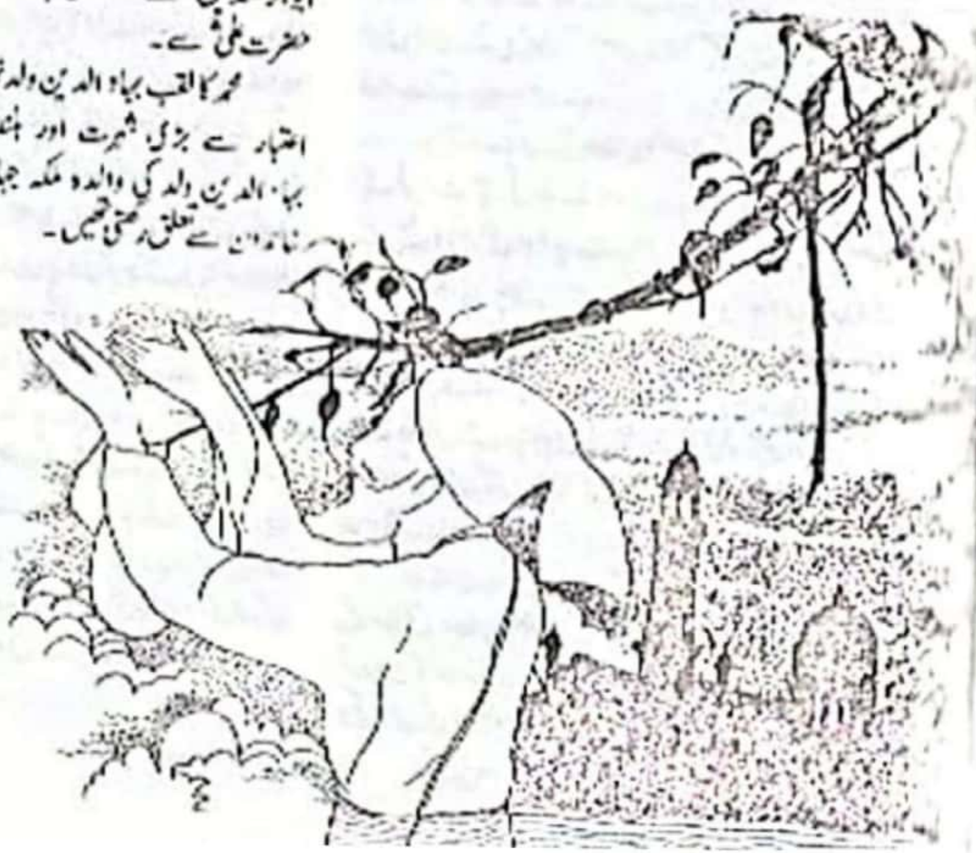
تسنیم بلگرامی

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کی ایک ایسی شخصیت، جس کے عظیم القدر بیٹے نے جب تصوف اور صوفیانہ شاعری میں بے مثل مثنوی کے حوالے سے ایک بلند مقام حاصل کرلیا... تو باپ کی شہرت رفتہ رفتہ ماند پڑ گئی۔
بہاء الدین ولد... خوارزم شاہی دور کی ایک انقلاب آفریں شخصیت... خوارزم شاہ جو بڑی بڑی حکومتوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اس کے درباری عالم طاقت کے نشے میں چُور کسی کی پروا نہیں کرتے تھے مگر بہاء الدین ولد کی ذہانت، علمیت اور دینی علوم پر غیر معمولی دسترس نے درباری عالموں کو حسد میں مبتلا کر دیا جبکہ بہاء الدین ولد اپنے کشف سے اپنے شہر کے مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرتے رہے۔ وہاں جو کچھ ظاہر ہونے والا تھا اسے بہاء الدین ولد نے عالم رویا میں بہت پہلے دیکھ لیا تھا مگر... حاسدین نے بادشاہ کو ان کے خلاف اتنا برگشتہ کیا کہ بادشاہ ان سے ملاقات کرنے پہنچ گیا مگر ان کے چاروں طرف شہریوں کا عقیدت مندانہ ہجوم دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھا۔ "اتنا زبردست ہجوم"... خوارزم شاہ نے یہ سوچ کر اپنے خزانے اور قلعے کی کنجیاں ان کے حوالے کرنا چاہیں کہ لوگوں کے دل تو بہاء الدین ولد کے قبضے میں ہیں اور خوارزم شاہ صرف خزانے اور قلعوں پر حکومت کر رہا ہے لیکن بہاء الدین ولد نے بادشاہ کو اس کے حال پر چھوڑ اور دوسرے شہر میں سکونت اختیار کر لی۔

ایک ایسی پہلو دار شخصیت کے علاوہ مرحوم کا سوانح جو بلاشبہ ... بڑی اہمیت کی

بلخ کو تاریخ میں بڑی اہمیت اور شہرت حاصل رہی ہے۔ پارسیوں کے عظیم بانی زرتشت کا تعلق بھی بلخ ہی سے تھا۔ ... سے گویا پارسی مذہب کی بنیاد پڑی۔ جہاں بعد میں بھی بہت سی نامی گرامی شخصیات پیدا ہوتی رہیں۔ بلخ کا تعلق خراسان سے تھا اور خراسان میں بڑے بڑے مشاہیر پیدا ہوتے رہے۔ یہاں 547 ہجری میں ایک غیر مقامی خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس کے مادری اور پدری سلسلے پر نظر ڈالی جائے تو 19 واسطوں سے، باپ کی جانب سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے سلسلہ مل جاتا ہے اور ماں کی طرف سے حضرت علیؓ سے۔

محمد کا لقب بہاء الدین ولد تھا، یہ لوگ دنیاوی اور علمی اعتبار سے بڑی شہرت اور بلند مقام رکھتے تھے۔ محمد بہاء الدین ولد کی والدہ ملکہ جہاں خوارزمی شاہوں کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔



547 ہجری میں پیدا ہونے والے محمد بہاء الدین ولد نے تعلیم حاصل کرنا شروع کی تو نوعمری ہی میں مروجہ علوم میں کامل و ماہر ہو گئے اور علم و فضل کی کیفیت یہ تھی کہ خراسان کی اطراف سے مشکل فتاوے انہی کے پاس آنے لگے۔ ان کی مجلس کا طریق اور انداز بادشاہوں جیسا ہوتا تھا، انہیں اپنی بے مثل مذہبی اور علمی کارکردگی کی وجہ سے سلطان العلما کا خطاب دیا گیا۔

ان کا معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک درس عام ہوتا، ظہر کے بعد اپنے خاص احباب کے حلقے میں حقائق و معارف بیان فرماتے، دوشنبے اور جمعے کو عام وعظ کہتے، ان کی ہیبت ہر جگہ نمایاں رہتی اور جو بھی درباری عالم انہیں دیکھتا متفکر ہو جاتا۔ بہاء الدین ولد جو اب سلطان العلما کہلاتے تھے، ان کے عقیدت مندوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور جن علما کو شاہی دربار میں قدر و منزلت حاصل تھی وہ سلطان العلما کی عوامی مقبولیت کو حسد کی نظروں سے دیکھتے مگر بے بس تھے۔

جس دن سلطان العلما عوام سے مخاطب ہوتے، بازار سنسان ہو جاتے اور ہر کسی کا رخ سلطان العلما کے جلسے کی طرف ہوتا۔ اگر بادشاہ کی سواری گزر رہی ہوتی تو لوگ اس کی طرف بھی متوجہ نہ ہوتے۔ درباری علما مولانا کے ان جلسوں کا ذکر حسد سے بادشاہ کے روبرو کرتے اور رعایا کی شکایت کرتے ہوئے کہتے۔ ''لوگوں کو اتنی تمیز اور اتنا احساس تو ہونا چاہیے کہ وہ بادشاہ وقت اور ایک عالم کے مقام اور مرتبے کے فرق کو سمجھیں۔ ایک عالم سے رعایا کو کیا ملے گا، خالی باتیں اور ان باتوں سے کسی غریب کی معیشت تو نہیں سدھر سکتی۔ عالم اگر کسی سے خوش ہو جائے تو وہ اس کو بخشش یا انعام میں کیا دے گا لیکن بادشاہ سلامت خوش ہو جائیں تو انسان کو فرش سے عرش تک پہنچا دیں گے۔''

بادشاہ کو بھی سلطان العلما سے عقیدت تھی، اس لیے وہ درباری علما کی حاسدانہ شکایتوں پر کوئی توجہ نہیں دیتا تھا اور علما کو منع کرتا تھا کہ بہاء الدین ولد یعنی سلطان العلما کو اپنا کام کرنے دیں۔ یہ لوگوں کو دین و دنیا اور آخرت کی جو تعلیم دیتے ہیں وہ ہر کوئی نہیں دے سکتا۔

بادشاہ کی سلطان العلما کی شان میں یہ مدح سرائی درباری عالموں کو بالکل پسند نہ آئی اور درباری علما کی نفرتوں میں اضافہ ہو گیا۔ بادشاہ نے علما کو منع کیا کہ وہ بہاء الدین ولد کی مخالفت سے باز آ جائیں۔ ''تم لوگ بھی اس پر بھی غور کیا کرو کہ بہاء الدین ولد کو لوگوں نے سلطان العلما کا خطاب یونہی نہیں دے دیا۔''

ایک درباری عالم نے بادشاہ کے اس فقرے سے فائدہ اٹھایا اور بادشاہ کی توجہ سلطان العلما کی طرف مبذول کرائی۔ ''حضور! بہاء الدین ولد، سلطان العلما کہلاتے ہیں، آپ غور فرمائیں کہ انہیں لفظ سلطان سے کتنی انسیت ہے۔ واقعی سلطان بننا ان کے بس کی بات تو ہے نہیں لیکن اس لفظ سلطان سے ان کی اندرونی خواہش کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ صبح شام ان کے در پر لوگوں کا اژدحام رہتا ہے اور لوگ ان سے جس احترام اور عزت سے پیش آتے ہیں اس سے سلطان العلما کے جذبۂ انانیت کو تسکین ملتی ہے۔ بادشاہ سلامت کو ان رموز پر نظر رکھنی چاہیے۔ یہ لوگ حکومت کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں اور خراسان تو یوں بھی فسادیوں کی جگہ ہے اور اکثر و بیشتر فتنے یہیں سے جنم لیتے رہتے ہیں۔''

بادشاہ نے ان تمام باتوں کا بظاہر کوئی اثر نہیں لیا مگر دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ بہاء الدین ولد امیر العلما بھی ہو سکتے تھے۔ امیر العلوم کا لقب اختیار کر سکتے تھے آخر لفظ سلطان انہیں کیوں پسند ہے...... یہ بات تو واقعی خطرے کی معلوم ہوتی ہے اور درباری علما بادشاہ کی توجہ جس خطرے کی طرف مبذول کرا رہے ہیں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

فی الحال بادشاہ نے موضوع کو ٹالنا چاہا، کہا ''میں بہاء الدین ولد اتنا طلب... سلطان العلما کو اپنے لیے خطرہ نہیں سمجھتا، تم لوگ اگر کوئی خوف یا خطرہ محسوس کرتے ہو تو تمہیں میرے لیے ایک کام کرنا ہوگا۔''

جو عالم اس معاملے میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا فی الفور اس نے پوچھا۔ ''حضور والا حکم دیں، بندہ آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''سلطان العلما کے عقیدت مندوں کی ایک فہرست تیار کی جائے اور ان کے ناموں کے ساتھ ان کے پیشے کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔ اس فہرست سے ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ سلطان العلما کے عقیدت مندوں میں فوجی کتنے ہیں، غریب دہقان اکثریت میں ہیں یا اقلیت میں، ہنرمند اور کاریگروں کی تعداد کیا ہے۔ اگر سلطان العلما کے ماننے والوں میں سپاہیوں کی کثرت ہوئی تو مجھے ان پر توجہ دینا ہوگی، میں نہیں چاہتا کہ میری حکومت میں دوہرا ریاستی نظام چل رہا ہو۔''

درباری عالم نے کہا۔ ''میں بادشاہ سلامت کی مرضی کے مطابق سلطان العلما کے عقیدت مندوں کی فہرست تیار کر دوں گا، ہو سکتا ہے اس فہرست میں سپاہیوں کی تعداد کم ہو مگر اس کمی کا حضور والا یہ مطلب ہرگز... نہ لیں کہ واقعی

درباریوں کی تعداد کم ہوگی، سپاہیوں سے سلطان العلما کے اصحابِ خفیہ بھی ہو سکتے تھے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "تو اپنا کام کر۔ یہ باتیں میں بھی سمجھتا ہوں۔"

بظاہر تو درباریوں نے یہی سمجھا کہ بادشاہ سلطان العلما کا عقیدت مند ہے اور ان کے مخالف اور حاسد درباری عالم کو آئندہ شکایتوں سے باز رکھنے کے لیے ایک دشوار کام اس کے سپرد کر دیا ہے تاکہ یہ درباری عالم اس میں الجھا رہے اور سلطان العلما کی جھوٹی شکایتیں نہ کرے۔

درباری عالم نے اپنی مدد کے لیے کچھ آدمی ساتھ رکھ لیے مگر اسے بعد میں یہ خیال بھی آیا کہ بادشاہ نے اس کے سپرد جو کام کیا ہے اس سے دربار کے دوسرے بہت سے لوگ بھی واقف ہو چکے ہیں اور ان درباریوں میں سلطان العلما کے عقیدت مند بھی ہوں گے لہٰذا یہ ساری خبریں سلطان العلما تک پہلے ہی سے پہنچ چکی ہوں گی اور سلطان العلما اب اپنے تو جی عقیدت مندوں کو منع کر دیں گے کہ وہ فی الحال سلطان العلما سے دور رہیں۔ اس طرح یہ درباری عالم ایسی کامیاب فہرست نہیں تیار کر سکے گا جس سے بادشاہ کو سلطان العلما کے خلاف بھڑکایا جائے اور اس طرح درباری عالم بادشاہ کی نظروں سے گر جائے گا۔

اپنے زوال کا خیال کر کے یہ درباری عالم پریشان ہو گیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا جسے واپس نہیں لایا جا سکتا تھا۔

وہ کچھ دن آوارہ و سرگرداں رہا۔ سلطان العلما کے وعظ سنتا رہا، لوگوں کی گنتیاں کرتا رہا۔ ان میں معروف چہروں کو حافظے میں محفوظ کرتا رہا اور ہفتہ دس دن کی تگ و دو کے بعد اسے اتنا بھی حاصل نہیں ہوا جسے وہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کر کے سرخرو ہو جاتا۔

بادشاہ نے ایک دن اس سے پوچھ لیا۔ "تیرے سپرد جو ذمے داری کی گئی تھی تو نے وہ کس حد تک پوری کر دی؟"

عالم نے اپنی کمزوری اور مجبوری بیان کی۔ "بادشاہ سلامت سے اس دن جو باتیں عام درباریوں کے سامنے ہوتی رہیں اس کا مجھے بعد میں احساس ہوا۔ یہ کام حضور والا اگر تخلیے میں میرے سپرد کرتے تو میں بہت جلد بادشاہ سلامت کی خدمت میں سرخرو ہو جاتا۔"

بادشاہ علاؤ الدین خوارزم شاہ تھا جس کی فتوحات اور دبدبہ شہروں شہروں، ملکوں ملکوں میں تھا۔ جس کی پیشانی کی شکن سے ہی انقلابات برپا ہو جاتے تھے۔ درباری علما بھی خوارزم شاہ سے بہت ڈرتے تھے اور بادشاہ سے باتیں کرتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ جب اس درباری عالم نے بادشاہ کی اس غلطی کی طرف توجہ دلائی کہ اگر خوارزم شاہ نے اس عالم کے ذمے جو فرض سونپا تھا وہ اگر عام درباریوں کی موجودگی میں نہ سونپا جاتا تو یہ عالم بادشاہ کی سونپی ہوئی ذمے داری کو بطریقِ احسن انجام دے سکتا تھا۔

خوارزم شاہ نے عالم کو انکھیوں سے دیکھا تو اس عالم کی جان نکل گئی اور ہکلاتے ہوئے عرض کیا۔ "بادشاہ سلامت بالکل فکر مند نہ ہوں، اگر درباریوں کو بھی مجھ سے متعلق یہ معلوم ہو چکا ہے کہ میں سلطان العلما کے ارادت مندوں کی کوئی فہرست تیار کر رہا ہوں اور ان درباریوں میں سے کسی نے سلطان العلما کو آگاہ کر دیا ہے تب بھی میں فکر مند نہیں ہوں، مجھے دشوار کام انجام دینے کا سلیقہ آتا ہے۔ بس اب حضور والا کو یہ کام آٹھ دس دن میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہوا ملے گا اور میری بادشاہ سے عاجزانہ درخواست ہے کہ مجھے کچھ اور وقت دیا جائے تاکہ میں یہ کام سلیقے اور ہوش مندی سے انجام دے لوں۔"

خوارزم شاہ نے اس عالم کی طولانی تمہید سے تنگ آ کر جواب دیا۔ "میں نے تو تجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ کام آٹھ دس دن کے اندر ہو جانا چاہیے۔ اب اگر تو مزید وقت چاہتا ہے تو میری طرف سے وہ تجھے مل گیا۔ جا اور یہ کام اطمینان اور ہوش مندی سے انجام دے۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ تو سلطان العلما کے عقیدت مندوں میں شامل ہو جا۔ اس طرح تیرا کام آسان ہو جائے گا۔"

اس عالم نے خوارزم شاہ کا شکریہ ادا کیا اور بادشاہ کی صحبت سے اٹھ کر سلطان العلما کے پاس جا پہنچا۔ یہ دوشنبہ یا جمعہ کا دن نہیں تھا اس لیے وہ آسانی سے سلطان العلما کے پاس نہیں پہنچ سکا اور سلطان العلما کے مریدوں نے اس عالم کو بتایا کہ وہ اپنا نام اور پتا اور ملاقات کی غرض لکھ کر کاغذ ان کے حوالے کر دے۔ سلطان العلما سے جواب حاصل کر کے وہ بتا دیں گے کہ اس کی ملاقات سلطان العلما سے کب اور کہاں ہو سکتی ہے۔

عالم نے کسی کاغذ پر کچھ لکھ کر دینے کے بجائے اپنا تعارف زبانی کروا دیا اور کہا۔ "میں ایک بادشاہ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا رہا ہوں اور اب سلطان العلما کی خدمت میں حاضری دے کر زیادہ فیض حاصل کرنے کی فکر میں ہوں۔ خوارزم شاہ کے دربار سے مجھے مالی فائدے حاصل ہوئے اور سلطان العلما کی خدمت میں رہ کے میں روحانی فیض حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

مرید کے دل پر بڑا اثر ہوا کہ وہ جس شخص کو ابھی تک

ایک عام سا عالم مجبور ہاتھ وہ تو بادشاہ کا حاشیہ نشین نکلا۔

مرید کے اطوار، انداز اور لہجے میں فرق آ گیا۔ اس نے کھڑے ہو کر پُرجوش طریقے سے مصافحہ کیا اور معافی مانگتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! آپ اپنا تعارف پہلے ہی کرو دیتے تو آپ سے اتنی طویل فضول گفتگو نہ ہوتی۔ آپ یہیں تشریف رکھیں میں اپنے پیرومرشد سے بات کر کے آتا ہوں۔ ہو سکتا ہے اسی وقت آپ کی ملاقات حضرت بہاء الدین ولد المعروف سلطان العلما سے ہو جائے۔''

درباری عالم نے اس مرید کی مرعوب ہو جانے والی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور کہا۔ ''تو اسی وقت اپنے پیرومرشد سے مل اور اسی وقت میری ملاقات کروا دے۔''

مرید اندر چلا گیا اور کافی دیر بعد منہ لٹکائے ہوئے واپس آیا اور نظریں جھکا کے عرض کیا۔ ''حضرت! میں نے تو پوری کوشش کی کہ اسی وقت آپ کی ملاقات کروا دی جائے مگر پیرومرشد کا کہنا ہے کہ آج ملاقات نہیں ہو سکتی، اب آپ جمعے کے دن محفلِ وعظ میں ان سے ملاقات کر سکتے ہیں۔''

اس عالم کو بے حد غصہ آیا اور کہا۔ ''میں تو پیرومرشد کی خدمت میں عاجزانہ قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا مگر پیرومرشد نے مجھے اندر نہ بلوا کر میری بے عزتی کی ہے۔ میں پیرومرشد کو بہت فائدے پہنچا سکتا ہوں۔ تو ایک بار پھر ان کے پاس جا اور میری طرف سے کہہ دے کہ مجھے ان کی خدمت میں خوارزم شاہ نے بھیجا ہے اور اب شاہ صاحب کو میرے توسط سے بہت فائدے پہنچیں گے۔''

مرید دوبارہ اندر جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا، کہنے لگا۔ ''جناب! آپ کے کہنے سے میں اندر دوبارہ چلا جاؤں گا مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پیرومرشد نے جو بات کہہ دی ہے وہ اس پر قائم رہیں گے اور اب آپ کی ملاقات جمعے کی شام یا دوشنبے کی شب کو ہو سکتی ہے۔''

درباری عالم نے پوچھا۔ ''اب اگر میں دوبارہ دوشنبے یا جمعے کو پیرومرشد سے ملا تو ملنے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، میں تو اسی وقت پیرومرشد کی مریدی میں داخل ہونا چاہتا تھا اور اس کے بعد خوارزم شاہ کا ایک خاص پیغام بھی پیرومرشد کے گوش گزار کر دیتا۔''

مرید نے بادلِ ناخواستہ دوبارہ اندر جاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے کہنے سے اندر جا رہا ہوں مگر پیرومرشد کی طبیعت سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے تو نے فوری ملاقات پر زور دیا پر میں یہ کہتا ہوں کہ تیری بات نہیں بنے گی اور بادشاہ سلامت کو پیرومرشد سے زیادہ تجھ سے شکایتیں پیدا ہو جائیں گی۔''

اس بار یہ مرید جلد ہی واپس آ گیا اور ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ''آیئے ملاقات کر لیں۔''

درباری عالم اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔

سلطان العلما کی خلوت میں اس وقت بھی دو عام طالب علموں کی طرح مؤدب بیٹھے ہوئے تھے۔

سلطان العلما نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔ ''تیری آمد کا شکریہ مگر جب تجھے یہ بتایا گیا کہ میری تجھ سے ملاقات دوشنبے یا جمعے کو محفلِ وعظ میں ہو سکتی ہے، تو تو آج ہی ملاقات پر کیوں زور دیتا ہے؟''

درباری عالم نے جواب دیا۔ ''پیرومرشد! آپ تو جانتے ہیں کہ خوارزم شاہ کی خدمت میں رہنے والوں کو فرصت بہت کم ملتی ہے اور میں جمعے یا دوشنبے کو حاضری نہیں دے سکتا۔''

سلطان العلما نے پوچھا۔ ''اب غایتِ ملاقات بھی بتا دے اور یہ بھی کہ خوارزم شاہ کا میرے لیے خاص پیغام کیا ہے؟''

درباری عالم نے جواب دیا۔ ''غایتِ ملاقات تو یہ ہے کہ میں آپ کی سیرت اور سوانح لکھنا چاہتا ہوں اس لیے مجھے آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا جائے اور یہ کہ میں جو کچھ معلومات حاصل کرنا چاہوں تو اس میں مجھے سہولتیں ملنی چاہئیں۔''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''تو میری سیرت اور سوانح لکھ کے کیا فائدہ اٹھائے گا۔ کیونکہ میری سیرت اور سوانح تو کھلی کتاب کی طرح ہے اور تو خوارزم شاہ کے دربار سے وابستہ عالم ہے، تیرے ہی بقول تجھے تو خوارزم شاہ کے دربار سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اس لیے تو میری سوانح پر دل جمعی سے کام کس طرح کرے گا؟''

درباری عالم نے جواب دیا۔ ''جب میں آپ کی سیرت اور سوانح پر کام شروع کروں گا تو مجھے سلطان سے اس کی اجازت بھی لینا پڑے گی اور خوارزم شاہ تو آپ سے اتنی عقیدت رکھتا ہے کہ وہ مجھے اس کارِ خیر کے لیے وقت اور اجازت دے دے گا۔''

سلطان العلما نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا اور اس کے بعد اپنے دونوں طالب علموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تو ان دونوں سے ملاقاتیں کرتا رہے گا اور انہی سے میرے متعلق معلومات بھی حاصل کر لیا کرے گا۔''

درباری عالم نے اس میں اپنی بے عزتی محسوس کی اور کہا۔ ''حضرت اب آپ مجھے اتنا کمتر بھی نہ سمجھیں کہ میں ان دونوں طالب علموں سے آپ کی سیرت اور سوانح کے لیے

دا ادا کروں گا۔ حضرت میں خوارزم شاہ کے دربار سے تعلق رکھنے والا انتہائی لائق و فائق عالم ہوں اور مجھے آپ سے براہ راست تعلق قائم رکھنے کی اجازت ملنی چاہیے۔"

سلطان العلما نے چہرے ہوئے موضوع سے گریز اختیار کیا اور پوچھا۔ "مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ تو میرے پاس خوارزم شاہ کا کوئی پیغام لایا ہے۔"

درباری عالم نے جواب دیا۔ "ہاں میں ایک پیغام بھی لایا ہوں۔ خوارزم شاہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کے ارادت مندوں کی ایک فہرست تیار کروں کیونکہ خوارزم شاہ کو کسی نے یہ بتایا ہے کہ آپ کے مریدوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آپ چاہیں تو ایک فوج تیار کر سکتے ہیں۔"

سلطان العلما نے پوچھا۔ "بس یا کچھ اور۔ اس شاہی فرمان کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں اس لیے کہ جب تو میرے سوانح اور سیرت پر کام کرے گا تو اسی سلسلے میں میرے مریدوں کا ذکر بھی ہوگا۔ میں حیران ہوں کہ آخر خوارزم شاہ میری فوج جیسی مریدوں کی تعداد سے پریشان کیوں ہے؟"

درباری عالم نے جواب دیا۔ "نہیں، خوارزم شاہ آپ کے مریدوں سے ذرا بھی پریشان نہیں۔"

سلطان العلما نے کہا۔ "جب تو نے میرے مریدوں کی تعداد کے ساتھ سلطانی فوج کا ذکر کیا تو میں فکرمند ہو گیا کہ اگر یہ خیالات خوارزم شاہ کے ہیں تو مجھے احتیاط سے کام کرنا چاہیے۔"

دونوں میں کچھ دیر اسی قسم کی مکالمت ہوتی رہی۔ آخرکار درباری عالم نے بتایا۔ "حضرت! آپ بات سمجھنے کی کوشش کریں، خوارزم شاہ آپ کا مرید ہونا چاہتا ہے۔"

سلطان العلما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیسی عجیب بات ہے کہ خوارزم شاہ میرا مرید ہونا چاہتا ہے جبکہ اسے اپنے امورِ سلطنت سے وقت ہی نہیں ملتا۔"

درباری عالم سلطان العلما کی اس ذہانت اور ہوشیاری پر حیران تھا۔

آخرکار سلطان العلما نے کہا۔ "اس وقت تو، تو چلا جا اور دو تین یا چھے کو مجھ سے دوبارہ مل۔ اور میری ذات سے متعلق جتنی معلومات تجھے درکار ہوں گی وہ ملتی رہیں گی۔ خوارزم شاہ کی خدمت میں میرا اسلام کہنا اور میری طرف سے پوچھنا کہ کیا بادشاہ کو میری صحبت میں آنے کا وقت مل جائے گا؟"

درباری عالم نے جواب دیا۔ "حضرت ابھی بادشاہ سے آپ کا سوال نہیں کر سکتا، وہاں تو دم مارنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔"

سلطان العلما نے اپنے دونوں طالب علموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تیری باتوں سے انہیں نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس لیے اب تو میرے دونوں بتائے ہوئے دنوں میں سے کسی دن ملاقات کرے گا اور بقیہ باتیں وہیں طے پا جائیں گی۔"

درباری عالم ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تھا مگر اب اسے یہ امید ضرور ہوگئی تھی کہ آئندہ ملاقاتوں میں وہ اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے لائق ہو جائے گا۔

یہ درباری عالم سلطان العلما کے دونوں ہاتھوں کو عقیدت مندی سے بوسہ دینے لگا تو سلطان العلما نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا۔ "مجھے اپنی اس عقیدت مندی سے شرمندہ نہ کر، میں سیدھا سادا انسان ہوں اور خدا نے بندگانِ خدا کے بارے میں مجھے جو ذمے داریاں سونپی ہیں مجھے انہیں انجام دینے دے۔"

درباری عالم پیر و مرشد کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا، اس لیے وہ شیخ کو ملاقات کرنے کا وعدہ کر کے باہر آ گیا۔ باہر جس پہرے دار نے اس درباری عالم کا پیر و مرشد سے رابطہ کروایا تھا اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "پیر و مرشد نے تجھ کو بہت وقت دے دیا تیری بات بن گئی یا اب بھی کچھ باقی ہے؟"

درباری عالم نے جواب دیا۔ "بات تو ابھی نہیں بنی مگر دوسری ملاقات میں بات ضرور بن جائے گی۔"

اس مرید نے پوچھا۔ "مجھے اگر اعتماد میں لیا جائے تو میں تیری بہت زیادہ مدد کر سکتا ہوں مگر اسی صورت میں جب مجھے بھی بادشاہ کو قریب سے دیکھنے کا تو کوئی موقع فراہم کر دے گا۔"

درباری عالم نے بے پروائی سے کہا۔ "تیرا یہ کام بھی ہو جائے گا اور تو میرا ایک کام وقتاً فوقتاً کرتا رہے گا۔ بس یہ سمجھ لے کہ اگر مجھے تجھ سے فائدہ پہنچے اور تو میرے لیے کام کرتا رہا تو میں بھی تیرے بہت کام آؤں گا۔"

مرید نے جو یہ دیکھا کہ اتفاق سے اسے خوارزم شاہ کے ایک درباری عالم سے تعارف حاصل ہو گیا ہے اور وہ اس کے ذریعے بڑی فائدے بھی حاصل کر سکتا ہے تو اس نے درباری عالم سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کا ہر کام بخوشی کرے گا مگر اس کے صلے میں یہ درباری عالم بھی اسے بادشاہ کے دربار تک پہنچا دے گا۔

دونوں میں ایک دوسرے کے کام آنے اور ایک

دوسرے کے لیے کام کرنے کا زبانی معاہدہ ہوگیا۔ اب درباری عالم کو یقین ہوگیا تھا کہ اگر وہ اسی طرح ہوشیاری اور عقل مندی سے کام کرتا رہا تو وہ بہت جلد سلطان العلما کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائے گا اور سلطان العلما کا خطاب بھی ان سے چھن جائے گا۔

خوارزم شاہ کا ہرگز یہ خیال نہیں تھا کہ وہ سلطان العلما کو درباری عالم کے کہنے سے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ درباری عالم نے اپنے طور پر خوارزم شاہ کے پوچھے بغیر ہی آگاہ کر دیا کہ وہ سلطان العلما کے سلسلے میں جو کام کر رہا ہے اس میں اسے شاندار کامیابی حاصل ہو جائے گی اس لیے اب خوارزم شاہ سے بھی سلطان العلما کے بعض مریدوں کو دربار میں آنے جانے کی اجازت ملنی چاہیے۔

لیکن خوارزم شاہ کے وہ جذبات جنہیں سلطان العلما کے ذکر سے بھڑکا یا گیا تھا، سرد پڑ چکے تھے اور خوارزم شاہ نے پوچھا۔ ''تو جن لوگوں کے لیے دربار میں آنے جانے کی اجازت مانگ رہا ہے ان کا تعلق زندگی کے کن شعبوں سے ہے۔ اگر وہ لوگ شوقیہ میرے دربار میں حاضریاں دینا چاہتے ہیں تو میں انہیں یہ اجازت نہیں دوں گا۔''

☆☆☆

درباری عالم نے اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ وعدے کے مطابق دوسرے کو شاہ صاحب کی مجلس وعظ میں پہنچ گیا اور وہاں انسانی ہجوم کے سمندر کو ٹھاٹھیں مارتے دیکھا تو اس کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے۔

یہ شخص ہجوم کا جائزہ لیتا ہوا سلطان العلما کے پاس پہنچا اور عاجزانہ درخواست کی۔ ''اب تو مجھے آپ سے ملتے جلتے رہنے کی عام اجازت ہونی چاہیے۔ میں نے خوارزم شاہ سے بھی اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کر دیا تھا اور خوارزم شاہ میری اس ملاقات سے بہت خوش ہوا۔ اب مجھے بھی آپ اپنے حلقہ ارادت میں داخل کر لیں تاکہ میں آپ کی سیرت اور سوانح لکھنے کا کام شروع کر دوں۔''

بہاؤ الدین ولد نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے، میں تجھے ہر روز ایک گھنٹا دیا کروں گا تو میری ذات سے متعلق جو چاہے پوچھتا رہے۔ میں ان کے جوابات دیتا رہوں گا۔''

اس کے بعد سلطان العلما نے اپنے ایک مرید خاص، بلند پایہ بزرگ سید برہان الدین محقق ترمذی کو ہدایت کی کہ وہ خوارزم شاہ کے عالم کو سیرت و سوانح لکھوانے میں مدد دیں اور دونوں سے کہا۔ ''جہاں میری ضرورت ہو مجھ سے پوچھ لیا جائے۔''

درباری عالم کو سید برہان الدین محقق ترمذی سے خطرہ محسوس ہوا کہ اس شخص سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا جس کے لیے وہ اتنی محنت کر رہا ہے لیکن سلطان العلما کے اس مرید سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا جو خوارزم شاہ کے دربار تک رسائی حاصل کرنے کا خواہش مند ہے۔

یہ شخص سیرت اور سوانح تو کیا لکھتا بس سلطان العلما کے ارادت مندوں کی چھان بین میں لگا رہا۔

سید برہان الدین ترمذی نے بھی یہی محسوس کیا کہ درباری عالم کسی اور ہی جستجو میں ہے اور اس مجلس میں آنے کا وہ مقصد نہیں ہے جسے یہ درباری عالم ظاہر کر رہا ہے۔ محقق ترمذی نے یہ بھی دیکھا کہ یہ سیرت و سوانح لکھنے والا عالم سلطان العلما کے ایک معمولی مرید سے زیادہ باتیں کرتا ہے اور یہ بھی محسوس کیا کہ اس شخص کی نگاہیں سلطان العلما سے ملنے جلنے والوں پر خاص طور پر مرکوز رہتی ہیں۔

کچھ ہی دنوں بعد محقق ترمذی نے سلطان العلما سے درباری عالم کی عدم توجہی کی شکایت کی اور کہا۔ ''مجھے تو یہ شخص مشتبہ لگتا ہے اور بظاہر یہ جس مقصد سے یہاں آ رہا ہے وہ اس کا حقیقی مقصد نہیں ہے۔''

سلطان العلما نے بھی محقق ترمذی سے اتفاق کیا اور کہا۔ ''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ یہ ہمارے پاس کس مقصد سے آتا ہے۔ اگر اس کی نیت میں کھوٹ ہے تو بالآخر اسے شرمندگی اٹھانا پڑے گی کیونکہ میں بھی کے لیے کھلی کتاب کے مانند ہوں جو اس کتاب کی عبارت میں ہے اس میں کسی ابہام کا پایا جانا ممکن نہیں۔''

یہ درباری عالم مہینوں آتا جاتا رہا مگر اسے سلطان العلما کے مریدوں میں کوئی فوجی نظر نہیں آیا حالانکہ فوجی آتے ضرور تھے مگر وہ سلطان العلما کے مریدوں کی فہرست میں نہیں تھے۔

اس عالم نے سلطان العلما کے خدمت گار مرید سے پوچھا۔ ''تو نے یہاں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزار دیا اس لیے تجھے یہاں کی اندر کی باتیں بھی معلوم ہوں گی۔''

مرید نے جواب دیا۔ ''بے شک میں تو حضرت پیر و مرشد کی خلوت اور جلوت کا خدمت گار ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں اپنے پیر و مرشد کی بہت سی ایسی باتیں بھی جانتا ہوں جن کا خاص لوگوں کو بھی پتا نہیں۔''

درباری عالم نے کہا۔ ''تب پھر تو مجھے یہ بتا کہ تیرے پیر و مرشد کی کوئی ایسی خفیہ فہرست بھی ہے جس میں ان مریدوں کا ذکر ہو جن کا تعلق خوارزم شاہ کے دربار اور فوج

سے ہو؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''ہمارے پیرومرشد خوارزم شاہ کے درباریوں اور فوجیوں سے روابط اس لیے نہیں رکھتے کہ انہیں ان لوگوں سے ایک خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ پیرومرشد کی تعلیمات پر عمل نہیں کرسکیں گے اور ان کی وجہ سے خوارزم شاہ کو بدگمانی ہوسکتی ہے۔''

درباری عالم نے اپنی ناامیدی کے اثرات چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیے اور کہا۔ ''میں نہیں مان سکتا کہ اپنے وقت کی اس بے مثال شخصیت سے خوارزم شاہ کے درباری اور فوجی فیض نہ اٹھاتے ہوں۔''

مرید نے جواب دیا۔ ''میں اپنے پیرومرشد کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں تجھے ہمارے پیرومرشد کی سیرت اور سوانح لکھنا ہے تو اسے آزادی سے لکھتا رہ اور فضول قسم کی جستجو سے باز رہ۔''

درباری عالم نے کہا۔ ''تیری بڑی مہربانی ہوگی کہ تو پیرومرشد کے ان چند مریدوں کے نام مجھے بتادے جن کا تعلق اپنے بادشاہ کے دربار یا فوج سے ہو۔''

مرید کو غصہ آیا کہ یہ شخص اپنی ہی کہے جارہا ہے اور اس کی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔

سلطان العلما کے اس مرید نے بے رخی اختیار کی اور کہا۔ ''تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو مجھے خوارزم شاہ کے دربار میں لے جائے گا مگر تو وعدہ کرکے بھول گیا اور مجھ سے اپنا کام مسلسل لے رہا ہے۔''

درباری عالم نے اپنی وقتی مجبوری بیان کی۔ ''دوست! تجھے شاہی دربار کا اندازہ نہیں ہے وہاں لوگ جس طرح پہنچتے ہیں یا کسی کو وہاں جس طرح پہنچایا جاتا ہے وہ عمل اور شرائط بہت دشوار ہوتی ہیں۔ میں نے تیرا تذکرہ خوارزم شاہ سے کیا تھا۔ وہ سلطان العلما کے کسی محبت یافتہ کو اپنے دربار میں نہیں آنے دے گا۔ خوارزم شاہ کو لوگوں نے سلطان العلما کی طرف سے برگشتہ کردیا ہے لیکن میں موقعے کی تلاش میں ہوں اور میں تجھے دربار تک پہنچا کر دم لوں گا۔''

درباری عالم کو نہیں معلوم تھا کہ اس مرید کی نگرانی ہورہی ہے محقق ترمذی کو اس مرید پر کچھ عرصے سے یہ شبہ تھا کہ اس کا درباری عالم سے ربط وضبط اور غیر معمولی تعلق کوئی راز رکھتا ہے۔

محقق ترمذی کو دونوں کے مکالمات کا علم ہوگیا اور اب جو اس درباری عالم نے محقق ترمذی سے سلطان العلما کے بارے میں کچھ سوالات کیے تو محقق ترمذی نے کہا۔ ''تجھے تو اس سے زیادہ معلومات پیرومرشد کے خدمت گار سے مل رہی ہیں پھر تو اپنا سارا وقت اس کو کیوں نہیں دے دیتا۔''

درباری عالم نے کہا۔ ''مجھے عمومی معلومات تو اس سے حاصل ہورہی ہیں مگر خصوصی واقفیت کے لیے وہ ذریعہ بالکل مناسب نہیں ہے اور اے محقق ترمذی، وہ خاص معلومات آپ ہی سے حاصل ہوسکتی ہیں۔''

محقق ترمذی نے پوچھا۔ ''آج تو مجھے ایک بات بتا دے تاکہ میں تیرا مسئلہ حل کردوں اور تو بہت زیادہ محنت ومشقت سے بچ جائے۔''

درباری عالم بہت حیران اور ششدر رہ گیا کہ محقق ترمذی نے اچانک یہ کس قسم کی باتیں شروع کردیں۔ ''حضرت! میں آپ کی باتوں کا مفہوم نہیں پاسکا آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

محقق ترمذی نے جواب دیا۔ ''دیکھو بھائی! تو جہاں سے تعلق رکھتا ہے وہ دنیا داروں کی خاص جگہ ہے۔ وہاں خدمتوں کا معاوضہ بلکہ انعام واکرام بھی ملتا ہے اور وہاں کے لوگوں کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ جس کام میں انہیں اپنا فائدہ نظر نہیں آتا وہ نہیں کرتے جبکہ سلطان العلما کے ماحول میں دنیاداری نہیں ملے گی یہاں لوگ بے لوث خدمات انجام دیتے ہیں کوئی کسی سے اپنی خدمت کا صلہ نہیں چاہتا تو خود بھی ایک عرصے سے یہ دیکھ رہا ہے کہ سلطان العلما ہفتے میں دو دن شہر بھر سے مخاطب ہوتے ہیں، انہیں دین اور آخرت کی باتیں بتائی جاتی ہیں اور ہمارے پیرومرشد اپنے اس بے لوث کام کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لیتے۔''

محقق ترمذی بولتے بولتے خاموش ہوگئے اور درباری عالم سوچ میں پڑ گیا کہ محقق ترمذی کی ان باتوں کا مطلب کیا ہے اور یہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ بہرحال اسے یہ احساس ضرور ہوا کہ وہ یہاں جس مقصد سے آیا تھا، اس میں اسے بری طرح ناکامی ہوچکی ہے۔

درباری عالم نے کہا۔ ''حضرت محقق ترمذی! میں بے شک خوارزم شاہ کے دربار سے تعلق رکھتا ہوں اور وہاں بھی مادی فائدے حاصل ہوتے ہیں مگر ان فائدوں کے علاوہ نقصانات بھی اٹھانا پڑتے ہیں اور لوگ قتل بھی کردیے جاتے ہیں، قید خانوں میں زندگیاں گزر جاتی ہیں۔ میں تو یہاں نہایت خلوص اور عقیدت سے آیا تھا، میں سلطان العلما کی سیرت اور سوانح لکھ کر شہرت دوام حاصل کرنا چاہتا ہوں، ایک بہت بڑے آدمی کی صحبت میں رہ کر اور اس سے متعلق کام کرکے مجھے ایسی شہرت مل جائے گی جو بادشاہ کے دربار

میں رہنے سے نہیں مل سکتی۔"

محقق ترمذی نے جواب دیا۔ "تیری ساری باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں اگر تو واقعی سلطان العلما کے دربار سے وابستہ رہ کے شہرت دوام حاصل کرنے کا خواہش مند ہے تو تجھے خوارزم شاہ کے دربار سے تعلق منقطع کر لینا چاہیے۔ یہ ذرا سی بات تیری سمجھ میں آ جانا چاہیے کہ تو بیک وقت دو کشتیوں میں نہیں رہ سکتا یعنی بیک وقت دو گھوڑوں کی سواری نہیں کر سکتا۔"

درباری عالم بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا، پوچھا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ بادشاہوں کے دربار سے جو لوگ وابستہ ہوتے ہیں وہ اللہ والوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کے لائق نہیں ہوتے اور انہیں اللہ والوں کی محفل میں بیٹھ کر اچھی باتیں سننے کا حق نہیں ہوتا جبکہ میں یہ جانتا ہوں کہ بادشاہوں کے دربار میں اور بادشاہ کی صحبت میں اچھے آدمیوں کا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ اچھے لوگ بادشاہوں کو برائیوں سے روکتے ہیں اور نیک عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ میں یہاں سے جو کچھ حاصل کروں گا وہ بادشاہ کے کام میں آئے گا۔"

محقق ترمذی نے یہ ساری باتیں سلطان العلما کو بتا دیں اور کہا۔ "اس شخص کی نیت ٹھیک نہیں ہے اسی لیے مجھے آپ حکم دیں کہ میں اس کے بارے میں اپنے طور پر معلومات حاصل کروں۔ پیر و مرشد، مجھے تو یہ شخص فتنہ لگتا ہے۔"

سلطان العلما نے محقق ترمذی کو منع کیا کہ اس شخص کو آنے جانے دیا جائے اور اگر اس کی نیت میں کھوٹ بھی ہے تو مجھے اس سے ڈر نہیں لگتا۔

کئی ماہ بعد خوارزم شاہ کو یاد آیا کہ اس کا درباری عالم سلطان العلما کے سلسلے میں کوئی کام کر رہا تھا مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ عالم اپنے کام میں کس حد تک کامیاب ہوا جبکہ سلطان العلما کے دوسرے کئی حاسد خوارزم شاہ کو مسلسل ورغلا رہے تھے اور خوارزم شاہ بھی کچھ کچھ سلطان العلما کے خلاف ہوتا جا رہا تھا۔

یہ درباری عالم بری طرح تھک چکا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ وہ شاہ صاحب کی صحبت میں زیادہ وقت دے کر اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اسے مہینوں کی کوششوں کے باوجود یہ پتا لگانے میں ناکامی ہوئی کہ سلطان العلما کی صحبت میں درباریوں اور فوجیوں کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے اور سلطان العلما یا محقق ترمذی کو ان لوگوں کی تعداد کا کوئی علم ہے۔ بس وہ محقق ترمذی سے اتنا ہی جان سکا کہ درباری اور فوجی یہاں آتے جاتے تو ہیں مگر ان کی یہاں نہ تو کوئی فہرست ہے اور نہ وہ مریدوں میں شامل کیے گئے ہیں۔

اسی دوران بہاء الدین ولد کے ہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی۔ یہ 604 ہجری کی چھ ربیع الاول کا واقعہ ہے۔ بچے کا نام جلال الدین رکھا گیا۔

بادشاہ کو بہاء الدین ولد کی طرف سے بدگمان کیا جا رہا تھا اور شہر میں علمائے وقت کا یہ حال تھا کہ وہ یونانی فلسفے کو بڑی اہمیت دے رہے تھے اور یونانی فلسفے کی کسوٹی پر اسلامی عقائد اور خدائی قوانین کو جانچا اور پرکھا جا رہا تھا اور لوگوں کا یہ حال تھا کہ ان کے ایمان اور عقیدے میں فتور پیدا ہو چکا تھا۔ ان کے دل و دماغ پر یونانی فلسفے نے غلبہ پا لیا تھا۔ اس لیے بہت سے دنیادار عالم بہاء الدین ولد کی خالص اسلامی تقاریر اور وعظ سن کر ناک بھوں چڑھاتے اور ان سے حد درجہ حسد بلکہ درپردہ دشمنی کرنے لگے تھے۔

خوارزم شاہ نے اپنے عالموں سے جب مسلسل بہاء الدین ولد کی شکایتیں سنیں اور وہ یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ بہاء الدین ولد کی مخالفت کرنے والے ان کے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکے تو اسے سخت کوفت ہوتی تھی مگر یہ بات اسے واقعی پریشان کر رہی تھی کہ بہاء الدین ولد سے لوگوں کی عقیدت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وعظ کے دو دنوں میں پورا شہر ان کے سامنے کھنچ جاتا تھا اور یہ باتیں خوارزم شاہ کا ہر آدمی شاہ کے گوش گزار کر رہا تھا۔ خوارزم شاہ ان خبروں سے حسد کا شکار ضرور ہوا مگر وہ اب بھی ان کا احترام کرتا تھا اور عقیدت مند تھا۔

یہ بالکل اتفاقی امر تھا کہ خوارزم شاہ کے درباری عالموں میں بہاء الدین ولد کا جو سب سے بڑا مخالف عالم تھا اس کا نام بھی بہاء الدین تھا اور یہ شخص ایران کے مردم خیز رے نامی خطے سے تعلق رکھتا تھا اور اسی نسبت سے یہ عالم بہاء الدین رازی کہلاتا تھا۔

بہاء الدین ولد نے کئی سال اسی کشمکش میں گزار دیے۔ چونکہ خوارزم شاہ کی بدگمانی کا ذکر لوگ ان سے کرتے تھے مگر بہاء الدین ولد ایک عرصے تک اس کشمکش کو برداشت کرتے رہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے دل و دماغ میں بادشاہ کے خلاف کچھ بھی نہیں ہے تو بادشاہ کے دل و دماغ میں بھی ان کے خلاف کچھ نہیں ہونا چاہیے۔

درباری عالموں نے ان کے ایک ایسے وعظ کو بطور سند جس میں بہاء الدین ولد نے حکمائے یونان کی بڑی مذمت کی تھی۔ انہوں نے اپنے وعظ میں یونانی فلسفے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا۔ "کچھ لوگوں نے کتب آسمانی کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور فلسفیوں کے ازکار رفتہ اقوال کو اپنا مسلک بنا لیا ہے۔ یہ لوگ نجات کی امید کیونکر کر سکتے ہیں۔"

بہاؤ الدین ولد کا یہ وعظ درباری علما کے علاوہ نیر درباری علما کو بھی پسند نہیں آیا اور انہوں نے بھی آپس میں مشورہ کیا کہ بہاؤ الدین ولد فلسفے کے دشمن ہیں اور انہیں ایسی تقریریں کرنے سے روک دینا چاہیے لیکن یہ درباری اور غیر درباری علما شہری عوام اور خواص کو دیکھتے تو ان کے حوصلے پست ہو جاتے، کیونکہ سلطان العلما زبردست عوامی قوت رکھتے تھے۔

بالکل اتفاقی بات تھی کہ سلطان العلما نے اپنے مخصوص عقیدت مندوں کی نشست میں اعلان کیا۔ ''کوگوا یہ جگہ ہمارے لیے محفوظ نہیں ہے اس لیے نقل مکانی ضروری ہو گئی ہے۔''

اس مخصوص نشست کے شرکا کو خوارزم شاہ کی طرف سے خوف محسوس ہوا کہ شاید ان کے پیرومرشد کو کوئی ایسی خفیہ خبر مل گئی ہے جس سے خوارزم شاہ کے کسی خطرناک اقدام کا قبل از وقت پتا چل گیا۔

محقق ترمذی نے پوچھا۔ ''حضرت! کیا آپ بھی نقل مکانی کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''بے شک مجھے تو یہ سارے علاقے خاک و خون میں لتھڑے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ میں نے ہر طرف آگ ہی آگ دیکھی ہے، شہر جل رہے ہیں اور ہر طرف ایک بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ لوگ پناہ گاہ تلاش کر رہے ہیں لیکن زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے انہیں کوئی پناہ گاہ نہیں مل رہی ہے۔''

سلطان العلما کی یہ دل کو ہلا دینے والی باتیں سننے والوں کے لیے ناقابل فہم تھیں کیونکہ اگر خوارزم شاہ سلطان العلما اور ان کے ارادت مندوں کے خلاف کوئی خوفناک قدم اٹھانے والا ہے تو کیا خوارزم شاہ پوری پوری آبادیوں کو تہ تیغ کر دے گا۔ شہروں کو آگ لگا دے گا اور جو لوگ یہاں سے بچ کر وقت سے پہلے نہیں چلے جائیں گے بس وہی محفوظ رہ جائیں گے۔

سلطان العلما سے استفسار کیا گیا کہ وہ اشاروں میں بات نہ کریں اور جن باتوں کا انہیں قبل از وقت علم ہو گیا ہے اس سے شہریوں کو بھی آگاہ کر دیں۔

سلطان العلما نے کہا۔ ''ابھی مجھے شہر چھوڑ دینے کا حکم نہیں ملا ہے لیکن یہ طے شدہ امر ہے کہ ہمیں یہ شہر عارضی طور پر چھوڑنا ہو گا۔''

مخصوص نشست کے شرکا نے پوچھا۔ ''ہمارے لیے آپ کا کیا حکم ہے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''تمہیں بھی یہ شہر چھوڑنا پڑے گا۔''

یہ لوگ یہ نہیں معلوم کر سکے کہ سلطان العلما شہر کو چھوڑ دینے کی باتیں کیوں کر رہے ہیں اور یہ بات تو زیادہ تشویشناک تھی کہ وہ دوسروں کو بھی شہر چھوڑ دینے کی تلقین کر رہے ہیں۔

محقق ترمذی نے پوچھا۔ ''تو حضرت ہمیں کب تک اس شہر کو چھوڑنا ہو گا؟''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''میں نے آنے والے برے حالات کی خبر تو کر دی ہے مگر قطعی یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ ہمیں یہ شہر کب چھوڑنا ہو گا اور کہاں پناہ لینا ہو گی؟''

اس مخصوص نشست میں جو خطرناک گفتگو ہوئی تھی اس نے سامعین کے دل و دماغ میں ہلچل پیدا کر دی تھی مگر وہ سلطان العلما کو مجبور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ساری تفصیل ایک ہی وقت میں بتا دیں۔ سلطان العلما کا یہ کہنا تھا کہ انہیں نقل مکانی کا ابھی حکم نہیں دیا گیا ہے اور جب یہ حکم ملے گا تو وہ اپنے خاص آدمیوں کو بتا دیں گے کہ اب اس شہر کو چھوڑ کر فلاں شہر میں پناہ لینی چاہیے۔ اور وہ اس حکم کے منتظر تھے۔

اب آپ اپنی تقریروں اور مواعظ میں بھی آنے والے خطرات کا ذکر کرنے لگے تھے، آپ نے لوگوں کو بتایا۔ ''اللہ کی رسی مضبوطی سے پکڑو ورنہ تمہیں کسی دوسری قوم کے ذریعے عبرتناک سزا دی جائے گی۔''

اب پورے شہر میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ سلطان العلما شہریوں کو نقل مکانی کی تلقین کرتے ہیں اور خود بھی اپنے احباب اور عقیدت مندوں کے ساتھ نقل مکانی کا ارادہ رکھتے ہیں۔

شہر بھر میں یہ خبر گشت کر گئی کہ شہر جلا دیے جائیں گے اور لاشوں کے ڈھیر لگے ہوں گے لیکن ایسا کیونکر ہو گا یہ بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ پورا شہر کس طرح ہلاک کیا جا سکتا ہے اور شہروں کو کیوں اور کس طرح جلا کر خاکستر کر دیا جائے گا۔

اب محقق ترمذی سے اکثر نومولود جلال الدین کے بارے میں سلطان العلما کے استفسار پر کچھ نہ کچھ بتاتے رہتے تھے۔ محقق ترمذی کا جلال الدین کے بارے میں یہ قول تھا کہ اس نے اتنا ذہین، عقل مند اور تیز..... تین چار سالہ بچہ نہیں دیکھا۔

سلطان العلما کو اپنے بیٹے کی تعریفیں سن کر بڑی خوشی ہوئی اور پانچ سال کی عمر میں اس بچے کو اپنی تربیت میں لے لیا۔

سلطان العلما جمعہ کی شب وعظ فرما رہے تھے اور خوارزم شاہ کو اچانک خیال آیا کہ اسے ان کا وعظ سننا چاہیے

اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کتنے شہری ان کا وعظ سننے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔

درباری عالم بہاءالدین رازی کو جب یہ معلوم ہوا کہ خوارزم شاہ خود بھی مجلس وعظ میں شرکت کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ بہت خوش ہوا کہ آج اس کی خواہش پوری ہو جائے گی اور وہ سلطان کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دے گا کہ سلطان العلما کے عقیدت مندوں سے بادشاہ کو ہوشیار رہنا چاہیے۔

سلطان العلما کو یہ خبر نہیں ہونے دی کہ آج خوارزم شاہ بھی مجلس وعظ میں شریک ہوگا۔

بہت بڑا ہجوم موجود تھا اور لوگوں کے پہنچنے کا سلسلہ جاری تھا لوگ قریب سے سلطان العلما کی تقریر سننا چاہتے تھے اور یہ لوگ گھنٹوں پہلے وہاں پہنچ گئے تھے۔

سلطان العلما نے اس دن بھی یونانی فلسفیوں اور ان کے فلسفے کو ہدف بنایا اور ان پر دیر تک تنقید کرتے رہے اور پھر اچانک موضوع تقریر سے گریز اختیار کرتے ہوئے فرمایا۔ ''لوگو! میں عالم اسلام کو نزع کے عالم میں دیکھ رہا ہوں، آبادیاں تہ تیغ کی جا رہی ہیں، مکانات جل رہے ہیں، کھیتوں اور شاہراہوں پر مسلمانوں کی لاشیں بکھری ہوئی ہیں، ہر طرف بھگدڑ جاری ہے اور ان کے دشمن بھاگنے والوں کا پیچھا کر رہے ہیں اور جو بھی ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے قتل کر دیا جاتا ہے۔''

خوارزم شاہ نے بھی یہ خطرناک تقریر سنی مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ سلطان العلما کس دشمن کی بات کر رہے ہیں جس سے مسلمانوں کو اتنا زبردست نقصان پہنچ جائے گا اور آبادیاں تہ تیغ کر دی جائیں گی، شہر، قصبے، گاؤں اور فصلیں پھونک دی جائیں گی اور ہر طرف لاشیں بکھری ہوں گی۔

سلطان العلما کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خوارزم شاہ اپنے امرا اور رفقا کے ساتھ آیا ہوا ہے اور وہ نہایت توجہ سے ان کی تقریر سن رہا ہے۔

سلطان العلما نے خوارزم شاہ کی پروا کیے بغیر اپنی تقریر جاری رکھی۔

خوارزم شاہ کے مصاحبین نے بادشاہ کی توجہ سلطان العلما کی بے توجہی کی طرف دلائی اور کہا۔ ''بادشاہ سلامت! ملاحظہ فرمائیں کہ سلطان العلما آپ کی تشریف آوری سے آگاہ ہو جانے کے بعد بھی آپ کو نظر انداز کر رہا ہے، اس کی اتنی جرأت کہ وہ بادشاہ وقت کی بھی پروا نہیں کرتا۔''

بادشاہ کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ ''مجمع تو نہایت کثیر ہے۔''

بہاءالدین رازی کو بادشاہ کی زبان سے یہ فقرہ سن کے ایک موقع ہاتھ آ گیا، برجستہ عرض کیا۔ ''حضور والا کو اس خاکسار نے کئی بار اس خطرے سے آگاہ کیا اور چاہا کہ اس کا سدباب ہو مگر بادشاہ سلامت کی مصروفیات آڑے آئیں اور ادھر کوئی توجہ نہ دی جا سکی۔ میں اب بھی یہی کہوں گا کہ اگر اس کی طرف توجہ نہ دی گئی اور کوئی تدبیر نہ کی گئی تو یہ اندیشہ موجود ہے کہ انتظام سلطنت میں خلل واقع ہو اور تدارک مشکل ہو جائے۔''

بہاءالدین رازی کی یہ باتیں بادشاہ کے دل و دماغ پر اثر کر گئیں اور اس نے بہاءالدین رازی کو حکم دیا۔ ''جا اور سلطان العلما کو مطلع کر کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں اور اسے اب تک میری آمد کی خبر کیوں نہ ہوئی؟''

یہ خبر سلطان العلما کو پہنچائی گئی مگر انہوں نے اپنی تقریر جاری رکھی۔

ہجوم کو جیسے ہی یہ خبر ہوئی کہ خوارزم شاہ اس مجلس میں موجود ہے تو ان میں بے چینی پیدا ہوگئی اور خوارزم شاہ کو راستہ دے دیا گیا اور بادشاہ اپنے مصاحبین کے ساتھ سلطان العلما کے قریب پہنچ گیا۔

واعظ کا دورانیہ مختصر کر دیا گیا اور خوارزم شاہ نے بھی اسے محسوس کر لیا اور اشارے سے سلطان العلما کو تقریر جاری رکھنے کا حکم دیا اور خود بھی تقریر بڑی محویت سے سنتا رہا، اسے تقریر میں بڑا مزہ آیا۔ تقریر کے اختتام پر سلطان العلما نیچے اترے اور خوارزم شاہ کا استقبال کیا۔

خوارزم شاہ نے ان کی پر مغز تقریر کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی آپ کے مواعظ کو پابندی سے سننا چاہیے۔''

سلطان العلما نے کہا۔ ''آپ کے پاس اتنا وقت کہاں کہ امور سلطنت کو نظر انداز کر کے پابندی سے میری مجلسوں میں شرکت فرمائیں۔''

ہجوم میں سے اکثریت خوارزم شاہ کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتی تھی اس لیے ان لوگوں نے بادشاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا لیکن خوارزم شاہ کے محافظ دستے نے تشدد کے ذریعے ان سب کو مار بھگایا۔

بادشاہ نے سلطان العلما سے تخلیے میں بات کرنا چاہی تو سلطان العلما نے کہا۔ ''میں اپنے آس پاس موجود لوگوں کو ہٹا سکتا ہوں مگر ہجوم پر میرا اختیار نہیں ہے۔''

خوارزم شاہ نے اپنے محافظ دستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہجوم کو وہ لوگ بھگا دیں گے۔''

سلطان العلما کے قریب کے لوگوں نے بھی دوری

اختیار کی کیونکہ بادشاہ سلطان العلما سے تخلیے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔

جب یہ دونوں تنہا رہ گئے تو بادشاہ نے بہاء الدین رازی کو اپنے قریب بلایا اور سلطان العلما نے بھی محقق ترمذی کو قریب آ جانے کا اشارہ کیا۔

خوارزم شاہ نے کہا۔ ''حضرت! مجھے آپ سے بڑی عقیدت ہے اور آپ کی تقریر میں جو حلاوت پائی جاتی ہے اس نے تو پورے شہر کو مسخر کر لیا ہے مگر بعض عالموں کو آپ کی تقریر کے اس حصے سے اختلاف ہے جس میں آپ یونانی فلسفے اور فلسفیوں کو رد کرتے ہیں اور عقل کو مسترد کر دیتے ہیں۔''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''ہمارے عالموں کو بھی یہ خیال رکھنا چاہیے کہ وہ انسانی فکر اور خیال کو اللہ کے کلام اور فرمودات پر ترجیح نہ دیں۔''

خوارزم شاہ نے محسوس کر لیا کہ اگر یہ گفتگو جاری رہی اور نوبت بحث و مباحثے تک جا پہنچی تو بدمزگی پیدا ہو جائے گی اور حاصل کچھ بھی نہ ہوگا۔ چنانچہ خوارزم شاہ نے موضوع بدل دیا اور کہا۔ ''اب حضرت مجھے یہ ضرور بتائیں کہ آخر بستیاں تہ تیغ کون کرے گا اور فصلیں، شہر، بازار اور قصبات کس طرح جلا دیے جائیں گے اور ہر طرف لاشوں کے ڈھیر کیوں لگ جائیں گے؟ آپ کس غارت گر قوت کا ذکر اپنے وعظ میں فرما رہے تھے۔''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''میں نے جو کچھ بتایا وہ مجھے عالم رویا میں دکھا دیا گیا ہے۔ ایک وحشی اور درندہ صفت قوم مشرق سے نمودار ہوگی اور دنیا کو جلا کر خاک کر دے گی۔''

خوارزم شاہ مسکرایا اور کہا۔ ''یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا خوارزم شاہ سے بڑی کوئی قوت اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ حکومتیں میرے نام سے کانپتی ہیں۔''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''اب میں طاقت اور ناطاقتی کے موضوع پر کیا بات کروں۔ بخدا میں نے مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر دیکھے ہیں اور شہروں کو فصلوں کے ساتھ جلتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ بخدا مجھے تو کوئی پناہ کی جگہ بھی نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ میں نے مسلمانوں کو وحشت زدہ عالم میں دوڑتے بھاگتے دیکھا ہے اور اسی کو میں نے اپنے وعظ میں بیان کر دیا۔''

خوارزم شاہ نے کہا۔ ''حضرت آئندہ اس قسم کی تقریر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میری حکومت اور میری موجودگی میں کوئی دشمن اتنا طاقتور نہیں ہو سکتا کہ خوارزم شاہ کی حدود سلطنت میں قدم رکھنے کی جرأت کرے۔''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''اے خوارزم شاہ! تو ایک معمولی بندہ ہے طاقت کے نشے میں جو جی میں آئے کہہ لے مگر میں نے مشرق کی طرف سے آتی ہوئی درندہ قوم کو کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو کچھ بھی دیکھا ہے وہ میرا خیال اور محض اندیشہ نہیں ہے، میں کئی مہینوں سے لوگوں کو مسلسل بتا رہا ہوں کہ وہ نقل مکانی کے لیے تیار رہیں اور انہیں اپنا وطن بالآخر چھوڑنا پڑ جائے گا۔''

بہاء الدین رازی دونوں کی دلچسپ باتیں سنتا رہا اور آخر کار خوارزم شاہ کا ساتھ دیا اور سلطان العلما سے کہا۔ ''حضرت! آپ کے علم و فضل کا کوئی جواب نہیں مگر یہ جو آپ بھیانک مستقبل کی نشاندہی کر رہے ہیں، اس پر کون یقین کرے گا؟''

سلطان العلما نے سادگی سے جواب دیا۔ ''جو یقین کریں گے وہ نقل مکانی کر جائیں گے اور آنے والے درندوں سے محفوظ رہیں گے اور جو یقین نہیں کریں گے وہ مارے جائیں گے اور جھگدڑ میں انہیں کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔''

خوارزم شاہ نے ناگواری سے کہا۔ ''آپ آئندہ اپنی تقریروں میں ایسی کوئی بات نہیں کہیں گے جن کا تعلق مستقبل سے ہو۔''

سلطان العلما نے جواب دیا ہے۔ ''میں مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر رہا ہوں اور اس سے بادشاہ وقت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اس لیے آپ مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہ لگائیں۔''

خوارزم شاہ نے کہا۔ ''آپ سلطان العلما کے لقب سے مشہور ہیں اس لیے آپ کی باتیں سننے والوں کے دل و دماغ میں مرتسم ہو جاتی ہیں۔ آپ خود غور فرمائیں کہ جب آپ تقریر میں لوگوں کو یہ بتاتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں ہر طرف بھگدڑ مچی ہوگی کوئی غارت گر قوم مسلمانوں کا قتل عام کر رہی ہوگی۔ شاہراہوں، سڑکوں، گلی کوچوں میں لاشیں بکھری پڑی ہوں گی۔ فصلیں، مکانات، آبادیاں جلا دی جائیں گی تو ان باتوں کا لوگوں کے دل و دماغ پر یہی اثر ہوگا کہ آئندہ یہاں کوئی حکومت نہیں ہوگی اور لوگ حکومت کے نہ ہونے کا یہی مطلب لیں گے کہ خوارزم شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو چکا ہوگا۔ کیا ان باتوں سے میری اور میری حکومت کی تحقیر نہیں ہوتی ہے۔''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''خوارزم شاہ! بخدا میں تیری تحقیر نہیں کر رہا ہوں، آنے والے دنوں کے بارے

میں جو کچھ میں نے بتایا اگر تو اسے قابل ذکر نہیں سمجھتا تو آئندہ میں احتیاط سے کام لوں گا اور لوگوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ نہیں کروں گا لیکن میرے خاموش رہنے سے تقدیر الٰہی بدل نہیں جائے گی۔"

بہاء الدین رازی نے سلطان العلما کو سمجھایا۔ "حضرت! آپ بادشاہ کا مفہوم سمجھ گئے ہوں گے آپ نے عالم رویا میں جو کچھ دیکھا وہ دوسروں کو نہیں دکھا سکتے اس لیے آپ اس کا چرچا بھی نہ کریں کیونکہ آپ کا چرچا فتنہ و فساد کا سبب بن جائے گا۔"

محقق ترمذی نے بہاء الدین رازی کو جواب دیا۔ "اے شخص! تو مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ سلطان العلما نے بھلائی کا کام کیا ہے کہ مسلمانوں کو قبل از وقت خطرات سے آگاہ کر دیا۔ جب خوارزم شاہ کو بھی یہ بات معلوم ہو گئی کہ مشرق سے نمودار ہونے والی کوئی غارت گر قوم یہاں تباہی مچائے گی تو سلطان وقت کو بھی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ سلطان العلما کا ہم سب پر احسان ہے کہ وہ ہمیں جن خطرات سے قبل از وقت آگاہ کر رہے ہیں، ہمیں ان سے بچنے کا انتظام اور اہتمام کر لینا چاہیے۔"

خوارزم شاہ کو یہ ساری باتیں فضول لگ رہی تھیں۔ اس نے غیر متوقع طور پر اپنی غیر معمولی..... عقیدت ظاہر کی اور سلطان العلما سے درخواست کی وہ ان کی باتیں ماننے کا اس لیے اسے مرید کر لیا جائے۔

سلطان العلما نے جواب دیا۔ "بادشاہ کا معتقد ہو جانا ہی میرے لیے کافی ہے۔"

خوارزم شاہ واپس چلا گیا اور سلطان العلما اس واقعے سے اتنے بددل ہوئے کہ بلخ کو چھوڑ دینے کا قطعی ارادہ کر لیا۔

اب سلطان العلما نے اپنی تقریروں میں آنے والے برے دنوں کا ذکر کرنا چھوڑ دیا لیکن ذاتی نجلیے کی نشستوں میں وہ یہی مشورہ دیتے رہے کہ بلخ کو چھوڑ دیا جائے اور دور دراز کسی شہر میں سکونت اختیار کی جائے۔

محقق ترمذی نے پوچھا۔ "حضرت! جب آپ کسی دور دراز شہر کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں دور دراز شہر کے نام سے بھی آگاہ فرمائیں۔"

سلطان العلما نے جواب دیا۔ "فی الحال میری نظر میں ہم سب کے لیے محفوظ شہر بغداد ہے وہ یہاں سے دور بھی ہے اور مضبوط بھی۔"

☆☆☆

خوارزم شاہ نے سلطان العلما کے پاس سے واپس جانے کے بعد اپنے مشیروں سے پوچھا۔ "مجھے یقین نہیں کہ سلطان العلما اپنی حرکتوں سے باز آ گئیں مگر میں نے اسے خود کو عقیدت مند ظاہر کر کے خاموش رہنے کی تلقین کر دی ہے مگر مجھے یقین نہیں کہ یہ شخص اپنی حرکتوں سے باز آ جائے گا۔"

بہاء الدین رازی نے پھر وہی الفاظ دہرائے جو اس نے سلطان العلما کے مجمع کثیر کو دیکھ کر خوارزم شاہ کے اس فقرے کے جواب میں کہے تھے جب خوارزم شاہ نے کہا تھا کہ کتنا کثیر مجمع ہے تو اس کے جواب میں بہاء الدین رازی نے کہا تھا۔ "حضور والا اگر اس کی تدبیر نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ انتظام سلطنت میں خلل واقع ہو اور تدارک مشکل ہو جائے۔"

خوارزم شاہ نے بہاء الدین رازی سے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ ہمیں تجھ جیسا مخلص مشیر اور صلاح کار میسر ہے اب ہمیں یہ مشورہ درکار ہے کہ ہمیں سلطان العلما کو ان حرکتوں سے باز رکھنے کے لیے کیا تدبیر کرنی چاہیے؟"

بہاء الدین رازی نے جواب دیا۔ "رموز مملکت سلطان سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ میری ناقص رائے تو یہ ہے کہ حضور والا خزانے اور قلعوں کی کنجیاں سلطان العلما کے حوالے کر دیں اور ساتھ ہی یہ پیغام دیں کہ جمعیت اور کثرت سب کچھ آپ کو حاصل ہے اور میرے پاس امور سلطنت میں سے صرف کنجیاں رہ گئی ہیں وہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہیں۔"

خوارزم شاہ اس مشورے سے خوش ہوا اور اس نے اپنے خزانے اور قلعوں کی کنجیاں سلطان العلما کے پاس بہاء الدین رازی کے ذریعے روانہ کر دیں۔

یہ چیزیں جس وقت سلطان العلما کے پاس پہنچیں اس وقت وہاں محقق ترمذی کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔

ان سب نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا اور اسے خوارزم شاہ کی طرف سے خطرے کی گھنٹی قرار دیا گویا خوارزم شاہ نے اس طرح سلطان العلما کو یہ پیغام دیا تھا کہ وہ اگر اپنی خیریت چاہتے ہیں تو بلخ چھوڑ کر خوارزم شاہ کی حدود سلطنت سے دور چلے جائیں۔

سلطان العلما نے کسی سے مشورہ بھی نہیں لیا کہ انہیں خوارزم شاہ کے اس اقدام کا کیا جواب دینا چاہیے۔ سلطان العلما نے بہاء الدین رازی کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔ خزانے اور قلعے کی کنجیاں اس کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ "سلطان اسلام سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اس ملک کا یہ تمام خزانہ و فینہ ملک و لشکر بادشاہوں کے لائق ہیں، ہم درویشوں

کو اس سے کیا سروکار۔ میں نہایت خوشی سے سفر کرتا ہوں تاکہ بادشاہ اپنے اتباع و احباب کے ساتھ یہاں بہ استقلال سلطنت کریں۔ جمعے کو وعظ کر کے میں چلا جاؤں گا۔"

بہاء الدین رازی نے سلطان العلما کا جواب خوارزم شاہ کو پہنچا دیا اور اس جواب سے خوارزم شاہ کے ساتھ ہی سلطان العلما کے حاسدوں کو بھی بڑی خوشی ہوئی کہ اب ان سب کا سلطان العلما سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔

یہ خبر سلطان العلما کے حجرے سے نکل کر پورے شہر میں پھیل گئی اور یہ بھی لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اس جمعے کو سلطان العلما کا بلخ میں آخری وعظ ہوگا۔ پورا شہر کرب و اضطراب میں مبتلا تھا اور جگہ جگہ لوگوں کے جتھے خوارزم شاہ اور سلطان العلما کے حاسدوں کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ شاہی مخبروں نے شہر کی اس صورت حال سے خوارزم شاہ کو مطلع کیا اور یہ خطرہ بھی ظاہر کیا کہ اب جمعے سے پہلے شہر میں ہنگامے ہو سکتے ہیں اور مسلمان بادشاہ کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔

خوارزم شاہ کو خوف اور خطرہ محسوس ہوا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فی الحال سلطان العلما کو روکنے کی کوشش کرے گا۔ اسی رات وہ اپنے وزیر اور بہاء الدین رازی کو ساتھ لے کر سلطان العلما کی خدمت میں پہنچا۔

سلطان العلما کو خوارزم شاہ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو انہوں نے نہایت خوش اخلاقی سے بادشاہ کا استقبال کیا۔

خوارزم شاہ نے شہر میں پائی جانے والی بے چینی کا ذکر کیا اور کہا۔ "ان حالات میں آپ کو اپنا شہر بلخ نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ مجھے احتجاج اور مظاہرہ کرنے والوں کے خلاف تشدد آمیز کارروائیوں کا حکم دینا پڑے گا اور جو منظر آپ نے خواب میں دیکھا ہے، اسے بھی ہم سب دیکھ لیں گے۔"

سلطان العلما نے پوچھا۔ "تو ہم سے کیا چاہتا ہے؟"

خوارزم شاہ نے جواب دیا۔ "آپ اسی شہر میں رہیں گے اور نقل مکانی کا خیال دل سے نکال دیں۔"

سلطان العلما نے پوچھا۔ "خوارزم شاہ! یہ تیرا حکم ہے؟"

خوارزم شاہ نے کہا۔ "میں آپ سے یہ استدعا کر رہا ہوں آپ کو حکم نہیں دے رہا ہوں۔"

سلطان العلما نے جواب دیا۔ "بادشاہ کو معلوم ہے کہ میں نقل مکانی کا ایک عرصے سے ارادہ کر رہا ہوں۔ میرے بلخ کو چھوڑنے میں بادشاہ کے کسی فعل کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر بادشاہ کی طرف سے مجھے خزانے اور قلعے کی کنجیاں

کے ساتھ وہ پیغام نہ ملا ہوتا، میں پھر بھی نقلِ مکانی کر جاتا۔"

جب خوارزم شاہ نے یہ دیکھا کہ سلطان العلما اس کی درخواست نہیں مانیں گے تو اس نے کہا۔ "اچھا اگر آپ بلخ چھوڑ دینے پر مصر ہیں تو آپ یہ سفر جمعے یا دوشنبے کی شب نہیں کریں گے۔ کیونکہ ان دونوں دنوں میں آپ کے وعظ میں پورا شہر جمع ہو جاتا ہے اور جب آپ وعظ کے بعد بلخ کو چھوڑیں گے تو پورے شہر میں آگ سی لگ جائے گی اور قتل و غارت گری اور خون خرابے کا بازار گرم ہو سکتا ہے، اس لیے آپ ان دو دنوں کے علاوہ نقلِ مکانی کریں گے تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔"

سلطان العلما نے خوارزم شاہ کی یہ درخواست مان لی اور آہستہ سے بادشاہ کو بتایا۔ "میں جمعے کو وعظ کہہ کر خاموشی سے اپنے گھر آ جاؤں گا اور ہفتے کی شب بلخ کو چھوڑ دوں گا۔"

خوارزم شاہ نے درخواست کی۔ "آپ ہفتے کی شب اتوار سے قبل پچھلے پہر سفر شروع کریں گے کیونکہ اس وقت پورا شہر نیند کے مزے لے رہا ہوگا اور کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہیں ہوگا۔"

سلطان العلما نے خوارزم شاہ کو یہ یقین دلایا کہ سلطان کی مرضی کے مطابق وہ اپنے سفر کا آغاز کریں گے اور خلق خدا کو فتنہ و فساد میں مبتلا نہیں ہونے دیں گے۔

خوارزم شاہ ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد جانے لگا تو سلطان العلما نے بطور خاص اسے مخاطب کیا۔ "اے بادشاہ! سن میری بات غور سے سن۔ میں نے مشرق سے جس غارت گر درندہ خو قوم کو اپنے شہروں پر حملہ آور ہوتے عالم رویا میں دیکھا تھا آج میں اس کی وضاحت کر رہا ہوں یہ قوم یعنی حملہ آور قوم تاتاریوں کی ہے۔ وہ حملہ آور ضرور ہوں گے اور انہیں قتل و غارت گری سے کوئی بھی نہیں روک سکے گا۔"

خوارزم شاہ نے سلطان العلما کی یہ باتیں توجہ سے نہیں سنیں، کیونکہ وہ اپنی سلطنت کو ناقابل تسخیر سمجھتا تھا۔

جمعے کو وعظ کہنے کے بعد ہفتے کی صبح سفر کی خفیہ تیاریاں شروع کر دیں۔ اس سفر میں جو لوگ یا جو خاندان ان کا ساتھ دے رہے تھے وہ بھی تیاریاں کرتے رہے اور ہفتے کی رات جب نصف شب گزر گئی تو یہ مختصر قافلہ بلخ کو چھوڑ کر بغداد روانہ ہو گیا۔

لیکن سلطان العلما کے سفر کی خبریں دور دور تک ان کے پہنچنے سے پہلے پہنچتی رہیں اور یہ جس شہر کے قریب پہنچتے تھے وہاں کے امرا اور علما شہر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کرتے اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے شہر میں لے جاتے۔

بغداد پہنچنے کے بعد انہوں نے یہاں زیادہ قیام نہیں کیا اور مکۂ معظمہ روانہ ہو گئے۔ یہاں بھی ان کا شاندار استقبال ہوا اور لوگوں نے ان کی ایسی قدر و منزلت کی کہ بادشاہ بھی اس قدر و منزلت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

یہاں بھی کچھ عرصہ رہنے کے بعد انہیں دمشق کا خیال آیا اور مکۂ معظمہ چھوڑ کر دمشق تشریف لے گئے۔ یہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد انہیں اپنے علاقے یاد آئے لیکن جیسا کہ وہ خوارزم شاہ اور بلخ کے لوگوں کو مطلع کر چکے تھے کہ تاتاری مسلمانوں کے ان علاقوں کو روند کر رکھ دیں گے، اس لیے وہ ان علاقوں میں واپس جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ بغداد کے بارے میں بھی انہیں قبل از وقت معلوم ہو گیا تھا کہ تاتاری یہاں بھی پہنچ جائیں گے اور چالیس شب و روز یہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوگا اور مسلمانوں کے خون سے دریائے دجلہ کا رنگ سرخ ہو جائے گا، اسی لیے وہ بغداد میں بھی مستقل قیام سے باز رہے۔ دمشق پہنچنے کے بعد انہیں بتایا گیا کہ یہاں بھی تاتاری پہنچ جائیں گے۔

یہ مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوششیں کرتے رہے مگر عالم اسلام میں ہر جگہ انہوں نے مسلمانوں کو غافل پایا۔ ان کی باتوں پر اکثریت دھیان نہیں دیتی تھی، وہ سلطان العلما کے وعظ سن کر سر دھنتے تھے مگر ان پر عمل نہیں کرتے تھے۔

دمشق میں کئی سال رہنے کے بعد انہیں روحانی طور پر بتایا گیا کہ وہ ترکی کا سفر کریں اور وہیں کسی شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لیں۔ یہ پُرسکون جگہ ان کے لیے مناسب ہوگی۔ چنانچہ سلطان العلما نے دمشق کو بھی چھوڑ دیا اور ترکی کے آق شہر میں سکونت اختیار کی، یہ شہر ان کی تشریف آوری کو اپنے لیے نعمت سمجھتا تھا۔ یہاں سلطان العلما نے ایک مدرسہ قائم کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

چار سال قیام کرنے کے بعد لارندہ تشریف لے گئے۔ یہ وہاں کے مشہور شہر قونیہ کا ایک قصبہ تھا۔ قونیہ میں روم کے سلطان علاؤ الدین کیقباد کی حکومت تھی اور وہ سلطان العلما کا غائبانہ ارادت مند تھا۔ اسے ان کا لارندہ جیسے چھوٹے سے قصبے میں قیام پسند نہیں آیا اور اس نے ان کی خدمت میں کچھ تحائف بھیجے اور درخواست کی کہ آپ قونیہ تشریف لائیں۔

سلطان العلما نے خوارزم شاہ کو بھگتا تھا اور بادشاہوں کی خوش اخلاقی اور منافقت سے خوب واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ بادشاہ کے دربار میں علما بھی ہوتے ہیں جو کسی

غیر درباری مشہور شخص عالم کو پسند نہیں کرتے اور اس کے خلاف حاسدانہ ایک محاذ کھڑا کر دیتے ہیں۔

سلطان العلما نے علاؤ الدین کیقباد کو شکریے کا جوابی پیغام بھیجا اور کہا۔ ''میں لارندہ کے چھوٹے سے قصبے میں لوگوں کو درس دینے میں خوشی محسوس کرتا ہوں اور درباری زندگی میں اپنے لیے کوئی جگہ نہیں پاتا۔ وہ لوگ مجھے پسند نہیں کریں گے، اس لیے بادشاہ کو تلخیوں سے بچانے کے لیے میں اس چھوٹے سے قصبے میں عافیت محسوس کرتا ہوں۔''

لیکن سلطان العلما کا یہ معذرت خواہانہ جواب کیقباد کو پسند نہیں آیا اور اس نے سلطان العلما کو یقین دلایا کہ وہ سلطان العلما کی عزت اتنی غائبانہ کرتا ہے تو ان کی تشریف آوری کے بعد اس میں اضافہ ہو جائے گا اور کسی درباری کو بھی ان کے خلاف بات کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

کیقباد کے بے حد اصرار کے بعد پہلے آپ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ انہیں کیقباد کی بات مان لینا چاہیے یا یہ جگہ چھوڑ کے کہیں اور چلے جانا چاہیے۔

سلطان العلما کے صاحبزادے جلال الدین اب بائیس سال کے ہو چکے تھے اور چار پانچ سال کے علاوہ مزید تربیت اور تعلیم اپنے والد بہاء الدین ولد سلطان العلما ہی سے حاصل کرتے رہے تھے۔

یہ عجیب اتفاق کی بات تھی کہ بہاء الدین ولد کے ابتدائی قریبی ساتھی محقق ترمذی نے آپ کا نقل مکانی میں ساتھ نہیں دیا تھا اور اپنے وطن ترمذ چلے گئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں جلال الدین اپنے والد ہی سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے اور اب جو انہیں کیقباد قونیہ بلا رہا تھا تو جلال الدین نے بھی اپنے باپ کو یہی مشورہ دیا کہ وہ سلطان علاؤ الدین کیقباد کی درخواست رد نہ کریں اور قونیہ میں مستقل سکونت اختیار کریں۔

کیقباد کو مطلع کر دیا گیا کہ سلطان العلما قونیہ میں رہنے کے لیے تیار ہیں۔

کیقباد کی طرف سے آدمی بھیج دیے گئے۔ سلطان العلما ان کے متعلقین اور ان کے ارادت مندوں کو اپنے ساتھ عزت و احترام سے قونیہ لے گئے۔

626ہجری کا وہ دن قونیہ میں یادگار ہو گیا۔ جب شہر کے باہر سلطان کیقباد نے سلطان العلما کا استقبال کیا اور انہیں اپنے ساتھ محل تک لے گیا اور پھر گھوڑے سے اتر کر سلطان العلما کو گھوڑے سے اترنے میں مدد دی اور اس طرح اپنی عاجزی اور انکساری ظاہر کی۔

سلطان العلما نے کسی محل کے بجائے قونیہ کے مدرسے میں قیام کیا اور یہیں کیقباد اکثر امرا کے ساتھ ان کا مرید ہو گیا۔

کیقباد کے اتابیق امیر بدر الدین گوہر تاش نے اپنے سلطان کو ان کی طرف التفات زیادہ مائل دیکھا اور کچھ عرصے کے بعد سلطان العلما کے تبحر علمی اور خداداد ذہانت کا اندازہ ہوا تو اس نے ان کے لیے ایک شاندار مدرسہ تعمیر کروایا اور اس کا نام مدرسۂ خداوندگار تجویز ہوا اور اس کے لیے بہت بڑا خزانہ وقف کیا گیا۔ یہاں کئی سال سے ایک قلعہ تعمیر کیا جا رہا تھا۔ سلطان العلما کی تشریف آوری اور قیام کے بعد قلعے کی تعمیر تکمیل کو پہنچی تو سلطان کیقباد نے درخواست کی کہ آپ قلعے کو ملاحظہ فرما کر دعائے خیر فرمائیں۔

سلطان العلما سلطان کے ساتھ قلعے کو گھوم پھر کے دیکھتے رہے اور آخر میں فرمایا۔ ''بے شک یہ قلعہ آفات کے سیل کے روکنے کے لیے اچھا ہے مگر مظلوموں کے تیر دعا کا کیا علاج؟ انصاف کا قلعہ بنائیے کہ اس میں دنیا کے امن اور عاقبت کی خیر ہے۔''

سلطان پر آپ کی نصیحت کا بڑا اثر ہوا۔

سلطان العلما کو قونیہ میں دو برس رہنا میسر آیا اور 628ہجری میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

آپ کے متنبہ کرنے کے باوجود خوارزم شاہ اور اس کے حدود سلطنت میں غارت گر تاتاریوں سے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا اور خوارزم شاہ اپنی طاقت کے نشے میں تاتاریوں کو حقیر سمجھتا رہا اور آخرکار ان کے سیلاب میں سمرقند و بخارا اور پورا ماوراء النہر تباہ و برباد ہوا۔ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے، لوگ پناہ گاہوں کی تلاش میں دوڑتے بھاگتے رہے اور قتل کر دیے گئے۔ فصلیں جلا دی گئیں، شہر پھونک دیے گئے اور آبادیاں ویران ہو گئیں۔

یہ سلطان العلما بہاء الدین ولد کون تھے اور ان کے بیٹے جلال الدین کو دنیا کس حیثیت سے جانتی ہے؟

یہ جلال الدین مثنوی مولانا روم کے خالق اور عالم گیر شہرت دوام کے مالک کے پدر بزرگوار تھے، مگر بیٹے کی شہرت نے ان کی شہرت کو ماند کر دیا۔

مضمون کے مآخذ:

مولانا رومی، مولانا شبلی نعمانی۔
نفحات الانس، جامی۔ تاریخ دعوت و عزیمت،
مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ انوار اصفیا،
شیخ غلام علی (شعبہ تصنیف و تالیف)

ضیاء تسنیم بلگرامی

سہارنپور کے قصبے نانوتہ میں ۲۰ جنوری ۱۸۱۸ء میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ باپ نے اس کا نام امداد حسین رکھ دیا۔ ابھی یہ سات سال کے تھے کہ ماں نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ نزع کے وقت ماں نے اپنی دوسری اولادوں کے مقابلے میں امداد حسین کو زیادہ اہمیت دی۔ انھوں نے خاندان کے ذمّہ دار حضرات کو آبدیدہ نظروں سے دیکھا اور نحیف اور غمزدہ آواز میں وصیت کی "لوگو! میں جا رہی ہوں، ہمیشہ کے لیے۔ مرنے سے پہلے ایک وصیت کرنا چاہتی ہوں، کیا آپ لوگ میرے بعد اس پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ فرمائیں گے؟"

ایک بزرگ عورت روتی ہوئی جاں بہ لب مریضہ کے پاس پہنچی اور وعدہ کیا "میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمھاری وصیت پر حرف بہ حرف عمل کیا جائے گا، اپنی وصیت سے مجھے آگاہ کر دو۔"

مریضہ نے اپنے بیٹے امداد حسین کا ہاتھ اس عورت کے ہاتھ میں دے دیا اور سوگوار لہجے میں کہا "میرے اس بچّے کا بطورِ خاص خیال رکھا جائے۔ اس کی غلطیوں اور خطاؤں کو نظر انداز کیا جاتا رہے، اسے مار تو مار جھڑکیوں تک سے بچایا جائے۔"

بزرگ عورت نے امداد حسین کو اپنے سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے وعدہ کیا "تمھاری وصیت پر پوری طرح عمل کیا جائے گا بہن، تم بے فکر رہو، کس کی مجال ہے کہ تمھارے امداد حسین کو ترچھی نظروں سے دیکھنے کی جرأت کرے۔"

ماں کا انتقال ہو گیا اور بیٹا اس ناز و نعم سے پرورش پانے لگا کہ زندگی کے ہر معاملے میں اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ کچھ بھی کرے کوئی اسے ٹوک نہ سکتا تھا۔ یہاں تک کہ بہت سے ایسے کام جن کا اختیار کرنا یا انجام دینا ضروری ہوتا، کوئی زبان تک لاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ بچّے کی دل جوئی کے شدید احساس اور پاسِ خاطر کے بے پناہ خیال نے لوگوں میں ایک طرح کی بے نیازی پیدا کر دی اور امداد حسین کو لوگوں کی عدم توجہی اور تغافل کا شکار ہو جانا پڑا۔ لوگوں نے ان کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجّہ نہ دی کیونکہ اس میں یہ امکان موجود تھا کہ کہیں کسی جگہ جبر سے کام نہ لینا پڑ جائے جس سے امداد حسین کی دل آزاری ہو اور ان کی ماں کی رُوح کرب میں مبتلا ہو جائے۔ انھیں خود ہی پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا اور مختلف اساتذہ سے تحصیلِ علم کرتے رہے۔ سنِ شعور میں پہنچ کے دہلی گئے اور مولانا نصیر الدین دہلوی کے حلقۂ درس میں بیٹھ گئے۔ مولانا کا تعلق سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک سے رہ چکا تھا اور یہ اپنی ذات میں بہت ساری خوبیاں رکھتے تھے۔ عالمِ دین، صوفی اور لائق سیاست داں۔ یہ اپنے طلبہ کو وہی درس دیا کرتے تھے جو تقریباً ایک سو سال پہلے شاہ ولی اللہ دہلویؒ پوری قوم کو دے چکے تھے اور ۱۸۳۱ء تک سیّد احمد شہیدؒ دیتے رہے تھے۔

نوجوان امداد حسین گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ صبح قریب تھی۔ کاروانِ شب کے آخری مسافر رخصت ہونے کو تھے، اس وقت امداد حسین رسُولِ مقبولؐ کے دربار میں حاضر تھے۔ رسُول اللہؐ کے آس پاس ان کے اصحاب موجود تھے۔ امداد حسین پر اتنا رعب طاری تھا کہ پاؤں سو سو من کے ہو گئے تھے۔ گردن جھک گئی اور آنکھوں میں تابِ نظارہ باقی نہ رہی۔ اسی عالم میں کسی نے امداد حسین کا ہاتھ پکڑ لیا اور حکم دیا "یہاں کیوں کھڑا ہے آگے بڑھ، ہوش میں آ۔"

یہ آواز کسی آشنا کی تھی، گردن اُوپر جو اٹھائی تو دیکھا دادا سامنے کھڑے ہیں۔ امداد حسین نے گڑگڑا کے سوال کیا "دادا جان! اِس وقت میں اپنے آپ میں نہیں ہوں اور میری ہمت جواب دے گئی ہے۔"

"تو میرا ہاتھ پکڑ!" دادا نے کہا "میرے ساتھ چل، میں تجھے رسُول اللہؐ

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

انوارِ اولیا (رئیس احمد جعفری) * انوارِ اصفیا (شیخ غلام علی اینڈ سنز) * علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد دوم چہارم (مولانا سیّد محمد میاں) * حکایاتِ اولیا (مولانا اشرف علی تھانوی) * کارل مارکس (ببارہ)

کے پاس لیے چلتا ہوں' ان سے تیری ملاقات کراتا ہوں، پریشان نہ ہونا۔"

دادا جان نے امداد حسین کی انگلی پکڑی اور رسُول اللہؐ کے رُوبرو پہنچا دیا۔ دادا جان نے امداد حسین کا ہاتھ رسُول اللہؐ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "حضور! اسے میں آپ کے حوالے کرتا ہوں' آپ جیسا بھی مناسب سمجھیں اس کے لیے......"

رسُول اللہؐ نے امداد حسین کا ہاتھ ایک دوسرے شخص کے حوالے کر دیا اور فرمایا "یہ امداد حسین ہے، اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔"

امداد حسین نے ان بزرگ کو غور سے دیکھا اور ان کی شکل و صورت حافظے میں محفوظ کر لی۔ جب بیدار ہوئے تو ان پر عجیب حیرت و انتشار کی کیفیت طاری تھی۔ لاکھ حافظے پر زور دے کر پہچاننے کی کوشش کرتے لیکن پہچانے نہ جاتے۔ اسی حیرت و انتشار میں کچھ دن گزر گئے۔ امداد حسین نے مشکوٰۃ شریف کا کچھ حصّہ مولانا محمّد قلندر محدّث جلال آبادی سے پڑھا تھا۔ اس پریشانی اور انتشار میں ان کی ملاقات اپنے اُستاد محدّث جلال آبادی سے ہو گئی۔ اُستاد نے پریشان اور کھوئے کھوئے چہرے کو بغور دیکھ کر سوال کیا "امداد حسین! تم پریشان کیوں ہو؟ وجہ؟"

امداد حسین نے آبدیدہ نظروں سے استاد کو دیکھا اور رقت زدہ لہجے میں اپنا خواب بیان کر دیا۔ بولے "جب سے یہ خواب دیکھا ہے میں ان بزرگ کی تلاش میں ہوں جن کے ہاتھ میں رسُول اللہؐ نے میرا ہاتھ دیا تھا۔"

محدّث جلال آبادی مسکرا دیے، بولے "تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

امداد حسین نے آزردگی سے جواب دیا "جب تک ان بزرگ سے میری ملاقات نہیں ہو جاتی۔ میں خود کو ناقص و نامکمل محسوس کرتا رہوں گا' اپنی ذات میں ایک کمی محسوس کرتا رہوں گا۔"

اُستاد نے کہا "موضع لوہاری یہاں سے قریب ہی واقع ہے وہاں چلے جاؤ، لوہاری میں کسی سے بھی میاں جی نور محمّد کا پتہ معلوم کر لینا جا کر ان سے مل لو۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ تمھاری پریشانی اور انتشار کا حتمی علاج کر دیں گے۔"

امداد حسین نے اُستاد کو متشکرانہ نظروں سے دیکھا اور اسی وقت پا پیادہ لوہاری روانہ ہو گئے۔ منزلِ مقصود تک پہنچتے پہنچتے ان کے پیروں میں آبلے پڑ گئے۔ وہ پھوٹنے لگے اور ان سے پانی جاری ہو گیا۔ لوہاری پہنچ کر لوگوں سے میاں جی نور محمّد کا پتہ پوچھا تو انھوں نے امداد حسین کو اس مشہور بزرگ کے آستانے پر پہنچا دیا۔ آستانے میں داخل ہوتے ہی کسی نے میاں جی نور محمّد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ ہیں حضرت میاں جی نور محمّد مدّظلہٗ۔"

امداد حسین نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہی وہ بزرگ ہیں رسُول اللہؐ نے جن کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دیا تھا۔ یہ فوراً آگے بڑھے اور انھیں پُرشوق نظروں سے دیکھنے لگے پھر خود رفتگی سے آگے بڑھے اور میاں جی نور محمّد کے قدموں میں گر گئے۔ میاں جی نے انھیں قدموں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور پوچھا "کیا تمھیں اپنے خواب پر یقین کامل اور اعتبارِ واثق ہے؟"

امداد حسین نے جواب دیا "حضرت! ایک ایسا خواب جس میں رسُول مقبولؐ موجود ہوں شک و شبے سے بالا ہوتا ہے۔ میں اپنے خواب پر شک کس طرح کر سکتا ہوں' اس کی صداقت پر مجھے پہلے بھی یقین تھا' اب بھی یقین ہے۔"

میاں جی نور محمّد نے پوچھا "رسُول اللہؐ نے تمھارا ہاتھ کس کے ہاتھ میں دیا تھا؟"

"آپ کے ہاتھ میں!" امداد حسین نے جواب دیا "اپنے خواب کی صداقت پر یقین تو تھا ہی لیکن آپ نے جس طرح میرے خواب کا ذکر کیا ہے اس سے مجھے خود آپ کی ذات بابرکات میں فیوض و کمالات کا بھی یقین ہو گیا ہے ورنہ ایک ایسا خواب جس کا آپ کو کوئی علم نہیں ہونا چاہیے آپ اس سے واقف ہیں اور میرے بتائے بغیر آپ بتا رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی کرامت ہے کہ اس کا انکار ناممکن ہے۔"

میاں جی نے کہا "اچھا تم میرے پاس ہی رہو۔ میں رسُول اللہؐ کا ادنا غلام ہوں۔ میں تمھاری مادّی اور روحانی تعلیم و تربیت کی ذمّہ داری قبول کرتا ہوں۔"

امداد حسین میاں جی کے ساتھ رہنے لگے اور ایک مدّت بعد خرقۂ خلافت حاصل کر لیا۔ اس موقع پر میاں جی نے پوچھا "اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

امداد حسین نے جواب دیا "وہی جو خدا پسند کرتا ہے۔"

میاں جی نے کہا "جواب واضح ہونا چاہیے، تسخیر کے طالب ہو یا کیمیا چاہتے ہو؟ جو چاہو طلب کر لو، تمھیں بخش دیا جائے گا۔"

امداد حسین رونے لگے۔ کہا "میں نے دُنیا کے لیے آپ کا دامن نہیں پکڑا ہے، میں خدا کو چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھ سے عظیم خدمات لے، اتنی عظیم کہ ان سے خدا کی مخلوق فیض یاب ہو، فائدہ اٹھائے۔"

میاں جی نے انھیں سینے سے لگا لیا۔ بولے "میں تمھاری علوِ ہمتی

کی داد دیتا ہوں، جاؤ میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں اور خدا تمھیں مایوس نہیں کرے گا، جو چاہتے ہو وہی ملے گا۔"

امداد حسین یہاں سے رخصت ہو کر گھر پہنچے تو اللہ اللہ کرنے لگے۔ ایک رات پھر خواب میں دیکھا کہ رسول اللہؐ انھیں یاد فرما رہے ہیں۔ امداد حسین نے پوچھا "اب اس ناچیز کے لیے کیا حکم ہے؟"

رسول اللہؐ نے فرمایا "تم ہمارے پاس کیوں نہیں آئے؟ ہمیں تمھارا انتظار ہے۔"

جب یہ جاگے تو فوراً سفر کی تیاری کر دی اور مکہ معظمہ روانہ ہو گئے وہاں ان کی ملاقات مولانا شاہ محمد اسحاق سے ہو گئی۔ یہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادے حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے تھے۔ انھوں نے شاہ ولی اللہ کی تحریک چلانے کی بھرپور کوشش کی تھی اور پورے برصغیر میں ایک ہلچل مچا دی تھی لیکن اپنوں اور غیروں کی مخالفت اور ریشہ دوانیوں نے انھیں ناکام بنا دیا تھا۔ اسی جدوجہد میں سید احمد شہید ہو گئے تھے۔ شاہ محمد اسحاق تحریک کی ناکامی کے بعد مکہ معظمہ ہجرت کر گئے اور وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ وہ یہیں سے برصغیر کی تحریک کی قیادت فرما رہے تھے۔

انھوں نے نوجوان امداد حسین سے دریافت کیا "تمھارا نام کیا ہے؟"

جواب ملا "امداد حسین!"

شاہ اسحاق نے کہا "نہیں، آج سے تم امداد حسین نہیں رہے، امداد اللہ کہلاؤ گے۔"

انھوں نے جواب دیا "بسر و چشم، مجھے منظور ہے۔"

شاہ اسحاق کی صحبت نے تو ان کی کایا ہی پلٹ دی۔ انھیں یہاں سے جو تعلیمات ملیں وہ نہایت عجیب و غریب اور منفرد تھیں۔

شاہ اسحاق نے دریافت کیا "برصغیر کی کیا حالت ہے؟"

امداد اللہ نے جواب دیا "بہت بری حالت ہے۔ مغل بادشاہ کی برائے نام حکومت ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفید فام تاجر آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر قابض ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اب گلی کوچوں اور بازاروں میں شاہی منادیوں آواز لگاتا ہے "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔" فسق و فجور عام ہے، ہر طرف بے عملی کا دور دورہ ہے کفار چاق و چوبند ہیں اور مسلمان تغافل اور تفاخر میں مبتلا ہیں۔"

شاہ اسحاق نے کہا "تم ہندوستان واپس جاؤ گے اور شاہ ولی اللہ کی تحریک کو آگے بڑھاؤ گے!"

امداد اللہ نے پوچھا "شاہ ولی اللہ کی تحریک کا نصب العین کیا ہے اور وہ ہندوستان میں کیسا انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے؟"

شاہ اسحاق نے جواب دیا "ہم تمھیں شاہ صاحب کی تحریک کے نصب العین سے اچھی طرح باخبر کر دیں گے اور یہ تحریک کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے ان تدابیر پر بھی روشنی ڈالیں گے۔"

امداد اللہ شاہ اسحاق کے پاس رہنے لگے۔ انھیں یہ خیال بھی ستاتا رہتا تھا کہ رسول اللہؐ نے انھیں طلب فرمایا ہے اور وہاں حاضری دینا ضروری ہے لیکن انھوں نے سوچا کہ پہلے شاہ صاحب کی تحریک اور اس کا نصب العین سمجھ لیا جائے کیونکہ اس تحریک کا تعلق بھی رسول اللہؐ کی منشا اور رضا ہی سے ہوگا۔



شاہ اسحاق نے ہندوستان کی بربادی اور تباہی کے دو سبب بتاتے ہوئے کہا "شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کی زبوں حالی کے دو بنیادی سبب معلوم کر لیے تھے۔ پہلا سبب یہ ہے کہ ملک میں خاص خاص طبقے اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ کچھ کیے دھرے بغیر اپنے کسی خاص امتیاز کی بنا پر مراعاتِ حقوق کے مستحق قرار پائیں۔ یہ لوگ قاری، عالم، شاعر اور وہ سجادہ نشین درویش ہوتے ہیں جو بادشاہوں کی طرف سے عطیے اور وظیفے پاتے ہیں۔ ان کا مطمح نظر ملک اور قوم کی خدمت کرنا نہیں محض دریوزہ گری ہوتا ہے۔ یہ حضرات بھیک کے نئے نئے ڈھنگ نکال لیتے ہیں۔ مختلف حیلے بہانوں سے بادشاہ اور امرا سے رقمیں وصول کرنا اور اپنا ذریعہ معیشت فراہم کرنا ان کا نصب العین ہوتا ہے۔ ان مہذب دریوزہ گروں کا ایک گروہ جاتا ہے تو دوسرا نازل ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ ملکی باشندوں کی زندگی تنگ کر رہے ہیں اور ملک اور قوم پر بارِ گراں بنتے جا رہے ہیں۔

خرابی اور بربادی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ کاشت کاروں، سوداگروں اور دست کاروں پر بھاری بھاری محصول لگائے گئے ہیں اور ان کی وصولیابی میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جبر و تشدد اور بھوک اور افلاس میں مبتلا وفادار رعایا بھی بغاوت پر اتر آتی ہے۔ اس بغاوت کو دبانے کے لیے غیر معمولی فوجی طاقت کی ضرورت پڑتی ہے اور اس غیر معمولی فوجی قوت کے مصارف بھی رعایا ہی سے جبر و تشدد سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ مہذب دریوزہ گروں کی پرورش اور فوجی قوت کے غیر معمولی مصارف نے ملک اور قوم کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔"

امداد اللہ نے ملکی اور قومی تباہی اور بربادی کا یہ دل نشیں اور پراثر تجزیہ سنا تو جذباتی ہو گئے، پوچھا "پھر ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کن باتوں پر منحصر ہے؟"

شاہ اسحاق نے جواب دیا "ملک کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں محصول کم سے کم ہوں اور دفاع پر بقدرِ ضرورت صرف کیا جائے اور حالات ایسے پیدا کیے جائیں کہ اندرونی بغاوت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

یہ اتنا بڑا انکشاف تھا کہ اس کے بوجھ نے امداد اللہ کو گم صُم کر دیا اور وہ اس مختصر تقریر پر گھنٹوں غور کرتے رہے۔ اُس وقت پورا ہندوستان ان کے سامنے تھا۔ پورا ہندوستان اور اس کا گھن لگا معاشرہ اپنے طبقات کے ساتھ ایک ایک کر کے ان کے عرصۂ خیال سے گزرنے لگا۔ امرا، شعرا، دُنیادار سجادہ نشین، خانقاہوں کے مجاور، خود غرض اور زمانہ ساز علما، یہ سب گِدھوں کی طرح ملک اور قوم کے نیم جاں جسم سے چمٹے ہوئے نوچنے کھانے میں مصروف دکھائی دیے۔ ملک اور قوم کا نیم جاں جسم کاشت کاروں، دست کاروں، تاجروں اور مزدوروں کا تھا۔ امداد اللہ نے سوچا کہ وہ تو ایک ایسی سمت میں جانے والے تھے جہاں دُنیا اور اہلِ دُنیا کی نفی ہو جاتی تھی لیکن خدا انھیں دنیا والوں کی طرف لے جا رہا تھا۔ پھر انھیں یاد آیا کہ انھوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت میاں جی نور محمد سے طلب بھی تو یہی چیزیں کی تھیں۔ انھوں نے حضرت میاں جی سے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھ سے کوئی عظیم کام لے۔ اپنی عظیم خدمات، اتنی عظیم کہ ان سے خدا کی مخلوق فیض یاب ہو، فائدہ اٹھائے۔ انھوں نے خیال کیا کہ ان کی خواہش پوری کی جا چکی ہے اور خدا ان سے جس نوع کی خدمات لینا چاہتا ہے وہ وہی ہیں جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی اور جن سے خدا کی مخلوق عظیم فائدے اٹھائے گی۔ اب ان کا شاہ اسحاق کی صحبت میں رہنے اور ان کی تقریریں سُننے میں اتنا جی لگنے لگا کہ ہر وقت یہی جی چاہتا کہ شاہ اسحاق بولتے رہیں اور وہ سُنتے رہیں۔

ایک دن شاہ اسحاق نے کہا: "کیا تم واقف ہو کہ رسُول اللہ ﷺ اس دنیا میں کیوں تشریف لائے تھے؟"

امداد اللہ نے جواب دیا: "واقف ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جو غرض و غایت آپ بتائیں گے وہ زیادہ حقیقی اور اعلا و ارفع ہوں گی اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ میرے جواب کے بجائے خود ہی اس سوال کا مفصل اور مشرح جواب عنایت فرما دیں۔"

شاہ اسحاق نے جواب دیا: "رسُول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت دنیا کی یہ حالت تھی کہ دُنیا عیش و عشرت میں بُری طرح مبتلا تھی اور شاہانہ تکلفات کا مرض اقتصادی توازن کو دیمک کی طرح چاٹ چکا تھا ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے دل میں القا کیا کہ وہ اس کا ایسا علاج کریں کہ مرض بھی ختم ہو جائے اور اس کا زہریلا مادہ بھی فنا ہو جائے چنانچہ آپ نے ان اسباب و وجوہ پر غور فرمایا جن سے اس مرض کے جراثیم نشو و نما پا رہے تھے۔ پھر آپ نے ان کا علاج کیا اور ایک صالح گروہ پیدا کر دیا۔"

امداد اللہ نے بے بسی سے کہا: "حضرت! آپ جو کچھ فرماتے ہیں اس میں معیشت اور اقتصادیات پیش پیش ہیں، آپ روحانیات کا ذکر بھی تو فرمائیں۔"

شاہ اسحاق نے جواب دیا: "تباہ حال معیشت اور بُری اقتصادی حالت جسم اور رُوح دونوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے اس لیے اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، کسی حال میں اور کسی وقت بھی۔"

۱۲ اس دن شاہ اسحاق نے انھیں جو تعلیم دی اور تقاریر کے ذریعے جو کچھ بتایا وہ شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ سے لیا گیا تھا۔ شاہ اسحاق نے شاہ ولی اللہ کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا۔

"اربابِ حکومت کا ٹھاٹھ اور تفاخر (ایک کا دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہنے کا مرض) معاشرے کا مزاج بگاڑ دیتا ہے۔ اس کا اثر یوں ظاہر ہوتا ہے کہ ہر صاحبِ اقتدار اپنے ماتحت کو لوٹنے لگتا ہے زمیندار اور جاگیر دار کاشت کاروں کا خون چوسنے لگتے ہیں اور جنھیں غریب مزدوروں اور دست کاروں پر اختیار ہوتا ہے وہ ان کے استحصال میں لگ جاتے ہیں اور بالآخر ماتحت طبقے اتنے گر جاتے ہیں کہ ان کی زندگی اور معیارِ زندگی کھیت جوتنے والے بیلوں اور بوجھ اٹھانے والے گدھوں اور گھوڑوں کے مانند ہو جاتی ہے۔ زرکشی اور زراندوزی کے نئے نئے قانون بننے لگتے ہیں۔ انسان کی پیدائش کا حقیقی مقصد انسانوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ایک طبقہ حد سے بڑھی ہوئی عیش اور دولت کی ہوس میں مبتلا ہو کر عقل و فکر کی چمک سے محروم ہو جاتا ہے اور دُوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں رہتا ہے کہ فکرِ فردا نام کی کوئی شے اس کے سامنے باقی نہیں رہتی اور اس صُورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملک اور قوم کی تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور ان چند افراد کا سربراہ بادشاہ ہوتا ہے!"

امداد اللہ حیرت زدہ اور مبہوت پلک جھپکائے بغیر شاہ اسحاق کی تقریر سُنتے رہے۔ یہ عجیب و غریب علم تھا۔ عجیب انکشافات تھے۔ ان کے دل و دماغ پر افکار کا بوجھ کسی پہاڑ کی طرح گر رہا تھا اور وہ خود کو اس میں دبتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ شاہ اسحاق کی تقریر جاری تھی، وہ کہہ رہے تھے: "اقتصادی عدمِ توازن اور طبقۂ اعلا کی شان و شوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرا طبقہ پیدا کر دیا۔ یہ طبقہ تن آسان، آرام طلب، سرکار پرست خوشامدیوں کا طبقہ ہے جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہو گیا ہے اور مختلف طریقوں سے رقمیں وصول کرتا رہتا ہے۔ ان میں خانقاہ نشین اور شعرا بھی شامل ہیں۔ بھانڈ اور مسخرے بھی انھی میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے لوگ بھی انھی میں شامل ہیں۔ فنونِ لطیفہ اور ادب اور شاعری کے لوگ بادشاہ کو ہمیشہ یہ باور کراتے رہتے ہیں کہ شانِ خسروانہ

کا اظہار اسی طرح ہوتا ہے کہ بادشاہ ان کی سرپرستی کرتے رہیں۔"

امداد اللہ نے سہم کر دریافت کیا "حضرت! اور کچھ؟"

شاہ اسحاق نے کہا "ایسے تمام لوگ جنھیں لازمۂ تمدن مانا جاتا ہے درحقیقت مفت خورے ہیں۔ اپنے فن یا خوش گپیوں سے بادشاہ کو خوش کرنا کوئی مقصد نہیں یہ مٹھی بھر لوگ مزدوروں اور کسانوں پر بار بن گئے ہیں اور اس طرح خدا کی بیشتر مخلوق روز بروز افلاس، فلاکت اور تباہ حالی میں مبتلا ہو کر مادی اور روحانی فلاح و بہبود سے محروم ہوتی جا رہی ہے اور پورے ملک میں تمھیں ایک انسان بھی ایسا نہ ملے گا جسے عاقبت کی فکر ہو۔ امداد اللہ! ذرا اس قوم کا تصور تو کرو جس کی گردن پر ملوکیت، شاہ پرستی اور سرمایہ داری کا بھوت سوار ہو چکا ہو۔ اس کے ہوش و حواس گم ہو چکے ہوں گے اور وہ انسانی شرف و عظمت سے گر کر چوپایوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکی ہو گی، جسے دن رات پیٹ کی فکر رہتی ہو اور یہ جہنم ہے کہ بھرنے کا نام ہی نہ لے۔"

اسی طرح شاہ اسحاق انھیں ہر روز تعلیم دیتے رہے اور امداد اللہ اسے ذہن و طبیعت میں محفوظ کرتے رہے۔ جب وہ ان امراضِ مزمنہ کے پیشِ نظر تحریک اور اس کی کامیابی پر غور کرتے تو دل اُلجھ جاتا۔ کام بہت بڑا تھا اور اسے کامیابی سے چلانا نہایت غیر معمولی کام تھا کیونکہ اتنے بہت سارے امراض کا علاج کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا، قوم اور ملک کے جسم میں جو امراض موجود تھے۔ ان میں بہت تو ایسے تھے جو دو مرضوں یا کئی مرضوں کے عمل اور ردِ عمل سے پیدا ہوئے تھے اور ان میں ایک مرض کا علاج دوسرے کے لیے زہر تھا۔ ان پیچیدہ امراض کے علاج میں وہی مشکل درپیش تھی جو ایک معالج کو اس وقت پیش آتی ہے جب وہ مالیخولیا اور بخار میں مبتلا کسی مریض کا علاج کرتا ہے، اگر معالج بخار کے فساد سے بچنے کے لیے ترکِ غذا کا حکم دیتا ہے تو ترکِ غذا سے مالیخولیا میں شدت پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح مالیخولیا کو زائل کرنے کے لیے اگر مریض کو اچھی اچھی غذائیں کھانے کا مشورہ دیتا ہے تو بخار سے نقصان پہنچنے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔

شاہ اسحاق کی صحبت اور تقریروں نے امداد اللہ کے دل میں ایک آگ لگا دی تھی۔ وہ جلد از جلد مدینہ منورہ جانے کے لیے بے چین تھے۔ راستے مخدوش تھے اور راہ میں لٹ جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ امداد اللہ نے خوف و خطر کو دل سے دور کیا اور مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ مدینے میں رسول اللہ صلعم کے آستانے پر حاضری دی اور جو ذمہ داریاں اور فرائض انھیں سونپے جا رہے تھے، ان سے عہدہ برآ ہونے کی دعا مانگی۔

اس کے بعد آپ ہندوستان واپس گئے۔ اب ان کے

ایک مصلح کے بارے میں سنا گیا کہ وہ جھوٹ بولنے لگا ہے۔ ایک دن چند آدمیوں نے اس کا راستہ روک لیا اور کہا "تم لوگوں کو گمراہ کر رہے ہو!"

مصلح نے جواب دیا "اگر میں گمراہ کر رہا ہوں تو یہ گمراہی عارضی ہو گی کیونکہ مجھے اس بات پر یقین ہے کہ جس جھوٹ کو تم میری ذات سے منسوب کر رہے ہو، وہ شیطان تک نہیں بولتا!"

لوگوں نے حیرت سے سوال کیا "کیا کہا، شیطان جھوٹ نہیں بولتا؟"

"ہاں شیطان جھوٹ نہیں بولتا!"

"وہ کس طرح؟ ہم تمھاری بات پر کس طرح یقین کر لیں؟"

مصلح نے جواب دیا "میرے سادہ لوح دستو! یاد رکھو۔ اگر شیطان جھوٹ بولتا تو کب کا مر چکا ہوتا لیکن وہ تمھارے بقول ابھی زندہ ہے اور اس کا زندہ ہونا ہی اس کے سچے ہونے کی دلیل ہے کیونکہ حیاتِ جاوداں کے لیے صداقت لازمی اور ضروری ہے۔"

زیرِ مطالعہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ تھی جس میں وہی تعلیمات بالتفصیل موجود تھیں جو شاہ اسحاق تقاریر کی شکل میں دے چکے تھے۔ اس کتاب میں 'فک کل نظام' کی دعوت دی گئی تھی۔ فک کل نظام کا مطلب تھا ہمہ گیر انقلاب۔ سماجی اور سیاسی زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب اور اس انقلاب کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ فوجی طاقت سے برپا کیا جائے۔ آپ نے جس جگہ قیام کیا تھا وہاں حسن علی شاہ نامی ایک بزرگ بیٹھا کرتے تھے۔ امداد اللہ کو دیکھتے ہی انھوں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور دوسری جگہ چلے گئے۔ امداد اللہ کو یہاں یکسوئی سے بیٹھ کر ایک عظیم الشان منصوبہ بنانا تھا۔ امداد اللہ کی تیز نظریں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ معاشرتی اور سیاسی زندگی کا ہر شعبہ اتنا داغدار تھا کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں کہاں پھایا رکھا جائے۔ امداد اللہ جس جگہ قیام فرما تھے حضرت میاں جی نور محمد ملاقات کو پہنچے اور مل کر بہت خوش ہوئے۔ پڑوس میں ایک ایسا خاندان بھی رہتا تھا جو اس جگہ کی ملکیت کا دعوے دار تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ یہ جگہ حکومت اسے دے دے۔ میاں جی نور محمد کی بزرگی کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی "حضرت! آپ خدا سے دعا کریں کہ یہ جگہ سرکار میرے نام کر دے۔ آپ مستجاب الدعوات ہیں، خدا آپ کی دعا رد نہیں کرے گا۔"

میاں جی نے فرمایا "ہم ایک شرط پر دعا کرنے کو تیار ہیں۔"

اس شخص نے کہا "ارشاد، میں ہر ممکنہ شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔"

میاں جی نے کہا "ہمارے امداد کو بیٹھنے کی تکلیف ہے۔ اگر تم بعد قبضہ اس جگہ ایک سہ دری بنوانے کا وعدہ کرو تو ہم تمھارے حق میں دعا کریں گے

اور اس سہ دری میں امداد اللہ رہیں گے۔"

اس شخص نے وعدہ کر لیا۔" مجھے منظور ہے، آپ دُعا فرمائیں۔"

میاں جی نے جاتے جاتے کہا۔" ہم دُعا کرتے ہیں، تم سہ دری کی تعمیر کا بندوبست کرو!"

کچھ عرصے بعد یہ شخص میاں جی کے پاس پہنچا اور انھیں حکومت کا وہ پروانہ دکھایا جس میں سرسری طور پر یہ اطلاع دی گئی تھی کہ حکومت نے اس کے حقِ ملکیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس شخص نے خوش ہو کر کہا۔" یہ سب کچھ آپ کی دُعا سے ہوا ہے۔"

میاں جی نے پوچھا۔" لیکن تمھیں اپنا وعدہ بھی یاد ہے؟"

اس شخص نے ذرا منہ بنا کے جواب دیا۔" جی ہاں مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن ایک مشکل پیش آگئی ہے جس نے مجھے تشویش میں ڈال دیا ہے۔"

میاں جی نے پوچھا۔" کیسی مشکل؟ کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔"

اس شخص نے جواب دیا۔" حضرت آپ سے کیا چھپانا، بات دراصل یہ ہے کہ میری مالی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اُس وقت میں نے آپ سے سہ دری بنانے کا جوش میں آ کے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن اب جو اپنی مالی حالت پر غور کرتا ہوں تو خود کو اس کا اہل نہیں پاتا۔"

میاں جی نے بے نیازی سے پوچھا۔" پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

جواب ملا۔" میں جزوی وعدہ پورا کر دوں گا، یعنی پوری سہ دری کی جگہ نصف تعمیر کرا دوں گا۔"

میاں جی نے لاپروائی سے کہا۔" اچھا آدھی ہی سہی، جیسی تمھاری مرضی۔"

یہ شخص واپس گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد دوبارہ حاضر ہوا، اب اس کے ہاتھ میں حکومت کا ایک اور کاغذ تھا۔ اس نے یہ کاغذ میاں جی کی طرف بڑھا دیا۔ بولا۔" حضرت غضب ہو گیا، ستم ہو گیا، ذرا اسے ملاحظہ تو فرمائیے!"

میاں جی نے یہ کاغذ لے لیا اور اسے پڑھنے لگے۔ اس میں حکومت نے اس شخص کو اپنے فیصلے سے مطلع کیا تھا کہ۔" حکومت نے اس زمین کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک تم زندہ رہو گے اس زمین کے مالک رہو گے لیکن مرنے کے بعد اس کا حقِ ملکیت حکومت کو واپس چلا جائے گا وہ جسے مناسب سمجھے گی دے دے گی۔"

میاں جی نے پوچھا۔" تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

اس شخص نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔" حضرت! آدمی جو محنت و مشقت کر کے جائداد بناتا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اس کی اولاد یا متعلقین اس سے محروم رہیں۔ آپ کو میرے معاملے میں ایک بار اور دُعا کرنا پڑے گی۔"

میاں جی نے جواب دیا۔" ہم دُعا کیا خاک کریں، تو نے تو خود ہی آدھا کر دیا تھا۔ اب یہ شکایت کس بات کی؟"

اس شخص کی سمجھ میں معاملہ آگیا، بولا۔" میں وعدہ کرتا ہوں کہ پوری سہ دری بنا دوں گا، میں قول سے پھر جانے پر نادم ہوں۔"

میاں جی نے کہا۔" اچھا اب واپس جاؤ اور امداد اللہ کے لیے سہ دری بنوانے کی تیاری کرو۔"

چند دنوں بعد اس شخص کو حکومت کی طرف سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ زمین کی ملکیت موروثی قرار پائی۔ اس نے خوش ہو کے امداد اللہ کے لیے سہ دری تعمیر کرا دی۔



امداد اللہ نے اپنے حصے کی جائداد بھی بھائیوں کو دے دی اور خود عسرت اور تنگ دستی میں گزر کرنے لگے۔ آنے جانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان میں نہایت پڑھے لکھے لوگ بھی شامل تھے۔ ان پڑھے لکھے لوگوں سے ایک ایسی فہرست تیار ہونے لگی جو ہمہ گیر انقلاب میں ان کے ساتھی بننے والے تھے۔ ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولوی محمد ضامن اور مولانا رشید احمد گنگوہی سرِ فہرست تھے۔ ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے کے موضوع پر گھنٹوں بحثیں ہوتیں اور ایک شاندار فوجی انقلاب لانے کی تدابیر زیرِ بحث آتیں۔ آنے والوں میں ایک میر عبدالغنی بھی تھے۔ ان کی آمد و رفت اچانک موقوف ہو گئی۔ امداد اللہ نے کسی سے دریافت کیا۔

"کیا بات ہے، کئی دن سے میر عبدالغنی نظر نہیں آئے۔"

کسی نے جواب دیا۔" حضرت، ان کا نہایت حسین و جمیل لڑکا انتقال کر گیا ہے۔ اس صدمے نے انھیں پاگل کر دیا ہے، وہ اپنے ہوش و حواس ہی میں نہیں۔ مخبوط الحواس ہو گئے ہیں۔ آئیں تو کیونکر آئیں۔"

آپ نے کہا۔" بھئی انھیں ایک بار ہمارے پاس تو لاؤ، ہم انھیں درست کر دیں گے۔"

جواب ملا۔" کوشش کریں گے۔ اگر آگئے تو آگئے ورنہ زبردستی لانا بہت مشکل ہے۔"

"بہر حال لانے کی کوشش کرو۔"

انتظار میں کئی دن گزر گئے اور میر عبدالغنی کو نہیں لایا جا سکا۔ ایک دن راہ میں امداد اللہ کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے مخبوط الحواس میر عبدالغنی کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ارشاد فرمایا۔

"عشق بر مُردہ نباشد پائیدار۔"

میر عبدالغنی نے جھرجھری لی اور ہوش میں آ گئے۔ بے اختیار سینے سے لگ کر رونے لگے۔

اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے۔ ان کا یہی کام رہ گیا تھا کہ وہ سماجی اور سیاسی احوال کا جائزہ لیتے رہیں۔ اس دوران شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیف نے کچھ اور انکشافات کیے، ایسے انکشافات جس سے دل و دماغ لرز جائیں اور جن کی صداقت ابدی تھی۔ شاہ ولی اللہ اپنی کتاب میں یہ اسرار کر رہے تھے: "زمین کا حقیقی مالک اللہ ہے لیکن ظاہری نظام کے لحاظ سے مملکت ہے، باشندگان ملک کی حیثیت کسی مسافر خانے میں ٹھہرے ہوئے مسافروں جیسی ہے۔

سارے انسان برابر ہیں اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ خود کو دوسرے انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے۔

ملک کے سربراہ کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی ہوتی ہے۔ سربراہ وقف کے متولی کی طرح اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ ملک کے عام باشندے کی طرح زندگی گزار سکے۔"

شاہ ولی اللہ کی اس کتاب میں اقتصادی اصول بھی موجود تھے۔ یہ بھی اپنی نوعیت اور تعریف کے اعتبار سے منفرد اور عجیب و غریب تھے۔ ان میں وہ حقائق بیان کیے گئے تھے جو عام فہم نہ تھے اور قبل از وقت تھے جن کے رواج کے لیے یہ ضروری تھا کہ پہلے انسانوں میں ذہنی انقلاب برپا کیا جاتا اور جو مستقبل کی قسمت تھے۔ مزدور اور کاشت کار جن کا معاشرے میں کوئی مقام نہ تھا، ان کے لیے شاہ ولی اللہ نے یہ لکھا تھا۔

"دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ مزدور اور کاشت کار قوتِ کاسبہ ہیں۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لیے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں۔

مزدور اور کاشت کار اور وہ لوگ جو ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں، ان کی ترقی اور خوش حالی ملک اور قوم کی ترقی اور خوش حالی ہے۔ جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لیے خطرہ ہے اور اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

جو سماج محنت کی صحیح قیمت نہ ادا کرے، مزدوروں اور کاشت کاروں پر بھاری محصول لگائے قوم کا دشمن ہے۔ اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

ضرورت مند مزدور کی رضامندی قابلِ اعتبار نہیں جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت نہ ادا کی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر لازم آتی ہے۔

کام کے اوقات محدود کیے جائیں اور مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقے میں محصور کر دے، ملک کے لیے تباہ کن ہے۔

روٹی، کپڑا اور مکان اور ایسی استطاعت کہ آدمی شادی کر سکے اور بچوں کو تعلیم و تربیت دے سکے، بلا لحاظ مذہب و نسل ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

وہ شاہانہ نظامِ زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کے عیش و عشرت کی وجہ سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو رہا ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر دیا جائے تاکہ عوام کی مصیبت ختم ہو جائے اور ان کو مساویانہ نظامِ زندگی کا موقع ملے۔"

فوجی تیاریوں کو جہاد کا نام دیا گیا اور طے یہ پایا کہ پہلے مغل فرماں روا کو حمایت و تائید میں لیا جائے۔ اس کے بعد ملک کی سب سے بڑی قوت انگریز کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے اور انھیں ملک سے نکال باہر کیا جائے۔ ایک فوجی تنظیم قائم کی گئی اور اس تنظیم کا امیر امداد اللہ کو بنا دیا گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حافظ ضامن اور مولانا محمد منیر کو فوج، حفاظت، عدل و قانون وغیرہ کے شعبے دیے گئے اور یہ طے پایا کہ مغل تاجدار کو بھی اس تنظیم میں شامل کر لیا جائے۔ بادشاہ کے منہ چڑھے نواب شبیر علی مرادآبادی کو بادشاہ کے پاس روانہ کر دیا گیا تاکہ وہ اس انقلابی تنظیم کے اغراض و مقاصد سے بادشاہ کو اچھی طرح آگاہ کر دیں۔ انگریز بھی اس تنظیم سے غافل نہیں تھے۔ اسی دوران رئیس تھانہ بھون قاضی عنایت علی کے بھائی عبدالرحیم سہارنپوری ہاتھی خریدنے تشریف لے گئے۔ سہارنپور کے انگریز مجسٹریٹ (اسپنکی) نے انھیں گرفتار کر لیا اور پھانسی پر لٹکا دیا۔

جنرل بخت خان دہلی میں فوجوں کی قیادت کر رہے تھے اور جنرل بخت خان کی نگرانی مولانا سردار علی کر رہے تھے۔ یہ مولانا بھی اسی تنظیم کے آدمی تھے۔ اسی دوران امداد اللہ بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دہلی پہنچ گئے۔ انھوں نے جامع مسجد میں بادشاہ سے ملاقات کی اور اسے اپنے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا۔ بادشاہ میں اتنا دم ہی نہ تھا کہ وہ ان کی مخالفت کرتا۔ ایک طرف تو وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا، دوسری طرف وہ امداد اللہ کی تنظیم کا ساتھ دینے پر آمادہ تھا۔ بادشاہ میں قوتِ فیصلہ تھی ہی نہیں۔ جو سامنے آتا وہ اسی کے ساتھ ہو جاتا۔ اس کے نزدیک

اور مرغِ باد نما کی طرح سمتیں بدلنے والے بادشاہ کی تائید سے اس انقلابی تنظیم کو یہ خوش فہمی پیدا ہو گئی کہ دہلی میں صالح نظام کے قیام کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔ علمائے کرام نے اپنی طرف سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کر دیا اور امیرِ تنظیم امداد اللہ پر دباؤ ڈالنے لگے کہ وہ بھی فتوے کی توثیق کر دیں۔ اس مقصد کے لیے ایک مجلس بیٹھی اور معاملات مذکور زیرِ بحث آئے۔ اس مجلس کا ایجنڈا تھا "اعلانِ جہاد"۔

اجلاسِ شوریٰ میں تمام حاضر ارکان نے اقدام (جہاد) کا فیصلہ کیا۔ صرف ایک بزرگ مولانا شیخ محمدؒ تھانوی نے مخالفت کی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے شیخ محمدؒ کو مخاطب کرتے ہوئے ادب سے عرض کیا۔ "حضرت! کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنانِ دین (انگریزوں) پر جہاد کو فرض بلکہ جائز تک نہیں قرار دے رہے ہیں؟"

مولانا محمد محدث نے جواب دیا "اس لیے کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلاتِ جہاد موجود نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سر و سامان ہیں۔"

مولانا قاسم نانوتوی نے کہا "کیا ہمارے پاس اتنا سامان بھی موجود نہیں جتنا کہ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے پاس موجود تھا؟"

مولانا محمد محدث نے کہا "اگر آپ کی تمام حجتیں اور باتیں مان لی جائیں تو سب سے بڑی شرطِ جہاد نصبِ امام کی ہے۔ وہ شخص کہاں ہے جسے امام بنا کر اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے؟"

مولانا قاسم، امداد اللہ کی طرف بڑھتے ہوئے بولے "نصبِ امام میں کتنی دیر لگتی ہے، مرشدِ برحق حضرت حاجی امداد اللہ ہم میں موجود ہیں انھیں کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی جائے۔"

شریکِ مجلس اور جنگی امور کے نگراں مولانا ضامن نے کہا "مولانا بس کیجیے، بات سمجھ میں آگئی۔"

اس کے بعد مجلس کے سبھی حضرات، امداد اللہ کی طرف بڑھے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ اس کے بعد سرفروشوں کا قافلہ شاملی (مظفر نگر) کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں کا راجا پہلے ہی سے انگریزوں کے خلاف تھا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ حاجی امداد اللہ تو امام تھے اور مولانا قاسم نانوتوی سپہ سالار۔ مولانا رشید احمد گنگوہی قاضی۔ مولانا منیر اور حافظ ضامن میمنہ اور میسرہ کے افسر تھے۔ ان لوگوں کے آس پاس لوگ جمع ہونے لگے اور بہت جلد اتنی طاقت ہو گئی کہ تھانہ بھون کے آس پاس سے انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیے گئے اور ان حضرات نے یہاں کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ اسی دوران میں انھیں خبر ملی کہ انگریزی توپ خانہ حرکت میں آ چکا ہے۔ انگریزی توپ خانہ جدید اسلحہ سے لیس تھا اس کے برعکس ان حضرات کے پاس تلواریں

مولانا رومیؒ

کی صحبت میں عقل و دانش کی باتیں چھڑی ہوئی تھیں، دورانِ گفتگو کسی شخص نے مولانا سے سوال کیا "حضرت! جب خدا کسی کو اس کے اعمال کی پاداش میں رسوا کرنا چاہتا ہے تو اس سے کس قسم کے اعمال سرزد کراتا ہے؟"

مولانا رومی نے جواب دیا "اسے اپنے بزرگوں پر لعن طعن کرنے پر مائل کر دیتا ہے۔"

تھیں۔ توڑے دار بندوقیں تھیں اور برچھے تھے۔ توپ کسی کے پاس بھی نہ تھی۔ جب انگریزی توپ خانہ ایک باغ کے کنارے سے گزر رہا تھا۔ تو باغ میں چھپی ہوئی جمعیت نے اس پر اچانک حملہ کر دیا اور سراسیمہ اور بدحواس انگریزی توپ خانے والوں کو شکست دے کر سامان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد شاملی پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ یہ مقابلے جاری ہی تھے کہ حافظ ضامن شہید ہو گئے۔ کہتے ہیں انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی میں مشہور بزرگ حضرت فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی بھی شریک تھے عین جنگ کے دوران یہ انگریزوں کے مقابلے سے ہٹ گئے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک طرف روانہ ہو گئے، کسی نے ان سے سوال کیا "حضرت! آپ کہاں تشریف لیے جاتے ہیں؟"

مولانا فضل الرحمٰن نے جواب دیا "انگریزوں سے جنگ کرنے کا فائدہ؟ میں نے ان کی صفوں میں خواجہ خضر کو دیکھا ہے، تم لوگ ناکام رہو گے۔"

اسی عالم میں یہ معلوم ہوا کہ دہلی پر انگریز قابض ہو گئے اور مغل بادشاہ گرفتار کر لیا گیا۔ دہلی کے تسلط کے بعد انگریزوں نے قرب و جوار کو سر کرنا شروع کر دیا۔ شاملی، سہارنپور اور مظفر نگر کی باری بھی آ گئی۔ حاجی امداد اللہ کی جماعت نے انگریزوں کو روکنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ تحریک کے بنیادی ارکان اِدھر اُدھر روپوش ہو گئے۔ انگریزی حکومت نے ان کے نام وارنٹ جاری کر دیے۔ حاجی امداد اللہ پنجلاسہ (انبالہ) پہنچ گئے۔ یہاں کا رئیس راؤ عبداللہ خاں آپ کا بہت معتقد تھا۔ انگریزوں کا وفادار لیکن آپ کا ارادت مند۔ کوئی دوسرا ہوتا تو حاجی امداد اللہ جیسے باغی کو اپنے گھر میں ہرگز پناہ نہ دیتا۔

راؤ عبداللہ خاں آپ کو تخلیے میں لے گیا اور آہستہ سے سوال

کیا "حضرت! رات کی تاریکی میں یہاں تک آتے ہوئے آپ کو کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

آپ نے جواب دیا "راؤ عبداللہ! تم گھبراتے کیوں ہو؟ ہم تمھارے گھر میں نہیں رہیں گے۔"

راؤ نے عقیدت سے کہا "پنجلاسہ میری جاگیر ہے، اس جاگیر میں میرے ہوتے ہوئے آپ کہیں اور نہیں ٹھیر سکتے۔"

آپ نے فرمایا "ہم نے یہ کہا ہے کہ تمھارے گھر میں نہیں رہیں گے کیونکہ افرنگی ہمیں، ہمارے نقشِ پا کے سہارے ڈھونڈتے چلے آرہے ہیں۔"

راؤ ان کی باتیں نہیں سمجھ سکا، بولا "حضرت! میں آپ کا اشارہ نہیں سمجھا۔"

آپ نے جواب دیا "ہم تمھارے اصطبل کی اس کوٹھری میں رہ لیں گے جس میں تم اپنے مویشیوں کا چارہ وغیرہ رکھا کرتے ہو۔"

راؤ کو آپ کی بات سے دُکھ پہنچا، بولا "یہ میں کس طرح گوارا کرسکتا ہوں کہ آپ میری موجودگی، علم اور جاگیرداری میں ایسی بُری جگہ اقامت فرمائیں۔"

آپ نے متبسّم ہوکر فرمایا "جو ہم کہتے ہیں اس میں تم دخل مت دو کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری اور تمھاری بہتری اسی میں ہے۔"

راؤ نے ہر طرح یہ کوشش کی کہ حاجی امداد اللہ اپنی اقامت کے لیے کوئی اور جگہ پسند فرمالیں لیکن یہ نہیں مانے اور مجبوراً آپ کی جائے نماز، لوٹا اور ایک چوکی مویشیوں کے چارے اور گھاس کی کوٹھری میں پہنچا دی گئیں۔



فجر کی نماز سے فارغ ہوکر راؤ عبداللہ خان لوگوں کی نظروں سے بچتے ہوئے حاجی صاحب کی کوٹھری میں پہنچا۔ اس وقت تک سُورج طلوع ہوچکا تھا اور حاجی صاحب نمازِ اشراق ادا فرما رہے تھے۔

راؤ عبداللہ خان انھیں نماز میں مشغول دیکھ کر واپس آگئے۔ یہ ابھی اپنی حویلی کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی سپاہ کی ایک گارد آتی دکھائی دی۔ انگریز کلکٹر آگے آگے تھا۔ یہ کلکٹر ہونے کے ساتھ ہی مجسٹریٹ ضلع بھی تھا۔ راؤ عبداللہ خان اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر سنکا اور خطرے کی بو محسوس کرنے لگا۔ پھر یہ سوچ کر کہ جو ہونا ہے ہوکر رہے گا عاجز اور بے بس انسان کا مشیّتِ ایزدی میں کیا دخل، ہمت کرکے مجسٹریٹ کے استقبال کو آگے بڑھا اور سلام دُعا کے بعد نہایت تپاک سے ہاتھ ملایا

اور کہا "جناب والا! زہے نصیب کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ خوش قسمتی۔ بلند طالعی، آیئے تشریف لایئے، اس وقت صبح صبح زحمت فرمائی کا کوئی تو مقصد ہوگا، براہِ کرم اس سے مطلع فرماکر اِس ناچیز کو خدمت گزاری کا موقع عطا فرمائیں۔"

مجسٹریٹ راؤ کی خوش اخلاقی سے متاثّر ہوا۔ کہاں تو یہ ارادہ کرکے آیا تھا کہ اچانک چھاپہ مار کر حاجی امداد اللہ کو برآمد کرے گا لیکن راؤ کے اطمینان، اعتماد اور خوش اخلاقی نے اسے مذبذب کردیا۔ اسے جس مخبر نے خبر دی تھی اُس نے یہاں تک بتادیا تھا کہ حاجی صاحب اصطبل یا اس کے آس پاس موجود کوٹھڑیوں میں سے کسی ایک میں روپوش ہیں مجسٹریٹ کو یقین تھا کہ وہ حاجی صاحب کو یہیں کہیں سے برآمد کرلے گا۔ راؤ عبداللہ خان کی خوش اخلاقی کا پُرجوش خوش اخلاقی سے جواب دیا "راؤ صاحب! ہم نے یہ سُن رکھا ہے کہ آپ کے اصطبل میں بڑے اچھے اچھے اور اعلا نسل کے گھوڑے موجود ہیں اور ان میں ایک ایسا گھوڑا بھی موجود ہے جس کی دُور دُور تک کوئی مثال نہیں ملتی، ہم تمھارا اصطبل دیکھنا چاہتے ہیں اور خاص کر وہ گھوڑا بھی، جس کا دُور دُور شہرہ ہے۔"

راؤ عبداللہ خان سناٹے میں آگیا لیکن اندر کی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا "جو کچھ آپ نے سُنا ہے، ممکن ہے سچ ہی ہو۔ اگر آپ کو ہمارے اصطبل کا کوئی گھوڑا پسند آگیا تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی اور ہم وہ گھوڑا بخوشی آپ کی نذر کردیں گے، آیئے ہمارے ساتھ تشریف لایئے اور اصطبل کے گھوڑے ملاحظہ فرمالیجیے۔"

مجسٹریٹ، راؤ عبداللہ خان کے ساتھ اس کے اصطبل میں داخل ہوگیا۔ راؤ عبداللہ خان نے ایک ایک کرکے اصطبل کے تمام گھوڑے دکھادیے۔ مجسٹریٹ گھوڑوں کے ساتھ ساتھ راؤ کے چہرے کا بھی جائزہ لیتا جارہا تھا۔ وہ راؤ کے چہرے پر خوف یا تشویش کے آثار دیکھنا چاہتا تھا لیکن راؤ میں ذرا بھی گھبراہٹ نہ پائی جاتی تھی۔ مجسٹریٹ کو اس مخبر پر غصہ آنے لگا جس نے اسے یہ جھوٹی خبر دی تھی کہ حاجی امداد اللہ، راؤ عبداللہ خان کے اصطبل وغیرہ میں کہیں روپوش ہیں۔ مجسٹریٹ اصطبل کے گھوڑوں کو دیکھتا بھالتا اس کوٹھری کے دروازے پر بھی پہنچ گیا جہاں حاجی صاحب واقعی روپوش تھے۔

مجسٹریٹ نے راؤ سے پوچھا "اور اس میں کیا ہے؟"

راؤ نے جواب دیا "یہ اصطبل نہیں ہے، اس میں گھاس اور مویشیوں کا دوسرا چارا رکھا جاتا ہے۔"

مجسٹریٹ نے پیشانی پر تردد کی شکنیں ڈالیں۔ بولا "گھاس اور

مویشیوں کا دُوسرا چارا ؟ کیا مطلب ؟ کیا مویشی گھاس کے علاوہ بھی کچھ کھاتے ہیں ؟"

راؤ نے جواب دیا " جی ہاں، دالیں، کھلی، چوکر، کربی، اسی طرح کی اور بہت ساری چیزیں ۔"

مجسٹریٹ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا " ذرا کھلوانا تو، ہم بھی تو دیکھیں کہ مویشی کون کون سی چیزیں اور کھاتے ہیں ۔"

راؤ کا دِل دھک دھک کرنے لگا، اللہ کا نام لے کر یہ کوٹھری بھی کھلوادی ۔ جب کوٹھری کے دونوں پٹ کھل رہے تھے تو راؤ کے دل کی کچھ عجیب سی کیفیت تھی ۔ کوٹھری کے دونوں پٹ کھُل گئے ۔ خالی چوکی، چوکی پر بچھا ہوا مصلاّ، کنارے لوٹا رکھا تھا اور چوکی کے نیچے کی زمین تر تھی گویا ابھی ابھی وضو کیا گیا تھا ۔ یہ تمام چیزیں موجود تھیں لیکن حاجی امداد اللہ کا کہیں پتہ نہ تھا ۔

مجسٹریٹ نے اپنے آدمیوں کی مدد سے کوٹھری کا کونا کونا چھان مارا لیکن حاجی امداد اللہ کا وہاں کہیں پتہ نہ تھا ۔ مجسٹریٹ چوکی، مصلّے اور لوٹے کی موجودگی کو کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا ۔ دریافت کیا " راؤ صاحب یہ سامان یہاں کیوں رکھا ہے ؟"

راؤ نے جواب دیا " جناب میں یہاں نماز پڑھتا ہوں ۔"

مجسٹریٹ نے گردن اُچکائی اور قدرے منہ ٹیڑھا کیا " آپ اس اصطبل میں، مویشیوں کے چارے کی کوٹھری میں نماز پڑھتے ہیں ؟ عجیب سی بات ہے، حالانکہ ہم نے یہ سنا ہے کہ مسلمان لوگ مسجد میں نمازیں پڑھتے ہیں ۔"

راؤ نے جواب دیا " آپ نے بھی درست ہی سُن رکھا ہے ۔ ہمارے مذہب میں نمازوں کی بابت یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر مسلمان فرض نمازیں تو مسجد میں ادا کرے لیکن نفلیں چھپا کر کسی چوری کی جگہ پر پڑھنی چاہییں اور اس حکم خداوندی کی تائید اور تعمیل میں ہم لوگ اشراق اور نفل نمازیں یہیں پڑھ لیا کرتے ہیں ۔"

لاجواب مجسٹریٹ مایوس ہو کر باہر نکلا اور اپنی راہ لینے سے پہلے آخری بار کہا " راؤ صاحب ! ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے تمہارا اتنا وقت برباد کیا ہے اس کا ہمیں ہمیشہ احساس رہے گا ۔"

راؤ نے انکسار سے جواب دیا " آپ قطعی افسوس نہ کریں کیونکہ آپ کو کسی اعلیٰ نسل کے گھوڑے کی تلاش تھی جو بدقسمتی سے ہمارے یہاں نہ نکل سکا لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ آپ ہمیشہ اپنی مطلوبہ شے نہ پا سکیں ۔ آپ مجھے ایک ذرا سا موقع عنایت فرمائیں ۔ میں آپ کی خواہش کسی بھی طرح پوری کرا دوں گا ۔"

مجسٹریٹ نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور چلا گیا ۔ راؤ دوبارہ اسی کوٹھری میں داخل ہوا، دیکھا، حاجی امداد اللہ نماز پڑھ رہے ہیں ۔ اس کی عقل چکرا گئی ۔ وہ کوئی سوال بھی نہ کر سکا اور اسے ان کی کرامت پر محمول کیا ۔

حاجی امداد اللہ کی طرف سے مولانا رشید گنگوہی بہت بے چین اور مضطرب تھے ۔ انھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ حاجی صاحب کہاں روپوش ہیں اور کیا ارادہ رکھتے ہیں ۔ آزادی سے کہیں تلاش بھی نہ کر سکتے تھے کیونکہ مولانا رشید احمد گنگوہی کا وارنٹ گرفتاری بھی کٹ چکا تھا اور وہ بھی انگریزوں کو مطلوب تھے ۔ اسی افراتفری میں کسی نے مولانا رشید احمد کو یہ خبر دی کہ حاجی امداد اللہ انبالہ کی جاگیر پنجلاسہ میں راؤ عبداللہ خان کے مہمان ہیں ۔ یہ چھپتے چھپاتے پنجلاسہ کے قریب پہنچ گئے اور بہ دقت تمام ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ یہ بہت روئے اور دریافت کیا " حضرت ! اب کیا منصوبہ ہے ؟"

حاجی امداد اللہ نے جواب دیا " مشیت کو ابھی وہ سب منظور نہیں شاید، جو ہم چاہتے ہیں اور وہ یہی کام شاید کسی اور سے لینا چاہتی ہے ۔"

مولانا گنگوہی نے سوال کیا " حضرت ! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا ۔"

حاجی امداد اللہ نے جواب دیا " ہماری باتوں کا جو مطلب ہے، وہ بہت صاف ہے، ہم مکہ معظمہ جا رہے ہیں اور وہیں سے اپنی تحریک جاری رکھیں گے ۔"

حضرت معروف کرخیؒ

کاموں کے آغاز اور انجام کی بابت اپنے مُریدوں کو بتا رہے تھے آپؒ نے کہا " دنیا کے بعض کام ایسے ہیں جن کا آغاز تلخ، لیکن انجام خیر میں ہوتا ہے اور بعض ایسے کہ ان کا آغاز شیریں ہوتا ہے اور انجام تلخ !"

کسی مُرید نے پوچھا " حضرت ان دونوں کی مثال دے کر وضاحت فرمادیں تو بڑا کرم ہوگا ۔"

حضرت معروف کرخیؒ نے جواب دیا " مثلاً نیکی اور گناہ، نیکی کا آغاز تلخ، لیکن انجام شیریں اور گناہ کا آغاز شیریں اور انجام تلخ ہوتا ہے ۔"

مولانا گنگوہی نے پوچھا "میرے لیے کیا حکم ہے ؟"
حاجی صاحب نے جواب دیا "تم یہیں ہندوستان میں رہوگے۔"
مولانا گنگوہی نے اضطراب سے پوچھا "میں آپ کی عدم موجودگی میں یہاں کیا کروں گا ؟"
حاجی صاحب نے جواب دیا "قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے اسی لیے ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم یہیں رہو اور فرمانِ خداوندی کا انتظار کرو۔"
مولانا گنگوہی کا دل بھر آیا اور وہ آنسو برسانے لگے۔ حاجی صاحب نے پوچھا "تم روتے کیوں ہو ؟"
مولانا گنگوہی نے جواب دیا "آپ کی مفارقت کا غم ایسا نہیں ہے کہ آسانی سے جھیل لیا جائے، بہر حال آپ فرماتے ہیں تو ہم یہیں ہندوستان میں رہیں گے اور وہ کام انجام دینے کی کوشش کریں گے لیکن ایک بات طے ہے وہ یہ کہ جلد یا بہ دیر انگریز ہمیں گرفتار کرلے گا۔ اس وقت آپ سے ملاقات کی کیا سبیل ہوگی ؟"
حاجی صاحب نے جواب دیا "تم واقعی گرفتار کرلیے جاؤ گے لیکن ہم بھی یہ وعدہ کرتے ہیں کہ جانے سے پہلے تم سے ملیں گے ضرور !"
مولانا گنگوہی واپس گئے اور گرفتار کرلیے گئے۔
حاجی امداد اللہ کو ایک بار پھر انگریزی دوڑ کا سامنا کرنا پڑا۔ حاجی صاحب جس مکان میں قیام فرما تھے۔ پولیس وہاں پہنچ گئی۔ اس وقت حاجی صاحب مکان کے کھلے صحن میں، چارپائی پر دراز تھے۔ یہ مکان ایک زمیندار کا تھا۔ سپاہیوں کو اپنے مکان میں داخل ہوتے دیکھ کر زمیندار نے نوکروں کو حکم دیا "تم لوگ کیا کر رہے ہو؟" سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ لوگ آئے ہیں ان کی مدد کرو اور مکان کے اندر اور باہر ان کی رہنمائی کرو۔" پھر حاجی صاحب کے اوپر لحاف ڈال دیا اور ڈانٹ کر ملازمین کو حکم دیا "اس بڈھے کو کھیت میں ڈال آؤ، اس نے کھانس کھانس کے اور تھوک تھوک کے سارے گھر کو گندا کر رکھا ہے۔"
ملازمین نے سپاہیوں کی موجودگی میں حاجی صاحب کی چارپائی کو سرہانے اور پائنتی سے پکڑا اور کھیت میں ڈال آئے۔ سپاہیوں نے انھیں گھر کے کونے کونے میں چھان مارا اور بے نیل و مرام واپس گئے۔
اسی قسم کا ایک واقعہ مظفر نگر کی گڑھی پختہ میں بھی پیش آیا تھا۔ اس زمانے میں گڑھی پختہ سہارنپور میں داخل تھی۔ یہاں کے رئیس نے حاجی صاحب کو پناہ دی لیکن مخبروں نے مجسٹریٹ ضلع کو مطلع کر دیا اور

پولیس کپتان گارڈ لے کر رئیس کی حویلی میں داخل ہوگیا۔ اس علاقے کے تھانے دار خواجہ احمد حسین تھے انھیں بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے حلقے میں، اس علاقے کے جس رئیس کی حویلی میں چھاپہ پڑ رہا ہے وہ حاجی امداد اللہ کی گرفتاری کی کوششوں سے تعلق رکھتا ہے۔ حویلی کے دروازے پر پہنچنے کے بعد انھیں احساس ہوا کہ یہ سب کچھ غالباً حاجی امداد اللہ کی گرفتاری کے سلسلے میں ہو رہا ہے لیکن اب معاملہ بہت آگے پہنچ چکا تھا اور تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا۔ معلوم نہیں کس طرح ذہن کو ایک عجیب و غریب ترکیب سوجھ گئی۔ انھوں نے حویلی کے دروازے پر ہی سے چلانا چیخنا شروع کر دیا۔ حویلی کے رئیس کا نام لے لے کر گالیاں دینا شروع کر دیں اور دھونس دیتے ہوئے کہا "کدھر ہے او نمک حرام! ذرا باہر تو نکل، سرکار کے باغیوں کو اپنی حویلی میں پناہ دیتا ہے، خدا کی قسم آج دیکھنا ہے کہ تو کس طرح بچتا ہے۔ اس جرم میں اگر تیرا علاقہ ضبط نہ کرادیا ہو تو خواجہ احمد حسین نہیں، بھنگی کہلانا پسند کروں گا۔"
رئیس کے کانوں میں یہ آواز جو پڑی تو اس نے فوراً حاجی صاحب کو کسی اور جگہ بھیج دیا اور یہ چھاپہ بھی ناکام رہا۔



مولانا گنگوہی قید خانے میں اذیتیں جھیل رہے تھے۔ انھیں حاجی صاحب کا انتظار تھا۔ وہ پریشان تھے کہ حاجی صاحب ان سے کس طرح ملاقات کریں گے۔ اگر وہ یہاں حسب وعدہ ملنے آئے بھی تو فوراً گرفتار کرلیے جائیں گے اور مولانا گنگوہی کو یہ منظور نہ تھا کہ حاجی صاحب گرفتار کرلیے جائیں۔
ایک دن عصر سے کچھ پہلے مولانا گنگوہی نے نیم غنودگی میں دیکھا کہ حاجی صاحب ان کے سامنے کھڑے ہیں اور کچھ ارشاد فرما رہے ہیں۔
مولانا گنگوہی نے حیرت سے پوچھا "حضرت! یہ آپ! یہاں تک کس طرح پہنچ گئے، کیا باہر پہرے دار موجود نہیں ہیں ؟"
حاجی صاحب نے جواب دیا "وہ موجود ہیں لیکن ہم نے تم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جانے سے پہلے تم سے ملاقات ضرور کریں گے چنانچہ اپنا وعدہ پورا کرنے آگئے ہیں۔ اب ہم سرزمینِ حجاز جا رہے ہیں۔"
مولانا گنگوہی اداس ہوگئے، بولے "لیکن پہرے داروں نے آپ کو یہاں تک کس طرح آنے دیا؟ کیا واپس جاتے ہوئے آپ کو گرفتار نہیں کرلیں گے ؟"
حاجی صاحب واپس جاتے ہوئے بولے "ہم جس طرح آئے ہیں

اسی طرح واپس بھی جائیں گے، تم ہماری فکر نہ کرو۔"

مولانا گنگوہی نے پوچھا "حضرت! میرا کیا انجام ہوگا؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا "تم فکر نہ کرو۔"

اس کے بعد حاجی صاحب پاک پٹن چلے گئے۔ کچھ دن وہاں رہے یہاں سے حیدرآباد سندھ میں داخل ہو گئے اور حیدرآباد سندھ سے رخصت ہوکر کراچی میں قیام کیا، کراچی سے مکہ معظمہ چلے گئے۔

اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ آپ مناسکِ حج ادا فرما رہے تھے کہ یکایک اپنے ایک ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر کنارے لے گئے اور افسردگی سے فرمایا "کچھ اور سنا تم نے؟ آج تو غضب ہو گیا۔"

ساتھی نے گو مگو جواب دیا "کیا ہوا حضرت؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں سنا۔"

آپ نے گردن جھکائی اور افسوس سے کہا "رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا۔ بہت برا ہوا۔"

ساتھی نے پوچھا "کس نے بتایا؟"

آپ نے جواب دیا "بتائے گا کون، بس ابھی ابھی پتہ چلا ہے۔"

ساتھی حیرت سے صورت دیکھتا رہ گیا۔ آپ نے کچھ توقف کے بعد فرمایا "بہرحال ہم پھانسی نہیں ہونے دیں گے۔ یہاں اتنی دور سے جو کچھ کر سکتے ہیں ضرور کریں گے۔"

ساتھی کی سمجھ میں یہ باتیں تو آ رہی تھیں لیکن وہ اس کی تفصیل جاننے کا خواہش مند تھا۔

اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ آپ اٹھے اور مولوی ولایت حسین اور مولوی مظفر حسین کاندھلوی کو اپنے ساتھ لیا اور شہر سے باہر چل پڑے۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ پانی سے دھل کر سبزہ جوان ہو گیا تھا۔ اپنے دونوں ہمراہیوں کو لے کر آپ سبزے پر بیٹھ گئے اور گردن جھکا کر خاموشی اختیار کی۔ دونوں ساتھی چہرے کے آثار چڑھاؤ پر غور کرتے رہے۔ پھر سر اٹھایا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، بولے "چلو اٹھو واپس چلیں کام ہو گیا۔"

مولوی ولایت حسین نے سوال کیا "کیسا کام؟ کس کا کام؟ کہاں ہو گیا کام؟"

حاجی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، بولے "رشید احمد کو اب پھانسی نہیں دی جائے گی۔ پھانسی کا حکم ٹل گیا۔"

کچھ دنوں بعد مولانا گنگوہی کی سزائے موت اور اس کی منسوخی کی خبر اسی ترتیب سے موصول ہو گئی۔

مارچ ۱۹۷۴ء

مکہ معظمہ میں امیر احمد رامپوری بھی قیام فرما تھے۔ یہ صاحب بھی انگریزوں کو درکار تھے۔ گرفتاری کے ڈر سے وطن جانے کا خیال تک دل میں نہ لاتے تھے۔ ایک دن گھر کی یاد غالب آگئی اور یہ حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے، حاجی صاحب نے صورت دیکھتے ہی کہا "ہندوستان جانا چاہتے ہو؟ جاؤ لیکن گرفتار ہو جاؤ گے۔"

امیر احمد نے خاموشی اختیار کر لی لیکن ایک دن پھر حاضر ہوئے اور اپنا پرانا جملہ ایک بار پھر دہرایا۔ حاجی صاحب کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں اور آپ نے ترش لہجے میں کہا "کیا تم گرفتار ہونا چاہتے ہو؟ اگر جی گرفتاری پر مائل ہے تو تم اسی وقت ہندوستان چلے جاؤ۔"

امیر احمد نے جواب دیا "حضرت! کون ہے وہ شخص جو اپنی گرفتاری سے خوش ہوگا۔"

آپ نے کہا "تو خوش ہوگا، ہمیں معلوم ہے کہ تو خوش ہوگا، جا چلا جا اور دیکھ کہ کیا چیز ظاہر ہوتی ہے۔"

کسی شخص نے امیر احمد سے تخلیے میں کہا "جناب! آپ ہندوستان فوراً روانہ ہو جائیں۔ قبلہ حاجی صاحب جیسا فرما رہے ہیں انشاء اللہ ویسا ہی ظہور پذیر ہوگا۔"

امیر احمد رامپوری اللہ کا نام لے کر ہندوستان میں داخل ہو گئے دہلی پہنچ کر ایک مسجد میں قیام کیا۔ سکون اور اطمینان کا سبب یہ تھا کہ حضرت مبہم لفظوں میں رہائی کا حکم فرما چکے تھے۔ امیر احمد نے چند دن حجرے میں رہ کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا، ان پر مقدمہ چلا اور مجسٹریٹ دانت پیس پیس کر رہ جاتا اور یہی کہتا کہ "امیر احمد! میں تمہیں دار پر نہ چڑھاؤں تو میرا نام نہیں۔"

امیر احمد نے حقارت سے جواب دیا "کیا تم پاگل ہو؟ کیا اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہے ہو؟"

"مجسٹریٹ نے کہا "پاگل ہم نہیں، تم ہو گئے ہو۔"

اس کے بعد انہیں جیل بھیج دیا گیا اور مقدمات چلنے لگے۔ آخر کار انہیں تمام مقدمات سے بری کر دیا گیا اور یہ اپنے گھر رامپور چلے گئے۔

میرٹھ کی نواحی آبادی کے ایک صاحب حج کے لیے جا رہے تھے۔ انھیں حاجی امداد اللہ سے غائبانہ اور والہانہ عقیدت تھی۔ انھوں نے حاجی صاحب کا صرف نام ہی نام سنا تھا، صورت نہیں دیکھی تھی۔ ان صاحب نے حج پر روانگی سے پہلے حاجی امداد اللہ کے لیے ایک کملی تیار کرائی اور اسے دوسرے سامان کے ساتھ لے کر حج کے لیے روانہ ہو گئے جب ان کا جہاز سمندر میں ہچکولے کھاتا جدے کی طرف بڑھ رہا

جلال الدین سیوطی

اپنے عقیدت مند کو نصیحتیں فرما رہے تھے آپ نے فرمایا "سات باتیں ایسی ہیں جو کسی بھی انسان کو ذلیل کر سکتی ہیں!"

• عقیدت مند نے پوچھا "کون کون سی؟"

سیوطی نے کہا "کسی دعوت میں بن بلائے پہنچ جانا۔ کسی مجلس میں اپنے مرتبے اور حیثیت سے بالاتر جگہ پر بیٹھنا، مہمان بن کر میزبان پر حکم چلانا، دوسروں کی باتوں میں دخل دینا، ان لوگوں سے خطاب کرنا جو سننے کے لیے تیار نہ ہوں، بدچلن سے دوستی کرنا اور سنگ دل اور حریص دولت مند سے مدد کا طالب ہونا۔"

تھا کہ یہ یکایک طوفان میں پھنس گیا، مسافروں پر اتنی دہشت اور بدحواسی طاری ہوئی کہ بے معنی شور و غل کرنے لگے۔ عجیب افراتفری اور نفسانفسی کا عالم تھا۔ انسانی فطرت کا تضاد جہاز پر ہر سو نظر آ رہا تھا۔ کچھ خوف سے موت کا استقبال کر رہے تھے اور انھوں نے اپنے آس پاس موجود اپنے عزیزوں کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور موت اور اپنی ذات کے سوا انھیں کچھ نظر ہی نہ آ رہا تھا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو موت کا استقبال اپنے عزیزوں اور بچوں کے ساتھ خوش دلی سے کرنا چاہتے تھے

حاجی امداد اللہ کا پرستار اور معتقد جہاز کے ایک کونے میں چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرنے لگا۔ مایوسی اور دل شکستگی نے دل کا عجیب حال کر رکھا تھا۔ وہ جہاز سے پہلے ہی دم بہ دم ڈوبتا جا رہا تھا۔ اسی عالم میں ذرا غفلت سی طاری ہو گئی۔ اس غفلت میں اس شخص نے دیکھا کہ کوئی صاحب سامنے کھڑے اس سے کہہ رہے ہیں کہ "حاجی امداد اللہ کی کملی کہاں ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "حضرت! آپ دیکھ نہیں رہے کہ جہاز طوفان میں پھنسا ہوا ہے ذرا دیر بعد ہم سب اور یہ جہاز کملی سمیت سمندر کی تہہ میں چلا جائے گا۔"

ان بزرگ نے متبسم ہو کر فرمایا "پریشان مت ہو، اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔ کون کہتا ہے کہ یہ جہاز ڈوب جائے گا، تھوڑی ہی دیر بعد موافق ہوائیں چلنے والی ہیں اور یہ جہاز طوفان سے بچ نکلے گا۔" اس کے بعد کہا "لاؤ وہ کملی تو دے دو مجھے۔"

یہ شخص گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ کملی ان صاحب کے حوالے کر دے لیکن جب ہوش و حواس ذرا بجا ہوئے تو پتہ چلا کہ سامنے وہ شخص موجود ہی نہیں ہے۔ اس واقعے کو خواب یا رویائے صادقہ کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس شخص کو یقین ہو گیا کہ اب جہاز طوفان میں نہیں ڈوبے گا۔ اس شخص نے اس واقعے کا ذکر کیے بغیر جہاز کے تمام مسافروں کو یہ خوش خبری سنا دی کہ جہاز نہیں ڈوبے گا۔ لوگ یہ سمجھے کہ یہ شخص موت کے خوف سے پاگل ہو گیا ہے اور جو کچھ بشارت دے رہا ہے دیوانگی کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن دیوانے کی بشارت حرف بہ حرف سچ نکلی اور جہاز طوفان سے بچ نکلا۔

مکّے میں داخل ہوتے ہی یہ شخص تلاش کرتا ہوا حرم کعبہ میں داخل ہو گیا۔ وہاں بہت سارے لوگ موجود تھے یہ ان کے چہروں کو غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ مالکی مصلّے کے قریب ایک شخص کو کھڑے دیکھ کر رک گیا۔ یہ شخص کملی لے کر آگے بڑھا اور کملی کو ان کے قدموں میں ڈال کر بولا "حضرت! اگر میں دھوکا نہیں کھا رہا تو یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ حضرت کا نام نامی اسم گرامی حاجی امداد اللہ ہے۔"

مخاطب کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ سوال کیا "تم نے کس طرح پہچانا؟"

اس شخص نے جواب دیا "میں آپ سے جہاز پر ملاقات کر چکا ہوں۔ جہاز کے حلیے اور موجودہ حلیے میں صرف اتنا فرق ہے کہ اس وقت آپ تہبند زیب تن فرمائے ہوئے تھے اور اس وقت پاجامے میں ملبوس ہیں۔"

آپ نے اس کا کوئی جواب تو نہ دیا لیکن کسی اور نے جواب دیا "طغیانی اور ریانی کے لیے تہبند ہی مناسب لباس تھا۔ مناسب اور موافق ہواؤں کے حوالے کرنے میں حاجی صاحب کو بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔"

یہ کس نے جواب دیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک آواز تھی جسے کانوں نے تو سن لیا لیکن آنکھیں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکیں۔



پچاس سال کی عمر تک حاجی صاحب مجرّد ہی رہے پھر اشارت غیبی سے یہ تنبیہہ ملی کہ ایک عارف کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شادی جیسی سنّتِ نبویہ سے محروم رہے۔ آپ نے اس اشارتِ غیبی پر بی بی خدیجہ بنت شفاعت رام پوری سے نکاح فرمایا۔

سہب مہنگ

آپ چوراسی سال تین ماہ بیس روز زندہ رہے اور ۱۲ رجمادی الآخر ۱۳۱۷ھ بروز شنبہ صبح فجر کی اذان کے وقت اپنے محبوبِ حقیقی سے جاملے اور جنت المعلیٰ (مکہ معظمہ) میں مدفون ہوئے۔

شاہ ولی اللہ کی تحریک کیوں ناکام ہوئی، اس کا تجزیہ تو مورخین اسلام کریں گے لیکن ہم تو یہ جانتے ہیں کہ وہ عہد طباعت اور اشاعت کے تیز رفتار اور خوبصورت وسائل سے محروم تھا اور میری ناچیز رائے میں ان کے بعد جن کے سپرد یہ کام ہوا وہ اس نکتے کو کسی طرح فراموش کر گئے کہ ذہنی انقلاب لائے بغیر کوئی بڑا انقلاب نہیں برپا کیا جاسکتا اور انقلابات نیچے سے اُوپر کی طرف چلتے ہیں، اُوپر سے آمریت یا شہنشاہیت تو نازل ہوسکتی ہے لیکن عوامی، طویل المیعاد اور اکثریت کے لیے فائدہ مند انقلاب عوام کے اعتماد اور تعاون ہی سے لایا جاسکتا ہے۔

خدا نے قرآن پاک کی سورۂ ہُود میں فرمایا ہے۔

" اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو، جو پیغام دے کر میں بھیجا گیا تھا وہ میں پہنچا چکا ہوں۔ اب میرا رب تمھاری جگہ دُوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکوگے۔ یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے۔"

اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس سال حاجی امداد اللہ پیدا ہوئے تھے اسی سال یعنی ۱۸۱۸ء میں ۵ مئی کو مشرقی جرمنی میں دُنیا کا بہت بڑا انقلابی مارکس پیدا ہوچکا تھا۔ جب یہ چھ سال کا تھا تو اس کا خاندان اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر عیسائیت میں داخل ہوگیا۔ خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اس انقلابی کی خاص حالات اور ماحول میں تعلیم و تربیت ہوتی رہی۔ انتہائی ناساعد حالات میں اس نے انسانی مصائب و آلام میں معاشی اور اقتصادی اسباب اور محرکات کا پتہ چلایا اور اس نے دُنیا کو بتایا کہ انسانی تاریخ میں جو سوسائٹی بھی نمودار ہوئی ہے اس کا انحصار ذرائع پیداوار اور دولت کی تقسیم پر رہا ہے۔ کسی سیّارے کی تخلیق یا کسی حیوانی نوع کا خاتمہ تاریخ نہیں، نتائج تاریخ ہیں۔"

اس نے ۱۸۶۷ء میں اپنی انقلابی کتاب "سرمایہ" کی پہلی جلد جرمن زبان میں شائع کی۔ ۱۸۷۸ء میں دوسری جلد شائع کرنے کی کوشش کی لیکن صحت جواب دے رہی تھی اس لیے یہ کام نہیں ہوسکا۔

۱۸۸۱ء میں اس کی ہمدم و ہم ساز اور زندگی میں ہر ہر قدم اور ہر حال میں ساتھ دینے والی رفیقۂ حیات چل بسی۔ ۱۴ رمارچ ۱۸۸۳ء کو وہ خود بھی چل بسا۔ موت کے بارہ سال بعد اس کے شاگرد اور دوست اینجلز نے اس کی کتاب "سرمایہ" کو مکمل صورت میں شائع کر دیا۔

یہ اس انقلابی کا ذکر ہے جس کے لیے علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

وہ کلیم بے تجلّی، وہ مسیح بے صلیب — نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز — مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب

مارکس نے اقوامِ عالم کو لرزہ براندام کر دیا۔ اس نے کسی تکلف اور لحاظ کے بغیر صاف صاف باتیں کیں، اس نے کہا۔

" سرمایہ دار اور بورژوا طبقہ حکومت کے لیے اس لیے نااہل ہے کہ وہ اپنے پیدا کردہ غلاموں کا پیٹ نہیں بھر سکتا اور یہ اپنے غلاموں کو روٹی دینے کے بجائے ان سے روٹی حاصل کرتا ہے۔ سماج اب زیادہ دیر تک ان کے وجود کو نہیں برداشت کرسکتا اور سماج کے وجود کے لیے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔"

" سرمایہ داری اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھود رہی ہے۔ وہ اپنے گورکنوں کو خود پیدا کر رہی ہے۔"

" ہم پر یہ الزام ہے کہ ہم ذاتی ملکیت کو ختم کر دینا چاہتے ہیں، وہ ملکیت جسے انسان اپنی محنت سے حاصل کرتا ہے۔ آپ اس سے خوف زدہ ہوجاتے ہیں لیکن آپ اس پر کیوں نہیں غور کرتے کہ آپ کے موجودہ سماج میں نوّے فی صد لوگ ذاتی ملکیت سے محروم کیے جاچکے ہیں اور دس فی صد انسان نوّے فی صد انسانوں کی محنت پر اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

" پرولتاری تحریک اکثریت کی ایک خود شناس اور آزاد تحریک ہے جس کے پیشِ نظر اکثریت کا مفاد ہے۔ پرولتاریہ اس وقت تک سر بلند نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ موجودہ سماج کو مٹا نہ دے۔"

دُنیا بہت کم اپنے عہد کے بڑے لوگوں کا اس شان اور جوش و خروش سے استقبال کرتی ہے جس کے وہ صحیح معنی میں مستحق اور حق دار ہوتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کا ہندوستان میں انتقال ہوا تو ان کی زندگی میں ان کے مرتبے اور قدر و قیمت کا لوگ صحیح اندازہ نہیں لگا سکے۔ حاجی امداد اللہ نے کام شروع کیا تو لوگ انھیں بھی نہ پہچان سکے۔ دُوسری طرف مغربی دُنیا تھی جس کی مشاہیر پرستی اور قدر دانی مشہور ہے۔ لندن میں جب مارکس کا انتقال ہوا تو ٹائمز کے علاوہ انگلستان کے کسی بھی اخبار نے اس کی موت کی خبر نہیں شائع کی اور ٹائمز نے بھی یہ خبر اپنے کسی مقامی نمائندے کے حوالے سے نہیں چھاپی تھی بلکہ اسے یہ خبر پیرس کے نمائندے نے بھیجی تھی اور اس نے اس خبر کے ساتھ جو مراسلہ بھیجا تھا اس میں لکھا تھا۔ "میں نے یہ خبر پیرس کے بعض اخبارات میں پڑھی ہے۔"





■ ضیا تسنیم بلگرامی

بنو ہاشم اور بنو امیہ کے مناقشات اور آویزشیں

ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال بڑھتی چلی گئیں، خوش قسمتی اور اقبال مندی بنو امیہ کی یاوری کرتی رہی اور انھیں مسلسل سیاسی استحکام حاصل ہوتا رہا اور ان کے مقابلے میں بنو ہاشم پے در پے انتشار اور پریشانیوں کا شکار ہوتے رہے۔ آخر بنو ہاشم کے چند بزرگوں نے اقبال مند بنو امیہ کے مقابلے میں باعزت پسپائی اختیار کی اور یہ مدینہ منورہ سے اپنی مرضی سے شہر بدر ہو کر عراق چلے گئے۔ انھوں نے بغداد کے نواح میں جبل ہنکار میں سکونت اختیار کی۔ ان کے سربراہ کا نام یوسف قریشی ہاشمی تھا۔ یوسف قریشی ہاشمی سرزمین عرب سے زیادہ دُور نہیں جانا چاہتے تھے۔ انھیں اپنے آباء و اجداد کی زمین سے محبت تھی لیکن بعد کی نسلوں میں یہ محبت قائم نہیں رہی۔ اور انھوں نے جبل ہنکار کو بھی چھوڑ دیا اور سندھ کے سیستان اور کیچ مکران میں داخل ہوگئے۔ قسمت مہربان تھی اور اقبال ان کا ہم رکاب تھا۔ ان دنوں سیستان اور کیچ مکران کے لوگ اپنے مقامی حکمرانوں کے جبر و تشدد اور ظلم و جور سے نالاں تھے۔ انھوں نے آلِ رسولؐ کو اپنے درمیان دیکھ کر بڑی آؤ بھگت کی اور اُن کی حمایت میں بغاوت کر کے اپنے مقامی حکمرانوں کو بے دخل کیا اور سیستان اور کیچ مکران کی حکومت نو وارد ان آلِ رسولؐ کے حوالے کر دی۔

یہ حکومت ایک دوسرے سے منتقل ہوتی ہوتی پانچویں نسل میں شہزادے بہاء الدین تک پہنچی، ان دنوں لاہور کے مشہور بزرگ سید احمد توختہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ کیچ مکران تشریف لے گئے اور اپنی صاحبزادی بی بی حاج کی شادی شہزادے بہاء الدین سے کر دی۔ یکے بعد دیگرے ان سے تین اولادیں ہوئیں، جمال الدین، ضیاء الدین اور حمید الدین۔ یہ خاندان نہایت خوش و خرم اور پُرمسرت زندگی گزار رہا تھا، حکومت تھی، بھرا پُرا کنبہ تھا، عزت تھی۔

بہاء الدین کو اقتدار سنبھالے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ انھیں اپنے جدِ اعلا کی سرزمین یاد آئی، جمال الدین اور ضیاء الدین کو ساتھ لیا اور حج بیت اللہ کو روانہ ہوگئے۔ حمید الدین سب سے چھوٹے تھے، کیچ مکران ہی میں رہ گئے۔ بہاء الدین نے اپنی نیابت کا فرض چھوٹے بھائی شہاب الدین ابوالبقا کو سونپا اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور دونوں بیٹوں سمیت رسول اللہؐ کے مزار پر حاضری دی، دل بھر آیا اور آنکھیں پرنالا بن گئیں۔ ان کا خاندان یہیں کی مٹی سے عالم وجود میں آیا تھا۔ وہ بے مقصد ایک ایسے ماضی کی یاد میں جسے انھوں نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا، مدینے کی گلیوں میں گھومتے پھرتے رہتے۔ یہاں کی فضا اور سرزمین میں ایک سحر تھا جس نے سندھ اور کیچ مکران کی یاد دل سے مٹا دی تھی۔ مدینے کے بعد عرب کے دوسرے علاقوں کی سیاحت شروع کر دی۔ وہ ان تمام مقامات مقدسہ کی زیارت کرنا چاہتے تھے۔ جہاں کہیں رسول اللہؐ تشریف لے جا چکے تھے۔ ان میں یمن بھی شامل تھا، یہ گھومتے پھرتے یمن پہنچ گئے۔ یہاں قیام فرما ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک معمولی بیماری نے ان کا کام تمام کر دیا۔ دونوں لڑکوں نے تجہیز و تکفین کی اور باپ کی محبت میں یمن ہی میں رہ پڑے۔ کیچ مکران کی حکومت ان کے چھوٹے بھائی شہاب الدین ابوالبقا کے پاس رہی دو سال بعد یہ بھی چل بسے اور اُن کی جگہ یمن کے مرحوم بہاء الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے حمید الدین حاکم بنا دیے گئے۔ بہاء الدین قریشی ہاشمی کا بیٹا اور لاہور کے مشہور بزرگ سید احمد توختہ کا نواسا برسرِ اقتدار آیا تو کیچ مکران کی فضا ہی بدل گئی۔ حمید الدین کو عدل و انصاف کا اتنا خیال رہتا کہ طاقت ور ظالم خود کو تنکے سے زیادہ کمزور محسوس کرتا اور کمزور مظلوم خود کو کیچ مکران کا سب سے زیادہ طاقت ور انسان محسوس کرتا۔ حمید الدین کا جدھر سے بھی گزر ہوتا لوگ احتراماً اپنی گردنیں جھکا دیتے۔ یہ احترام یہ قدر و منزلت ان کی نہیں ان کے عدل و انصاف کی تھی۔ اس احترام اور قدر و منزلت سے حمید الدین میں حکومت اور امارت کی خو بُو پیدا ہوتی رہی اور حکومت کے اکیسویں سال ان میں ایک ایسے شخص کی تعمیر ہو چکی تھی۔ جس کے سر میں حکومت کا نشہ اور دل میں اپنی برتری کا شدید احساس پیدا ہو چکا تھا۔

دن بھر کار بار مملکت انجام دینے کے بعد تھکے ہارے حمید الدین محل میں داخل ہوئے۔ راستے کے آس پاس سبزے اور پھول دار پودوں اور درختوں کے قطعات سے گزرتے ہوئے یہ اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ محنت اور تھکان کا بوجھ اٹھائے جب یہ اپنی خواب گاہ میں داخل ہوتے تو یکبارگی ٹھٹک کر رہ گئے۔ سامنے ہی ان کی مسہری بچھی ہوئی تھی

اس پر بچھے ہوئے پھولوں کی خوشبو نے پوری خواب گاہ کو معطر کر رکھا تھا اور اس معطر مسہری پر ان کی نونایت نامی کنیز آنکھیں بند کیے دین و دنیا سے بے خبر مدہوش خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی، کنیز کی اس جرأت اور گستاخی نے حمیدالدین کو مشتعل کر دیا۔ انھوں نے تالی بجا کے محل کی پہرے دار مسلح عورتوں کو طلب کر لیا اور ایک تنومند سخت مزاج عورت کو حکم دیا: "اس گستاخ کنیز کو گریبان پکڑ کے جگا دیا جائے اور اس کے بعد اسے کوڑے سے زدوکوب کیا جائے!"

اسی وقت کوڑا بھی مہیا ہو گیا اور موٹی خدمت گار عورت نے کنیز کو گریبان سے کھینچ کر بیدار کر دیا، اس نے نیم خوابیدہ نظروں سے ماحول کا جائزہ لیا تو سہم کر رہ گئی۔ تنومند پہرے دار عورت اپنے آقا کے حکم کوڑا زنی کا انتظار کرنے لگی۔

حمیدالدین نے قہر آلود نظروں سے کنیز کو گھورا اور دریافت کیا: "تجھ میں یہ جرأت کہاں سے آئی کہ اپنے مالک کی مسہری پر خوف و دہشت کے بغیر سو گئی؟"

کنیز نے نہایت اطمینان سے گردن جھکا لی اور جواب دیا۔ "مجھے یہ بستر بہت اچھا لگا تھا، بس یہ سوچ کر لیٹ گئی تھی کہ دیکھوں اس پر لیٹنے والے کو کیسا آرام ملتا ہے۔"

"پھر کیسا آرام ملا؟" حمیدالدین نے غصے میں سوال کیا۔

کنیز نے بے نیازی سے جواب دیا: "ایسا آرام کہ میں آج سے پہلے اس سے آشنا بھی نہ تھی!"

حمیدالدین نے طنزاً کہا: "بے شک ہم تجھے ایک ایسی لذت سے بھی آشنا کرائے دیتے ہیں کہ اس سے بھی تو آج تک ناآشنا رہی ہو گی۔"

کنیز حمیدالدین کی بات نہیں سمجھ سکی اور ان کی صورت تکنے لگی۔

حمیدالدین نے غصے میں چیخ کر تنومند پہرے دار عورت کو حکم دیا "تعمیل ہو، اب مزید برداشت کی طاقت نہیں ہے، کوڑا زنی، مسلسل کوڑا زنی، تا حکم ثانی کوڑا زنی!"

تنومند پہرے دار عورت کا ہاتھ اوپر اٹھا اور کنیز پر برسنے لگا۔ شپ شپ، شڑاپ شپ۔ کوڑے کی ہر ضرب پر کنیز دوہری ہو جاتی لیکن زبان سے اُف تک نہ کرتی۔ حمیدالدین کو رہ رہ کے اس بات پر غصہ آرہا تھا کہ آخر یہ کنیز روتی کیوں نہیں۔ جب وہ دیر تک کوڑے کی ضربات برداشت کر کے ہنستی مسکراتی رہی تو حمیدالدین نے ہاتھ کے اشارے سے کوڑا زنی موقوف کرا دی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے کنیز کے روبرو پہنچ گئے۔ وہ کنیز سے آنکھ ملاتے گھبرا رہے تھے۔ کنیز اب بھی مسکرا رہی تھی، جگہ جگہ سے کپڑے مسک چکے تھے اور ان میں سے خون چھلک رہا تھا۔

حمیدالدین نے غصے اور کھسیانے پن کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا: "بے شرم! بے غیرت! اس ہنسی کا سبب؟ کیا کوڑے کی ضربات تجھے تکلیف نہیں پہنچا رہیں؟"

مسکراتے ہنستے چہرے پر آنسوؤں کی دھاریں کافوری شمعوں کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ کنیز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "میرے مسکے ہوئے کپڑے اور لہولہان جسم کیا یہ گواہی نہیں دے رہے ہیں کہ کوڑوں کی مار نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی ہے؟"

"پھر تو ہنس کیوں رہی ہے؟"

کنیز نے بے نیازی سے جواب دیا: "میں یہ سوچ کر ہنس رہی تھی کہ پھولوں کے جس بستر پر چند لمحے سو کر میں اتنی اذیت ناک سزا بھگت رہی ہوں اس بستر پر ہر روز سونے والا کتنی بڑی سزا کا مستحق ہو گا۔"

اس مختصر سے جملے نے حمیدالدین کے دل و دماغ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ان کے چہرے کا کرب اندرونی کشمکش اور اذیت کی غمازی کر رہا تھا۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور پھولوں سے لدی ہوئی مسہری کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ بے خیالی میں دو ایک بار اس پر بیٹھ جانے کا ارادہ بھی کیا، اس پر بیٹھنے کی نیت سے جھکے بھی لیکن بیٹھے نہیں۔ کنیز کے پُراثر، دل کو مجروح کر دینے والے الفاظ کانوں میں مسلسل گونج رہے تھے۔ کنیز اور مسلح پہرے دار خواتین ادب سے سر جھکائے کسی حکم کی منتظر کھڑی تھیں۔

کچھ دیر بعد حمیدالدین نے سر اوپر اٹھایا اور حسرت و مایوسی سے انھیں دیکھنے لگے، دل کے سوتے آنکھوں کی راہ سے پھوٹ نکلے تھے۔ کنیز کے سوا کسی اور میں اتنی جرأت نہ تھی کہ آنکھیں ان سے چار کر سکتی۔

حمیدالدین نے انھیں حکم دیا: "جاؤ، باہر جاؤ، تخلیہ۔"

ساری عورتیں منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر الٹے پیروں واپس جانے لگیں، انھی میں کنیز بھی شامل تھی۔ حمیدالدین نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا: "تم نہیں، تم رک جاؤ۔ بس چند لمحوں کے لیے!"

کنیز رک گئی۔ حمیدالدین نے اُسے قریب بلایا: "ہمارے قریب آجاؤ!"

کنیز ان کے قریب چلی گئی۔ یہ بغور اس کی صورت دیکھنے لگے۔ کنیز نے نظروں کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں۔ حمیدالدین نے پوچھا "تم کون ہو؟"

کنیز نے جواب دیا: "آپ کی ایک ادنا کنیز نونایت۔"

حمیدالدین نے کہا: "نہیں، تم کوئی اور ہو، تم نے ایک جملے سے

ہمارے دل و دماغ کو پھونک کے رکھ دیا ہے!"

کنیز خاموش رہی، کچھ دیر بعد اس نے کہا "حضور کے چہرے سے تکان اور محنت کے آثار ہویدا ہیں، تھوڑی دیر کے لئے آرام فرمالیں طبیعت قابو میں آجائے گی۔"

حمید الدین نے پھولوں میں رچی بسی مسہری پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور پھر کنیز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آرام کر لیں؟ اس مسہری پر؟ جس پر چند لمحوں کی استراحت کی سزا ابھی تم بھگت چکی ہو؟"

کنیز نے جواب دیا "حضور والا! وہ ایک بات تھی جو ختم ہو گئی، آخر میں اس اذیت ناک سزا کی تکلیف کس طرح برداشت کرتی یقین جانیے اس عارفانہ جواز نے یکایک مجھ میں اتنی ہمت اور برداشت کی قوت عطا کر دی کہ اگر میں اسے کرامت یا معجزہ قرار دوں تو غلط نہ ہوگا۔"

حمید الدین نے وہ رات کس طرح گزاری اس کا صحیح علم اور احساس انہی کو ہوگا۔ لیکن رات بھر کی بے چینی اور اضطراب کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صبح ہوتے ہی انھوں نے کنیز کو آزاد کر کے خود سے جُدا کر دیا۔

حکومت کی ذمہ داریاں اور اس کی پُر فریب دل نوازیاں اب بھی عناں گیر تھیں اور کنیز کا عارفانہ جواز انھیں شکست دینے کی کوشش میں تھا۔ کبھی یہ حاوی ہوتا کبھی وُہ۔ اس کشمکش نے انہیں ہلکان کر دیا۔ انھوں نے داروغۂ اصطبل کو طلب کیا اور حکم دیا "ہم شکار پر جانا چاہتے ہیں۔ ہمارا گھوڑا حاضر کیا جائے!"

داروغۂ اصطبل نے غمزدہ اور سوگوار آقا کی اندرُونی کیفیت کو بھانپتے ہوئے سوال کیا "شکار میں ہمرکابی کا شرف کس کس کو بخشا جائے گا؟"

حمید الدین نے کرب سے جواب دیا "کسی کو بھی نہیں۔ ہم تنہا جائیں گے!"

داروغۂ اصطبل نے حیرت سے جواب دہرایا "حضور شکار پر تنہا تشریف لے جائیں گے؟"

"ہاں ہم تنہا جائیں گے۔"

داروغۂ اصطبل نے اسی وقت شاہی گھوڑا حاضر کر دیا۔ اور حمید الدین نے اسی وقت شکار کا ضروری سامان ساتھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کے جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہ بڑی دیر تک بے مقصد ادھر اُدھر گھوڑا دوڑاتے رہے۔ ایک آگ تھی جو دل میں روشن تھی اور وہ اس کی آنچ میں پھنک رہے تھے۔ جنگل کے دل کش حسین نظارے اپنی مرطوب تازگی اور تراوٹ سے اس آگ کو بجھانے سے قاصر تھے۔ اسی عالم میں ایک جھاڑی سے سرسراہٹ کی آواز سُنائی دی کسی جنگلی درندے کے خیال سے انھوں نے اپنی کمان میں تیر جوڑا اور جھاڑی کی طرف نظر جما کے کھڑے ہو گئے۔ یکایک کوئی چھوٹا سا جانور نکل کے ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ انھوں نے اسے ایک نظر میں پہچان لیا۔ یہ ہرن کا ایک خوبصورت بچّہ تھا۔ یہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کے اس کی طرف بڑھے۔ جو کام جنگل کے قدرتی مناظر نہ کر سکے تھے ہرن کے بچّے نے انجام دے دیا تھا۔ اس کی پیاری پیاری شکل اور ننھے منّے سراپا نے حمید الدین کو اس پر مائل کر دیا کہ وُہ اسے زندہ گرفتار کر لیں یہ بچّہ برق رفتاری سے بھاگ رہا تھا۔ اس کے چاروں پیر بھاگنے کے دوران ایک ہی جگہ پڑ رہے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے چاروں انگلیاں انگوٹھے سے مل مل کر اپنی جگہ واپس جاتی رہیں۔ دونوں کا درمیانی فاصلہ دم بدم کم ہوتا رہا۔ دونوں جنگل سے نکل کر آبادی میں داخل ہو گئے۔ کچّے پکّے مکانوں کے ہیولے آہستہ آہستہ اپنی اصل صورت میں نظر آنے لگے۔ ہرن کے بچّے نے آبادی کے بجائے ویرانے کی راہ اختیار کی ——— آگے ایک ندی بہہ رہی تھی۔ حمید الدین نے سوچا اب یہ بچ کے کہاں جائے گا۔ ندی میں پھاندنے سے رہا۔ اس دوران وہ بستی کے قبرستان میں داخل ہو گئے۔ کچی پکی قبریں بے ترتیب حالت میں دُور تک پھیلی ہوئی تھیں ہرن کے بچّے نے کوئی بچنے کی راہ نہ دیکھ کر ایک شکستہ قبر میں گھس کے پناہ حاصل کی، حمید الدین کے چہرے پہ خوشی بکھر گئی، گھوڑے سے کودتے ہوئے کہا "اب کہاں جاؤ گے بچ کر؟ آخر پکڑ ہی لیا ہم نے تمھیں؟"

یہ آہستہ آہستہ قبر کے شگاف تک پہنچ گئے۔ اس میں جھانک کر اندر دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ کچھ نظر نہ آیا۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے شگاف کو بڑا کرنے کی کوشش کی اور جب یہ شگاف اتنا بڑا ہو گیا کہ اندر کی ہر چیز روشنی میں آگئی تو یہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے کہ وہاں ہرن کے بچّے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ البتہ ایک لاش ضرُور رکھی تھی۔ تازہ کفن یہ بتاتا تھا کہ اسے دفن کیے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ آخری دیدار کرنے والوں نے میّت کا چہرہ کھُلا ہی چھوڑ دیا تھا اور اس کے لب و رخسار پر ایک بچھو رینگتا پھر رہا تھا۔ وہ بار بار کبھی ہونٹوں پر ڈنک مارتا کبھی رخسار پر نیش زنی کرتا۔ حمید الدین ہرن کے بچّے کو تو گئے بھُول، اس تازہ واقعے نے ان کی پوری توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ آخر وہ برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے تیر کی مدد سے اسے ہٹانے کی کوشش کی لیکن وُہ رینگ کر پھر وہیں پہنچ گیا۔ انھوں نے سوچا کہ یہ کوئی عام واقعہ نہیں ہے، اس خیال سے وُہ بار بار بچھو کو ہٹاتے رہے اور وہ ہر بار رینگ کر وہیں پہنچ جاتا۔ وہ بچھو کو مارنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے کسی طرح بچھو کو قابو کیا اور اسے ندی میں پھینک آئے۔ ان کے خیال میں اس طرح انھوں نے بچھو کو بے بس

کر دیا تھا اور اب وہ کسی بھی طرح قبر تک نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ایک سانپ پانی کی لہروں کو چیرتا ہوا بچھو کی طرف بڑھا اور وہ جیسے ہی بچھو کے قریب پہنچا، بچھو سانپ پر سوار ہو گیا۔ سانپ پانی سے خشکی پر آگیا اور تیزی سے قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ حمیدالدین بھی اس کا پیچھا کرتے ہوئے قبرستان میں داخل ہو گئے۔ سانپ بچھو سمیت اسی قبر میں داخل ہو گیا۔ بچھو سانپ کی پشت سے رینگ کر نیچے اُتر گیا اور لب رخسار پر نیش زنی کرنے لگا۔ سانپ میت کی گُدّی کو ڈسنے لگا۔ اس واقعے نے حمیدالدین کو بہت متاثر کیا۔ یہ وہاں سے اپنے گھوڑے تک پہنچے اور اس پر سوار ہو کر قریب کی آبادی میں داخل ہو گئے۔ سامنے سے گاؤں کا مکھیا آرہا تھا انھوں نے اسے روک کر دریافت کیا "کیوں بھائی! کیا تم اسی گاؤں کے رہنے والے ہو؟"

مکھیا نے جواب دیا "ہاں، کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"تم کیا کرتے ہو؟"

"میں اس گاؤں کا مکھیا ہوں!"

"خوب!" حمیدالدین نے کہا "میں ایک مسافر ہوں اور تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ گاؤں کے قبرستان میں جو تازہ قبر بنی ہوئی ہے وہ کس کی ہے؟"

مکھیا نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ لیے بولا "کیوں؟ تم یہ جان کر کیا کرو گے؟"

حمیدالدین نے جواب دیا "میں وہاں سے گزر رہا تھا اور اس تازہ قبر کو دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی، میرا خیال ہے وہ شخص عذابِ قبر میں مبتلا ہے۔"

مکھیا نے کہا "وہ یہاں کا زمیندار تھا۔ خدا مغفرت کرے۔ اس نے لوگوں کے بڑے دل دکھائے تھے!"

حمیدالدین لرز گئے۔ ایک زمیندار اتنا گنہگار تھا تو کیچ مکران کا حکمران کتنے گنا زیادہ گناہگار ہوگا۔ مکھیا نے اس فکر مند اور سوچ کی الجھنوں میں مبتلا شخص کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی ہوشمند کسی پاگل کو دیکھتا ہے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ جس شخص سے مخاطب ہے۔ وہی یہاں کا حکمراں ہے۔

حمیدالدین نے گھوڑے کا رخ موڑا اور محل کو واپس ہوتے انھوں نے محل میں داخل ہوتے ہی بیوی کو مطلع کیا کہ وہ تاج و تخت سے کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں اگر بیوی کو ان کی رفاقت عزیز ہے تو اُسے بھی سب کچھ ترک کر کے ان کے ساتھ چلنا ہوگا، وفادار بیوی نے بلا تامل اعلان کیا کہ "میری موت زندگی کے آپ مالک ہیں۔ آپ جس حال میں بھی رکھیں گے خوش رہوں گی۔"

حمیدالدین نے کہا "اگر یہ بات ہے تو سب کچھ اسی محل ہی میں رہنے دو اور ہمارے ساتھ نکل چلو۔"

شوہر پرست بیوی نے اپنا سب کچھ محل میں ہی چھوڑ دیا اور جو کپڑے پہنے تھی اسی میں شوہر کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی۔ ان کی منزل لاہور تھی، جہاں حمیدالدین کے نانا سید احمد توختہ قیام فرما تھے اور جن کی بزرگی اور عظمت کا دُور دُور شہرہ تھا۔

ابھی لاہور آٹھ میل دُور تھا کہ بیوی پے در پے قے کرنے لگیں پیٹ میں جو کچھ تھا منہ کے راستے نکلنے لگا۔ بیوی بے دم ہو گئیں اور ہاتھ پیر چھوڑ دیتے۔ ایسا لگا جیسے وہ گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہیں، جانے ہی والی ہیں۔ حمیدالدین قے زدہ بے دم بیوی کے سرہانے جا کھڑے ہوئے۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول کر فرمایا "بیوی! ہمیں تمھارے پاس سے دُنیا کی بو آرہی ہے۔"

بیوی نے نحیف و نقیہہ آواز میں کہا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"

حمیدالدین نے جواب دیا "ہمارا مطلب واضح ہے، تمھارے پاس سے دُنیا کی بو آرہی ہے۔ کیا تم نے اپنا سب کچھ محل میں چھوڑ دیا؟"

"ہاں!" بیوی نے جواب دیا "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لائی!"

حمیدالدین نے بطور تنبیہہ کہا "ہم پھر بھی یہی کہیں گے کہ تمھارے پاس سے دُنیا کی بو آرہی ہے۔ ذرا غور کرو کہ کہیں تم غلطی سے کوئی قیمتی چیز لے کر تو نہیں چلی تھیں؟"

بیوی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "بے شک میں غلطی پر تھی!" اس کے بعد بیوی نے اپنے سامان میں سے ایک قیمتی تسبیح نکال کر حمیدالدین کے سامنے ڈال دی، کہا "بس یہ تسبیح ہے میرے پاس مروارید کی، اگر دُنیا کی بو اس میں سے آرہی ہے تو اسے آپ اسی وقت کسی کے حوالے کر دیجیے!"

حمیدالدین نے وہ مروارید کی تسبیح کسی درویش کو دے ڈالی اور اِدھر اُدھر کی سیر و سیاحت کرتے لاہور میں داخل ہو گئے۔ نانا سید محمد توختہ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور نواسے کی بڑی خاطر مدارات کی۔

نانا سید محمد توختہ نے حمیدالدین کو اس حال میں دیکھ کر سوال کیا "کیا بات ہے، بغیر اطلاع کیے تم لاہور میں کس طرح وارد ہو گئے؟"

حمیدالدین کا دل بھر آیا۔ بھرائی آواز میں کہا "نانا جان! ہم درویشی اختیار کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ اس سفر میں ہماری

راہ نمائی فرمائیں!"

نانا نے خوش ہو کر جواب دیا "تم مایوس مت ہو، لیکن درویشی اختیار کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لو کہ دنیا تمہیں طرح طرح سے ورغلائے گی اور کوشش کرے گی کہ تم ایک بار پھر اس کے پاس واپس جاؤ۔ اس وقت تم کیا کرو گے؟"

حمیدالدین نے جواب دیا "ہم جس راہ پر چل پڑے ہیں۔ اس پر مستقل مزاجی سے چلتے رہیں گے، آپ مطمئن رہیں۔"

نانا نے کہا "اگر یہ بات ہے تو بسم اللہ، ہم ہر طرح حاضر ہیں۔"

اس کے بعد حمیدالدین اپنے نانا کی نگرانی اور سرپرستی میں عبادت و ریاضت کرنے لگے، سینے کی سوزش نے ان کا کھانا پینا سونا جاگنا حرام کر دیا تھا۔ انھیں کسی شے کی پروا نہ تھی۔ وہ کسی طرح جلد از جلد راہ سلوک پر گامزن ہونا چاہتے تھے۔



حمیدالدین چونکہ کیچ مکران کے حاکم رہ چکے تھے۔ اس لیے انھیں نانا ہمیشہ حاکم ہی کہہ کر مخاطب کرتے۔ یہاں تک کہ جب بعد میں حمیدالدین نے شاعری شروع کی تو انھوں نے اپنا تخلص بھی حاکم ہی اختیار کیا۔

عبادت و ریاضت میں کافی وقت گزار چکنے کے بعد حاکم اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ انھیں نانا کسی اہم خدمت پر متعین کر دیں لیکن وہ ایسی چپ سادھے ہوئے تھے کہ اگر حاکم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اکتا کر بھاگ کھڑا ہوتا لیکن حاکم خود کو فنا کر دینے کے لئے نانا کی خدمت میں پہنچے تھے وہ عبادت و ریاضت میں روزِ اوّل کی طرح مشغول رہے۔

ایک دن نانا نے انھیں طلب کیا اور کہا "حاکم! تمھیں لاہور کے شمالی سرے پر جانا ہے۔ وہاں ایک ٹیلے پر تمھیں ایک بزرگ یادِ الٰہی میں مشغول ملیں گے۔ تم ان سے ملو اور پینے کا پانی طلب کرو!"

حاکم نے حیرت سے کہا "اس کے بعد؟"

نانا نے کہا "جب وہ پانی لے کر حاضر ہوں تو پانی کا برتن ہاتھ میں لے کر پٹک دینا!"

اس عجیب و غریب حکم نے حاکم کو پریشان کر دیا۔ پوچھا "پھر؟ اس کے بعد؟"

نانا نے کہا "اس سے پھر پانی طلب کرنا!"

"پھر اس کے بعد؟"

"پھر اس کے بعد حسبِ سابق پانی کا برتن زمین پر پٹک کے توڑ دینا۔"

حاکم نے پھر سوال کیا "اس کے بعد؟"

"اس کے بعد پھر وہی، بار بار یہی کرتے رہنا۔"

حاکم نے کہا "نانا جان! ظاہر ہے اس کے پاس پانی کے برتن سینکڑوں کی تعداد میں تو ہوں گے نہیں آخرکار یہ ختم ہو جائیں گے اور ایک ایسا مرحلہ بھی آ جائے گا کہ وہ پانی دینے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اس صورت میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

نانا نے جواب دیا "جب وہ پانی دینے سے قاصر رہیں تو تم غصے میں ان کے دو چار گھونسے رسید کر دینا اور پھر بھاگ کر ہمارے پاس چلے آنا۔"

حاکم اس عجیب و غریب حکم کا مطلب نہیں سمجھ سکے لیکن نانا کے حکم کی تعمیل میں مذکورہ ٹیلے پر پہنچ گئے۔ وہاں ایک درویش آنکھیں بند کئے یادِ الٰہی میں مشغول تھے۔

حاکم نے اس کے روبرو کھڑے ہو کر پانی طلب کیا "بابا! ہم پیاسے ہیں۔ تھوڑا سا پانی پلا دو۔"

درویش نے آنکھیں کھولیں اور کٹیا میں پانی لینے چلے گئے۔ حاکم نے پانی کا پیالہ ہاتھ میں لیتے ہی زمین پر گرا دیا اور کہا "بابا اور پانی لے آؤ۔"

درویش تیوری پر بل لائے بغیر دوبارہ کٹیا سے پانی لے آئے۔ اس بار حاکم نے پانی کا پیالہ زمین پر پٹک دیا اور غصے میں کہا "ہم پیاسے ہیں بابا ہمیں پانی پلاؤ۔"

درویش بے چون و چرا اندر گیا اور تیسرا پیالہ لے آئے۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا اور حاکم نے پھر پانی طلب کیا۔ ان کا خیال تھا درویش کو غصہ آ جائے گا لیکن درویش کے تحمل کا جواب نہ تھا۔ وہ متواتر بار بار پانی لائے اور اپنے جملہ پیالوں کا یکساں حشر دیکھتے رہے۔ جب پیالے ختم ہو گئے اور حاکم کی آب طلبی جاری رہی تو درویش نے آہستہ سے کہا۔

"بابا! اب کوئی پیالہ کٹیا میں نہیں ہے، ورنہ ضرور حاضر کرتا!"

حاکم غصے میں آگے بڑھے اور درویش پر مکّوں کی بارش کر دی۔ ان کی خاصی مرمت کر چکنے کے بعد بہ واپسی کے لئے مڑے، تو درویش نے ان کا راستہ روک لیا اور نہایت تحمل سے کہا "بابا! ہمیں آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔"

حاکم نے درشت لہجے میں حقارت سے کہا "کہو کیا کہنا ہے؟"

درویش نے اُن کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں سہلاتے دبانے لگے، بولے "ہم سالہا سال سے ترکِ دنیا کیے بیٹھے ہیں کبھی کھایا کبھی نہیں کھایا، کم کھانے اور فاقے کرنے سے ہماری صحت رخصت ہو گئی اور آج ہم ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مکّوں اور گھونسوں میں آپ کے ہاتھوں کو سخت تکلیف اٹھانا پڑی ہوگی، ہم آپ کی تکلیف کا فی الحال یہی علاج کر سکتے ہیں کہ انھیں سہلا

دبا کے ٹھیک کر دیں، آپ ذرا دیر اور ٹھیریں اور ہم کو اپنی خدمت کا موقع دیں۔"

درویش دیر تک ان کے دونوں ہاتھوں کی مالش کرتے رہے۔

جب یہ اپنے نانا کے پاس واپس پہنچے تو نانا نے ان کی صورت دیکھتے ہی کہا۔"حاکم! تسلیم و رضا کا مفہوم سمجھ میں آیا؟ اسے ہمیشہ ذہن میں محفوظ رکھنا!"

حاکم نے آہستہ سے جواب دیا۔"بہت بہتر۔ گو تسلیم و رضا کی راہ نہایت دشوار ہے، لیکن ہم اس پر چلنے کی کوشش ضرور کریں گے۔"

ابھی عبادت و ریاضت جاری ہی تھی کہ نانا کا آخری وقت آ پہنچا۔ انھوں نے اپنے نواسے حاکم کو طلب کیا اور کہا۔"حاکم افسوس کہ میرا وقت آپہنچا اور میں تمہیں مرتبہ سلوک تک نہیں پہنچا سکا۔ لیکن یہ بھی مشیت ایزدی تھی کہ میں اپنے حصے کا کام ختم کر کے بقیہ کے لیے صحیح شخص کا نام بتا دوں!"

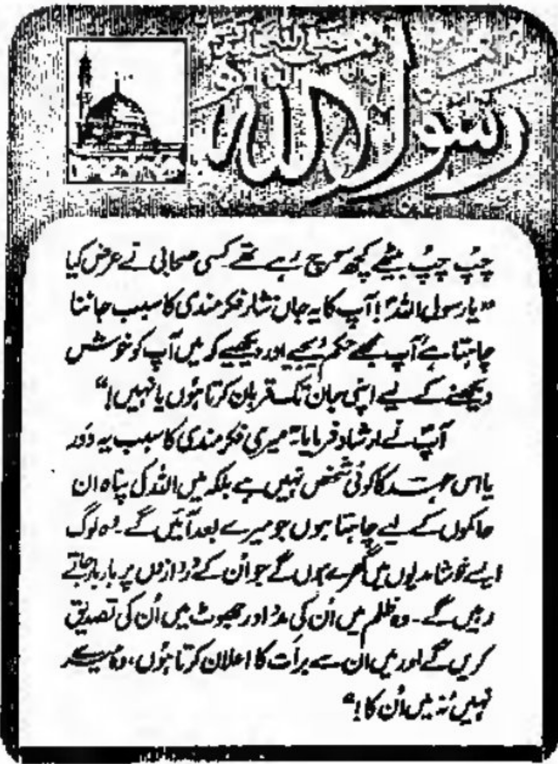
حاکم رونے لگے۔ نانا نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شفقت سے دبا کے فرمایا۔"حاکم! تمھارا باقی مقسوم سہروردی سلسلے میں ہے۔ تم وہاں پہنچو اور اپنی قسمت کا بقیہ حاصل کر لو۔"

اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ حاکم ان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر سہروردیہ سلسلے کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں بغداد روانہ ہو گئے۔ اب ان پر کیف و مستی طاری ہونے لگی تھی۔ یہ شہاب الدین سہروردی کی خانقاہ میں داخل ہو کر اتنے وارفتہ و مست ہوئے کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ یہاں تک کہ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں بھی حاضری نہ دے سکے۔ چوتھی رات شہاب الدین سہروردی سے رسول اللہ ؐ نے خواب میں فرمایا۔"شہاب الدین! ہمارا فرزند تین دن سے تمھاری خانقاہ میں ملاقات کو آیا ہوا ہے لیکن اس پر استغراق نے اتنا غلبہ کر رکھا ہے کہ وہ تم سے ملاقات تک نہ کر سکا۔ تم خود اس سے ملو اور چند دن اسے اپنی صحبت میں رکھ کر اس کی منزلِ مقصود کا پتہ دو۔"

شہاب الدین بیدار ہوتے ہی حاکم کو تلاش کرتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے۔ حاکم اس وقت بھی سکر و مستی میں تھے۔ انھیں شہاب الدین کی آمد کا بالکل پتہ نہ چلا۔ شہاب الدین نے حاکم کا ہاتھ پکڑ کے فرمایا۔"حاکم! ایسی بھی کیا بے خودی کہ جس سے ملنے آئے اس سے ملے بغیر ہی سکر و مستی میں چلے گئے!"

حاکم فوراً ہی عالمِ صحو میں آگئے۔ ہوش و حواس میں آتے ہی،

مسلسل



چپ چپ بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ کسی صحابی نے عرض کیا "یا رسول اللہ ؐ! آپ کا یہ جاں نثار فکر مندی کا سبب جاننا چاہتا ہے۔ آپ مجھے حکم دیجیے اور دیکھیے کہ میں آپ کو خوش دیکھنے کے لیے اپنی جان تک قربان کرتا ہوں یا نہیں!"

آپ ؐ نے ارشاد فرمایا۔"میری فکر مندی کا سبب یہ دور یا اس عہد کا کوئی شخص نہیں ہے بلکہ میں اللہ کی پناہ ان حاکموں کے لیے چاہتا ہوں جو میرے بعد آئیں گے۔ وہ لوگ ایسے خوشامدیوں میں گھرے ہوں گے جو ان کے دروازوں پر بار بار جاتے رہیں گے۔ وہ ظلم میں ان کی مدد اور جھوٹ میں ان کی تصدیق کریں گے اور میں ان سے برأت کا اعلان کرتا ہوں، وہ میرے نہیں نہ میں اُن کا!"

سامنے شہاب الدین سہروردی کو دیکھ کر ادب سے بیٹھ گئے۔

شہاب الدین سہروردی نے کہا۔"حاکم! ابراہیم بن ادہم کی طرح تم نے درویشی تخت و تاج دے کر حاصل کی ہے۔ تمہارے اس ایثار اور قربانی نے زہد و ریاضت کا پہلا مرحلہ تو یوں ہی طے کر دیا ہے۔ اب مزید کیا درکار ہے، ہمیں بتاؤ؟"

حاکم نے جواب دیا۔"یا شیخ الشیوخ عالم! سید احمد توختہ ترمذی لاہوری اس ناچیز کے نانا تھے۔ انھوں نے ایک عرصے تک اس خاکسار کی تعلیم و تربیت فرمائی اور اپنے آخری لمحوں میں خالق حقیقی کے پاس جانے سے پہلے ارشاد فرمایا کہ حاکم تیری قسمت کا بقیہ ایک ایسے عزیز کے پاس ہے جس کا تعلق سلسلۂ سہروردیہ سے ہے۔ میں نے سوچا اس بزرگ کو میں کہاں تلاش کروں، سیدھا آپ کے پاس چلا آیا۔ کیونکہ سلسلۂ سہروردیہ آپ ہی کے دم سے قائم ہے اور اس سلسلے میں آپ ہی میری صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں!"

شہاب الدین سہروردی نے بہ نظرِ غائر حاکم کو دیکھا اور مراقبے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد فرمایا۔"حاکم! ہم نے کشف سے اس شخص کو تلاش کیا۔ جس کے پاس تمھاری قسمت کا بقیہ ہے۔ افسوس کہ وہ اس وقت عالمِ وجود میں نہیں!"

حاکم نے پریشان ہو کے دریافت کیا۔"کیا ان صاحب کا وصال ہو چکا ہے؟"

"نہیں"۔ شہاب الدین سہروردی نے جواب دیا۔"وہ تا حال عدم سے

وجود ہی میں نہیں آتے ؟"
حاکم نے حیران ہو کے خاموشی اختیار کی۔ کچھ دیر بعد دریافت کیا" حضرت! کچھ وضاحت سے ارشاد فرمائیں۔"
شہاب الدین سہروردی نے جواب دیا" تمہاری قسمت کا تقسیم شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے پوتے کے پاس ہے اور وہ حضرت ابھی تشریف ہی نہیں لائے۔"
حاکم نے پوچھا" ان بزرگ کا نام کیا ہوگا؟"
شہاب الدین سہروردی نے جواب دیا" رکن الدین ابوالفتح فیض اللہ"
حاکم فکرمند ہو کر بیٹھ گئے۔ شہاب الدین سہروردی نے پوچھا" تم کیا سوچ رہے ہو؟"
حاکم نے جواب دیا" میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے کس کے پاس جانا چاہیے۔ ان کا انتظار کہاں کرنا چاہیے؟"
شہاب الدین سہروردی نے کہا" تم وہیں چلے جاؤ جہاں تمہارے پیر و مرشد ظہور فرما ہونے والے ہیں یعنی ملتان، اور وہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کرو۔"
حاکم نے کہا" بہتر ہے جیسا حکم شیخ الشیوخ عالم!"
چلتے وقت شہاب الدین سہروردی نے انھیں تبرک کا ایک مصلا عطا فرمایا اور دعائیں دے کر رخصت کر دیا۔
رحیم یار خاں اسٹیشن سے جب آپ جانب شمال چلیں گے تو آپ چھ میل فاصلہ طے کرنے کے بعد قلعہ مو مبارک تک پہنچ جائیں گے ایک ہندو راجا نے بنس کرو رنے اپنی ماں کے لیے یہاں قلعہ تعمیر کرایا تھا اور ماں کی نسبت سے اس کا نام مو رکھ دیا تھا۔ یہاں آج بھی قدیم مو اور قلعے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ چھ سو گز دائرے میں پھیلی ہوئی فصیل اور پچاس فٹ بلند گڑھی کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ حاکم بعد ازاں یہیں پہنچے تھے۔ اس وقت یہ جگہ آباد نہیں تھی۔ یہاں ایک ہندو جوگی رہتا تھا جس کے کرشموں کا بڑا چرچا تھا۔ حاکم یہاں پہنچ کے اس کے قریب ہی رہنے لگے۔ جوگی کئی دن تک ان کے حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ حاکم کی غربت اور افلاس نے ہندو جوگی کو بہت متاثر کیا۔ اس نے مٹی اور کانسی کے چند برتن ساتھ لیے اور حاکم کی صحبت میں پہنچ گیا۔ آپ نے سر اٹھا کے جوگی کو دیکھا اور سوال کیا" کیسے آنا ہوا شری مان جی؟"
ہندو جوگی نے کہا" میں تمھیں کئی دن سے پریشان دیکھ رہا ہوں!"
حاکم نے کہا" پھر اس کا کیا علاج ہے تمہارے پاس؟"
ہندو جوگی نے کہا" علاج تو اس وقت کیا جاتا ہے جب مرض کی تشخیص ہو جاتی ہے۔"
حاکم نے پوچھا" پھر تم نے کیا مرض تشخیص کیا؟"
جوگی نے جواب دیا" افلاس، غربت، معاشی بدحالی، تہی دستی۔"
حاکم کو ہنسی آ گئی، بولے" بس تمھاری یہیں تک رسائی تھی۔ خوب۔ اور کچھ؟"
جوگی نے جواب دیا" مرض تو ایک ہی ہے لیکن اس کے نام کئی ہیں، مثلاً پریشان حالی، مالی اور معاشی تنگی وغیرہ۔"
حاکم نے پوچھا" اگر ہمیں واقعی یہی مرض ہے تو اس کا علاج کیا ہے تمھارے نزدیک؟"
جوگی نے ساتھ لائے ہوئے برتن حاکم کی طرف بڑھا دیے اور کہا" سر دست ان سے کام چلائیں، آگے بھگوان بھلا کرے گا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"
حاکم نے برتن ہاتھ سے نہیں پکڑے بے نیازی سے کہا" انھیں رکھ دو۔ یہ ہمارے کیا کام آئیں گے؟"
جوگی نے کہا" یہ بظاہر مٹی اور کانسی کے برتن ہیں لیکن ہماری نظر کیمیا اثر سے سونے کے ہو جائیں گے۔ انھیں بازار میں بیچ کر کھانے پینے کا خرچ چلانا۔"
یہ کہہ کر جوگی مسکرانے لگا اور ایک نظر خاص برتنوں پر ڈالی اس نظر میں کیا اثر تھا کہ سارے برتن آہستہ آہستہ سنہری رنگ اختیار کرنے لگے۔ بالکل اس طرح جیسے دھوپ میں جگمگاتی زمین پر آہستہ آہستہ ابر کا کوئی ٹکڑا سایہ فگن ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد سارے برتن سونے کے ہو گئے۔
جوگی نے ان برتنوں کو اک شان متکبرانہ سے دیکھا اور حاکم سے کہا" تم چاہو تو یہیں رہو اور ان برتنوں کی قیمت سے خرچ چلاؤ۔ جب ساری رقم خرچ ہو جائے تو مجھے دوبارہ مطلع کر دینا۔ میں اور انتظام کروں گا لیکن اگر تم یہاں نہ رہنا چاہو تو جہاں جانا چاہو ان برتنوں کو لے کر چلے جاؤ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"
حاکم نے ان برتنوں کو اٹھا کے دریا کی نذر کر دیا اور اک شان بے نیازی سے کہا" ہم بے غرض اور بے فکر لوگ کہاں سونے چاندی کے چکر میں پڑیں گے۔ جس نے حکومت اور امارت کو اس درویشی پر قربان کر دیا ہو۔ وہ سونے چاندی کے ان چند ٹھیکروں کی کیا پروا کرے گا۔"
جوگی بے چین ہو کے کبھی تو حاکم کی صورت دیکھنے لگتا اور کبھی دریا کی اُن موجوں کو گھورنے لگتا جنھوں نے اُن کے سونے کے برتنوں کو کھا لیا تھا۔ اُسے حاکم کی اس حرکت پر غصہ بھی

آ رہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے حاکم سے کاروباری انداز میں کہا "میرے سونے کے برتنوں کو دریا میں ڈال کر تم نے میرے دل کو تکلیف پہنچائی ہے اگر تم انھیں اپنے مصرف میں نہیں لانا چاہتے تھے تو تمھیں اس بات کا بھی حق نہ پہنچتا تھا کہ انھیں دریا برد کر دو۔ میں اپنی محنت اور ریاضت کے ثمرے کا یہ انجام پسند نہیں کرتا۔ اگر تم اتنے ہی غنی اور بے نیاز ہو تو براہ کرم کسی بھی طرح میرے برتن مجھے واپس کر دو۔ مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم ان برتنوں کو کہاں سے اور کس طرح حاصل کرو گے۔ میں تو بس اتنی سی مختصر بات جانتا ہوں کہ میں نے تمہیں جو برتن دیے تھے وہ مجھے واپس مل جانا چاہئیں!"

حاکم نے بے فکری سے کہا "بس اتنا ہی ظرف تھا تم میں؟ جن برتنوں کو دریا کی نذر کیا جا چکا ہو وہ تمہیں واپس کس طرح کیے جا سکتے ہیں اور پھر یہ کہ وہ برتن تو تم نے ہمیں دے دیئے تھے۔ ان کا ہم کچھ بھی کریں تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہ ہونی چاہیے!"

"واہ جناب!" جوگی نے کہا "میں نے جو کچھ تمہیں دیا تھا کسی کام کے لیے دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں اُسے یوں دریا بُرد کر کے اس کے فائدے سے محروم کر دیا جائے!"

حاکم نے بظاہر بے لبسی کا اظہار کیا "لیکن اب تو وہ دریا کی تہہ میں بیٹھ چکے یا پانی کی موجوں میں کہیں اِدھر اُدھر بہہ گئے اب ان کا دوبارہ حاصل کرنا ناممکن ہے۔"

جوگی نے بے مروّتی سے کہا "جناب میں ممکن ناممکن کچھ نہیں جانتا، مختصر بات، مجھے اپنے برتن درکار ہیں اور کچھ نہیں۔"

حاکم نے کہا "اگر برتنوں کی واپسی ممکن نہ ہو تو؟"

جوگی نے جواب دیا "تب پھر انہی کے وزن کا سونا فراہم کر دینا!"

حاکم نے کہا "ہاں یہ متبادل صورت ہمیں منظور ہے۔ تمہیں برتنوں کے عوض اتنے ہی وزن کا سونا فراہم کر دیا جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

جوگی نے اکتاتے ہوئے پریشان لہجے میں کہا "لیکن کب؟ کر دیا جائے گا نہیں، مجھے تو وہ ابھی اسی وقت اسی جگہ درکار ہے۔"

حاکم نے افسوس سے کہا "اگر تم اپنی ضد پر قائم ہو اور ہمیں وقت اور مہلت نہیں دینا چاہتے تو نہ سہی!"

جوگی نے چبا چبا کے باتیں بنائیں "شریمان جی! جب بات دل میں آتی ہے تو اسے زبان تک لانے میں کیا حرج ہے۔ تم بے گھر بے در پردیسی، معلوم نہیں بہتے بہاتے کہاں سے یہاں آگئے ہو۔

مئی ۱۹۷۳ء



کا ایک ارادت مند غصے میں بڑبڑاتا اور دل فول بکتا رازی کے سامنے پہنچا۔ رازی نے نہایت تحمل سے پوچھا "تم اپنے آپ سے کیوں گزر رہے ہو؟"

مشتعل شخص نے جواب دیا "حضورِ والا! نکتہ چینوں نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے اور میرے عیب جُو بازار کی بیماریاں پھیلانے والی مکھیوں کی طرح ہر وقت میرے آس پاس بھنبھناتے رہتے ہیں!"

رازی نے نہایت تحمل سے جواب دیا "اس سلسلے میں تمھیں ایک ہی مشورہ دے سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ تم اپنے دل کی قوت پوری طرح کام میں لا کر عیب جو اور نکتہ چیں حضرات کو یوں نظرانداز کر دیا کرو گویا تم عبادت میں مصروف ہو۔"

تمہارا کیا بھروسا کہ یہاں رہو گے بھی یا کہیں چلے جاؤ گے۔ اس سے پہلے ہی اپنا حساب کتاب چکا لینا ضروری ہے!"

حاکم نے کہا "یہ بے اعتباری، یہ بے مروّتی! ہم تمہارا حساب کتاب چکا کے یہیں رہیں گے اسی جگہ، تم نے اس گنہگار کو سمجھنے میں غلطی کی ہے، تم نے یہ نکتہ نہیں سمجھا کہ یہاں جو کچھ ہے محمدؐ عربی کے طفیل ہے۔ تمھاری نظر کیمیا اثر کیسا بھی کرشمہ دکھائے۔ اس کی پرواز کی ایک حد ہو گی، ایک انتہا، لیکن تم یاد رکھو بے کنٹھ ملے کا نا ہیں بِلا محمدا ناؤں (جنت محمدؐ کا نام لیے بغیر نہیں ملے گی)"

جوگی کو بس ایک ہی بات سے دلچسپی تھی، سونے کے برتنوں کی واپسی۔ بولا "شریمان جی! زیادہ باتوں کا وقت نہیں ہے، اپنا اور میرا وقت برباد نہ کریں!"

حاکم نے جوش میں دریا میں ہاتھ ڈال دیا۔ بولے "دریا! ہمیں سونا اور موتی درکار ہیں، اپنے دامن کی ایک حقیر سی مقدار اپنے کنارے ڈھیر لگا دے، یہ لالچی جوگی بے صبرے پن کا اظہار کر رہا ہے۔ ورنہ ہمیں سونے چاندی کی کوئی ضرورت نہیں!"

اسی وقت موجوں میں ایک طلاطم پیدا ہوا اور سمندر کی سرکش موجوں کی طرح دریا کی امواج ساحل کی طرف بڑھیں اور جب وہ واپس گئیں تو دریا کے کنارے بے شمار قیمتی موتیوں اور سونے کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ حاکم نے جوگی کو حکم دیا "اس میں سے جتنا جی میں آئے اٹھا لے اور اپنی راہ پکڑ!"

جوگی حواس باختہ کبھی حاکم کو دیکھتا اور کبھی سونے اور موتیوں کے ڈھیر کو۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا "شریمان جی! یہ سب کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "یہ وہ ہے جس کا تمہیں کوئی علم نہیں!"

جوگی آپ کے قدموں میں گر گیا۔ روتا ہُوا بولا "شری میاں جی میں ایک لوبھی انسان، مجھ میں وہ بے غرضی اور استغنا کہاں جو تم میں پایا جاتا ہے۔ تم نے ابھی یہ کہا تھا کہ بے کھٹے ملے کا نا ہیں ملا محمد آناؤں مجھے اس نام کی جاپ کرا کے مسلمان کر لو، اب اس ہندو جوگ میں کوئی مزہ نہیں رہا۔"

آپ نے اسے اسی وقت مسلمان کر لیا اور اس کا اسلامی نام زین الدین رکھ دیا۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ سینکڑوں سال گزر جانے کے بعد بھی آپ کے مزار کی مجاوری اسی نومسلم زین الدین کی نسل میں چلی آ رہی ہے۔



یہاں رہتے رہتے جب کچھ مدت گزری تو ان کا شہرہ اِدھر اُدھر پھیلنے لگا۔ کیچ مکران سے آپ کا خاندان بھی مئو پہنچ گیا اور اس درویش کے قدموں میں جھک گیا۔ انھوں نے چند گاؤں آپ کی نذر کیے کہ وہ اُن کی آمدنی سے لوگوں اور حاجت مندوں کی دستگیری فرمائیں۔ انہی میں ایک گاؤں ایسا بھی تھا۔ جس پر حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے ایک مُرید کو تصرف حاصل تھا۔ اسے حاکم کے کارندوں سے کسی قسم کی تکلیف پہنچی۔ اس نے شکایتاً اپنے پیر زکریا ملتانی کو ایک نامہ لکھا کہ "یا پیرو مُرشد حمید الدین حاکم نامی ایک بزرگ جو سید احمد توختہ کے نواسے ہیں اور جو کبھی کیچ مکران کے حاکم تھے، درویشی اختیار کر کے مئو میں قیام فرما ہیں، ان کے آدمی میرے ایک گاؤں میں مداخلت کرنے لگے ہیں۔ خاکسار ان سے نہیں الجھنا چاہتا۔ حضور ان سے میری سفارش فرما دیں۔ کیونکہ اللہ والے ہی اللہ والوں سے مناسب مقام بات چیت کر سکتے ہیں۔"

حضرت زکریا ملتانی نے حاکم کو خط لکھا "واضح ہو کہ تم قریشی ہاشمی حضرت ابوالحسن ہنکاری کے جانشین ہو اور تمہارا نام حاکم ہے لیکن طریقِ سلوک میں محکوم ہو کر رہنا ہی لازم ہے اور کسی ایسے امر کا ارتکاب کرنا جو اربابِ حال کے مناسبِ حال نہ ہو اچھا نہیں ہے ایک چھوٹے سے قطعۂ زمین کی خاطر کسی مسکین کے دل کو آزردہ کرنا کہاں تک مناسب ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

اس خط نے حاکم کو جھنجھوڑ دیا۔ آپ نے فوراً ہی جواب لکھا "بعد تمہید خدائے ذوالجلال و درود ایزد متعال حضرت پر واضح ہو کہ یہ احقر اگرچہ حاکم کہلاتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ محکوم احکام الٰہی ہے۔ یہ ناچیز خود کو درویشوں کی خاکِ پا سمجھتا ہے اور خدا گواہ ہے کہ ہمیں درویش مذکور کے رنجیدہ ہونے کا کوئی علم نہیں اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ درویش کا کوئی مزاحم نہ ہو گا۔"

اس خط نے حضرت زکریا ملتانی کو اتنا خوش کیا کہ انھوں نے حمید الدین حاکم کو بلا بھیجا، یہ ان کی خدمت میں پہنچے تو حضرت زکریا ملتانی نے بے پایاں خوشی کا اظہار کیا۔ ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اور آخر میں اپنی لڑکی بی بی فاطمہ کو ان سے وابستہ کر دیا۔ اس موقع پر زکریا ملتانی کے کسی عقیدت مند نے کہا "جناب یہ بہترین موقع ہے کہ آپ پیرو مرشد سے بیعت و خلافت کی بات بھی کر لیں۔"

حاکم نے جواب دیا "نہیں میں بیعت و خلافت کی خواہش لے کر ہرگز نہیں آیا۔ ہم تو ان کے پوتے حضرت رکن الدین علیہ الرحمہ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

یہ بیوی کو لے کر مئو واپس چلے گئے۔

مئو میں جو مُرید اور ارادت مند آپ کے آس پاس رہنے لگے تھے یا حاضریاں دینے لگے تھے۔ ان میں ایک مہر نامی شخص بھی تھا۔ یہ آپ کے لیے ہر روز دودھ لے کر آتا تھا۔ جہاں سے آتا تھا۔ وہ جگہ دریا کے اُس پار تھی۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی کشتی مل جاتی تھی اور وہ اس کے ذریعے دریا عبور کرتا تھا۔ ایک دن جو وہ دودھ لے کر پہنچا تو دریا میں دُور دُور تک کوئی کشتی نظر نہیں آئی۔ اس نے کنارے بیٹھ کے کسی کشتی کا کافی دیر تک انتظار کیا۔ لیکن انجام مایوسی نکلا۔ آخر اس نے ہمت کی اور بسم اللہ کہہ کے دریا میں اتر پڑا۔ دودھ کا برتن سر پر رکھ لیا اور دریا کے تند و تیز دھارے کو کاٹتا ہوا دوسرے کنارے کی طرف بڑھا۔ بیچ دریا میں اسے بھنور نے آ لیا۔ جب اُس نے یہ دیکھا کہ اس کا دریا سے بچ نکلنا ناممکن ہے تو اس نے آہستہ سے کہا "حضرت! میری نیت ٹھیک تھی اور میری دلی خواہش تھی کہ دُودھ پہنچانے کے معمُولات میں فرق نہ آئے لیکن شاید قدرت کو یہ منظور نہیں ہے۔ میں دریا کی موجوں اور بھنور کا تو مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن مجھ میں مشیتِ ایزدی کے مقابلے کی تاب نہیں ہے، ان حالات میں، میں آپ کی مدد کا طالب ہوں۔ لیکن آپ بھی اسی حد تک مدد کر سکتے ہیں جتنی خدا کو منظور ہے۔"

اس نے اچانک ایسا محسوس کیا جیسے کسی ہاتھ نے اس کی گردن پکڑ لی ہے اور سرکش امواج اور بھنور کے منہ سے چھین کر ساحل کی طرف لیے جا رہا ہے۔ جب ذرا ہوش آیا تو پتہ چلا کہ وُہ ساحل پر کھڑا ہے، وُہ دُودھ لے کر دیوانہ وار حاکم کی خدمت میں پہنچ گیا اور انھیں پورا قصّہ سُنا کے عرض کیا "حضرت! آج تو بس خیر ہو گئی۔ ورنہ میں تو زندگی

سبب تنگ

سے مایوس ہی ہوگیا تھا، مجھے آپ کے قدموں تک پہنچنے میں جو محنت کرنا پڑی ہے، کچھ میں ہی جانتا ہوں!"

آپ نے اپنا ہاتھ، جس کی آستین بھیگی ہوئی تھی، اپنے ارادت مند کی طرف بڑھا دیا اور متبسم ہو کر فرمایا: "بیشک، اس میں کیا کلام لیکن محنت تنہا تمھاری ہی نہ تھی بلکہ ہمارے ہاتھ سمیت ہے!"

اس شخص نے حاکم کا ہاتھ چوم لیا۔ آہستہ سے کہا: "اس بھیگی آستین اور محنت کے قربان، بخدا! مجھے اس کا علم نہیں تھا!"

فقر و فاقہ تو ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھیں اور ان کی بیوی کو اکثر بھوکا رہنا پڑتا۔ ایک ایسا وقت بھی آگیا کہ پانچ دن تک متواتر انھیں فاقے کرنے پڑے۔ فاقوں سے نڈھال بیوی ان کے سامنے کھڑی ہوگئی اور زبان پر شکایت کا ایک لفظ لائے بغیر بزبانِ حال سب کچھ کہہ دیا۔

حاکم نے سبے جبینی سے پوچھا: "نیک بخت! تو کیا چاہتی ہے؟"

بیوی نے اپنے دکھ چھپا کے عرض کیا: "صورت بیں، حالش مپرس"

آپ نے خاموشی اختیار کی اور پھر مصلے کا ایک کونا اٹھا کے اس کے نیچے سے ایک نہایت قیمتی موتی نکال کر بیوی کے حوالے کیا۔ بولے: "اس کی بازار میں بہت زیادہ قیمت مل جائے گی، ذرا سنبھال کے خرچ کرنا۔"

بیوی کا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ قیمتی موتی کے مل جانے کی طمانیت نے انھیں اس درجہ مطمئن کر دیا کہ انھیں نیند آگئی۔ خواب میں دیکھا وہ جنت میں داخل ہو چکی ہیں، وہاں نہایت حسین محل جگہ جگہ بنے ہوئے ہیں، اور ان میں ایک محل ایسا بھی تھا جس کے ایک دروازے کا کنگرہ غائب تھا۔ انھوں نے کسی پاسبان سے سوال کیا: "یہ محل کس کا ہے؟"

پاسبان نے جواب دیا: "حضرت حمید الدین حاکم کا۔"

بیوی نے گھبرا کر دوسرا سوال کیا: "لیکن اس کا تو ایک کنگرہ غائب ہے۔ آخر یہ کیوں؟"

پاسبان نے جواب دیا: "اس کنگرے کے مروارید کو انھوں نے دنیا ہی میں طلب کر لیا ہے، جو انھیں دے دیا گیا۔"

بیوی کی آنکھیں کھل گئیں، بدحواس پریشان حال موتی ہاتھ میں لے کر شوہر کے پاس پہنچیں اور اسے شوہر کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "مجھے فاقوں سے مرجانا گوارا۔ لیکن آپ نے اس موتی کو جہاں کہیں سے بھی حاصل فرمایا ہے وہیں واپس پہنچا دیجیے۔"

حاکم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ انھوں نے موتی کو مٹھی میں لے کر بیوی کو آنکھیں بند کر لینے کا حکم دیا، جس کی حرف بحرف تعمیل ہوئی اور موتی غائب ہوگیا۔

بیوی ایک عرصے سے اپنے والد کے پاس نہیں گئی تھیں۔ بھائیوں کی یاد بھی ستاتی رہتی تھی۔ ایک دن یہ اپنے بھائی صدرالدین عارف کے گھر پہنچیں اور زمین پر بوریہ بچھا کر سو گئیں۔ صبح صدرالدین سو کر اٹھے اور بہن کو بوریے پر سوتا دیکھا تو حیران رہ گئے۔ کیونکہ انھوں نے رات کو بہن کے لیے آرام دہ بستر بچھا دیا تھا، لیکن وہ خالی پڑا تھا، بہن کے بیدار ہو جانے پر بھائی نے سوال کیا: "بہن! جب بستر موجود تھا تو پھر زمین پر بوریہ بچھا کر کیوں سو گئیں؟"

بہن نے جواب دیا: "بھائی! ایک عرصے سے ایسے بستر پر سونے کی عادت ختم ہو چکی ہے کیونکہ تمھارے بہنوئی (حاکم) پوری رات چار رکعتوں میں گزار دیتے ہیں۔ ان رکعتوں میں وہ پورا قرآن ختم کرنے کے عادی ہیں۔ انھیں رات کو لیٹنا شاذ و نادر ہی میسر آتا ہے۔ ایک دن وہ آرام فرما رہے تھے کہ قریب صبح میں نے ان کے سر کے نیچے تکیہ رکھ دیا۔ وہ جاگ رہے تھے انھوں نے برہمی سے تکیہ ہٹا کے ایک طرف رکھ دیا اور مجھ سے کہا: 'تم شیخ کبیر بابا زکریا کی بیٹی ہو کر میرے نفس کو آرام و تلذذ کی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟' ان کی اس بات نے مجھے شرمسار اور نادم کر دیا اور اس دن سے خود میں نے آرام کی نیند ترک کر دی۔"

بھائی کو اس واقعے نے بہت متاثر کیا۔ کہا: "حمید الدین حاکم نام کا ہی حاکم نہیں، بلکہ تزکیۂ نفس اور زہد و ریاضت میں بھی ہم سب کا حاکم ہے!"

آپ کا شہرہ ملتان اور رحیم یار خاں کے اس پار شمالی ہند تک جا پہنچا۔ غیاث الدین تغلق کا وزیر اپنے چند مصاحبین کے ساتھ آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا، اس وقت آپ اپنے کپڑوں میں پیوند لگا رہے تھے۔ کسی نے آپ کو مطلع کیا کہ فرماں روائے ہند کا وزیر اپنے خدام کے ساتھ آپ کی زیارت کو حاضر ہوا ہے، ذرا سی دیر کے لیے آپ اس کے روبرو بیٹھ جائیے۔ آپ نے وزیر کو مصاحبین اور خدام سمیت اپنے پاس بلا لیا۔ وزیر اور اس کے ساتھیوں نے حاکم کو پیوند لگاتے جو دیکھا تو ذرا سی دیر کے لیے دل میں یہ خیال گزرا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں کہ انھیں صحیح سلامت کپڑے تک میسر نہیں اور یہ کہ ان کا کوئی ایسا مخلص ارادت مند بھی نہیں جو ان کے کپڑوں میں پیوند لگا دیا کرے۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ حاکم نے پیوند لگانے کا کام موقوف کیا اور اپنی کلاہ کو ٹیڑھا کر دیا۔ کلاہ کا ٹیڑھا ہونا تھا کہ سبھی کے منہ ٹیڑھے ہو گئے۔ وزیر اور اس کے ساتھی گھبرا گئے، وزیر مؤدبانہ آگے بڑھا اور حاکم کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور روتے ہوئے عرض کیا: "حضرت! مجھے اپنی ناقص اور گناہگار سوچ کا احساس ہے اور میں نادم و شرمسار ہوں۔ براہ کرم معاف فرما دیجیے۔ آئندہ میں ایسی جسارت

نہیں کروں گا!"

حضرت حاکم نے فرمایا "رسول اللہؐ اپنے کام خود کیا کرتے تھے۔ تم تو اپنے رسولؐ کی اتباع کرتے ہیں۔ دوسرے اس پر ملول اور افسردہ کیوں ہوں!"

وزیر نے عاجزی سے کہا "میں شرمندہ ہوں۔ معاف فرما دیجیے!"

آپ نے اپنی کلاہ سیدھی کر دی۔ وزیر اور اس کے ساتھیوں کے منہ سیدھے ہو گئے۔ وزیر یہ کہتا ہوا واپس چلا گیا کہ آپ کی بزرگی اور عظمت کا میں تہہ دل سے معترف ہو چکا ہوں اور آئندہ کسی بھی قسم کی ایسی گفتگو یا رویے سے پرہیز اور گریز کروں گا جس سے کسی بھی انسان کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہو۔"

آپ نے آہستہ سے کہا "یہی مناسب ہے ورنہ دل آزاری کے جواب کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی ذرا سی بے تکلفی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے سے گریز کرے اور دل آزاری کا جواب دل آزاری سے دے۔"

آپ نے سوچا کہ پیر کے انتظار میں ایک جگہ بیٹھے رہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ حج کر لیا جائے۔ آپ نے خانہ کعبہ پہنچنے کی تیاری کی اور جہاز میں بیٹھ کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئے ایک جگہ طوفان ایسا آیا کہ جہاز کے بچ نکلنے کے آثار ہی جاتے رہے کچھ دیر بعد اس افراتفری میں طوفان کے شور میں منادی نے باآوازِ بلند اعلان کیا۔ وہ کہہ رہا تھا "حضرات جیسا کہ آپ لوگ خود ہی ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ جہاز طوفان میں پھنس چکا ہے۔ اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ کوئی شخص سمندر میں پھاند کر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے۔ تاکہ اس جان کے عوض سینکڑوں جانیں بچ جائیں!"

حاکم کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے ارادے کی کسی اور کو خبر تک نہ ہونے دی۔ چپ چاپ جہاز سے پانی میں گر گئے اور ہاتھ پیر مارنے لگے۔ لوگوں نے بڑے افسوس سے کہا "بھئی ہم نے یہ کب کہا تھا کہ حاکم ہی سمندر میں کود جائیں۔ کوئی بھی کود سکتا تھا۔"

جہازیوں نے چاہا کہ انھیں بچا لیا جائے لیکن حاکم غوطے کھاتے، ڈبکیاں لگاتے کہیں غائب ہو گئے۔ جہازیوں کو انھیں دیر تک تلاش کرنے کے باوجود جب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو وہ انھیں وہیں چھوڑ کر آگے روانہ ہو گئے۔ حاکم غوطے لگاتے۔ ٹکریں مارتے ایک چھوٹے سے جزیرے پر پہنچ گئے۔ اس جزیرے میں ایک چھوٹا سا پہاڑ بھی تھا۔ حاکم اس پہاڑ کی طرف روانہ ہو گئے۔ پہاڑی پر پہنچ کر انھوں نے متجسسانہ ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کہیں بھی آبادی کا نشان تک نہ تھا۔ وہ ایک سرسبز و شاداب حصے کی طرف بڑھے۔ سبزہ زار پر جگہ جگہ انسانی ڈھانچے اور ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ آپ وہیں بیٹھ گئے اور غور کرنے لگے کہ ان بدبخت انسانوں کے ساتھ وہ کون سا حادثہ پیش آیا۔ جس نے انھیں ہڈیوں کے پنجروں میں تبدیل کر دیا انہیں حیرت تھی کہ کہیں ایک انسان تو نظر آتا۔ آہستہ آہستہ دن ختم ہو رہا تھا۔ اور شام قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس ویرانے میں زندگی گزارنے کا تصور تک محال تھا۔ وہ ادھر ادھر کسی جاندار کی تلاش یا آبادی کی جستجو میں چلنے پھرنے لگے یہاں تک کہ شام ہو گئی اور سورج مغربی افق میں منہ چھپانے لگا۔ یہ سرسبز و شاداب قطعے پر واپس چلے گئے اور انسانی ڈھانچوں اور ہڈیوں کے درمیان رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ سورج چھپا اور چاند نے تب و تاب کا مظاہرہ کیا۔ یہ قبلہ رُخ ہو کے سربسجود ہو گئے۔ کافی دیر گزرنے کے بعد جب انھوں نے سلام پھیرا تو اپنے بائیں طرف کسی انسانی وجود کو محسوس کیا۔ حاکم نے اب جو غور سے دیکھا تو انھیں ایک نہایت حسین و جمیل عورت کھڑی نظر آئی۔

حاکم نے حیرت سے کہا "تم کون ہو اور یہاں کہاں رہتی ہو؟"

عورت نے سوگواری سے جواب دیا "میں وہ بدقسمت عورت ہوں جس کا اب اس جگہ کوئی بھی موجود نہیں، سبھی میرا ساتھ چھوڑ کر ملکِ عدم سدھار چکے!"

حاکم نے پوچھا "یہ سب ہلاک کس طرح ہوئے؟"

عورت نے جواب دیا "انھیں ان کی ہوس کھا گئی۔"

عورت کا جواب حاکم کی سمجھ میں نہ آیا۔ عورت سے پوچھا "اب تم کیا چاہتی ہو؟"

عورت نے جواب دیا "تم یہیں رہ جاؤ۔"

حاکم نے پوچھا "وہ کیوں؟"

عورت نے کہا "اس لیے کہ یہاں میں تنہا ہوں اور ایک تنہا عورت یہاں کس طرح رہ سکتی ہے!"

حاکم نے جواب دیا "اچھا صبح ہونے دو، سوچ کر جواب دیں گے۔"



اس کے بعد حاکم پھر عبادت میں مشغول ہو گئے۔ عورت ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہو گئے اور عورت کی طرف دیکھا تو اسے نہایت انہماک اور اشتیاق سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ حاکم نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ عورت ان کے قریب آ گئی اور چاند کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "کتنا حسین منظر ہے؟"

آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

عورت نے حل فریب تبسم کا مظاہرہ کیا، بولی "چاندنی اور موسم کا نشہ میں اپنی رگ رگ میں دوڑتا محسوس کر رہی ہوں معلوم نہیں آپ کا کیا حال ہے؟"

آپ نے سکوت بحال رکھا۔ عورت کھسک کر بالکل قریب آگئی بولی "آپ نے اس ویران بستی کی بابت یہ تو محسوس ہی کر لیا ہوگا کہ یہاں از سرِ نو آبادکاری کی سخت ضرورت ہے۔"

آپ نے جواب دیا "ہم یہاں مستقل رہنے نہیں آئے ہیں۔ کل صبح ساحل پر پہنچ کر ہم کسی جہاز کا انتظار کریں گے اور اس پر بیٹھ کر یہاں سے چلے جائیں گے لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ ہم سے چاہتی کیا ہو؟"

عورت نے افسردگی آمیز شوخی سے کہا "لیکن تم یہاں سے کیوں چلے جانا چاہتے ہو؟ یہاں رہتے کیوں نہیں؟"

آپ نے جواب دیا "ہم حج کی نیت سے گھر سے نکلے تھے اور وہی مقصد اس وقت بھی پیشِ نظر ہے۔"

عورت نے آپ کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی، بولی "لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ یہیں رہیں اور ہم دونوں کے اتحاد اور یک جہتی سے نسلِ انسانی کا سلسلہ قائم ہو۔ میں یہاں ایک آباد بستی دیکھنے کی خواہش مند ہوں، میرا خیال ہے آپ کی بھی یہی خواہش ہوگی!"

"نہیں!" آپ نے بیزاری سے جواب دیا "ہماری ایسی کوئی خواہش نہیں!"

عورت سرمستی و سرشاری سے بے خود ہوئی جا رہی تھی۔ خود کو آپ کی آغوش میں گرا دینے کی کوشش کی لیکن آپ کھسک کر ذرا دور ہوگئے عورت گھاس پر گر گئی۔ سنبھل کر اٹھی تو اس طرح کہ قہر کی نظروں سے انھیں گھور رہی تھی۔ کچھ کہنے کے لیے اس نے ابھی اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ حاکم نے اک ادائے خاص اور بے نیازی سے کہنا شروع کیا "او زنِ بازاری ہماری بات ذرا غور سے سُن، ہم تیرے مطلب کے نہیں ہیں، اگر تو ہم سے بڑی ہے تو ہم تجھے اپنی ماں کی جگہ تصور کریں گے۔ اگر تو ہماری ہم عمر ہے تو خود کو ہماری بہن تصور کر، اور اگر عمر میں ہم سے چھوٹی ہے تو ہم تجھے اپنی بیٹی سمجھیں گے۔ ان رشتوں کے علاوہ کسی اور رشتے کا ہمارے ذہن میں کوئی تصور نہیں!"

عورت نے سکوت اختیار کیا اور غور سے حاکم کی شکل دیکھنے لگی حاکم نے نظریں چرائیں اور گردن جھکا کے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد سر اٹھایا تو پتہ چلا وہ عورت کہیں جا چکی ہے۔

اس وقت کسی نے کہا "حاکم! ہمیں تیرا امتحان مقصود تھا تیرے آس پاس جن لوگوں کے ڈھانچے اور ہڈیاں بکھری پڑی ہیں۔ یہ سب اس عورت کے شکار ہو چکے ہیں۔ اس سے چاہت اور مواصلت کا انہیں یہ صلہ ملا ہے۔ یہ عورت بمنزلہ قحبہ تھی۔ دُنیا کی بھی یہی حیثیت ہے تو نے اسے ٹھکرا کر ایک اہم امتحان میں مثالی کامیابی حاصل کی ہے۔ تو صبح ساحل پر پہنچ جا، وہاں ایک جہاز تیرا منتظر ہوگا۔ اس پر بیٹھ کر خانہ کعبہ پہنچ"

اس ہاتفِ غیبی کی آواز پر حاکم سجدے میں گر گئے اور روتے ہوئے فرمایا "یا الٰہ العالمین! میں ایک کمتر اور بے بس انسان جس امتحان میں کامیاب ہوا ہوں۔ اس میں بھی تیری ہی مہربانی پیش پیش تھی ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ کٹھن امتحان۔"

دوسرے دن صبح واقعی انھیں ایک جہاز مل گیا اور یہ اس پر بیٹھ کر خانہ کعبہ کے لیے روانہ ہوگئے۔



حرم کے گرد طواف کرنے کے دوران آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ آپ کے نقشِ پا پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ نے گھوم کر اسے دیکھا اور کہا "ظاہری نشان پر چلنا تو نہایت آسان ہے لیکن باطنی نقشِ قدم پر چلنا بہت دشوار کیونکہ یہاں ہر قدم پر قرآن پاک ختم کرنا پڑتا ہے!"

اس شخص نے دل میں خیال کیا، حاکم جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس کا واقعی یہ مطلب نہیں کہ وہ ہر ہر قدم پر قرآن پاک ختم کر لیتے ہیں بلکہ یہ محاورتہً فرمایا ہوگا۔ آپ نے اسی وقت فرمایا "نہیں، ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا وہی مطلب ہے جو ہم نے کہا، تم ان رموز کو کیا سمجھو۔"

وہ شخص حیران و پریشان ایک طرف چلا گیا اور کسی دوسرے بزرگ سے حاکم کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ شخص ابھی ابھی جو کچھ کہہ رہا تھا کیا یہ درست ہے؟"

ان بزرگ نے جواب دیا "یہ حمید الدین حاکم سلطان التارکین ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا وہی مطلب ہے جو لفظوں میں ادا کیا گیا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں۔"

اس طرح وہ ایک عرصے تک اپنے پیرِ رشد کا انتظار کرتے رہے اور آخر کار عمر کا ایک بڑا حصہ گزارنے کے بعد انہیں رکن الدین کی شرفِ مُریدی حاصل ہوئی۔ ایک عمر رسیدہ شخص کا ایک نوعمر شخص کی پیری پر ایمان لے آنا معمولی بات نہیں ہے لیکن حاکم نے یہی کیا۔ نوعمر شیخ رکن الدین شیخ حاکم کے پیر تھے اور عمر رسیدہ شیخ حاکم نوجوان شیخ رکن الدین کے مرید۔



ملتان کے کنارے کفار کا لشکر اس غرض سے اکٹھا ہوا کہ وہ مسلمانوں کو لوٹے مارے گا۔ لیکن لوٹ مار اور قتل و غارت گری سے پہلے ہی حضرت حاکم نے اپنی چھاگل دریا میں ڈال کر نکال لی۔ آہستہ آہستہ

پانی کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ دریا خشک ہوگیا۔ کفار کا جو لشکر دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالے پڑا تھا، دریا کے خشک ہو جانے سے پیاس سے تڑپنے لگا۔ اسی عالم میں ملتان والوں نے ان پر حملہ کر دیا اور چشم زدن میں انہیں شکست دے دی۔ لیکن ان مسلمانوں کو بھی پانی کی سخت دقت اٹھانی پڑی۔ وہ اصل واقعے سے لاعلم تھے۔ اس لاعلمی کے ساتھ وہ کسی اور بزرگ کے پاس پہنچے اور اس کے سامنے مشکلات اور شکایات پیش کیں انھوں نے بھی سکوت اختیار کیا۔ ان صاحب نے تنگ آکر لوگوں سے کہا "ہم پیری مرشدی کے اتنے دعوے دار تو نہیں لیکن اتنی سی بات ہمیں بھی معلوم ہے کہ تم سب بابا زکریا ملتانی کے پاس چلے جاؤ اور اپنی مشکل ان کے رو برو بیان کرو مسئلہ ابھی اسی وقت حل ہوا جاتا ہے"۔

چنانچہ ان لوگوں نے یہ مسئلہ بابا زکریا ملتانی کے سامنے رکھا۔ انھوں نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا۔ پھر فرمایا: "ذرا بابا حمید الدین حاکم کو یہاں آنے کی زحمت تو دینا"۔

لوگوں نے تھوڑی دیر بعد حاکم کو دادا پیر کے رو برو کھڑا کر دیا آپ نے حاکم سے کہا: "کیوں بھئی حاکم! یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا تم اس پر خوش ہو کہ دریا کا سارا پانی اپنے کوزے میں بھر لیا۔ بابا حاکم! ہمیں یہ بتاؤ کہ تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

حاکم نے نرمی سے جواب دیا۔ "حضرت! وہ پانی تو ہم نے کفار پر بند کیا تھا!"

بابا زکریا نے کہا: "لیکن وہ تو کب کے جا چکے ہیں۔ اب تو اپنے بھائی مسلمان بھی پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور اس کے ذمے دار تم ہو صرف تم!"

حاکم نے فرماں برداری سے کہا: "جیسا حکم ہو اس کی تعمیل کی جائے"۔

بابا زکریا نے فرمایا: "کوزے کا پانی دریا میں الٹ دو بس ہم یہی چاہتے ہیں!"

"بہتر ہے!" حاکم نے اسی وقت کوزے کا پانی خشک دریا میں ڈال دیا اور اسی وقت سے دریا جاری ہوگیا۔

شیخ بہاء الدین زکریا وصال فرما گئے، بابا زکریا کے صاحبزادے شیخ علم الدین سجادہ نشینی کے امیدوار بن کر سلطان غیاث الدین کی خدمت میں پہنچ گئے ان کا خیال تھا کہ اس معاملے میں ان کے بھتیجے رکن الدین آڑے آئیں گے اور انھیں اسی طرح اپنی راہ سے ہٹایا جا سکتا تھا کہ بادشاہ خود انھیں سجادہ نشین کی حیثیت سے نامزد کر دے۔ جب یہ دہلی پہنچے تو ان سے دو ایک ایسے کرشمے سرزد ہوئے کہ بادشاہ ان کے مرتبے کا قائل ہوگیا۔ شیخ علم الدین نے بادشاہ سے عرض کیا: "جنابِ والا! میں بادشاہ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ بادشاہ مجھے بابا زکریا ملتانی کی جگہ سجادہ نشین کی حیثیت سے نامزد فرما دیں، میں بابا زکریا کا بیٹا اور پڑھا لکھا شخص ہوں۔ جبکہ شیخ رکن الدین میرے بھتیجے اور بابا زکریا کے پوتے ہیں اور بے پڑھے لکھے بھی ہیں۔ لوگوں کا رجحان ان کی طرف ہے اور اس رجحان کے خلاف اور میرے حق میں بادشاہ سلامت جو فیصلہ بھی صادر فرمائیں گے لوگ اس پر متفق ہو جائیں گے!"

بادشاہ نے اسی وقت حکم صادر کیا کہ شیخ رکن الدین کو بھی بادشاہ کے رو برو حاضر کیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور شیخ رکن الدین اپنے خدا رسیدہ عمر رسیدہ مرید حاکم کو لے کر دہلی روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک جگہ انھوں نے دیکھا کہ ایک طویل دیوار کھڑی ہوئی ہے۔ ایک ایسی دیوار جو انھیں تو نظر آرہی تھی لیکن اسے عام انسان نہیں دیکھ سکتے تھے، شیخ رکن الدین نے حاکم سے کہا: "بابا حاکم! اس دیوار کو دیکھ رہے ہو؟"

حاکم نے جواب دیا: "جی پیر و مرشد!"

شیخ رکن الدین نے کہا: "یہ دیوار سلسلۂ چشتیہ اور سہروردیہ کے درمیان حدِ فاصل ہے"۔

حاکم نے عصا بلند کیا اور دیوار پر رسید کیا: "آخر یہ حد بندی کیوں؟ اسے گر جانا چاہیے"۔ وہ دیوار ایک ہی ضرب میں غائب ہوگئی

جب یہ لوگ بادشاہ کے سامنے پہنچے تو علم الدین نے اپنی قابلیت کے اظہار کے طور پر سوال کیا: "بادشاہ سلامت شیخ رکن الدین سے معلوم فرمائیں کہ وضو میں ہاتھ دھونا، کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا سنت ہے اور منہ دھونا فرض۔ لیکن فرض پر سنتوں کو کیوں مقدم کیا گیا؟"

شیخ رکن الدین کی طرف سے حاکم نے جواب دیا: "سنتوں کے،

میدانِ عرفات

میں لاکھوں آدمیوں کا ہجوم تھا اور یہ سب آہ و زاری اور توبہ میں مشغول تھے۔ انھی میں ابراہیم بن ادھم کے پیر فضیل بن عیاضؒ بھی موجود تھے۔ ہجوم اور توبہ و استغفار سے متاثر ہو کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا: "اے اللہ! اگر اتنا بڑا ہجوم کسی بخیل کے در پر کھڑے ہو کر اسی عجز اور درد و سوز سے گڑگڑاتے تو وہ بھی انھیں خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے گا۔ اور تو جو ارحم الراحمین اور رحمتِ مجسم ہے انھیں کس طرح اپنے جود و کرم سے محروم رکھے گا!"

تقدیم رنگ، ذائقہ معلوم کرنے کی غرض سے ہے۔ ہاتھ دھونے سے پانی کا رنگ معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کلی کرنے سے اس کے ذائقے کی اچھائی برائی معلوم ہو جاتی ہے اور جب پانی ناک میں ڈالا جاتا ہے تو ناک ہمیں بتا دیتی ہے کہ پانی بدبودار ہے یا نہیں۔ جب تین جگہوں سے پانی کی طہارت کی گواہی مل جاتی ہے تب ہم پر فرض کی ادائیگی واجب آجاتی ہے یعنی منہ دھونا اور فرض پر سنتوں کو اسی لیے مقدم کیا گیا ہے"

شیخ علم الدین نے بادشاہ سے کہا "حضور والا! جواب حاکم نے دیا ہے جو ایک پڑھے لکھے انسان ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے سوالوں کے جواب شیخ رکن الدین مرحمت فرمائیں!"

شیخ رکن الدین کو غصہ آگیا۔ فرمایا "اچھی بات ہے!" اسی وقت کسی کو حکم دیا "جاؤ بازار سے ایک جاہل غلام خرید لاؤ۔ ہماری طرف سے چچا علم الدین سے وہ سوال جواب کرے گا!"

بادشاہ کی ایما اپنا کام کیے جا رہی تھی۔ اس کی ایما پر بازار سے ایک غلام خرید کر لایا گیا۔

شیخ رکن الدین نے حاکم سے کہا "بابا حاکم! تم اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ٹپکا دو!"

پیر کے حکم کی فوری تعمیل عمل میں آئی۔ شیخ رکن الدین نے بادشاہ سے کہا "اب یہ شخص چچا علم الدین سے کسی بھی موضوع پر بحث و مباحثہ کر سکتا ہے!"

بحث مباحثے کا آغاز ہوا۔ پتہ چلا کہ نو خرید جاہل غلام علم الدین پر کئی گنا زیادہ فوقیت رکھتا ہے۔ جب بحث و مباحثے کا فیصلہ نو خرید غلام کے حق میں ہو گیا تو رکن الدین نے وہیں یہ اعلان کر دیا "آج میں اپنے دادا کی سجادہ نشینی ہرگز نہیں چاہتا اس کے لیے چچا علم الدین ہی مناسب ہیں"

بادشاہ نے علم الدین کو بابا زکریا کی جگہ سجادہ نشین نامزد کر دیا۔

جب شیخ علم الدین ملتان روانہ ہونے لگے تو رکن الدین نے انھیں نصیحت کرتے ہوئے کہا "اول تو یہ کہ خانقاہ میں کبھی بھی کسی کو درس نہ دینا دوم یہ کہ رقص میں جو کبوتر بھی رہتے ہیں۔ انھیں وہاں سے نکالنا مت!"

علم الدین نے کوئی جواب نہ دیا۔ رکن الدین نے پھر کہا "جو فقیر مسجد یا حجرے میں اذکار و اشغال رکھتے ہوں انھیں ستانا مت!"

علم الدین نے نہ تو کوئی وعدہ کیا اور نہ ہی کوئی جواب دیا بلکہ اس کے بعد انھوں نے ہر وہ حرکت کی جس سے رکن الدین کو تکلیف پہنچ سکتی تھی انھوں نے خانقاہ میں درس کا سلسلہ جاری کیا۔ کبوتروں کو رقص سے نکال باہر کیا اور ان فقرا کو ستانا شروع کیا جو وہیں کہیں گوشہ نشین تھے۔ انہی میں حاکم کے علاتی بھائی شیخ حاتم بھی تھے جن پہ سکر و مستی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ علم الدین نے ان کے خلاف سخت محاسبہ کیا۔ انھیں نمازوں میں شریک ہونے سے روک دیا اور کہا "نماز سکر و مستی میں کہاں جائز ہے؟ اس لیے آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آئندہ آپ احتیاط رکھیں!"

اس پابندی پر سبھی نے جو کچھ کہا سنا وہ تو ایک الگ بات تھی لیکن اس معاملے میں بطور خاص حاکم کے علاتی بھائی حاتم نے جوش میں کہا "اے سوختگان عشق را چرا می سوزی" (او جلے ہوئے! عشق کے جلے ہوؤں کو کیوں جلاتا ہے؟)

ادھر زبان سے یہ جملہ نکلا اور ادھر علم الدین کو سوزش نے تپانا شروع کیا اور وہ ساتویں دن جاں بحق ہو گئے۔

حکومت کو ٹھوکر مار کر درویشی اختیار کرنے والا یہ شخص ایک سو سترہ سال زندہ رہا۔ بڑی بڑی کرامتیں ظہور پذیر ہوئیں۔ لوگوں کی مشکلات حل ہوئیں۔ آپ کو سلطان التارکین کا خطاب عطا ہوا۔ جو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا سرخرو اور کامیاب ہوا۔

یہ سنہ ۷۲۷ھ کا ذکر ہے۔ ملتان میں کسی بزرگ نے نعرہ بلند کیا "لوگو! ہوشیار! اس کی ایک سمت غرق ہونے کو ہے۔ لوگو خبردار! یہاں کی ایک طرف غرق ہونے والی ہے!"

لوگ بدحواس اور پریشان آپ کی خدمت میں پہنچے اور کہا "حضرت یہ کیسی آواز بلند ہوئی ہے۔ کیا واقعی یہاں کا کوئی بڑا حصہ غرق ہونے والا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہم لوگ بچ نکلنے کی فکر کریں!"

آپ نے متبسم ہو کر ارشاد فرمایا "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، ہاں ان دنوں کوئی صاحب رحلت ضرور فرمائیں گے!"

اور ایک ہفتے بعد ۱۲ ربیع الاول کو خود حضرت حاکم وفات پا گئے۔ آپ کی وفات ملتان میں ہوئی، لیکن تجہیز و تکفین مؤمن میں ہوئی جو بہاول پور کی تحصیل رحیم یار خاں کے ریلوے اسٹیشن ترنڈہ سے جانب شمال چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

حاکم نے بہت سوں کو مسلمان کیا اور بہت ساری کتابیں بھی تصنیف کیں۔ آپ شاعر بھی تھے اور حاکم تخلص کرتے تھے۔ فقہ میں کنز، صرف میں پنج گنج، تفسیر میں نیام اور نظم میں گلزار آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

حمید الدین حاکم کے سوانح حیات میں جلال و جمال کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ شاہی جلال اور فقیری جمال۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "الفقر فخری" حمید الدین حاکم نے اس قول کی صداقت اپنے اعمال سے ثابت کر دی۔ حکومت کو بے نیازی سے ٹھکرا کر فقر کا خرقہ پہن لینا ہی "الفقر و فخری" کی ایک دل کش اور حسین تفسیر ہے۔



ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے

شیخ المشائخ
معصوم ولی
صحرانورد درویش
ابن خلدون
عارف کامل
اجودھن کا درویش
عالم باطن
اسحاق اخرس
شمع فروزاں
انا الحق
متکلم صوفی
بہاءالدین ولد
شیخ محمد
بے تاج بادشاہ
محیط عالم
حاکم فقیر